

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکینہ

ماہنامہ

مارچ 2019

نگارونِ ملی
معراج رسول

صفحات 306
قیمت 100 روپے

سحر ساجد و انشاں آفریدی کے دلکش ناول.....

معروف قلم کار شگفتہ بھٹی کی خوشگوار آمد.....

ناویہ احمد، رفاقت جاوید و ہاجرہ ریحان کی خصوصی تحریریں.....

منی ناول

دردانہ نوشین خان 104

اداریہ

مدیرہ 15

مجھے کچھ کہنا ہے

افسانے

باجرہ ریحان 51

محبت کے حوصلے

افشین نعیم 61

افشین کی لڑکیاں

میرجے کے لیے خدائی کا پیسہ 89

سلسلے وار ناول

میر سارا رنگ انارکلی افشار آفریدی 18

سحر ساجد 152

نار

ناولٹ

کشف بلوچ 131

ہنگام

طیبه عنصر مغل 66

طواف آرزو

شایا نعیم 183

فصلوں کا فیصلہ

رفاقت جاوید 188

بیگم جہان

ایک دن جہان میں کے ساتھ آسپہ عامر 215

ایلیا علی غفار 137

پیگم بیکس

خصوصی مضامین

اختر شجاعت 254

بشیر علی

نادیہ احمد 218

ایک لفظ محبت کا

نرہت اصغر 260

وہ آج کے بزمِ مہربان

عورت کہانی

شائستہ زریں 268

فرحین اظفر 93

عورت و مرد



مستقل عنوانات

295	شگفتہ یاسمین	خوش آفتہ	16	ادارہ	دین کی باتیں
297	پاکیزہ بہنیں	بڑا پاکیزہ	275	ادارہ	گوشہِ نظر افش
299	ادارہ	روحانی مشورے	277	مدیرہ	بہنوں کی محفل
301	مہ جیس	حسن نگار کو آئے	287	عظمیٰ آفاق سعید	پاکیزہ دلیری
302		ہومیو پیتھک	292	صغریٰ زیدی	میں اکثر تنہا ہوں
			294	ادارہ	پیشہ و غیر پیشہ



(وہ وقت یاد کرو) جبکہ تم (وادی کے) نزدیک کنارے پر تھے۔ اور وہ (کافر) دور کے کنارے پر تھے۔ اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کر لیتے تو تم میعاد میں ضرور اختلاف کرتے۔ لیکن (تم کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر دے جو ہوتا تھا۔ تاکہ جس نے ہلاک ہونا ہو وہ حجت سے ہلاک ہو۔ اور جس نے زندہ رہنا ہو وہ (بھی) حجت سے زندہ رہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے (۴۲) (وہ وقت یاد کرو) جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے خواب میں انہیں کم دکھایا تھا۔ اور اگر وہ (اللہ تعالیٰ) انہیں تجھ کو زیادہ دکھاتا تو تم ضرور ہمت ہار دیتے اور تم ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔ یقیناً وہ سینوں کی حالت کو خوب جاننے والا ہے۔ (۴۳) اور (وہ وقت یاد کرو) جبکہ تم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو اس نے انہیں تمہاری نظروں میں کم دکھلایا۔ اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھلایا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر دے جو ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۴۴) اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو۔ جب تم (لڑائی کے موقع پر) کسی گروہ کے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ (۴۵) اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تم ہمت ہار دو گے۔ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۴۶) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ جو اپنے گھروں سے اترتے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے اور وہ (لوگوں کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے (بھی) ہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے احاطے میں ہے۔ (۴۷) اور جب شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا۔ اور اس نے کہا کہ آج کے دن تم پر آدمیوں میں سے کوئی غالب نہیں آئے گا، اور میں یقیناً تمہارا مددگار ہوں۔ پس جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا شیطان اپنی ایڑیوں پر پلٹ گیا، اور کہنے لگا، یقیناً میں تم سے بری ہوں۔ بے شک میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو یقیناً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۴۸) (وہ وقت یاد کرو) جبکہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، کہنے لگے ان (مسلمانوں) کو تو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ (۴۹) اور کاش تو اس وقت دیکھے جبکہ فرشتے ان لوگوں کو جو کافر ہو گئے (دنیاوی زندگی سے) پورا، پورا لے لیتے ہیں۔ وہ ان کے چہروں اور ان کی بیٹیوں پر مارتے جاتے ہیں۔ اور (کہتے جاتے ہیں) جلانے والا عذاب چکھو۔ (۵۰)

آنحضرت ﷺ کے اسمانے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اَحْسَنَ خَلْقِ اللّٰهِ

سید کو نین، ختمی مرتبت افضل الانبیاء، رحمۃ اللعالمین، رسول اقدس حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا اولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم سب سے زیادہ بڑھ کر، لائق تر، سب سے زیادہ بہتر کے ہیں۔

حضرت شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ نبی تائب ہے اللہ کا، کسی کا اپنی جان مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا، اپنی جان و کئی آگ میں ڈالنی روا نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے۔

1۔ القرآن: ترجمہ: یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (پیغمبر) مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر (زیادہ) حق رکھتے ہیں۔ (سورۃ احزاب آیت 6)

2۔ الحدیث: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہر مومن کے لیے میں دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ اولیٰ ہوں، اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

مجاہد نے کہا کہ تمام انبیاء اپنی امت کے باپ ہوتے ہیں اور اسی رشتے سے مسلمان آپس میں بھائی کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے نبی کی دینی اولاد ہیں۔

(بخاری و مسلم)

4۔ الموانع: قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتا چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا اور ان سب سے بڑھ کر تھا۔

(کارلائل)

بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین اخلاص انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور معاشرے کے لیے اعلیٰ ترین اخلاقی ہدایت ہے، ہر لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے۔

(گوئنز)

4۔ الفضائل: جو شخص چاہے کہ اس کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور

عشق پیدا ہو جائے تو ہر فرض نماز کے بعد (۴۷) مرتبہ یہ اسم پاک ”سیدنا اولیٰ“ پڑھنے پر مداومت رکھے۔

۲۔ اگر کوئی قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا اور ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ روزانہ نماز فجر یا عشاء کے بعد با وضو حالت میں تین سو مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ کر بارگاہ الہی میں دعا مانگے۔ ان شاء اللہ بہت جلد قرض کی ادائیگی کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔

(فیصرہ حیات کی کتاب انوار اسالہ النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی کبھی انسان کی زندگی میں گمراہی کا باعث بنتی ہے۔ اس حادے کی کا اپنی ذات اور ارد گرد کے لوگوں پر سے اعتماد مزلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جاسکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جاسکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی نہ دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دار العمل ہے جہاں انسان کے دوہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرت انسان حسد یا بوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے اس بس تباہی ہے زندگی کی چاہت میں زندگی گزوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرانی ہے عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبیوں، فیصلوں اور احساس جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

سلسلے وار ناول

میرا سارا زندگی اتار دو

افشاں آفریدی





شیرازی ولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی معنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یواہس اسے سے تین سال بعد واپس آکر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے وادی کا ارادہ زوہا کی سعد سے شادی کے بعد ردا کو اس کی شریک حیات بنانے کا تھا لیکن ردا کی مرضی نہیں تھی۔ اب عکرمہ واپس آیا تو درمکون کو دیکھ کر ٹھنک جاتا ہے۔ زواریا نہتا مسخ کاڑھ سے لڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں زخم آتا ہے وہ اپنے دوست سرفراز کے سی ویو والے اپارٹمنٹ میں زلفی، ندیم اور مولانا بخش کے ساتھ تھا۔ عکرمہ آئی کیپ میں پکچر شاپ اور icmap میں یونٹک کلاسز لینے لگتا ہے درمکون سائرہ چچی کی بھانجی تھی جس کی ڈوٹے واری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ عاصمہ لاج میں عاصمہ اور مہران، زواریا کو ایک دن پہلے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ زواریا جب بھی کراچی سے باہر جانے کا کہتا ہے انہیں لگتا ہے وہ لاہور واپس چلا جائے گا۔ ٹریپ شوٹنگ زواریا کا بھین تھا وہ کار ساز شوٹنگ رینج میں تھا جب شہرین کا بیٹا اس کے پاس آتا ہے کہ اس کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور وہ اسے پک کر لے۔ شہرین اسے بتاتی ہے کہ وہ ٹانگیو انڈر ویکٹر رہی ہے۔ وہ شہرین کو اس کے گھر چھوڑتا ہے لیکن اس کے بلانے پر بھی اندر نہیں جاتا۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زواریا کے متعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہریار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ عکرمہ وادی سے کہتا ہے کہ بچا جان کو درمکون کی تعلیم شروع کر ادینی چاہیے۔ مظفر، عکرمہ سے درمکون کو پڑھانے کا کہتے ہیں۔ جلال انصاری، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زواریا کو کال کر لیں۔ عکرمہ رات کو گھر آتا ہے تو گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اور درمکون کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ وادی کو عکرمہ بتاتا ہے تو وہ اسے سکون آور وادی میں ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ شہرین، زواریا کو فون کرتی ہے تو عاصمہ ریدو کرتی ہیں وہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ لوگ سوا سال سے کراچی میں ہیں، عاصمہ، زواریا کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ عکرمہ، درمکون سے پوچھتا ہے کہ اس نے پڑھائی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ شہرین، عاصمہ سے ملنے آتی ہیں تو وہ بہت اچھے سے ملتی ہیں اور شہرین کو بتاتی ہیں کہ وہ ایک اسکول چلا رہی ہیں شہرین، عاصمہ کو بتاتی ہے صنوبر خالہ کے شوہر نے بچے نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کر لی تو وہ انصاری ماؤس آگئیں اور جب زواریا لاہور سے کراچی آگیا تو وہ پنڈی چل گئیں۔ یہ سن کر وہ بہت دکھی ہوتی ہیں۔ شہرین، عاصمہ کو منع کرتی ہے کہ اس کے آنے کا تذکرہ وہ زواریا سے نہ کریں۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 3

ردا کی شادی میں اب صرف دوڑھائی ماہ بچے تھے، تیاریاں زور شور پر تھیں..... تاہم چچی جان نے ابھی تک درمکون کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

اس شام بھی شاپنگ سے واپسی پر ردا اور سائرہ بیگم اپنی لائی ہوئی چیزیں دیکھ رہی تھیں..... ساتھ ہی زوہا بیٹھی مہمانوں کی لسٹ بنارہی تھی کہ مظفر صاحب اندر داخل ہوئے۔

”ہاں بھئی..... تیاریاں مکمل ہوئیں کہ نہیں..... ہاں اپنی شریک حیات کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔

”ارے ابھی کہاں..... ابھی تو صرف جیمز کے کپڑے اور جیولری وغیرہ لی ہے۔ جبکہ مشینری اور فرنیچر باقی ہے..... آپ اور سیف نے بھی ابھی تک کچھ ڈیپانڈ نہیں کیا ہے..... کم از کم آپ اور سیف تو اب اسٹارٹ لیں..... کل سیڑھے سے آپ سیف کو ساتھ لے جایئے گا..... اماں تو عکرمہ کے ساتھ ہی جائیں گی.....“ مصروف سے انداز میں سائرہ بیگم نے جواب دے کر ساتھ ہی ہدایت بھی دی۔

”ہوں..... دیکھتا ہوں کل یا شاید پیر کو ناظم ملے تو پھر سیف کو بھی لے جاؤں گا.....“ سائرہ بیگم کے کہنے پر انہوں نے تھکے، تھکے انداز میں جواب دیا۔

سارہ بیگم کو سب افراد یاد تھے مگر ڈرکنون کو وہ جیسے قصداً بھول گئی تھیں۔

مظفر صاحب دل ہی دل میں کڑھنے لگے تھے..... سوچتے تھے اپنی شریک حیات کا آخر کس حربے، کس طریقے سے دل موم کریں کہ وہ ڈرکنون سے کم از کم انسانیت کے نالغی ہمدردی کریں۔

اب بھی اسی سوچ کا عکس ان کے چہرے پر تھا..... جسے زوہا محسوس کرتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا پایا..... آپ اتنے پریشان کیوں ہیں.....“ گھر مندی سے والد کی طرف دیکھتی زوہا ان کے لیوں پر بھی بھی مسکراہٹ لے آئی۔

”کچھ نہیں بیٹا..... بس یونہی ڈرکنون کا خیال آ گیا تھا۔ تمہاری میسی نے اس کے لیے کچھ نہیں لیا ابھی تک..... حتیٰ کہ سوچا بھی نہیں۔“

”تو آپ سوچ لیجیے..... آپ پر پابندی تو نہیں ہے کوئی.....“ حسب توقع سارہ بیگم یک دم ترخ کر بولی تھیں۔

”پابندی تو آپ پر بھی نہیں ہے سارہ بیگم.....“ جواباً وہ بھی تلخ ہونے سے نہ بچا سکے تھے خود کو۔

”میرے پاس کرنے کے لیے اور بھی کئی ضروری کام ہیں مظفر صاحب..... اپنی لاڈلی کے لیے آپ ہی نکال لیں کچھ وقت۔“

”ہاں تو میں ہی نکالوں گا وقت۔ جب اس کے لیے میں ہی سوچ رہا ہوں تو وقت بھی مجھے ہی نکالنا ہوگا۔“ ان کی تیز نظریں بیوی کے چہرے پر ٹھک رہی تھیں۔

جیولری کا بکس کھٹاک سے بند کرتے ہوئے وہ ٹھیک ٹھاک چراغ پا ہو چکی تھیں۔

”ہاں ٹھیک ہے..... اب جبکہ آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ مجھے اس لڑکی سے نہ اس کے مسائل سے اور نہ ہی اس کی آنے والی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے تو پھر آپ بار، بار یہ دیکھ کر امیرے سامنے مت رویا کریں اور پلیز مجھے میری بیٹی کی خوشی میں خوش خوش شریک ہونے دیں۔“ دو ٹوک انداز میں کہہ کر جس وقت وہ تیز قدموں سے چلتی لوگ روم سے باہر نکلیں مگر مدامی وقت اندر داخل ہوا تھا..... سلام کر کے چچا جان کے پاس آ بیٹھا۔

”تم کہو..... مگر یہ کیا حال ہے.....؟“

مظفر صاحب نے کسی سوچ میں مستغرق مگر مدہ کو متوجہ کیا تو وہ چونک کر سنبھلا۔

”الحمد للہ..... آپ نے جو کام کہے تھے وہ میں نے کر دیے ہیں اور ہاں کسی بیگ صاحب کا فون بھی آیا تھا آپ کے لیے، کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کرایہ جمع کر دیا ہے..... تاکید کر رہے تھے کہ آپ کو ضرور بتا دوں۔“

”چلو شکر ہے بالآخر ان حضرات کو بھی خیال آیا.....“ وہ کچھ ریلیکس ہوئے بیگ صاحب کا سن کر۔

”ویسے یہ کون سے مکان کا کرایہ ہے چچا جان..... جہاں تک میری معلومات ہیں آپ کا تو کوئی ون یونٹ بگلا نہیں تھا۔“

”یہ میرا نہیں ڈرکنون کے والد کا چھوڑا ہوا مکان ہے بیٹا..... ڈرکنون ہمارے پاس ہے، اس لیے میں نے اسے کرایہ پر دے دیا تاکہ وہ کچی خود کو ہمارے اوپر بوجھ نہ سمجھے..... اور لوگوں کو بھی سکون رہے کہ وہ اپنا ہی کھار ہی ہے۔“ مگر مدہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا جس پر کچھ فی ان کے لیے کا کھانہ بنی تھی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا..... میسی اس وقت ردا کی شادی کی خوشی اور اسٹریس سے اب سیٹ ہیں..... اس لیے کبھی کبھی تلخ ہو جاتی ہیں..... آپ اگنود کر دیں..... رہ گیا ڈرکنون کا معاملہ تو اس سے میں نے کئی بار کہا ہے ساتھ ملنے کے لیے مگر وہ تیار نہیں، گھر سے باہر جاتے اس کی جان نکلتی ہے..... دوسرے اسے زرق برق کپڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں.....“ زوہا نے تردید سے باپ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ ممنونیت سے مسکرا دیے۔

چاہیے.....“ شکرگزاری سے کہتے، کہتے وہ آزدہ ہو گئے تھے۔
 ”چلیز پاپا ایسی کوئی بات نہیں..... وہ میری بھی تو کزن ہے.....“ زوہا نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔
 ”ابنی دے..... میں نے اس کے لیے ڈریس خریدے ہیں۔ بہت ہلکے کام والے اس کی چوڑے کے
 مطابق..... بس اب کسی دن اسے ساتھ لے جا کر ٹیبلر کو دینا ہے۔“
 ”تو اسے آج ہی لے جاؤ..... اگر تم کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو.....“ مظفر صاحب خوش ہوتے ہوئے
 بولے..... کم از کم زوہا کو تو اس کا خیال ہے یہ سوچ کر وہ سرور سے ہو گئے تھے۔
 ”آج.....؟ ہوں..... آج بھی جاسکتے ہیں..... عکرمہ تم لے چلو گے نہیں، پاپا تو ابھی واپس آئے ہیں.....
 تنکھے ہوئے ہیں۔“

کچھ سوچ کر اس نے عکرمہ سے پوچھا تو وہ جواباً اثبات میں سر ہلا گیا۔
 ”مگر ذرا جلدی کرنا مجھے آج ایک کلاس لینی ہے آٹھ بجے تک۔“
 ”اوکے، اوکے..... میں پانچ منٹ میں ڈریس کنون کو لے کر آتی ہوں.....“ گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے اس
 نے بجلت کہا اور چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔
 ”بہت ڈرتے دار اور حساس ہے میری بیٹی..... یقین کر عکرمہ اگر زوہا اور اماں نے میرا اور درکنون کا ساتھ نہ
 دیا ہوتا تو آج میں اپنے مرحوم دوست کی روح کے سامنے نہ صرف شرمندہ ہوتا..... بلکہ خود اپنی عدالت میں بھی مجرم
 گردانا جاتا۔“

عکرمہ نے گہری نظر سے ان کا مشاہدہ کیا۔
 بہت فکر مند رہنے لگے تھے وہ درکنون کے لیے..... عکرمہ کو قدرے حیرت ہوئی کہ کیا کوئی کسی غیر کے لیے اس
 قدر بھی حساس ہو سکتا ہے۔
 ”آپ اتنا اسٹریس نہ لیں چچا جان..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان فیکٹ سب ٹھیک ہو رہا ہے..... آگے بھی
 سب بہتر ہوگا۔“

اس کے لہجے میں کچھ تھا..... یقین یا شاید امید..... مظفر صاحب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک دم
 ایک سیکنڈ کے لیے کوئی خیال ان کے ذہن میں کوندا..... ایک امید کا شعلہ جیسے جل اٹھا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل انہوں
 نے خود کو جھڑک دیا کچھ بھی تھا..... عکرمہ ان کا بھتیجا تھا اور انہیں سیف کی طرح پیارا تھا۔
 ایک طویل جدوجہد کے بعد آج وہ اس مقام تک آیا تھا..... انہیں معلوم تھا کہ اماں نے اس کے لیے کتنے
 خواب بن رکھے ہیں۔

ایسے میں وہ اسے ”صحرا“ کا اذن سفر کیسے دیتے۔
 وہ تو شاید ان کے کندھے کا بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جاتا مگر اماں کی بوڑھی آنکھوں کے وہ خواب جو انہوں
 نے جو ان بیٹا بہو کھونے کے بعد صرف اپنے پوتے کی خاطر سالوں سے سجا کر رکھے تھے، انہیں کیسے تاراج کرتے۔
 ”یا اللہ تو ہی مالک ہے..... تو ہی کوئی شکیل نکال اس معصوم بچی کے لیے.....“ تڑپ کر دل سے دعا لگتی تھی۔
 سامنے بیٹھے عکرمہ نے انہیں بغور دیکھا اور ابھی کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ زوہا اسے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔
 ”لیجیے پاپا..... آپ کی لاڈلی ساتھ جانے سے انکاری ہے۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیں۔“ مظفر صاحب کے
 سامنے لا کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے زوہا مسکرا رہی تھی۔

”کیوں بیٹا۔ تم کیوں انکاری ہو؟“ وہ درمکنوں کے لیے حلاوت یک دم ان کے لہجے کا حصہ بنی تھی۔ وہ نروس سی ہو کر اٹھکیاں مسلنے لگی۔

”وہ اصل میں آج گھر میں کچھ کام ہے۔ شاید مہمانوں کو آنا ہے اور۔۔۔“

”بیٹا یہ شادی کا گھر ہے، اس میں تو اب ہمد وقت کام ہی کام ہوگا۔ لوگ آتے جاتے رہیں گے مگر تمہاری تیاری بھی تو ضروری ہے ناں۔۔۔“ انہوں نے اٹھ کر قریب آتے ہوئے محبت سے سمجھایا تو وہ لا جواب سی ہو گئی۔

”لہذا ایقہ کام تم ردا اور سائز پر چھوڑو اور فی الحال زوہا کے ساتھ ٹیلر کے یہاں چلی جاؤ۔۔۔ واپسی میں اپنے لیے جیولری وغیرہ بھی لے لینا۔۔۔ چلو تو پھر اچھے بچوں کی طرح میری بات مانو اور زوہا کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔“ شفقت سے ہونٹ کا تکی درمکنوں کے لیے کوئی راہ فرار نہ چھوڑتے ہوئے انہوں نے فرمان صادر کیا تو وہ متذبذب سی پلٹ گئی۔

”جاؤ بیٹا۔ وہ تیار ہو کر آجائے گی۔ تم یہ چابی لے لو۔۔۔ میری کار لے جانا اور پلیز خیال رکھنا اس کا۔“

اسے چابی تھماتے ہوئے انہوں نے ملتجیانہ تاکید کی تھی۔

”جی ہاں کل۔۔۔“ وہ چابی لے کر لاؤنج میں آگیا۔۔۔ جہاں زوہا موجود تھی۔

”کہاں ہیں۔۔۔ درمکنوں؟“ اس نے استفسار کیا۔

”وہ ابھی برنر بند کر کے اندر گئی ہے۔۔۔ غالباً چادر لینے۔۔۔“ زوہا نے کہا تھا۔

زوہا ریدر بعد درمکنوں اپنی بڑی سی چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ کر زوہا کے پیچھے مرے، مرے قدموں سے چلی آ رہی تھی۔

”کہاں جاتا ہے۔۔۔؟“ کار اسٹارٹ کرتے ہی بنیادی سوال ہوا۔ زوہا راستہ بتانے لگی۔ عکرمہ نے بیک ویو مرے دیکھا۔۔۔ ہونٹ کا تکی درمکنوں یوں سر جھکا کر بیٹھی تھی گویا کسی طرف دیکھ لیا تو جیسے قیامت ہی آجائے گی۔ خوف اور سر اسٹیکسی اس کے چہرے ہی سے نہیں حرکات و سکنات سے بھی ظاہر تھی۔۔۔ بہر حال ٹیلر شاپ قریب ہی تھی چند منٹوں میں وہ وہاں پہنچ گئے تھے۔

”چلو آؤری۔۔۔ یہ رہی میرے ٹیلر کی شاپ۔“

اترتے، اترتے درمکنوں کی نظر آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عکرمہ پر پڑی۔۔۔ وہ جس انداز سے بیٹھا تھا صاف ظاہر تھا کہ اس کا گاڑی سے اترنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

ایک عالم گھبراہٹ میں درمکنوں نے زوہا کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ ”کیا یہ نہیں جائیں گے ہمارے ساتھ۔۔۔“ کچھ تھا اس کی نظر میں زوہا کے لیے اس کا مانی انصرمیر سمجھنا مشکل نہیں رہا۔۔۔ جبھی اس نے عکرمہ کو متوجہ کیا۔

”عکرمہ۔۔۔ تم ساتھ آؤ۔۔۔“

”میں؟۔۔۔ مگر میرا کیا کام۔۔۔“

وہ خاصا حیران ہو کر مڑا تھا۔ جو اب زوہا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں درمکنوں کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا کوئی کام نہیں۔۔۔ بس ہماری حفاظت کرنا۔۔۔ چلو اب اترو نیچے۔“

بلکے چپکے لہجے میں یہ کہہ کر اس نے عکرمہ کو تاکیدی نظروں سے دیکھا تو وہ گہری سانس بھر کر کار سے اتر آیا۔ ٹیلر کے پاس انہیں چند منٹ لگے۔

درمکنوں کی نظریں باہر آتے ہی اس کی تلاش میں بھٹکی تھیں۔۔۔ مگر اسے سامنے بیٹھا دیکھ کر کچھ سکون محسوس ہوا۔

”چلیں۔۔۔“ وہ اٹھ کر پاس آیا۔

”کیا خیال ہے درمی تمہارے لیے جیولری اور کاسٹیکس کی شاپنگ بھی آج ہی نہ کر لی جائے۔“
 ”نہیں، آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ یوں بھی کاسٹیکس اور جیولری کی مجھے ضرورت نہیں۔“ نہایت آہستہ آواز میں گردن موڑے اپنی جانب دھبھی زد ہوا سے اس نے سادگی سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔
 ”بجائے ایشیائی ہونے کے، تم ان مصنوعی سہاروں کے بغیر ہی انتہائی حسین ہو۔“ سناٹھی لہجہ غلوں بھرا تھا۔

جو اب اس ایک خاموشی نگاہ زد ہوا پر ڈال کر اس نے بلا ارادہ سامنے لگے بیک ویو مرین اپنا چہرہ دیکھا۔
 ایک مکمل حسن تھا اس کے خدو خال میں، معصومیت اور جاذبیت کی چمک سمیت۔ مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھیں کسی مقرر کی طرح قائل کرنے کے سارے رموز جانتی تھیں۔

اس پر سادگی، آزدگی اور سراسیمگی نے مل کر جیسے اس کے سادہ حسن کو دو آتھہ کر دیا تھا۔
 یک دم اس نے نگاہ بدل کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور کچھ اس طرح پٹھی کہ بیک ویو مرین خود کو نہ دیکھ سکے۔
 گھر پہنچ کر کار سے اترتے ہی درمکون نے زد ہوا کا شکریہ ادا کیا تھا۔
 ”گو کہ مجھے ان سب چیزوں کی نہ خواہش رہی تھی نہ ضرورت پھر بھی آپ نے میرے لیے سوچا یہ سب کیا۔“ آئی ایم ریٹلی تھینک فل۔

”پلیز ڈزی ایس مت کہا کرو۔ پلیزی۔۔۔ مجھے ردا جیسی لگتی ہو تم۔“ اس کا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے زد ہوا نے اس کے شکریہ کا قصد ابرام کیا تھا۔

”یوں بھی شکریہ تو تمہیں عکرمہ کا ادا کرنا چاہیے۔ جس نے ہمیں لانے کے لیے وقت نکالا۔“
 کار لاک کر کے قریب آتے عکرمہ کو دیکھ کر زد ہوا نے قصد بلند آواز سے کہا تو وہ بلا ارادہ نظر اٹھا کر عکرمہ کی طرف دیکھنے لگی۔ جو اس اثنا میں ان کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

”ہوں۔ غالباً مجھ سے کچھ کہتا ہے آپ کو۔۔۔؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔
 ”میں تو نہیں البتہ درمی شاید کچھ کہتا چاہ رہی تھی۔“ زد ہوا نے بھی تبسم چھپاتے ہوئے تجاہل برتا۔ تو درمکون نروس ہی ہو کر عکرمہ کو دیکھنے لگی۔ جو دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں پھنسائے کھڑا تھا۔

”پلیز۔۔۔ کہیے میں سن رہا ہوں۔“ اب تو وہ مکمل طور پر اس کی طرف مڑ گیا تھا۔ انداز قطعی سنجیدہ تھا۔
 ”جی۔ وہ بس۔۔۔ شکریہ آپ کا۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا اس نے بجلت انگ، انگ کر کہہ دیا تھا۔

زد ہوا اس بات پر یک دم کھلکھلا کر فیس پڑی جبکہ عکرمہ کے سنجیدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
 درمکون مزید نروس ہی ہو کر زد ہوا کی طرف مڑی تو عکرمہ مسکراہٹ ضبط کرتا۔ ”اُس۔۔۔ مائی پلیز۔۔۔“ کہتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے کم آن یار۔۔۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔۔۔ اب اتنا بھی ہجھو انہیں ہے میرا کزن کہ اتنی سی بات پر ”شکریہ“ نہ بغیر نہ ملے۔۔۔ وہ تو بس ہم چاہتے ہیں کہ تم سب سے محل مل جاؤ۔ باتیں کرو۔۔۔ ہنسو بولو۔۔۔ تو تمہیں بولنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ آئی ہو پ۔۔۔ تم نے مانڈ نہیں کیا ہوگا۔“ عکرمہ کے اندر جاتے ہی زد ہوا نے وضاحت کی۔ درمکون جانتی تھی اس لیے بس ممنونیت سے دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

یہ لو شہرین..... سنہال کر رکھ لو اسے..... نانتی کی تپیل پر وہ اور میوندہ بیگم تھے..... اس نے آلیٹ پلیٹ میں ڈال کر اپنے سامنے رکھا ہی تھا کہ میوندہ بیگم نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے۔“

”لاہور کا انرکٹ ہے۔“

”آپ لاہور جا رہی ہیں.....؟“ ٹکٹ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ سوالیہ ہو گئی تھی۔

”میں نہیں..... تم لاہور جا رہی ہو.....“ میوندہ بیگم نے گویا دھماکا ہی کر ڈالا۔

”میں.....؟“ اس کے لہجے میں حیرت اور تشویش دونوں شامل تھے۔

”ہاں تم.....“ میوندہ بیگم کے اطمینان میں ذرا کی نہیں آئی تھی۔

”مگر کیوں..... اب میں نے کیا کر دیا.....؟“

”کیا مطلب کیا کر دیا.....“ اب کے میوندہ بیگم کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا تھا۔

”تم تو یوں کہہ رہی ہو..... جیسے انصاری ہاؤس تمہیں سزا کے طور پر بھیجا جاتا تھا۔“

”ہاں..... تو اس میں غلط کیا ہے..... کسی کرمٹل جیسی کڑی نگرانی ہوتی تھی میری وہاں..... شاید ہی کبھی آغا

جان نے نرم لہجے میں بات کی ہو مجھ سے جبکہ زوی کے لیے کیسے پھول جھڑتے تھے ان کے منہ سے۔“

”ٹھیک کرتے تھے وہ۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو زیادہ سرنہیں چڑھایا جاتا..... ایسے ہی تربیت کی جاتی ہے ان

کی..... اگلے گھر جانا ہوتا ہے انہیں..... زوی ان کا پوتا ہے..... اور تم نواسی ہو۔“

”تو یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ نواسی ہونا ایک جرم ہے.....“ اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ انداز ایسا تھا کہ میوندہ

بیگم کو چیلے ترس آ گیا اس پر۔

”کیا ہو گیا ہے شہری..... بچپن سے تم انصاری ہاؤس رہتی آئی ہو..... انسان اتنے سال جن کے ساتھ رہتا

ہے! مانوس ہو جاتا ہے ان سے تمہیں تو وہاں رہنا بہت اچھا لگتا تھا ناں۔“

”تب کی بات اور تھی..... تب وہاں خولہ تھی، زوی تھا، طاری بھائی تھے..... اب سب چلے گئے ہیں وہاں

سے..... میرا بالکل دل نہیں لگتا وہاں..... لے دے کر ایک عینی رہ گئی ہے وہاں۔“

”اور آغا جان..... وہ بھی تو تمہیں یاد کرتے ہیں..... کتنی محبت سے بلایا ہے انہوں نے تمہیں.....“ میوندہ نے

پیار سے سمجھایا۔

”تو آپ آغا جان سے کہیں ناں کہ وہ یہاں آجائیں۔ میں انہیں زوی سے ملانے لے کر جاؤں گی کتنا مزہ آئے گا۔“

جواب میں شہرین کا لالا ابالی پن سے کہنا میوندہ بیگم کے ماتھے پر بل ڈال گیا۔

”دماغ درست ہے تمہارا..... آغا جان بڑے ہیں۔ اصولاً انہیں نہیں بلکہ زواہ کو ان کے پاس جانا چاہیے۔“

”بس..... اسی پہلے آپ..... پہلے آپ..... میں ٹرین چھوٹ جائے گی۔ مجھے عینی نے بتایا تھا کہ آغا جان زوی کو

بہت مس کرتے ہیں، اکثر اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنی محبت ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر آغا جان

قدم بڑھالیں تو۔“

”تم رہنے دو..... یہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں..... اول تو تمہارے پاس عقل کی کمی ہے، دوسرے

جو ہے اس کا بھی استعمال تمہیں گراں گزرتا ہے.....“ میوندہ بیگم بیٹی کو خشکیں نظروں سے دیکھتے ہوئے عالم بیزاری

میں گویا ہوئیں۔

نتیجتاً اس کا منہ بن گیا تھا۔

”تو پھر نہ سمجھیں ناں مجھے وہاں۔“

”صنوبر آ رہی ہے لاہور اس نے بھی اصرار کیا ہے کہ تمہیں بھیج دوں وہاں۔“

”جج..... کیا واقعی.....؟“ صنوبر خالہ کے نام پر وہ خوشی سے کھل گئی..... ”اب آئے گا مزہ..... آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... خواہ مخواہ میرا اتنا خون جلا اور بے عزتی الگ ہوئی آپ کے ہاتھوں.....“ شرارت سے ماں کو دیکھتے ہوئے وہ مزے سے بولی تھی۔

”صنوبر تمہیں سر براہزد دینا چاہ رہی تھی..... مگر تم اس قدر فضول لڑکی ہو کہ مجھے جھک کر کر کے آخر اگلو ای لیا۔“

”اچھا ہی ہوا..... کم از کم اب سفر تو اچھا گزرے گا ناں میرا۔“

صنوبر خالہ سے ملنے کی خوشی نے اسے گویا تروتازہ کر دیا تھا..... ماں کے گلے میں جھولتے ہوئے وہ مسرت سے کہہ رہی تھی۔ میمونہ بیگم نے مصنوعی غصے سے اسے دیکھا تو وہ ٹھٹھکلا کے ہنس پڑی۔

”سوری..... کیا کروں۔ آپ کے والد بزرگوار سے زیادہ آپ کی سویت سی بہن زیادہ اچھی لگتی ہیں مجھے.....“

”کیونکہ تمہاری لگا میں جو نہیں کستی وہ۔“

”واٹ اپور..... صنوبر خالہ دنیا کی سب سے پیاری خالہ ہیں.....“ اس کے لہجے میں خالہ کے لیے پیار ہی پیار تھا..... میمونہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

”اچھا اب ذرا جلدی سے پیسے تو دیں مجھے لاہور جانے کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔ ارے بھی آپ کی چھوٹی

بہن کے لیے ٹفٹ لیتا ہے..... اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں مانگ رہی میں۔“

پیسوں کی فرمائش کے جواب میں ماں کی تیوری چڑھتی دیکھ کر جھٹ بہانہ بنایا تو میمونہ بیگم اس کی چالاکی پر

اسے گھور کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....☆.....

”بیٹا ڈکٹون..... یہ کتابیں سنچال لو..... نگر مہ لایا ہے تمہارے لیے، کہہ رہا تھا آج شام چار بجے تم پڑھنے

کے لیے تیار رہنا.....“ دادی نے سائڈ ٹیبل پر رکھے پلندے کی طرف اشارہ کیا۔

”آج سے ہی دادی.....؟“

وہ حیرت زدہ سی کہتی سائڈ ٹیبل کے پاس آرکی اور بے خیالی میں سب سے اوپر رکھی اکٹا نکس کی کتاب کو انگلی

سے چھوا..... ابھی کل ہی تو فارم بھر کر دیا تھا اس نے۔

”ہاں..... آج ہی سے..... بیٹا، وہ کہہ رہا تھا کہ امتحان میں کچھ ماہ ہی باقی ہیں.....“ دادی نے نگر مہ کا پیغام

بہم پہنچایا۔

”پہلے ہی کافی وقت گزر چکا ہے تمہیں انٹر کیے..... اچھا ہی ہے کہ یہ سال ضائع ہونے سے بچ جائے۔“

اس نے کتاب کھول کر چند صفحے پلٹے تو جیسے زندگی کے کئی اوراق ایک ساتھ پلٹ گئے..... یہ کتابیں یہ مضمون

اور اس سے بڑے اس کے خواب..... کیا کچھ تھا اس کی زندگی میں..... کس قدر بھرپور ماضی تھا..... روشن اور درخشاں.....

”آہ.....“ اس کے سینے سے جیسے کوئی آہ نکلی تھی۔

گہری سانس بھر کر اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب آہستگی سے بند کر دی۔

”کیا ہوا بیٹا.....؟“ دادی اس کی طرف ہی متوجہ تھیں۔ ان کے استفسار پر وہ جیسے چوکی۔

”کچھ نہیں دادی.....“ تھکے، تھکے لہجے میں کہتی..... وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر ٹنگ گئی۔

”فکرمٹ کرو بیٹا..... نگر مہ بہت اچھا استاد ہے ماشاء اللہ..... اس کے شاگرد بہت چاہتے ہیں اسے۔ تمہیں

بھی بہت محنت و لگن سے پڑھائے گا وہ۔“ وادی عکرمہ کی تحریف میں رطب اللسان ہو چکی تھی..... اسے بھی ساتھ ہی لٹالیا تھا اور انہیں سنتے ہوئے اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ وہیں ان کے پاس لیٹے، لیٹے سو گئی۔
 غالباً عصر کا وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی..... گھڑی سوا چار بج رہی تھی۔
 ”اوہ.....“ وہ گہرا کر اٹھ بیٹھی..... ”کیا ہو گیا آج مجھے..... اتنا لمبا سو گئی میں۔“ ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹتے ہوئے وہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ عجیب کسلمندی سی طاری تھی..... ساتھ ہی گہرا مٹ بھی۔
 ”اوہ..... دیر ہو گئی..... وادی نے بتایا تھا کہ چار بجے پڑھنا ہے۔“
 ”چلو میں بھی اٹھوں اب.....“ اس نے خود کو گھر کا اور گھڑی ہو کر کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے دور کرنے لگی تھی
 کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”جی.....!“

حسب توقع عکرمہ تھا۔

”السلام علیکم..... کیا حال ہے.....؟“

گرے شلوار قمیص میں لمبوس عکرمہ کے سادہ سے استفسار پر وہ محض ”ٹھیک ہوں“ ہی کہہ سکی۔

”آج پڑھائی شروع کرنی ہے یا۔“

”جی میں بس آ رہی ہوں..... وہ ان فیکٹ۔“

”اُس اوکے..... panic ہونے کی ضرورت نہیں..... آج کی ایوننگ کلاس آف ہے میری..... آج ہم

ہائپ اینڈ آوریٹ بھی شروع کر سکتے ہیں..... آپ فریش ہو لیں، میں باہر لاؤنچ میں ویٹ کر رہا ہوں۔“

آخری صدمہ

نفرت اور محبت کے محاذ پر لڑنے والی ایک ماں کی

داستان..... **نشور ہادی** کے خیالات کی پرواز

فاتح مقتول

ماضی کے پوشیدہ گوشوں..... اور بندر پیچوں میں پنہاں راز و

نیاز..... تاریخی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم سے

رنگ آسمان

سازشی لوگوں کی گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک

واقعات کا سنگم..... **ایے آدراسچوت** کا سحر انگیز انداز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کریناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ

لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اپریل 2019ء کا دلکش شمارہ ایک نظر میں

ہو بصورت کہانیاں کا مجموعہ
سیریس ڈائجسٹ
 ماہنامہ

مزید

علم و ادب کی محفل
 محفل شعر و سخن

اور

ملک مشرق حیات کی تفتیش

اسی کے علاوہ

تنویر ریاض، نادیہ نور، شاہ زین رضوان، ثمر عباس،

ڈاکٹر شید شاہ سید اور منظر امام کی خوبصورت کہانیاں

مدرسوں میں بے انداز تھا۔ وہ کچھ ریلیکس ہوئی اور دانش روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر لگی تو چپ چلا
دادی نماز سے فارغ ہو کر باہر لاؤنج میں بیٹھی ہیں..... اسے خاصی تسلی ہوئی۔

آج پہلی بار عکرمہ سے براہ راست بات کرنا اور پڑھنا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ٹھیک ٹھاک خروں تھی۔
لاؤنج میں آئی تو دل جیسے کانٹوں میں دھڑک رہا تھا۔ ایسا تو اس نے جیسی محسوس کیا تھا جب پہلی بار اسکول میں
داخل ہوئی تھی۔ اس نے ننھی انگلیوں سے بابا کے مضبوط ہاتھ کو تھا سے جب پہلا قدم اندر رکھا تھا تو بابا نے کس قدر
حوصلہ دیا تھا۔ اور پھر جب نئے کالج میں داخل ہوئی تو ماں اس کے ساتھ تھیں۔
مگر آج..... آج وہ تنہا تھی۔

”نہیں میں تنہا نہیں..... میرا اللہ میرے ساتھ ہے.....“ کوئی اندر بولا تھا وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی
سامنے آ بیٹھی۔

عکرمہ اکناکس کی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے آنے پر سر اٹھا کر دوستانہ مسکراہٹ سمیت اس کی
جانب دیکھا۔

”لیٹس اشارٹ.....!“ سوالیہ انداز تھا اس نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”پڑھانے کے لیے میں فریڈی دے پر بلیو کرتا ہوں ڈورمکٹون..... ہم اچھے دوستوں کی طرح پڑھیں
گے..... ان فیکٹ میں آپ کو صرف گاؤڈ کروں گا..... آپ کی میپل کروں گا..... یہ کوئی اسٹیریو ٹیچیکل نیچر
اسٹوڈنٹ ریلیشن شپ نہیں ہے..... میرا خیال ہے میں ڈی پی آپ کو ایک سے دو گھنٹے دے سکتا ہوں..... ا
hope it will be enough for you..... مگر ضرورت پڑے تو آپ کسی بھی
وقت مجھ سے میپل لے سکتی ہیں.....“ اس نے ماحول کو دوستانہ کرنے کی خاطر کچھ تہید باندھی۔

”چلیے پھر بسم اللہ کریں..... یہ لیجیے.....“ کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے عکرمہ نے اسے بغور دیکھا
تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مامدی چمک لہرائی تھی..... شاید اب بھی کہیں اندرا علی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کے
مانند چنگاری موجود تھی۔

”میرا خیال ہے ہم اشارٹ کرتے ہیں۔“

اسے اب بھی خاموش دیکھ کر بالآخر اس نے کہا تو درمکٹون بے مشکل خود کو کمپوز کر سکی۔

”جیسا آپ ٹھیک سمجھیں.....“ مدغم لہجہ میں میکا کی سا جواب آیا تھا۔

”صرف میرا سمجھنا ضروری نہیں..... پڑھنا آپ کو ہے..... اگر آپ کا انٹرسٹ لٹریچر میں ہے تو ہم اس سے
بھی اشارٹ لے سکتے ہیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے..... پڑھنا تو دونوں کو ہی ہے۔ کسی سے بھی اشارٹ کریں.....“ لہجہ اور چہرے سے
بدولی اور اکناہٹ عیاں تھی۔

”یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے..... پڑھنا تو ہے ہی تو پھر ایسا کرتے ہیں..... اشارٹ لیتے ہیں اکناکس
سے.....“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے ڈورمکٹون کی عدم دلچسپی محسوس کرنے کے باوجود پڑھنا شروع کر دیا۔

ماضی کے کچھ دھندلے خاکے آنکھوں کے سامنے بن اور بگڑ رہے تھے۔ وہ بہ مشکل خیالات کی یورش سے خود کو
نکال سکی۔

عکرمہ کا انداز بہت سادہ مگر دلچسپ تھا..... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی متوجہ ہو گئی تھی۔
پھر کچھ دن اسی طرح گزر گئے عکرمہ روز ہی گھنٹا سا اگھنٹا اس کے لیے نکال لیتا تھا مگر اس کی کوشش کے باوجود

مذہبوں کوئی خاص رد عمل نہیں دے رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے لگتا جیسے وہ کسی تجسس سے مخاطب ہو۔۔۔۔۔ نہ وہ اس کے کسی سوال کا جواب دیتی تھی نہ خود سے ہی سوال کرتی۔

بس سامنے بیٹھی اپنے سیدھے ہاتھ کی پتیلی پر ٹھوڑی ہلکے نظریں کتاب پر جمائے اسے سنے جاتی۔ یہاں تک کہ وہ ہی گھٹنا گزرنے کی اطلاع دیتا تو وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی چپ کے ساتھ کتابیں سمیٹ کر چل دیتی۔
 ”ایسا آخر تک چلے گا۔۔۔۔۔ تین ہفتے ہونے کو آئے مگر درکنوں کی حالت میں کوئی سدھار نہیں۔۔۔۔۔“ اس دن دو بکونوں کتابیں سمیٹ کر بیڑھیاں اتر گئی تو داوی متفکری اس کے پاس آئی بیٹھیں جو گہری سانس بھر کر کمر صوفے کی پشت سے نکاتے ہوئے اسی صحن میں سوچ رہا تھا۔

”تین سال کی گرد چھنے کے لیے تین ہفتے بہت کم ہیں داوی۔۔۔۔۔ اول بات تو یہ کہ وہ پڑھنا ہی نہیں چاہتیں اور دوسری یہ کہ اسٹریس، ڈپریشن اور بہت بڑے غم سے لڑتے لڑتے وہ مڑ حال ہو چکی ہیں۔۔۔۔۔ چھری کند ہو جائے تو اس کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔“ دادی کے سوال پر اس نے تجزیہ پیش کیا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔
 ”میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ ان کا انٹرسٹ ڈویلپ کروں مگر لگتا ہے کہ وہ آرٹس کے پیکٹس میں کمر نہیں لے رہی ہیں۔۔۔۔۔ بیٹھے پانی کی مچھلی کھارے پانی میں تیر نہیں پار رہی۔“
 اس نے تین ہفتے کا جائزہ لیا تو یہی ”وجہ“ سمجھ میں آئی۔

”تو تم اسے سمجھاؤ بیٹا۔۔۔۔۔ یوں بھی سنا ہے اسے PHD کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔۔۔۔۔ اب وہ نہ کرے تو کم از کم بی کام ہی کر لے۔۔۔۔۔“ دادی نے مشورہ دیا تو وہ سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا پھر ان کے قریب جھکا۔
 ”جی سوچ تو میں بھی یہی کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ دیکھتے ہیں اگر اس ہفتے بھی یہی حالت رہی تو میں بات کروں گا۔ خیر آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔ میری دعا ہے اللہ سے کہ تمہاری اور ہم سب کی مدد سے وہ جلد ہی اس گرداب سے باہر نکل آئے، آمین۔“

”ثم آمین۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ مسکرایا۔
 ”چلیے۔۔۔۔۔ اٹھیے۔۔۔۔۔ آج آپ کو میرے ساتھ شاپنگ پر جانا ہے۔۔۔۔۔ چچی جان بہت بار کہہ چکی ہیں۔۔۔۔۔ اور مجھے بھی ردا کی شادی کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔“

”مگر تم تو لی کے ساتھ جانا چاہ رہے تھے۔۔۔۔۔“ دادی نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہوں۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ویک اینڈ پر جاؤں گا مگر فی الحال تو آپ تیار ہو جائیں۔۔۔۔۔ میں نیچے ویٹ کر رہا ہوں۔“
 ☆ ☆ ☆

ابھی وہ فرنچ کلاس لینے کے لیے نیلوفر کے ساتھ بیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اچانک نہ جانے کیسے نیلوفر کا چیر چھلا اور وہ بیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا کہ وہ نہ نیلوفر کو سنبھال سکی نہ اس کی مدد کر سکی۔ کتنے ہی زینے تیزی سے نیچے اترنے کے باوجود وہ نیچے کی طرف لڑھکتی نیلوفر کو تھام نہ پائی۔

یہ بیڑھیاں بھی بہت عجیب تھیں جن کے زینے اونچے اونچے تھے۔۔۔۔۔ نیلوفر کو سر پر شدید چوٹ آئی تھی، ساتھ ہی اس کا بازو بھی زخمی ہوا تھا۔

”اودھ مائی گاڈ۔۔۔۔۔“ نیلوفر کو اٹھاتے ہوئے وہ گہرا گئی تھی۔

”اٹ تمہارے سر سے تو خون بہہ رہا ہے نیلی۔۔۔۔۔ پلینز اسٹوڈنٹس کے پاس چلتے ہیں۔“

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 29

ادھر ادھر سے گزرتی اسٹوڈنٹس کی مدد سے یہ مشکل وہ اسے کاٹک لانے میں کامیاب ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ دونوں قریبی کلینک میں تھیں۔

نیلوفر کو بیڈ تیج کرنے کے لیے اندر لے جایا جا چکا تھا۔ وہ وینٹک روم میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اسے کہیں نزدیک سے بڑی مانوس آواز سنائی دی۔

”ڈونٹ وری کا شف۔ میں کل پھر آؤں گا۔۔۔۔۔ اس بار بیڈ تیج چھینج کرانے میں کوتاہی نہیں ہوگی۔“

اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ زاویار انصاری کو ڈاکٹر باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ زاویار کی یقین دہانی ظاہر کرتی تھی کہ ڈاکٹر اس کا کھنص معالج ہی نہیں غالباً دوست یا شاسا بھی تھا۔

”you better be careful Zawyaar۔۔۔۔۔ زخم ابھی کچا ہے۔“ ڈاکٹر نے

مسکرا کر مصافحہ کیا اور کمرے کی طرف پلٹ گیا تو زاویار نے آگے کی جانب قدم بڑھائے۔ ابھی دو قدم آگے ہی آیا تھا کہ سامنے شہرین کو دیکھ کر ڈرا کی ذرا ٹھٹکا۔

”السلام علیکم زوی۔۔۔۔۔ کیسے ہو۔؟ یہاں کیوں آئے ہو۔۔۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔؟“ شہرین اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کے انداز میں تردید تھا۔

”علیکم السلام۔ ٹھیک ہوں میں، تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ اس کا لہجہ حسب توقع خاصا خشک تھا۔

”وہ ان ٹیکٹ نیلی کو چوٹ آئی ہے۔ میں اس کے ساتھ یہاں آئی ہوں مگر تم یہاں کیسے۔۔۔۔۔ کیا ہوا ہے۔ یہ بیڈ تیج کس لیے کرائی ہے تمہیں۔۔۔۔۔“ بجلت اپنے یہاں آنے کا سبب بتا کر وہ استفسار کرنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ بس ایک معمولی سا زخم ہے۔ اس کی بیڈ تیج کرائی تھی۔“ بھویں سکھرتے ہوئے اس نے سرسری سا بتایا تھا۔

”چوٹ معمولی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ روز بیڈ تیج کروانی ہے۔۔۔۔۔ یقیناً گہرا زخم آیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔“ شہرین ایک دم فکر مند سے بولی تو وہ چڑ گیا۔

”تمہیں اپنا دماغ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ تم ڈاکٹر ہونے پر زیادہ فکرت کرو۔“

”تمہاری بھی نہ فکر کروں تو کیا کالے چور کی کروں۔۔۔۔۔ حد ہوگئی ہے زوی۔۔۔۔۔“ اس نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”کہا ہے ناں کہ ٹھیک ہوں میں۔۔۔۔۔ تم اپنی فرینڈ کی خبر لو۔ اسے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔“ زاویار کو اس کے چہرے پر لکھی تشویش واضح طور پر نظر آئی۔ تو کچھ سوچ کر بولا۔ اس بار لہجہ میں قدرے نرمی تھی۔ وہ

دونوں باتیں کرتے ہوئے کلینک کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔

”ہوں، اس کے سر میں بہت چوٹ آئی ہے۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو جائے۔“ ڈر ادیر کے لیے اس کا دھیان نیلوفر کی طرف چلا گیا تھا۔ ”مگر تم اپنا خیال رکھنا، میڈیسن وقت پر لینا۔ تاکہ زخم جلد از جلد heal up ہوں، تمہاری بہت بری عادت ہے۔ جب تک گھر والوں کو اچھی طرح نچا نہ لو۔ تم دوا نہیں کھاتے۔“

”تم زیادہ نیٹی (nanny) اور گرینی (granny) نہ بنو۔۔۔۔۔ اپنا خیال کیسے رکھنا ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ ایک عالم بیزاری میں گویا ہوا تھا وہ۔

”ہوں۔۔۔۔۔ سو تو ہے۔۔۔۔۔ پہلے سے بہت اسمارٹ اور اسٹراٹک ہو گئے ہو۔ خیال رکھنا تو واقعی آگیا ہے تمہیں۔۔۔۔۔ مگر زوی خیال صرف اپنا ہی نہیں اپنوں کا بھی رکھا جاتا ہے۔“ سناٹائی نظروں سے دیکھتے ہوئے شہرین نے کہہ کر بنجیدگی اختیار کی۔ وہ جانتا تھا کہ اشارہ کس طرف ہے۔

”اپنا بیت کی تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ ڈیڑھ شہرین مرزا۔۔۔۔۔! رشتے اگر صرف ایک جانب سے

بجائے جائیں تو اُن کا ٹکڑا بہن بہت جلد انسان کو تھکا دیتا ہے۔“

”مائی گاؤ زوی..... جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے..... تم تو انجینئرنگ کے اسٹوڈنٹ تھے ناں.....؟ یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا.....“ چنانچہ وہ واقعی متاثر ہوئی تھی یا محض ظاہر کر رہی تھی۔

”زندگی سے..... زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے میڈم۔“

”cool dude بہت انٹرستنگ گفتگو کرنے لگے ہواب۔“

”تمہاری بات مکمل ہوگئی ہو تو کیا میں جاسکتا ہوں.....؟“ اس کے سانس کی انداز پر زواویا نے ماتھے پہ تئوریاں ڈالتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

”اجازت تو ایسے مانگ رہے ہو جیسے منع کروں گی تو رک ہی جاؤ گے۔“

”آئی کیسے ہو یہاں.....؟“ زواویا نے اس کا طنز واضح طور پہ نظر انداز کیا تھا۔

”خود زاریوں کے.....“ اس نے فخریہ کارنامہ بتایا۔

”کہیں تمہاری ڈرائیونگ کے نتیجے میں ہی تو تمہاری دوست یہاں نہیں پہنچ گئی.....“ اس بار طنز زواویا کی طرف سے تھا۔

”جی نہیں.....“ اس کی بات سمجھ کر منہ بنایا تھا اس نے۔

”تو پھر کیا آسمان سے کوئی آفت نازل ہوئی ہے جو یہاں نظر آرہی ہو۔“

”نہیں زوی..... میں اور نیلی انٹی ٹیوٹ کی سیزر حیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے کی طرف لڑھکتی چلی گئی..... میں کچھ کر بھی نہیں سکی۔“

اس کے استہزائیہ انداز کو وہ جیسے سمجھ ہی نہیں سکی تھی..... سادگی سے بتایا۔

”ہوں..... ہوتا ہے کبھی، کبھی ایسا، ہمارے ساتھ چلنے والا اچانک گرنا چلا جاتا ہے اور ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتے۔“

زواویا کی دماغی رو جیسے کسی اور طرف چلی گئی تھی..... وہ یوں پولا جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔

”اور پتا ہے..... اس کی وجہ کیا ہے.....؟“ وہ جیسے پوچھ رہی تھی۔

زواویا نے اسے خاموشی سے دیکھا۔

”ہم ہیں اس کی وجہ، اصل میں ہمارا دھیان صرف اور صرف اپنی طرف ہوتا ہے اور اس بے دھیانی میں ہم یہ

دیکھ ہی نہیں پاتے کہ گرنے والے کو ہمارے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے.....“ شہرین کے سادہ سے انداز میں

کوئی گہرائی نہیں تھی..... مگر اس کی بات کی گہرائی زواویا کو لب بستہ کر گئی۔

”میں دھیان نہیں دے سکی تو میری دوست گر گئی..... مسئلہ صرف گرنے کا نہیں ہے اسے چوٹ بہت آئی

ہے.....“ شہرین فکر مند سی بولی تو زواویا نے اس بار غور سے اس کی جانب دیکھا۔

”تم گھٹ فیل کر رہی ہو۔“

”ہوں..... تھوڑا بہت.....“ شہرین سچائی سے بولی تھی۔

”تم نے اسے دکھا تو نہیں دیا تھا ناں..... یہاں تو لوگ دوسروں کو قبر میں اتار کر بھی ڈھٹائی سے زندہ رہتے

ہیں۔ یہ تم نے کیا غم پال لیا ہے.....؟“ اس کا لہجہ یک دم سخت ہو گیا تھا۔

سر کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے زواویا انصاری نے جیسے لاشعور سے کوئی بات جھٹکنی چاہی۔

”کم آن زوی..... شی از مائی فرینڈ..... آج اس کو بخار بھی تھا ہلکا، ہلکا..... صرف میری خاطر اور میرے

بھروسے آئی تھی وہ یہاں۔“

ماہنامہ پاکیزہ — مارچ 2019ء [31]

شہرین فکر مند ہونے کے ساتھ، ساتھ شرمندہ بھی تھی۔

زادیا روک اس کا ہر لفظ جیسے کسی تازیانے کی طرح لگا۔

”اونہ۔۔۔“ ایک دم وہ طنز سے ہنس پڑا تھا۔۔۔ شہرین نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”یہ بھروسہ ہی تو مروا تا ہے انسان کو۔۔۔ بیوقوف لوگ ہی بھروسہ کرتے ہیں دوسروں پر اور پھر منہ کی کھاتے

ہیں۔۔۔“ وہ زہر خند ہوا۔

”نہیں زوی۔۔۔ بیوقوف لوگ نہیں۔۔۔ محبت کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں دوسروں پر۔۔۔ درحقیقت،

انہیں سامنے والے پر نہیں، اپنی محبت پر بھروسہ ہوتا ہے۔۔۔“ جواب میں شہرین نے کچھ ایسی رسائیت سے کہا کہ

لمحے بھر کے لیے وہ جیسے حیرت میں گہرا رہ گیا مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

”دیش کول۔۔۔ ہائی داوے۔۔۔ یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا۔۔۔؟“ زادیا کے لہجے میں استہزاء تھا۔

”زندگی سے۔۔۔ نالائق سہی مگر اسٹوڈنٹ تو میں بھی زندگی کی ہی ہوں ناں۔۔۔“

خاصاً تمل کر جواب دیا تھا اس نے مگر اس سے پہلے کہ زادیا رپلٹ کر کچھ کہتا۔۔۔ شہرین کو عقب سے پکار لیا گیا تھا۔

”میں ابھی آئی۔“

وہ افتاں و خیزاں کلیںک کے اندر چلی گئی تو اس نے لمحے بھر کے لیے رک کر سوچا اور پھر سر جھٹک کر پارکنگ کی

طرف مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

فون کی بیل کافی دیر سے بج رہی تھی مگر لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ناچار اسے ہی بڑھ کر ریسیور اٹھانا پڑا۔

”ہیلو۔۔۔“ بیزاری بھرے ٹھکے ہوئے انداز میں بہ مشکل ہونٹوں سے نکلا تھا۔

”ولیکم ہیلو۔۔۔ کیا حال ہیں بھئی۔۔۔؟“

دوسری طرف جو کوئی بھی تھا بڑے فریش موڈ میں تھا۔۔۔ درمکنون کی بیزاری کے جواب میں خاصی شگفتگی بھری

بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”کس سے بات کرنی ہے آپ کو۔۔۔“

یہ انداز گفتگو اسے سہا دیتا تھا۔ اب بھی بڑی سراسیمگی سے سوال کیا۔

”کرنی تو کسی اور سے تھی مگر اب لگتا ہے کہ اگر آپ سے کر لی جائے تو بھی کوئی خاص مضائقہ نہیں۔“

مناطب کی برجستگی اور بے تکلفی اسے شپٹا گئی۔

”جی۔۔۔ آپ رکیے، میں کسی کو بلائی ہوں۔۔۔“ گھبراہٹ میں کہا۔

”ارے میں نہیں، آپ رکیے۔۔۔ کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں ناں کہ۔۔۔“

”یا اللہ۔۔۔“ ریسیور فون کے اسٹینڈر پر پینگ کرتے ہوئے اس کا دل گویا کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

”کسے بلائے، ابھی ہر اسان کھڑی سوچ رہی تھی کہ کڑکڑاتے بلیک شلوار سوٹ میں لمبوس مگر مہ اوپر سے

آتا دکھائی دیا۔

”سب ٹھیک ہے؟ آپ اس قدر پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔۔۔؟“

قریب آتے ہوئے اس نے ملاحت سے سوال کیا تو اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں فون کی طرف اشارہ کر دیا۔

”کون ہے۔۔۔؟“ ریسیور اٹھا تے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ لاعلمی کا تاثر دیتی تیز قدموں سے چلتی کچن

کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

”کمال ہے.....“ اس کی حد درجہ گھبراہٹ پر اس نے سر جھٹک کر ہیلو کہا تو پتا چلا دوسری طرف ولی ہے۔
 ”کیا حال ہے بھئی، کہاں ہو تم اور یہ تمہارا موبائل کیوں بند ہے کل سے.....“ اس کی ہیلو سنتے ہی ولی اشارت ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں اور موبائل میرا زوبا کے بیٹے نے کولڈ ڈرنک سے نہلا دیا تھا..... اس لیے خراب ہو گیا ہے.....“ اس نے بتایا۔

”ہوں..... جیسی کل سے کانٹیکٹ نہیں ہو پا رہا تھا..... ویسے یہ فون پر ابھی کون تھا..... ردا اور زوبا کی آواز تو میں پہچانتا ہوں..... یہ کون محترمہ تھیں.....؟“ ولی نے شوخی سے پوچھا تو وہ چونکا۔ درکنوں کی حواس باختگی یاد آئی۔
 یقیناً اس نے ہی کچھ کہا ہوگا۔

”وہ ڈسکنوں ہیں..... زوبا کی کزن..... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو.....؟“ اس نے قدرے سختی بھری سنجیدگی سے استفسار کیا تو ولی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”ارے تقریباً ملگنی شدہ ہوں میں..... تم زیادہ وہم نہ پالو..... وہ تو موصوفہ کی آواز اس قدر خوب صورت لگی کہ تھوڑی سی چیخڑ چھاڑ کر لی گروہ تو یوں بھاگی ہیں جیسے میں انسان نہیں کوئی بھوت ہوں.....“ ولی کی بے فکری اپنی جگہ قائم تھی۔ مگر مہ کے لہجے کا اس پر خاک اثر نہ تھا۔

”بھوت سے کم بھی نہیں ہو تم..... پلیز آئندہ فون کرو تو شرافت کے جامے میں رہنا۔“ اس نے گویا ٹوک دیا تھا مگر اُدھر بھی ولی تھا چکنا کھڑا.....

”جو مزاج یار میں آئے..... سر تسلیم خم ہے۔“

”گھماؤ ہو تم.....“ وہ بہرہ مشکل ہی ضبط کر سکا۔

”تم سے کم.....“ ولی بھر بولا۔

”بہر حال یہ بتاؤ میری تلاش میں کیوں تھے..... کوئی کام تھا؟“

”ہاں تم پر ریڈنٹ کے پی اے جو لگے ہو کہ تم سے ہی کام ہوں گاناں میں۔“

اس کے سوال پر خلاف توقع ولی ہنسا گیا۔ اسے ہنسی آگئی۔

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ تم سے کچھ بات کرنا تھی۔ ان لکٹ ایک پراجیکٹ ملا ہے مجھے، کافی انٹرٹنگ ہے۔ بس ٹائم منجھٹ اچھی ہونا ضروری ہے۔ سوچا تم سے مل کر ڈسکس کر لوں..... گھر پر مل سکتے ہو ابھی.....؟“

”ہوں ابھی تو جا رہا ہوں مگر..... ایک گھنٹے بعد گھر پر ہی ہوں گا..... تم آ جاؤ.....“ رست واضح پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے دعوت دی۔

کراچی کی ٹریفک کا جو حال ہے وہ کسی سے چھپا نہیں..... لہذا اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود واپسی پر اسے دیر ہو ہی گئی تھی۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا پتا چلا سیف کے ساتھ ولی ڈرائنگ روم میں منتظر بیٹھا ہوا ہے وہ بھی اُدھر ہی چلا آیا۔

”السلام علیکم ا“ اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!..... ہو گیا تمہارا “ایک“ گھنٹا.....“ ولی کھڑے ہوتے ہوئے طنز آبولتا تھا۔ وہ مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا دیا۔

”بس یار..... یہ کراچی کا ٹریفک تمہیں پتا تو ہے۔“

”ہاں، ہاں، ایک ہم ہی فریٹک کے مارے ہو۔ میں تو اڑن قاتین پر سفر کر کے آیا ہوں ناں.....“ وہ ولی ہی کیا جو ہار جائے۔

”یہ تو ہے.....“ وہ سر کھجا کر رہ گیا۔
 ”وہ تو سیف نے مجھے ہمتی دی ورنہ میری بوریت تو عروج پر تھی۔“
 ”ساتھ ہی بہترین گرین ٹی بھی پلائی..... وہ بھی تو بتائیں.....“ سیف اپنی کاوش اور تعریف پر پھولے نہیں سار ہاتھا۔
 ”ہاں یہ بھی ہے۔“ ولی کو گویا یاد آیا۔ پھر عکرمہ کی طرف دیکھ کر بولا..... ”ویسے یار دادی کے ہاتھ کی چائے کا توطف ہی اور ہے۔“

”وہ دادی کے نہیں..... درمکنوں کے ہاتھ کی چائے تھی ولی بھائی..... دادی تو اب بچن میں کام ہی نہیں کرتیں، سب کچھ اپنی شاگردہ موصوفہ درمکنوں کو کھادیا ہے۔“
 ”سیف غالباً یہ تمہارے کرکٹ گراؤنڈ میں جانے کا نام ہے.....“ تنہی بنجیدگی سے اس نے اسے متوجہ کیا تو وہ جیسے چونکا۔ وقت کا احساس ہوتے ہی وہ رنو چکر ہوا۔

”خیریت، یہ سیف کو کیوں ٹوکا تم نے.....؟“ ولی اس کے جاتے ہیں پیچھے پڑ گیا تھا۔
 ”ٹوکا نہیں یاد دلایا ہے اسے.....“ اس نے رسان سے کہا۔
 ”بکومت..... میں نے تمہاری آنکھوں میں سمیہ دیکھی تھی۔“
 ”ہاں تو..... غلط کیا ہے اس میں..... گراؤنڈ میں اس کے فرینڈز ویٹ کر رہے ہوں گے.....“ وہ مزید بنجیدہ ہوا تو ولی نے قصد آبات کا رخ موڑ دیا۔

”اوکے، اوکے..... چلو پھر تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے چلو آؤ اور چلیں۔“ لاؤنج خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ رہے تھے کہ نیچے جاتی ہوئی درمکنوں سے مرٹ بھڑھو گئی۔ عکرمہ کو کسی اجنبی کے ساتھ دیکھ کر وہ حسب معمول ٹھٹک گئی۔
 ”السلام علیکم.....!“ اس لمحے ولی اخلاق کی بلندی پر تھا..... اس نے خوفزدہ نظریں اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔
 اور جواباً مشکل ”علیکم السلام!“ کہہ کر ان دونوں کے راستہ چھوڑنے پر تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔
 ”آنرہ درمکنوں.....؟“ سوالیہ نظروں سے عکرمہ کو دیکھ کر ولی نے استفسار کیا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سر پر دے ماری۔
 ”سدھر جاؤ.....“

☆.....☆.....☆.....

”دیکھیے دادی..... یہ سوٹ میں نے ویڈنگ ریسپشن کے لیے لیا ہے..... درمکنوں پر کتنا جچے گا۔“ اندر دادی کے کمرے میں بیٹی زوہا جوش سے بول رہی تھی۔
 ”ہوں..... ماشاء اللہ..... بہت حسین ہے..... اس کے چاند سے حسن کا ہالا لگے گا۔“ دادی نہال ہی تو ہو گئیں۔
 لاؤنج میں بیٹھے عکرمہ کو اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا..... آج زویا، ٹیکر سے وہ سارے کپڑے لے آئی تھی جو درمکنوں کے لیے اس نے سلوائے تھے۔

”اسے پسند نہیں اس لیے میں نے بہت ہیوی کام والے سوٹ نہیں لیے مگر ان کی اسلپنگ ایسی شاندار کرائی ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔“
 ”ہوں..... پورے دس میگزینز میں سے یہ ڈیزائن ڈھونڈے ہیں زوہانے، اتنی جان تو میرے جہیز کے

کپڑوں کے لیے نہیں ماری اس نے۔“

ردا جو قریب ہی بیٹھی اخروٹ کھا رہی تھی مزے سے بولی تھی۔

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں..... تمہارے چندرہ بہترین سوٹوں میں سے دس کی ڈیزائننگ میں نے ہی تو کی ہے۔“ زوہا فوراً دفاعی انداز اختیار کر گئی تھی۔

”ہاں..... مگر وہ اس اسٹینڈرڈ کی نہیں.....“ ردا شوخی سے بولی وہ ہنس پڑی۔

”تو ٹھیک ہے ناں..... تمہاری تو شادی ہو رہی ہے۔ تم تو لگ چکی ہو ٹھکانے..... لہذا اب نمبر تو ڈر کمون کا ہی ہے ناں۔ چنانچہ ساری جھڑپی کو اس کی طرف فوکس کروانا ضروری ہے..... اس شادی میں در کمون کو سب سے زیادہ ہائی لائٹ ہونا ہے.....“ شوخ لہجے میں کہتی وہ کپڑے احتیاط سے نہ کرنے لگی تھی۔

اس اثنا میں سائرہ بیگم، ردا کو ساتھ لے جانے کے لیے اوپر چلی آئی تھیں..... عکرمہ کے سلام کا جواب اشارے سے دے کر وہ بھی دادی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
ردا نے اسے دوبارہ نہیں چھیڑا صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”ہاں بیٹا..... سارے ہی کپڑے نفیس ہیں۔ خاص طور پر رنگ تو ایسے ہیں کہ جو در کمون کے حسن کو چار چاند لگا دیں گے.....“ دادی نے تو صغنی نظروں سے سارے جوڑے دیکھے۔

”وہ تو ٹھیک ہے اماں..... مگر لباس کے جھللاتے رنگ نصیب کی سیاہی تو نہیں مٹا سکتے.....“ کمرے میں داخل ہوتے ہی دادی کی ستائش پر سائرہ بیگم نے بے ساختہ کہا تو وہ تینوں ہی نہیں..... باہر بیٹھا عکرمہ بھی ناگواری محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

”جیسے آپ لوگ چاند کہہ رہے ہیں۔ اس میں داغ ہے اور دنیا والے ایسے داغ نظر انداز نہیں کرتے.....“ ان تینوں خواتین پر نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے حد درجے پروردی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”بلکہ اماں میں تو آپ اور زوہا پر حیران ہوں۔ پہلے بھی کتنی بار آپ لوگوں نے اس کی شادی کی کوششیں کیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی جو اس کی ماضی کی داستان سنتا ہے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو چلو غیر لوگ تھے مگر اب یہاں شادی میں سب خاندان والے ہوں گے۔ میری تینوں بیٹیوں کے سرال والے ہوں گے۔ تو کیا اب ان سب کو بھی ساری ”سجائی“ بنائی جائے گی۔ ذرا سوچے کہ پھر آگے کیا ہوگا..... کیا منہ دکھائیں گے ہم اور ہماری بچیاں اپنے سرال والوں کو۔ جس بدنامی سے بچنے کے لیے خود ڈر کمون کا ”باپ“ اسے یہاں دوسرے شہر لے آیا۔“

در کمون کے ”باپ“ کا لفظ نہایت نفرت اور حقارت سے لیتے ہوئے وہ گویا پھنکا کر رہی تھیں۔

”اب وہ بدنامی ہم اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔“

”پلیز میسی۔ اب اس طرح بھی نہ سوچیں آپ..... دنیا کے سارے لوگ خود غرض نہیں ہیں۔ در کمون نے کوئی گناہ نہیں کیا کہ ہم اسے کال کو شغری میں چھپا دیں..... اس کے اچھے مستقبل کے لیے اگر ہم کوشش نہیں کریں گے تو بھلا اور کون ہے اس کا دنیا میں.....“ زوہا صاف گوئی سے کہے بنا نہ رہ سکی..... حسب معمول در کمون کے موضوع پر دونوں بحث پر اتر آئی تھیں۔

”تو کیا اس کا مستقبل بنانے کی خاطر میں اپنے بچوں کا فیوچر داؤ پر لگا دوں.....“ وہ غصے سے بل کھا کر بولیں۔ ”اول تو اس حادثے کے بعد اس لڑکی کی ذہنی حالت ہی ایسی نہیں کہ وہ شادی پر آمادہ ہو سکے..... دوسرے ڈاکٹر نے بھی منع کیا ہے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے لیے..... پہلے تم خود ڈر کمون کو تو راضی کر لو شادی کے لیے پھر دوسرا اسٹیپ بھی لے لینا.....“ انہوں نے خوشگین نظروں سے بیٹی کو گھورا تو وہ لا جواب سی ہو گئی۔

”یوں بھی میں نے دنیا دیکھی ہے..... ہمارے معاشرے میں کوئی مرد اتنا باخبر نہیں ہوگا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایک ایسی لڑکی کو شریک حیات بنالے۔ یہ مرد خود تو چاہے نوسو چاہے کھائے ہوئے ہوں..... پر بیوی کے معاملے میں ان کی سوچ اور ہی ہوتی ہے۔ بہر حال میں اس ضمن میں مزید اور کچھ نہیں سننا چاہتی..... مظفر کی آنکھوں پر تو اس وقت صرف ہمدردی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ انہیں وہ سب نظر نہیں آ رہا جو میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے، اسے یوں جذباتیت سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ میں سمجھتی ہوں ردا کی شادی کے بعد اس بارے میں سوچیں گے فی الحال وہ پڑھ لے اور اس کا علاج مکمل ہو جائے یہی بہت ہوگا.....“ یک دم انہوں نے سر دلچے میں کہہ کر گویا بات ختم کی اور دادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اماں آپ کے دونوں کی پکیو مینی رہ گئی تھی ناں..... وہ مجھے دے دیجئے میں کرواتی آؤں گی۔“
دادی ابھی ذرا دیر پہلے والی گفتگو سے کچھ اداس ہو گئی تھیں..... خاموشی سے اٹھ کر الماری سے مطلوبہ شاپنگ بیگ نکال کر دیا اور پھر وضو کرنے چل دیں۔

”اوکے..... پھر میں چلتی ہوں۔ زوہا تمہارے پاپا آجائیں تو دیکھ لینا درکنون نے چائے دے دی ہے انہیں یا نہیں، اوکے.....“ سارہ اسے ہدایات دیتی ردا کے ساتھ رخصت ہو گئیں تو وہ باہر لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں عکرمہ ابھی تک براجمان تھا۔

”چائے نہیں..... زندگی واقعی اتنی تلخ ہے یا ہم خود اپنی باتوں سے اسے تلخ بنا لیتے ہیں.....“ بدولی سے کہتی زوہا ابھی تک میسی کے کہے ہوئے جملوں میں الجھی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تاسف بھرا تھا کہ عکرمہ کو متوجہ ہونا پڑا۔
”ہر ایک کی اپنی سوچ ہے اور اپنا، اپنا نظریہ..... ہم کسی پر اپنا پوائنٹ آف ویو زبردستی تصویب نہیں کرسکتے۔ اسی طرح ہر کسی کا ہم سے متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔“
”معنی.....؟“

”معنی یہ کہ تم وہ کرو جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے اور دوسروں کو وہ کہنے اور کرنے دو جو ان کے مطابق درست ہے.....“ زوہا کے مستفسر انداز پر اس نے رسائیت سے جواب دیا تو وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر مطمئن سی ہو گئی۔
”ہوں..... تم ٹھیک کہتے ہو..... بقول شاعر

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے
ہم اپنی وضع کیوں بدلیں گے

”ویل سیڈ.....“ وہ حوصلہ افزائی کی خاطر مسکرا دیا۔

”ویسے تم یہاں کیا ڈرکنون کا ویٹ (انتظار) کر رہے ہو۔“

”ہوں..... موصوف کو پڑھنا ہوتا ہے اس ٹائم پر مگر لگتا ہے آج کسی خاص مہم میں جتی ہوئی ہیں محترمہ۔“ اس نے گھڑی پر طائرانہ نظر ڈال کر کہا۔

”ہوں..... ان فیکٹ آج کے دن صوفیہ خالہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے اس کا دل نہ چاہ رہا ہو پڑھنے کا۔ بہت مس کرتی ہے وہ انہیں.....“ زوہا نے بتایا تو وہ گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔
”آئی سی.....!“

والدین کی کمی اور ان سے چھڑنے کا دکھ اس کے اوڑھکنوں کے مابین مشترک تھا اور وہ اس کی شدت اور انتہا سے بخوبی واقف تھا۔ جیسی خاموش ہو گیا تھا۔

یک دم سنی کے رونے کی آواز پر زوہا اندر چلی گئی..... وہ بھی اسٹڈی میں جانے کے خیال سے نیچے جانے ہی

خود اعتمادی

کامیاب اور قابل فخر زندگی اور مکمل شخصیت کے لیے جس چیز کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کا اعتماد ہے۔ کامیابی کی اونچی چوٹی پر پہنچنے کے لیے خود اعتمادی ہی مہم معاون ثابت ہوتی ہے۔ خود اعتمادی کے ذریعے سے ہی بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام کا ممکن ہونا ایک فطری عمل ہے۔

اعتماد ہی کامیابی کی بنی ہے۔ اعتماد کے فقدان میں فتح، ناممکن بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اعتماد ہی ہوتا ہے جو کامیابی کو آپ کے قدموں میں لا کر نچھاور کرتا ہے۔ تاریخ پر اگر دھیان دیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کسی شعبے میں کسی نے کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو اس کامیابی میں راز اس کا اعتماد ہوگا۔

دراصل یہ طاقت تو انسان کے اندر موجود ہوتی ہے، صرف اس طاقت کو عمل کی ضرورت ہوتی ہے جیسا آپ کا اعتماد ہوگا، ویسی طاقت آپ کو ظاہر ہوگی، ویسی آپ کی زندگی بنے گی۔

زندگی کو پُر امید، پھر تیز اور چست رکھیے پھر کون سا کام ہے جو آپ نہیں کر سکتے۔ خود اعتمادی کا فقدان، کہیں میں نا کام نہ ہو جائیں، وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا، یہ دوسرے اور وہم دل سے باہر نکال کر پھینک دیں اور امید یقین کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ جب کوئی شخص اپنی قوت و کارکردگی کے کمزور پہلو دیکھتا ہے تو پھر اپنی صلاحیت کا اعتماد کھودیتا ہے اور وہ نا کام ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کا معلم اعتماد ہی ہے۔ دل کی حکومت میں اعتماد ہی سپہ سالار ہے۔ تمام قوتیں اس کا حکم مان کر چلتی ہیں جو شخص خود اعتمادی اور خدا پر یقین اور بھروسے پر آگے بڑھتا ہے اسے کامیابیاں مل کر ہی رہتی ہیں۔

از: فضلہ بتول، بہارہ کبوتر

لگا تھا کہ ڈر کنون کتابیں اٹھائے اوپر آتی دکھائی دی۔

سفید کاشن کے سوٹ پر سادہ سا دوپٹا اوڑھے وہ خاصی مضطرب لگ رہی تھی۔ مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھیں کافی دیر رونے کے باعث متورم تھیں۔ عکرمہ کے سامنے آنے پر وہ جواپنے آپ میں گم کسی درد میں ڈوبی چلی آ رہی تھی جیسے ایک دم چونک کر سنبھلی۔

”آ..... آپ جا رہے ہیں..... کہیں؟“

”ہاں..... یونہی اسٹڈی میں جا رہا تھا نیچے..... مجھے لگا آج آپ کا پڑھنے کا موڈ نہیں تو سوچا میں بھی کچھ اور کر لوں.....“ اس کے ہڑبڑا کر استفسار کرنے پر اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”سوری، آج دیر ہو گئی.....“ نظریں چرائی وہ صوفے کے ساتھ بڑی سینئر ٹیبل پر کتابیں رکھ کر وہیں بیٹھ گئی.....

عکرمہ کو بھی ناچار واپس آنا پڑا۔

”ویسے ضروری نہیں کہ ہم آج پڑھیں..... آپ چاہیں تو آج کا دن آف بھی کر سکتی ہیں۔“

اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں کہا تو ڈر کنون نے مڑی ہوئی گیلی پلکیں اٹھائیں۔

”کیوں؟“ کا سوال جیسے آنکھوں میں تحریر تھا۔

”اس لیے کہ آپ آج بہت افسردہ ہیں۔ بددلی سے پڑھائی کیسے ہوگی؟“

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کیے وہ براہ راست اسے فوکس کیے بیٹھا تھا جو اس کی بات پر پلکوں کو بھیگنے سے ندر وک سکی تھی۔

ٹپ ٹپ آنسو ایک تو اترے اس کے سنہری رخساروں کو بھگوتے سفید دوپٹے میں جذب ہونے لگے.....

آبگینوں کو گویا محسوس لگ گئی تھی..... سفید براق لباس میں وہ کس قدر مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔

”جیسے آپ لوگ چاند کہہ رہے ہیں..... اس میں داغ ہے۔“

ذرا دیر پہلے ساڑھ بیس کے کہے گئے جملے نے اس کی سماعتوں کو زبردستی بند کر دیا۔ تو وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا جو آنسو بہنے لگی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”کسی مفکر کا قول ہے کہ آنسو اگر روک لیے جائیں تو وجود کی عمارت کو تیلین زدہ کر دیتے ہیں تو پھر آپ ایسی ناکام کوشش کر رہی کیوں ہیں۔“

وہ جیسے اسے کھل کر رونے کا بھرپور موقع دینا چاہتا تھا۔

”جب یہ آنسو بہہ جاتے ہیں تو سامنے کا منظر بہت صاف اور واضح نظر آنے لگتا ہے اور دکھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ جب مجھے اپنی ماما جان یاد آتی ہیں تو میں خوب روتا ہوں..... ذرا سی بھی کنبوئی نہیں کرتا اور یوں میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“ بڑے شفیق انداز میں وہ گویا اپنا آپ اس کے سامنے کھول کر رکھ رہا تھا۔ دُرکنون نے تحیر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ بھلا یہ شخص بھی روتا ہوگا جو مسکراتا ہے تو ارد گرد کا سارا ماحول مسکرانے لگتا ہے۔

اس نے گویا سامنے بیٹھی لڑکی کو شرمندگی سے نکالا۔

تو وہ جو خفیف ہونے لگی تھی آچل سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”آپ بھی..... جبکہ دادی آپ کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔“

بے اختیار لبوں سے پھسلا تھا..... عکرمہ اس کے بول پڑنے پر قدرے حیران ہوا مگر ظاہر کیے بغیر بولا۔

”ہماری زندگی میں ہر رشتے کی اپنی، اپنی جگہ ہے دُرکنون..... یہ سچ ہے کہ مجھے ماں، باپ کے پیار کی کمی محسوس نہیں ہوئی کہ دادی اور چچا جان مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں مگر ماں باپ کے وجود کی کمی، کبھی کوئی پوری نہیں کر سکتا..... خاص طور پر میرے بابا کی جگہ کبھی کوئی نہیں کر سکا..... جب میں چھوٹا تھا تو ان کے کندھے پر سوار ہو کر مسجد جایا کرتا تھا اور جس دن وہ مجھے چھوڑ کر گئے پھر چچا جان کے ساتھ میں ہر بار مسجد گیا مگر نہ تو بابا کا شفیق کندھا تھا اور نہ ہی وہ ناز اٹھوانے والا بیٹا حالانکہ چچا جان مجھ میں اور سیف میں کبھی فرق نہیں کرتے.....“ وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے گویا ماضی میں سفر کر رہا تھا۔

”یہ نہیں کہ چچا جان کی محبت یا شفقت میں کوئی کمی تھی۔ بس یہ تھا کہ میں ہی ان سے ویسے ڈیما نڈ نہ کر سکا جیسے کہ اپنے والد سے کیا کرتا تھا۔“

اس کے بردبار لہجے سے کچھ جھٹک رہا تھا۔ جو دُرکنون محسوس کر کے جیسے اپنے غم سے نکل کر اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اور جب وہ چپ ہوا تو جیسے یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

عکرمہ نے خود میں واپس آتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا جو بغور اسے سن رہی تھی۔

”تو سچ یہ ہے کہ ہر انسان کا ایک ماضی ہے مگر اپنے ماضی کو سینے سے لگا کر رکھنا غلط ہے۔ زندگی ہمیشہ آگے کی طرف سفر کرتی ہے۔ بلا ضرورت ماضی کے خول میں جھانکتے رہنے سے حال اور مستقبل و ہندلانے لگتا ہے۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔ کون جانے آگے ہمیں بہت کچھ ملنے والا ہو۔“

”مگر یہ تو خود فریبی ہے..... لوگ ہمیں ہمارے ماضی سے شناخت کرتے ہیں۔“ اس کی طویل گفتگو کے جواب میں اپنے ہاتھوں کی کلیروں کو بغور دیکھتے ہوئے ایک عجیب سے حسرت بھرے ناامید سے لہجے میں دُرکنون نے کہا تھا۔

عکرم کو احساس ہوا آج وہ اسے محض سن ہی نہیں رہی سمجھ بھی رہی ہے جیسی بات کو بڑھاتے ہوئے بولا۔
 ”خود فریبی انسان کی فطرت کا جزو ہے۔ انسان مایوسی کے اندھیرے میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا..... جانتے ہوئے بھی انجان بن کر اپنے آپ کو تسلی اور تسکین دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے..... اس سے گو ہر مقصود تو ہاتھ نہیں آتا لیکن خود فریبی کی لذت، غم کی اذیت کو کچھ کم ضرور کر دیتی ہے..... اس لیے میں خود فریبی کو غلط نہیں سمجھتا۔“ اس کا انداز نا سحانہ اور فلسفیانہ تھا جبکہ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”رہ گئی بات..... لوگوں کی تو لوگ ہمیں اسی سے شناخت کریں گے جسے ہم اپنے وجود کا حصہ بنا کر رکھیں گے۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے حال کو اس کا حوالہ سمجھا جائے تو اسے اپنے ماضی سے نکل کر حال میں سفر کرنا ہوگا۔ یہ ایک آزمودہ نسخہ اور طے شدہ فارمولا ہے.....“ اس نے حتیٰ انداز میں کہہ کر گویا بات ختم کی تو ڈر کنون نے ایک لپٹے کے لیے اس کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا تھا۔

☆.....☆.....

گھناؤپ اندھیرا تھا۔ ایسی شدید تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا..... وہ بہ مشکل ٹٹول، ٹٹول کر چل رہا تھا..... کتنی ہی دیر گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہیں ہو پایا تھا۔ آنکھوں کے آگے مانوس نے سیاہی کی چادر تان رکھی تھی کہ یوں ہی اچانک چلتے، چلتے اس کے قدم کسی انسانی وجود سے ٹکرائے تھے۔
 ”اوہ..... کون ہے.....؟“

اس پُر بیت سنائے میں گونجتی اس کی اپنی آواز اس کی دھڑکنوں کو دہناتا گئی۔
 جواب نہاں تھا۔

اس نے بری طرح گھبراتے ہوئے جھک کر اپنے قدموں تلے پڑے وجود کو لرزاتے ہاتھوں سے چھوا۔
 ”کون ہو..... کون ہو تم.....؟“

کپڑے کی زرباٹھوں سے زاریار کو اندازہ ہوا کہ گرا ہوا وجود نسوانی ہے۔ بے اختیار اس نے پکار ڈالا تھا۔
 تاریکی میں آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھنے کے سبب اسے اب دھندلا سا ہیولہ نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔
 نازک نسوانی وجود غالباً زخمی تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر انسانی خون کی چیچھا ہٹ محسوس ہوئی تو اس نے سامنے پڑے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ جو کوئی بھی تھی..... منہ کے بل سرک پر پڑی تھی۔

اس لمحے اس نے خوف کی انتہائی شدت کو خود پر حاوی ہوتا محسوس کیا تھا۔ کہیں دور کوئی کار گزری تھی شاید جس کی ہیڈ لائٹ نے کچھ دیر کے لیے تاریکی کو کچھ کر سارا منظر واضح کر دیا تھا۔

اس نے جھک کر نسوانی وجود کو سیدھا کیا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک دلخراش چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا.....“ اس کی اپنی چیخ اس قدر زوردار تھی کہ نہ صرف اس کی آنکھ کھلی بلکہ وہ گھبرا کر

بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔

”مائی گاڈ.....“

یہ سب خواب تھا..... وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر موجود ہے..... یہ محسوس کرنے کے باوجود حسب معمول اس کے دل کی دھڑکن اعتدال پر نہیں آرہی تھی..... جتنے ہی سالوں سے وہ یہ خواب ہفتے میں کئی بار دیکھتا تھا..... مگر آج تک وہ اس کیفیت پر قابو نہیں پاسکا تھا جو اس طرح رات کو چیخ مار کر اٹھ بیٹھنے کے بعد اس کے وجود سے لے کر

اس کی ذات تک کو مفلوج کر کے رکھ دیتی تھی۔

”کیا کروں میرے مالک..... آخر یہ سزا کب تک.....؟“

انگلیاں بالوں میں پھنساۓ وہ بددلی سے بیڈ کے کنارے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ لیپ آن کیا اور وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ گویا اسے سوئے ہوئے صرف گھنٹا ہی ہوا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر گلاس تو موجود تھا مگر پانی نادر..... اس نے منرل واٹر کی بوتل کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو وہ بھی غائب.....

ناچار بددلی سے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا کرے سے باہر نکل آیا۔ کارڈیور سنسان پڑا تھا۔ تاہم لاؤنج میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی یہاں بھی چھن چھن کر پہنچ رہی تھی..... یقیناً کوئی نہ کوئی جاگ رہا تھا۔ چکن جانے کے لیے اسے لاؤنج سے ہی گزرنا تھا۔ پیاس کا غلبہ تھا اس لیے اسے ناگوار خاطر اس طرف آنا پڑا..... حسب امید چپس، پوپ کارن اور گرم، گرم کافی سے لطف اندوز ہوتی وی کے آگے ڈٹا مہران اس کے سامنے تھا۔

اس نے نظر انداز کر کے لکھنا چاہا مگر مہران اس دوران اسے دیکھ چکا تھا۔

”ہیلو bro..... کیا حال ہے..... آج رات پھر جاگ گئے ہو آپ.....؟“

اس کے شوخ انداز پر مسخر کا گمان کرتے ہوئے انتہائی غضب سے اسے غور کر جواب دے بغیر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ ”کمال ہے.....“ گو کہ مہران اس رویے کا عرصہ دراز سے عادی تھا مگر کبھی، کبھی اسے واقعی حیرت ہوتی تھی..... آخر کس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا کہ مہران کی پیہم کوششوں کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے سے آج بھی صدیوں کے فاصلے پر تھے۔

”ویسے مانتا پڑے گا گاڈ..... بڑا ہی ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ پیس تو نے ہمیں گفٹ کیا ہے.....“ اب کے مہران کے لبوں پر بڑبڑاہٹ تھی۔

جس لمحے پانی پی کر خود کو قدرے پرسکون کر کے ”وہ“ کچن سے برآمد ہوا۔ مہران اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور لاشعوری طور پر اس کے باہر آنے کا منتظر بھی۔

”اتنی لیٹ نائٹ جاگ رہے ہو تم..... کل کالج نہیں جانا تمہیں.....؟“ خلاف معمول اور خلاف توقع وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے اس کے سامنے والے صوفے کی پشت پر آکھڑا ہوا تھا۔

”جاگ تو آپ بھی رہے ہو bro.....“ مہران کے لبوں پر ہمیشہ کی طرح آج بھی خوشگوار مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ جواب خلاف توقع ملا تھا..... اس کی بھوسیں تن ہی گئیں۔

مہران نے جونہی اس کے ماتھے پر ٹھکنوں کا جال مینے دیکھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ان فیکٹ میرے روم میں دو بج کم آ رہا ہے سو یہاں چلا آیا..... بالکل لیٹ ایکشن مووی ہے..... اس لیے رہا نہیں گیا..... کم آن آپ بھی جوائن کرو.....“ اس کے دوستانہ انداز میں کچھ تھا۔

وہ ایک لمحے کو چپ چاپ اسے دیکھتا رہا اور پھر ٹی میں سر ملاتا پلٹ گیا۔ ”ہاہ.....“ اس کے جانے پر مہران نے گہری سانس بھری تھی پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گر گیا۔

”ٹھیک ٹھاک مسٹری ہے..... ڈیڑ مہران چلو تم بھی مٹی ڈالو اور یہ مووی دیکھو کل صبح واپس بھی کرنی ہے.....“ خود کو مشورہ دے کر وہ بی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

مین گیٹ سے اندر تک درمکنوں اور ردا ساتھ، ساتھ آئیں..... عکرمہ کسی سے موبائل پر بات کرنے میں روف ہو چکا تھا۔

”شکر ہے تم لوگ آ گئے..... اب تو میرا مغفلت کا کوڑہ بھی ختم ہو رہا تھا..... جو تم لوگوں کے انتظار میں، میں کافی سے زیادہ استعمال کر ڈالا ہے۔“

زوہانے انہیں دیکھتے ہی غصے سے آنکھیں نکالی تھیں۔

”مجھے کچھ مت کہنا..... ساری غلطی درمکنوں کی ہے۔ یہ محترمہ بھول ہی گئی تھیں کہ صبح پایا کیا کہہ کر گئے تھے۔“
ردانے دور سے ہی ہاتھ اٹھا کر اپنا دفاع کیا..... تو تنہے ہوئے چہرے سمیت قریب آئی زوہا دھمی پڑ گئی۔
”بلکہ محترمہ بغض تھیں کہ میں ہی اس کے لیے شاپنگ کر لوں.....“ ردانے بقیہ کہانی بھی فوراً سنا ڈالی تو اس نے فکھ کھڑی پشیمان سی درمکنوں کے کندھے پر بازو پھیلا دیے۔

”اوہ..... کم آن درمی..... ہم سب ساتھ چلیں گے ناں..... دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔“

وہ جوابا کیا کہتی..... محض ہچکلی سی مسکراہٹ مسکرا کر رہ گئی۔

”کچھ پیو گی؟“

”نہیں.....“ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس دوران عکرمہ بھی اندر داخل ہوا۔

”تم کچھ لوگے عکرمہ.....؟“ کچن کی طرف جاتی زوہانے ہانک لگا کر پوچھا تھا۔

”ہاں..... ایک کپ چائے بنا دو۔“

لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے جوابا کہا تھا۔ بے خیالی میں سامنے بیٹھی درمکنوں پر نظر پڑی تو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

غور کرنے پر ہاتھ لگا وہ آج ہمیشہ سے زیادہ نرم و نرم تھی..... اور کچھ اپ سیٹ بھی۔

”کیا بات ہے..... آپ اتنی ٹینس کیوں لگ رہی ہیں.....“ وہ متردسہ استفسار کر گیا تو درمکنوں چونک کر اپنے سے پر ہاتھ پھیر کر اسے دیکھنے لگی۔

”تو بہ..... یہ چہرہ ہے میرا یا تینوں سائن۔“

”نہیں تو..... میں ٹینس تو نہیں.....“

جب سے اس نے پڑھنا شروع کیا تھا آہستہ، آہستہ اس کی جھجک کم ہونے لگی تھی۔ پہلے ہوں، ہاں سے کام لیتی تھی تاہم اب مکمل جملے بولنا شروع کر دیے تھے۔

”ہونا بھی نہیں چاہیے..... آپ کی کزن کی شادی ہے۔ آپ کو تو بہت خوشی، خوشی اور جوش کے ساتھ حصہ لینا ہے۔ جب ہم کسی کی خوشی میں خوش اور غم میں دکھی ہوتے ہیں تو وہ بھی ہمیں دل سے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔“ نادانستہ طور پر ہی سہی مگر وہ پھر تاحسانہ ہو گیا تھا۔

”چچا جان آپ کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی میں اگر آپ دل سے شامل ہوں گی تو میں بہت اچھا لگے گا..... کبھی کبھی دل کے نہ چاہنے پر بھی ہمیں اپنوں کی خوشی میں خوش ہونا پڑتا ہے۔“

”ایسی بات نہیں..... میں ردا باجی کے لیے خوش ہوں.....“ وہ اس کی بات کو قطع کرتے ہوئے بھجلی بولی تھی۔
”تو پھر اس بات کو ثابت اور ظاہر بھی تو ہونا چاہیے.....“ بالآخر وہ مسکرا ہی دیا تھا..... جوابا وہ لب بھینچ کر

پنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ لو.....“ روانے بیک سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے..... ”یہ پاپا اور داوی نے دیے ہیں ڈپرکمنوں کے لیے۔“

”تو اسی کو دینے تھے ناں.....“ زوہانے نوٹ لے کر ایک طرف رکھے۔

”تم خود ہی دینا..... میں یہاں بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے لائی ہوں اسے..... اب یہ معرکہ تم ہی مارتا سمجھیں.....“ روانے کو کیز کرتے ہوئے صاف ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔

”یوں بھی تمہاری بات اس کے دماغ میں زیادہ جلدی آ جاتی ہے..... ویسے آج کل تو عکرمہ بھائی کی بھی سننے لگی ہے۔“

”اچھا.....“ زوہانے دھچکی لی۔

”ہوں..... شروع میں تو مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ درکنون پڑھائی میں انٹرسٹ لے گی مگر عکرمہ بھائی کے سوٹ اور جینٹل رویے سے غیر متوقع طور پر اس میں کافی تبدیلی آئی ہے.....“

”اللہ کرے..... یہ تبدیلی مستقل بنیادوں پر ہو اور دھیرے، دھیرے درکنون زندگی کی طرف لوٹ آئے۔“ ردا کے تفصیل بتانے پر زوہانے صرف دل سے دعا کی تھی۔

(کتنا اچھا دل ہے زوہا کا..... اپنی کزن کے لیے وہ کس قدر فکر مند اور مہر خالص ہے، وہ بھی ایسے پُر آشوب دور میں جہاں سنگے رشتوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔)

”چلو آؤ اور چل کر چائے پیٹے ہیں۔ ابھی سے سہانے سپنوں میں نہ کھو جاؤ دلہن بیگم.....“ زوہانے کہنی سے ٹھوکا دے کر اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم شگفتگی سے مسکادی۔

”خیریت.....! یہ تم دونوں کیا اسٹیجوز بنے بیٹھے ہو.....“ لاؤنچ میں آتے ہی زوہانے دونوں کی خاموشی کا نوٹس لیا تھا۔

”تمہارا ویٹ کر رہے تھے..... تم چائے بنانے لگی تھیں یا پاپے لگانے.....“ عکرمہ نے حسب توقع جواب دیا تھا۔

”خیر ایسی بھی بات نہیں..... اجنی وے تم لودری۔“

”نہیں..... مجھے خواہش نہیں ہے.....“ اس نے سادگی سے انکار کیا تھا۔

”خواہش تمہیں کبھی ہوتی بھی ہے؟ ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں اور تم ایسے پریشان بیٹھی ہو..... جیسے ایگزامینشن ہال کی طرف لے جایا جا رہا ہو تمہیں.....“ ردا نے اہانگ تھا م کر تبصرہ کیا۔

عکرمہ نے دیکھا اس کے جملے پر وہ سخت سے ایک دم گلابی ہو گئی تھی۔

”بائی داوے..... تم دونوں سسز کے ساتھ شاپنگ کرنا کسی امتحان سے کم بھی نہیں..... اتنا ٹائم لیتی ہو کہ دوسرا بندہ چکر اچک جائے۔“

ایک دم عکرمہ نے سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ ردا اور زوہا دونوں ناراض ہونے لگیں۔

”تم تو رہنے دو عکرمہ..... ہمارے ساتھ بڑے نخرے کرتے ہو..... اپنی بیگم آئے گی تو گھنٹوں اس کے ساتھ مارے، مارے پھرا کر دو گے.....“ زوہانے مستقبل کا نقشہ کھینچا تھا۔

”وہ بھی خوشی، خوشی.....“ ردا نے لقمہ دیا۔

”اللہ نہ کرے کہ تم جیسی ہو میری لائف پارٹنر.....“ اس نے قصد اچڑانے والے انداز میں کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

”ہاں مافوق الفطرت مخلوق ہوگی ناں وہ..... سیدھا آسمان سے بیڑھی لگا کر اترے گی.....“ زوہا جل ہی تو گئی۔

”ہو بھی سکتا ہے۔“ وہ مسکراہٹ دیا کر بولا۔

تبت سنو

آپ کے قدرتی حسن کو دوبالا کرے -
اس کے استعمال سے جلد ہمیشہ صاف
اور ملائم رہتی ہے اور چہرے پر ایک نئی
تازگی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔



تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

English

انگلش پھر سب سے آگے!



انگلش دنیا کا بہترین ٹوتھ پیسٹ ہے۔

کیونکہ اس میں ہے فیکو سیریکائیڈیم کے ساتھ ذیل فلورائیڈ، تاکہ آپ کے دانتوں کو طے
Maximum نہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection

A Quality Product of
Sarwan & Sons
Pakistan

@SnScare

english.toothpaste

Pakistan Standards

سے تصدیق شدہ

<https://reading.caretofun.net>

تھا..... اور تیر ٹھیک نشانے پر لگا بھی۔
 ”مطلب.....؟“ وہ اٹھتے، اٹھتے رک گیا۔
 ”مطلب زارا آ رہی ہے..... اس مہینے ساتھ میں خولہ بھی ہے..... واوی کو اچھی لگی ہے خولہ اور.....“ زوہا کہہ رہی تھی کہ روانے جملہ اچک لیا۔

”اب اگر آپ کو پسند آئی تو چٹ مگنی۔“
 ”پٹ بیاہ.....“ زوہا نے بڑے پرجوش انداز سے کہا تو وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
 ”اللہ مالک ہے..... جب میں نے آج تک کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تو امید ہے کہ میرے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا..... دیکھنا کس قدر نفیس ہوگی میری پارٹنر.....“ اس نے زیر لب مسکرا کر کپ میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 درمکون اس دوران بس سب کو سختی دے دیتی تھی..... شادی اور لائف پارٹنر کے ذکر پر عکرمہ کے لبوں پر جو سہل، سہل مسکراہٹ آئی تھی۔ ردا کی آنکھوں میں جو وہ پہلے خواب سے تھے وہ ان سب خوشیوں سے کس قدر دور تھی۔
 کسی کی زندگی میں شامل ہونے اور کسی کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کا خیال..... اس سے جڑے خواب، سب کچھ کتنا خوب صورت تھا ان سب کے لیے مگر اس کے لیے ایک ذرا ناخواب تھا یہ.....

”خوش فہمی ہے یہ تمہاری.....“ زوہا ساتھ چلتے چلتے شوخی سے بولی تھی۔
 ”اور تمہاری غلط فہمی.....“ عکرمہ نے برجستہ جواب دیا تھا۔
 ”دیکھا کرو..... یہ تو ابھی سے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔“
 ”ہاں ذرا سا برا کیا کہہ دیا عکرمہ بھائی تو طرفداری پر اتر آئے۔“
 ”وہ تو ظاہر ہے..... عکرمہ شیرازی کی پارٹنر ہوگی..... اب کوئی ایسی دہی تو ہونے سے رہی۔“
 ”ہوں..... آئے خولہ آ رہی ہیں شارجہ سے، دیکھ لیتے ہیں۔“
 کار میں بیٹھے، بیٹھے ان تینوں کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہی..... جبکہ ان سب کے پیچھے ست قدموں سے چلتی درمکون کے احساسات سے وہ تینوں انجان تھے۔
 ”چلو اب جلدی چلو..... ویسے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے.....“ کار میں بیٹھے ہی زوہا کو وقت کی نگر ستانی تھی۔

☆.....☆.....

داوی کا specialist lungs سے اپنا ٹیٹ اپ تھا آج۔ عکرمہ آخر کی کلاس موقوف کر کے کچھ جلدی ہی گھر واپس آ گیا۔ داوی نے کہا تھا کہ لنگ گھر پر کر کے ساتھ نکل چلیں گے۔ واپسی میں بازار بھی جانا تھا انہیں..... وہ سیدھا اوپر داوی کے پاس آیا۔
 ”السلام علیکم داوی۔“

”وعلیکم السلام..... جیتے رہو.....“ داوی بھی اس کے انتظار میں تھیں۔
 ”آپ بس تیار ہو جائیں..... میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔“
 ”جلدی آنا بیٹا..... کھانا تیار ہے نیچے۔“

داوی اس کو تاکید کرتی نیچے چلی گئیں..... ذرا اوپر بعد ڈارک براؤن شلوار سوٹ میں ملبوس سیل فون پر کسی کو ٹیکسٹ کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا تو داوی اسے ڈائمنڈ نیپل پر اپنی منتظر ملیں۔ اس نے بھی کرسی سنبھال لی۔ ردا اور چچی جان حسب معمول آج بھی شاہک سے واپس نہیں لوٹی تھیں۔ اس نے بھویں اچکا کر دیکھا درمکون بھی غائب تھی۔

”چلو بیٹا۔ بسم اللہ کرو۔“ دادی نے پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تو اس کی متلاشی نظریں دروازے تک جا کر لوٹ آئیں۔

”ڈر مکتون کہاں ہیں؟“

”جگن میں ہے۔ اسے آج بھوک نہیں ہے۔“

”بھوک نہیں ہے سے کیا مطلب ہے.....؟ کیا طریقہ ہے..... لچ نہیں کھائیں گی تو اس کے بعد کی دوا کا کیا ہوگا۔ آپ بلائیں انہیں اور کہیں جتنی بھوک ہے اتنا کھائیں آگے۔“

پلاؤ کی ڈش اپنے سامنے کھکاتے ہوئے اس نے گویا حکمانہ انداز اختیار کیا تھا..... دادی نے متفق ہوتے ہوئے اسے آواز لگائی تو وہ مرے، مرے قدموں سے اندر چلی آئی۔

”جی دادی.....!“ عکرمہ کی طرف دیکھنے سے قصد احتراز کرتے ہوئے وہ دادی کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”کھانا کھائیں بیٹھ کر..... کھانے سے کیا ناراضی ہے.....“ دادی سے پہلے وہ بولا تھا..... لہجہ حکمیہ تھا۔

ڈر مکتون نے دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”مجھے بھوک نہیں.....“ نظریں جھکائے، جھکائے اس نے کمزور آواز میں بودا سا بہانہ بتایا۔

عکرمہ کی بھوس اس کا جواب سن کر ایک خاص زاویے پر آکر کیں۔

”آپ کو بھوک نہیں مگر کھانا کھانے کی ضرورت ضرور ہے..... کھانا کھائیں اور اب اس بارے میں مزید کوئی

بحث نہیں ہوتی چاہیے۔“

وہ سنجیدگی سے کہہ کر اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر گیا۔ اس نے بیچارگی سے دادی کی طرف دیکھا۔

مرتا کیانہ کرتا کے مصداق وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

عکرمہ کھانے کی طرف متوجہ ہوا تو اسے جی چند لقمے لینے ہی پڑے۔

”ٹھیک سے کھائیں..... اس کے بعد دوا بھی لینی ہے آپ کو۔“

بظاہر وہ کھانے میں مگن تھا مگر جب اچانک اس نے ٹوکا تو احساس ہوا کہ وہ اتنا بے خبر بھی نہیں جتنا وہ اسے سمجھ رہی تھی۔ دادی نے سب سے پہلے ہاتھ کھینچا تو در مکتون نے فوراً پلیٹ آگے کی طرف سرکائی۔ عکرمہ نے نوٹ تو کیا مگر اس بار ٹوکا نہیں۔

”چلیں دادی..... میرا خیال ہے اب ہمیں کلنا چاہیے۔“ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے

کہا تو دادی سر ہلا کر اٹھ گئیں۔ در مکتون نے اس دوران برتن سمیٹنے شروع کر دیے تھے۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں..... میں نے کہا تھا کہ اب ہمیں کلنا چاہیے.....“ پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے

اس نے ڈر مکتون کو مخاطب کیا تو وہ جیسے چونک گئی۔ بہت تحکم سے کہہ کر وہ دادی کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں باہر ہوں دادی..... انہیں لے کر آپ آجائیں..... گھر لاک کرنا ہے..... جائیں در مکتون اپنی میڈیسن

لیں اور چابی لے آئیں کمرے سے۔“ وہ مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ در مکتون نے دادی کو مدد طلب نظروں

سے دیکھا مگر وہ بھی پوتے کی حامی نظر آ رہی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے وہ گو کہ دن کا وقت ہے مگر میں اس طرح تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتی.....“ عکرمہ کے

جاتے ہی وہ بولیں۔

”مگر مجھے دن میں ڈر نہیں لگتا دادی.....“ وہ جانے کو راضا مند نہیں ہو رہی تھی..... دے، دے، دے لہجے میں بولی۔

”لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے میں مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے..... سناڑہ کا تو تمہیں پتا ہے شام سے پہلے

نہیں لوٹیں گی۔۔۔۔۔ آج تو سیف کو بھی ساتھ لے کر گئی ہیں۔ مظفر میاں بھی شام ڈھلے ہی آتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں بھی دیر ہوگئی تو خود سوچو بیٹا کس قدر پریشان ہو سکتی ہو تم۔۔۔۔۔“

دادی نے شفق لہجے میں حلاوت سے سمجھایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی متفق ہوگئی۔ ریڈ سوٹ پر گلابی شال وڑھے جب وہ باہر نکلی تو دادی و عکرمہ کے ساتھ گاڑی میں اس کی منتظر تھیں۔۔۔۔۔ گھر لاک کر کے وہ بھی چپ چاپ کار کی پچھلی نشست پر آ بیٹھی۔

ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر وہ لوگ سیدھے جیولر کی شاپ پر گئے۔ دادی کو ردا کے لیے کچھ خریدنا تھا۔ ”کیا خیال ہے کہ ایک عہد بندی یا بھی لے لوں ردا کے لیے۔۔۔ سیٹ کے ساتھ، ساتھ۔۔۔۔۔“

دادی غالباً دونوں ہی سے مخاطب تھیں۔ دونوں نے ہی سر ہلادیا۔

دادی کے کہنے پر جیولر نے تین چار ڈبے ان کے سامنے لا دھرے۔

نہیں جڑاؤ والی میٹروں بندی یا ان کے سامنے تھیں۔ دادی انتخاب کرنے لگیں۔۔۔۔۔ عکرمہ نے دیکھا دونوں ہاتھ کود میں رکھے درمکون گلاس وال کے پرے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سراپیمگی اور خوف کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ دیکھنے کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ سوچ اور بصارت کا تعلق منقطع ہے۔

”یہ کیسی رہے گی۔۔۔۔۔؟“ یک دم دادی نے ایک بندی اٹھا کر درمکون کے سامنے لہرائی تو وہ حال میں لوٹی اور سامنے کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھی ہے دادی۔۔۔۔۔“ آہستگی سے کہہ کر اس نے نظر سامنے رکھے ڈیوں پر جمائی۔

”دیکھو تو کیسی لگے گی۔۔۔۔۔“ اچانک دادی نے سر پر اوڑھا اس کا دو پٹا قدرے پیچھے سرکاتے ہوئے اس کی شیع پیشانی پر بندیا نکادی۔ وہ اس پیش قدمی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے یکبارگی شیشا سی ٹکی۔

”دیکھو عکرمہ۔۔۔۔۔ اچھی لگ رہی ہے ناں۔۔۔۔۔!“ اب کے انہوں نے عکرمہ سے رائے لینی چاہی تو اس نے یک لمحے کے لیے درمکون کی طرف دیکھا۔

سادہ چہرے پر گھٹنٹے سے ہی ایسی رعنائی اتر آئی تھی کہ دادی دیکھ کر ”ماشاء اللہ“ کہے، پتا نہ رہ سکیں۔ وہ بہت ل ہو رہی تھی اسی لیے اس نے آہستگی سے نگاہیں موڑ لیں۔

”آپ کی چوائس ہے دادی اچھی تو ہوگی ہی۔۔۔۔۔“ مبہمی مسکراہٹ سمیت اس نے دادی سے کہا تو وہ متبسم ہو گئیں۔

”چل ہٹ۔۔۔۔۔ دادی کو بیانا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یقین کریں“ کچھ کہہ رہا ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولا تھا، لہجہ یقین دلائے پر مصر تھا۔ دادی ہولے سے ہنس پڑیں۔

”بس پھر میری پسند کی ہوئی لڑکی کے لیے بھی اسی طرح ہاں کہہ دینا۔۔۔۔۔“ انہوں نے لگے ہاتھوں اس سے مدد لینے کی کوشش کی تو وہ شرارت سے سر کھچا کر ہنس پڑا۔

”آپ پسند تو کریں۔۔۔۔۔ مایوسی نہیں ہوگی۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔۔۔!“

دادی اس کے جواب پر مسروری ہو گئیں۔۔۔۔۔ درمکون نے چند ٹانے کے لیے عکرمہ کے متبسم چہرے پر نظر ڈالی۔

”شاید جن کی زندگی ایسے کرہناک اور کھٹکتے ورینت سے دوچار کرنے والے حادثوں سے عبادت نہیں ہوتی۔

مستقبل کے ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہیں جبکہ میری آنکھیں خواب تو کیا بصارتیں بھی کھوجی ہیں جیسے میں بھلا

بے سنے کیسے سجا سکتی ہوں۔۔۔۔۔“ کسی پردہ رولے کا ہولناک تصور اسے جھرجھری لینے پر مجبور کر گیا۔

عکرمہ نے اس کی خالی، خالی نظریں خود پر محسوس کیں تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔۔۔۔۔ وہ غالباً اس دوستانہ

تبسم کے لیے تیار نہیں تھی..... اس لیے خفیف سی ہو کر دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”سریہ غالباً آپ کی ہونے والی مسز ہیں..... انہیں یہ ڈائمنڈ رنگ دکھائیں..... یقیناً پسند آئے گی۔ ایک بہترین تحفہ ہوگا آپ کی فانیسی کے لیے.....“

اسی اثنا میں ایک نو عمر لڑکا رنگرز کا ڈبا اٹھائے چلا آیا تھا..... انداز پر وفیشنل تھا۔ عکرمہ کو متوجہ کر کے ڈرہکنون کی طرف اشارہ کیا تو اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا..... دادی اور عکرمہ بھی ایک لمحے کو چونکے اور پھر سنبھل گئے۔

”لاؤ بیٹا دکھاؤ..... میں اپنے پوتے کی دلہن کے لیے دیکھ لیتی ہوں.....“ دادی نے بڑے سجاؤ سے کہہ کر ڈبا اس سیلز مین کے ہاتھ سے لے لیا۔

ڈرہکنون پر دل ہوتے ہوئے بلا ارادہ دوپٹا کھینچ کر ماتھے تک لے آئی پھر بعد میں دادی نے رنگ اور کٹی پینڈنٹ اسے دکھا کر رائے مانگی مگر وہ صرف سر ہلاتی رہی..... یہاں تک کہ دادی جانے کو انھیں۔

”چلیں.....“ اسے گویا زنداں سے رہائی ملی تھی۔

”ہاں بیٹا..... آؤ.....“ دادی کہہ کر آگے بڑھیں۔

عکرمہ ان کے پیچھے، پیچھے آ رہا تھا..... وہ بھی کچھ کچھ کر قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ عکرمہ کی رفتار کے ساتھ ہی اس کے قدم اٹھ رہے تھے، رک رہے تھے۔

اس دوران دادی کو راستے میں ایک شاپ پر نہ جانے کیا نظر آ گیا تھا جو وہ رک گئیں۔

عکرمہ باہر ہی رک گیا تھا لہذا اسے بھی رکنا پڑا۔

”مشورہ ایک امانت ہوتا ہے..... جب کوئی آپ سے مشورہ مانگے تو سوچ کچھ کر دینا چاہیے.....“ دادی کے

شاپ کے اندر جاتے ہی وہ بولا تھا۔ اس کا جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ گویا ڈرہکنون کے سر پر سے گزرا۔

”جی.....؟“

”میرا خیال ہے دادی کی دکھائی ہوئی کسی چیز کو بھی آپ نے غور سے نہیں دیکھا اور نہ ہی دل سے رائے

دی.....“ سینے پر بازو پٹپٹوہ اس سے براہ راست مخاطب تھا..... ڈرہکنون اس گوشالی پر خفیف سی ہو گئی۔

”ایسی بات نہیں..... میں نے تو کوشش کی کہ اچھا مشورہ دوں مگر مجھے جیولری کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم

نہیں.....“ ندامت سے کہتے ہوئے وہ انک انک گئی تھی۔

”اگر معلوم نہیں ہے تو اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ ویسے کمال ہے..... ایک لڑکی ہو کر آپ کو شاہنگ اور جیولری

سے انٹرسٹ نہیں..... کو اسٹ امیزنگ.....“ اس نے قصداً تحیر کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میری پسندنا پسند دلچسپیاں، خواب، میری خوشی اور ارمان سب ایک سیاہ مائی رنگ میں ڈوب گئے ہیں۔

اے بھلے انسان تمہیں کیا معلوم کہ کبھی میں کیا تھی۔ اب تو بس یہ وجود زندہ ہے وہ بھی اس لیے کہ دل کے دھڑکنے کا

عمل میرے اختیار سے باہر ہے ورنہ کبھی وہ جو اک ”ذات“ تھی میرے اندر..... غرض ہوا اندر ہی کہیں دفن ہو چکی

ہے..... یہ میرا وجود تو ایک چلتا پھرتا مقبرہ ہے بس.....“

وہ اپنی الجھی ہوئی سوچوں میں الجھے جا رہی تھی..... عکرمہ نے اس کو بغور دیکھا تو احساس ہوا کہ انجانے میں

ہی سہمی اس نے ڈرہکنون کے زخم جھیل دیے ہیں۔ واپسی پر ڈرہکنون مانند بت بیٹھی رہی تھی۔

دادی البتہ خوش تھیں کہ آج پہلی بار وہ ان کے ساتھ شاہنگ پر آئی تھی اور ان کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ عدم توجہی

اور بے دلی سے ہی سہی وہ کم از کم گھر سے باہر تو نکلی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے پوچھنے پر مشورے بھی دیے تھے اس نے۔

(جاری ہے)

محبت کے حوصلے

ہاجرہ رحمان

”میں نے بتایا تھا کہ آج صرف وہی عورت پاک باز ہے جو بد صورت ہے..... کیونکہ صرف بد صورت عورت کو ہی مرد دل لگی کے قابل نہیں سمجھتے اور پھر تم بھی تو بھند تھے کہ اسی سے شادی کرو گے کیونکہ تمہاری نظر میں ایک با کردار، ذہین عورت ہے حد حسین مگر کسی کی متروکہ محبوبہ سے لاکھ درجہ بہتر بیوہ ثابت ہو سکتی ہے پھر شکل صورت کا تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر مسئلہ تو ہے اور وہ یہ کہ جس کو بھی دل لگی کرنے والا ہی



نہیں ملا ہو جس پر بھی کوئی فدا نہیں ہوا ہو۔ جسے اسکول کالج کے زمانے میں بھی راہ چلنے کی لڑکے نے خط جیسا کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہی نہیں پکڑا یا ہو تو بھلا وہ کیا جانے یہ عشق، عاشق کیا بلا ہیں۔۔۔۔۔ اب تمہاری بیچاری۔۔۔۔۔ بد صورت سی بیوی کیا جانے کے معشوق کی موجودگی میں کس طرح خود کو سونورا جاتا ہے اور کس طرح غیر موجودگی کو محسوس کر کے ملنے پر جتا جاتا ہے۔۔۔۔۔ لہذا تم بلا وجہ ہی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔ وہ اگر تمہارے وقتاً فوقتاً دیے گئے پھول اور تحائف لے کر خوشی کا اظہار نہیں کرتی یا پھر تمہارے ساتھ کسی میٹنگ ترین ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آتی تو یقین کرو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ خوش نہیں یا پھر تمہارے ساتھ ہونے پر اسے پھچلا کوئی عاشق یاد آ جاتا ہے، اصل مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس بیچاری کو معلوم ہی نہیں کہ تم یہ سب جتن اس کے عشق میں، اس کو خود سے مانوس کرنے کے لیے کر رہے ہو۔

اب وہ بیچاری کیا جانے۔۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے اس کے ساتھ ایک دن گزارنے کی اجازت دے دو تو میں اس کو ڈھنگ سے سمجھا سکوں گی کہ بی بی اب تم ایک جاذبِ نظر، خوب صورت اور کامیاب مرد کی بیوی ہو لہذا اپنے احساسِ کمتری سے باہر آؤ اور شوہر کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے کی تھوڑی بہت جدو جہد کر لو تو کچھ نہیں جائے گا۔ صحیح ہے ناں؟“

میں جانتا تھا رابعہ میری بیوی کے بارے میں کچھ اسی طرح کی باتیں کرے گی۔۔۔۔۔ ایک حسین عورت اگر دوسری حسین عورت کے بارے میں قیاس آرائی کرے تو وہ اور بھی حسین لگتی ہے مگر جب ایک بیوقوف عورت کسی ذہین عورت کے بارے میں قیاس آرائی کرتی ہے تو وہ اور بھی بیوقوف نظر آنے لگتی ہے اور اس وقت مجھے اپنی بہن میری ذہین بیوی کے بارے میں اسی طرح کی باتیں کرتی ہوئی جدت سے زیادہ بیوقوف لگ رہی تھی۔ اس میں رابعہ کا بھی قصور نہیں تھا آخر کو وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور بالکل اسی جان کی طرح سوچتی تھی اور میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ امی جان کو ایسا بچپن سے ہی ناپسند تھی۔

بات تو صرف یہ تھی کہ امی جان کو ہمیشہ سے خوش شکل ہی پسند تھے ان کی نظر میں اچھی شکل صورت ہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔۔۔۔۔ ان کے نزدیک تعلیم، خاندان، بڑو باری یہاں تک کہ کردار کچھ بھی اچھا نہیں ہو بس شکل صورت اچھی ہونی چاہیے، وہ خود بھی اپنی جوانی میں خاندان کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں اور انہوں نے اپنی پسند سے پایا سے شادی کی تھی جو خاندان کے پینڈم ترین مردوں میں سے تھے اس کے بعد امی جان نے ہمیشہ صرف ان رشتے داروں اور ملنے والوں سے رابطہ رکھا جن کی شکل صورت اچھی رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی یہ رہی کہ اس نے ہم باجج بھائی، بہن کو بھی امی جان اور پایا کی طرح اچھا قد کاٹھ اور شکل صورت عنایت کر دی تھی لہذا میری دونوں بہنوں کے لیے بھی اچھی شکل صورت کے لڑکے تلاش کیے گئے تھے جو کہ دونوں ہی خاندان سے باہر کے تھے جبکہ کسی ایک بہن کو خاندان میں کسی بہتر اور مناسب لڑکے سے بیاہنے کا شوق میرے والد کے دل میں ہی رہ گیا تھا اور اسی کے ساتھ میری دونوں بھائیاں بھی اپنی آب و تاب میں چندے ماہیاب لائی گئی تھیں۔ ہمارا پورا خاندان جب ایک ساتھ کسی شادی بیاہ میں اسج پرفوٹیشن کے دوران ایسا کسی میز پر ساتھ ہوتا تو پورے ہال میں ہم سب جیسے بالکل مختلف بالکل الگ نظر آ رہے ہوتے اور ہر دیکھنے والی آنکھ ہم پر رشک کرتی نظر آتی ایسے میں میرا ماموں جان کی سب سے چھوٹی بیٹی لکلی کی طرف جھکاؤ امی جان کے ساتھ رابعہ کو بھی مجھ سے ناراض کر گیا تھا۔

رابعہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھی لہذا ہم دونوں میں بالکل دوستوں کی طرح کی بے تکلفی تھی اس کا شوہر امی جان کی پسند سے ایک لمبا، صحت مند، گورا چٹا انسان تھا مگر شعیب سال کے زیادہ تر دن رابعہ کے ساتھ سرسرا میں یعنی ہمارے گھر میں ہی گزارہ کرتا کیونکہ اس کے پاس کوئی مستقل کام نہیں تھا مگر امی جان کو پھر بھی وہ پیارا تھا اور رابعہ کو اپنے بیٹیوں بھائیوں کے اپنے الگ، الگ کام کی بدولت گھر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی لہذا رابعہ اور شعیب کا واحد کام گھر میں ہونے والے ہر کام،

ہر بات اور مکمل کی منصوبہ بندی میں ہر طرح سے ٹانگ اڑاتا تھا۔ میری شادی کے سلسلے میں جہاں امی جان کو منانا مشکل تھا تو راجہ کو سمجھانا مشکل ترین کام تھا مگر میں یہ کر گزرا تھا کہ کبھی مصلحت کے ساتھ اور کبھی غصے، غضب کے ساتھ..... اس کے بعد کئی ہفتے میری اور راجہ کی بات چیت بند رہی مگر پھر لیلیٰ کی خاموشی نے مجھے پھر اپنی بہن کی طرف جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسئلہ تو یہی تھا کہ میں اس کے علاوہ کون سی کیا سکتا تھا۔

شادی کے تین مہینے گزرنے کے باوجود لیلیٰ کی خاموشی سنجیدگی اور لیے دیے رہنے والی عادت سے اب مجھے ابھن ہونے لگی تھی۔ خاندان میں شادیوں کا موسم عروج پر تھا لہذا میری شادی کے بعد ہی تین، چار شادیاں **تظار در تظار** ہمارے لیے روز کہیں نہ کہیں جانے کی وجہ بن گئی تھیں..... مگر لیلیٰ اکثر ہی شادی، ویسے کے دن کسی نہ کسی بہانے جانے سے انکار کر دیتی تھی، صرف یہی نہیں، میں ان دعوؤں کے علاوہ بھی لیلیٰ کی خاموشی توڑنے کے لیے اسے کئی بار اچھے سے ریسٹورنٹ لے کر جا چکا تھا۔ ماموں جان کا خاندان حیثیت میں کسی طرح بھی ہمارے خاندان سے کم نہیں تھا لہذا میں یہ تو مان نہیں سکتا تھا کہ لیلیٰ ایسی جگہوں پر جا کر بقول راجہ کسی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہوگی اور نہ ہی میں یہ مان سکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ جانا پسند نہیں آتا ہوگا۔ آخر شادی سے پہلے یہ حیثیت کزن، ہم کوئی پارٹے تھے اور لیلیٰ کو ہمیشہ کم گو اور سنجیدہ ہی ہی نظر آتی تھی مگر وہ میرے سامنے آتی تھی۔ نوکروں کی موجودگی میں بھی میرے لیے جائے ناشتے، کھانے کا انتظام بھی زیادہ تر وہی کرتی تھی جس سے میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے مگر وہ ایک شریف انفس انسان تھی۔ اس میں شوخی نام کو نہیں تھی پھر بچپن سے ہی میں اسے اپنے آپ میں کم سا پایا تھا۔ وہ سامنے بھی بیٹھی ہوتی تب بھی بات کم ہی کرتی زیادہ تر ماموں جان کے گھر کے دوسرے، افراد یہ فرض ادا کرتے تھے اور میرے لیے اس کا بس میرے ارد گرد موجود ہونا بھی بہت ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کیوں پسند بھی مگر اس

کے پاس جانا اس کی دوسری اور بھی، کبھی ہونٹوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ مجھے اچھی لگتی تھی۔ راجہ اور امی جان کی نظروں میں وہ ایک بد صورت لڑکی تھی مگر میرے لیے اس کا سانولا رنگ اور نیچے نقوش ایک الگ طرح کی کشش رکھتے تھے۔ گہری سیاہ آنکھیں جن سے کبھی، کبھار ہی اس کی بھاری پلکیں مکمل اٹھا کرتیں تو جیسے مجھے ہر طرف دھند بھری سیاہی اتنی محسوس ہونے لگتی..... میری پسند جان لینے کے بعد امی جان نے جس طرح لیلیٰ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا مجھے حیرت ہوئی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی شخص کسی خاندان کے دو افراد کو اچھا یا برا لگ رہا ہو۔ امی جان کی نظر میں لیلیٰ میرے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھی۔ ان کے نزدیک مجھے اپنے جیسی گورے رنگ اور بھورے بالوں والی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے، انہوں نے میرے لیے ایک سے ایک خوب صورت لڑکی دیکھ رکھی تھی یہاں تک کہ کئی ایک کو انہوں نے مجھ سے ملنے کے لیے گھر پر بھی بلا لیا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے ان روز، روز کی ملاقاتوں سے بچنے کے لیے لیلیٰ کا نام لے لیا تھا اور پھر ایک لمبی اور مشکل جدوجہد کے بعد مجھے وہ حاصل ہو سکی تھی اور اب جبکہ وہ اس قدر پاس تھی تو اور بھی دور محسوس ہوتی..... راجہ اپنی بات کا جواب نہ پا کر تاسف سے سر ہلاتی ابھی مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہی۔

”میں تو کہتی ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شوہر بن کر دکھا دو.....“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ارے بھئی مطلب یہ کہ اب تک تم اسے عاشق کی طرح کسی بھوزے کے مانند اڑے، اڑے پھرتے تھے اب ذرا اس سے شوہر کی طرح پیش آؤ، کبھی کسی بات پر غصہ کرو، عجیب وغریب سے حکم صادر کرو اور آئس سے آنے سے ذرا پہلے فون کر کے کسی مشکل سے کھانے کی فرمائش کرو اور پتہ نہیں تو آئس جانے سے پہلے اس سے اس کی پسند کیلئے لیے کپڑے نکالنے کا کہو اور جب وہ نکال کر رکھے تو کبھی پتلون، کوٹ کے رنگ اور کبھی ٹائی کے بے ڈھنگے ہونے پر تنقید کر کے اپنی پسند سے کپڑے نکال

کر چہن کر آفس نکل جاؤ کیا مجھے؟“ رابعہ نے
کچھ اس رازداری سے کہا کہ مجھے بے اختیار ملی آگئی۔
”ہا ہا ہا..... لگتا ہے شعیب بھائی بہت مشکل وقت
دیتے رہے ہیں میری بہن کو.....“

میری بات پر رابعہ کے چہرے پر رنگ سالہرا ایا اور
وہ جڑبڑ ہوتی تیزی سے آگے بڑھ گئی..... مگر بات وہ
بچے کی کر گئی تھی۔ مجھے بھی لگی کہ رہا تھا کہ لیلیٰ کو شاید
میں کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہا ہوں اب وہ میری بیوی
ہے اور میں اس کی خوشامد کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔
بھئی بھئی وہ بھی تو مجھے احساس دلانے کہ اسے میری پروا
ہے، وہ مجھے چاہتی نہیں تو کم از کم مجھ سے خوش تو ہے۔
دوسری ہی صبح مجھے یہ موقع مل گیا۔ رابعہ نے تو مجھے لیلیٰ
کی پسند پر تنقید کرنے کا کہا تھا مگر بات یہ تھی کہ میں لیلیٰ
کی پسند سے نکالے گئے کپڑے پہننے کا اب تک اتنا
عادی ہو چکا تھا کہ اب اگر بھی خود نکالنے کی کوشش بھی
کرتا تو گڑباجاتا لہذا کپڑے نکالنے کے علاوہ مجھے کسی
اور بات پر تنقید یا غصہ کرنے کا جواز ڈھونڈنا تھا اور وہ
یوں ملا کہ رجب میں سنگار میز کے سامنے کھڑا بالوں
میں برش پھیر رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ لیلیٰ کو اپنے پیچھے
بستر ٹھیک کرتے دیکھ رہا تھا تو وہ اچانک میری طرف
دیکھے بغیر مجھ سے شاپنگ پر جانے کی اجازت مانگنے اور
میرے آفس بیچ کر گاڑی واپس بھیجنے کے بارے میں
بات کرنے لگی۔

”تم سے کتنی بار کہا ہے کہ یہ اچانک کا بنایا ہوا پلان
مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے..... تمہیں کہیں جانا ہوا کرے
تو مجھے کم از کم دو چار دن پہلے سے بتایا کرو، تمہیں؟“
میں نے کڑا کے دار واز میں کہا تو بستر کی چادر ٹھیک
کرتے لیلیٰ کے ہاتھ جیسے متحد ہو گئے۔ اس نے اسی طرح
میری طرف دیکھے بغیر ہلکا سا سر ہلایا اور ہونٹ سمیٹ لیے۔
”اتنا کوئی ضروری نہیں، میں دو چار دن بعد بھی
جاسکتی ہوں یا پھر ابو جان کی گاڑی بھی منگوا سکتی
ہوں؟“ اس کا جواب اسی اطمینان اور تحمل سے ملا تو اب
کی بار میں واقعی غصے میں آ گیا۔

”ہاں کیوں نہیں، ماموں جان کی گاڑی میں جاؤ“

تا کہ پھر لوک ہیں کہ میں اتنا نا امل ہوں کہ شاپنگ پر
جانے کے لیے گاڑی تک مہیا نہیں کرتا..... کیوں یہی
مطلب ہے نا.....؟“

مجھے جس رویتے کی امید تھی ویسا کچھ بھی نہیں
ہوا..... بس اتنا کہ پہلے اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر
ایک دم جیسے تھکے سے انداز میں لمبی سانس بھر کر بستر کے
کنارے تنگ گئی۔ مجھ میں اور ہمت نہیں تھی کہ آج کے
لیے اتنا ہی بہت تھا اس سے زیادہ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا
کیونکہ لیلیٰ سے زیادہ تو میں خود تکلیف میں تھا..... میں
جلدی سے اپنا والٹ اٹھا تا کرے سے باہر نکل آیا۔

”کہاں پھنسا دیا رابعہ نے بھی..... چھوڑو یہ غصہ
بھئی..... وہ جیسی بھی ہے ٹھیک ہے بس ایسے ہی چلنے دیتا
ہوں، آخر خبری نہ بھی تو پچھلے گئے“ میں یہی سب سوچتا
آفس آ گیا اور اترتے ہی بہادر کو گاڑی کے ساتھ واپس
کر دیا۔ بہادر ہمارا کافی پرانا ڈرائیور تھا اس کے علاوہ
بھی دو ڈرائیور ہمارے ہاں کام کرتے تھے مگر بہادر پر
گھر کی خواتین کے لیے بھروسہ کیا جاتا تھا لہذا جب بھی
بہنوں یا امی جان کو کہیں جانا ہوتا تو بہادر کو ہی ڈرائیور
دی جاتی تھی۔ آفس آ کر اپنے معمول کے مطابق میں
لیلیٰ کو فون کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا اور اس بے چینی میں
مجھے رابعہ پر اور بھی غصہ آنے لگا..... کیسا بے شکا سا
مشورہ دیا میری بیوقوف ترین بہن نے..... اسی سوچ
میں کسی نہ کسی طرح دوپہر کی اور جب کھانے کے لیے
میں آفس کی کینٹین میں بیٹھا کچھ مزدوروں کے مسائل
سن رہا تھا تو اچانک پہلے تو میرے موبائل پر یکے بعد
دیگرے پاپا اور امی جان کا فون آیا اور دونوں نے ہی دو
چار بتل دے کر بند کر دیا۔ میں ابھی ان میں سے کسی کو
فون کرنے والا تھا کہ بہادر کا فون آنے لگا..... مجھے یہی
لگا کہ وہ واپس آنے کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون
کر رہا ہوگا..... لہذا میں نے اس کی کال کاٹ کر پہلے پاپا
کو فون ملا یا مگر پاپا نے فون نہیں اٹھایا اور بہادر کی بار،
بار کال آنے لگی لہذا میں نے اب کی بار اس کو فون لگایا۔
”چھوٹے صاحب..... وہ میں آج دن میں
چھوٹی بہو کو کل پلازہ چھوڑ کر آیا تھا“ دوسری طرف سے

بہادر کی گھبراہٹ ہوئی سی آواز آئی۔

”ہاں میں جانتا ہوں، میں نے ہی تمہیں لپٹی کو لے جانے کے لیے بھیجا تھا۔ تو؟“ میں تیزی سے گویا ہوا۔

”چھوٹے صاحب..... چھوٹے صاحب وہ..... میں بڑے صاحب کے بلانے پر اُن کے آفس چلا گیا تھا۔ چھوٹی بہو سے بات ہوئی تھی انہوں نے دو گھنٹے بعد گل پلازہ کے باہر سے پک کرنے کا کہا تھا مجھے۔ چھوٹے صاحب وہ دیکھ کہ آپ کے پانکیا کیا چھوٹی بہو صاحبہ کی کوئی کال آئی ہے؟“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو بہادر جلدی سے مطلب کی بات کرو بار.....؟“ اب کی بار میں بہادر کی گھبراہٹ سے خود بھی گھبرا گیا۔

”بھئی میں یہاں یعنی گل پلازہ آیا مگر یہاں قریب نہیں جانے دے رہے مطلب یہاں تو..... یہاں تو پتا چلا کہ پوری بلڈنگ میں آگ لگنے کی وجہ سے کافی نقصان وغیرہ ہوا ہے اور کافی لوگوں کی ہلاکت بھی ہوئی..... بہت سی ایسی بولینس بھی آ جا رہی ہیں گل پلازہ جانے والی واحد سڑک صرف ایسی بولینس کے لیے کھلی ہوئی ہے، یہ سب تو اب بی وی پر بھی آ رہا ہے چھوٹے صاحب، آپ کے پاس چھوٹی بہو کا کوئی فون آیا ہے کیا؟“

بہادر پتا نہیں کیا، کیا بتا رہا تھا مگر میرے حواس جواب دے چکے تھے۔ اسی وقت مجھے پایا کینٹین میں داخل ہوتے نظر آئے..... میں بھی انہیں دیکھ کر..... بے اختیار ان کی طرف بھاگا۔

”جلدی کرو..... میں نے پتا کر لیا ہے زمینوں کو عباسی شہید اور جناح اسپتال پہنچایا گیا ہے..... چلو وقت نہیں ہے۔“ ہمیشہ کی طرح پایا نے اپنے محکمانہ انداز میں اسپتال کے بارے میں بتا کر کھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی کسی مشکل میں آتے ہمیشہ اسی طرح مستثنیٰ انداز میں پیش آتے تھے۔

ہم دونوں بھاگ بھاگ باہر آئے، پایا اپنی گاڑی خود ہی چلا کر لائے تھے مگر راستے میں انہوں نے بتایا کہ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اپنے آفس سے اسپتال کے لیے نکل گئے ہیں ان دونوں کو جناح

توبہ

انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک..... انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا سے رجوع کر لے اور اپنے گناہوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکو کاری کا خدا سے پکا وعدہ کر لے تو یہی اس کی توبہ ہے۔ یہ توبہ گناہ گار سے گناہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں ڈال دیتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے، جس نے توبہ کی اور ایمان صالح لایا اور نیک عمل کیے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اقتباس از سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مصنف: شبلی نعمانی

سید سلیمان ندوی

انتخاب: فرید ہاشمی، کراچی

اسپتال جانے کا کہہ کر ہم دونوں عباسی شہید پہنچ گئے۔ میں نے راستے میں ایک، دو بار لیٹی کو فون لگایا تھا اور پھر اس کی طرف سے جواب نہ پا کر پایا کو بتایا تھا۔ اس کے بعد سے پایا نے معلومات کروائی تھیں اور پھر بہادر کو گھر جانے کا کہہ کر وہ سیدھے میری طرف چلے آئے تھے..... عباسی شہید اسپتال کے احاطے میں کئی ایسی بولینس کھڑی تھیں جن کے اندر سفید چادر میں لپٹے کئی جسم بڑے ڈھنگے انداز میں لیٹے نظر آ رہے تھے اور کئی لوگ وہاں ان جسموں کے چہروں کو دیکھ، دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو حادثے کے بارے میں سن کر اپنے کسی پیارے کی تلاش میں آئے تھے اور بدحواسی میں رونا تک بھولے ہوئے تھے، ایسے میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو

مجھے کندھے سے پڑے ہوئے واپس پہلے ہال میں لے آئے اور دروازے سے ہی کھڑے انہوں نے ایک کونے پر اشارہ کیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً وہ لیلیٰ ہی تھی جو کندھے تک چادر اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ کر اس کے قریب ہی جا بیٹھا۔ یہ سوچے بغیر کے میرے اس طرح جگہ بنائے بغیر لیلیٰ کے قریب بیٹھنے سے برابر والے زخمی کو تکلیف ہو سکتی تھی مگر میں اس وقت لیلیٰ کو دیکھ کر ہوش میں کہاں رہا تھا۔ اس کے بال اجڑے ہوئے خون میں لت پت تھے اس کے ماتھے پر پٹی کے نام پر بس ایک پتلی سی ڈوری جیسا کچھ باندھا گیا تھا جس سے اس کے ماتھے کا زخم صاف نظر آ رہا تھا جس سے ہلکا، ہلکا خون بہہ کر اس کی گردن سے گزرتا اس کے دائیں کندھے کو لال کر رہا تھا۔ چہرے پر کئی خراشیں آچکی تھیں اور چادر بھی کئی جگہ سے خون آلود ہو رہی تھی مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پھر بھی اس نے مجھے قریب آتے دیکھ کر بھی کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نام لے کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ زخموں کی مرہم پٹی کرتی ایک نرس ہمارے قریب آگئی۔ ”بھگدڑ میں پیروں تلے روندے جانے کی وجہ سے یہ سارے زخم آئے ہیں ان کو..... ڈاکٹر نے چیک کر لیا ہے کوئی ایسی چوٹ نہیں آئی جس سے ان کی جان کو خطرہ ہو مگر آپ یوں کریں کہ یہاں سے نکل کر ان کو کسی پرائیویٹ اسپتال میں بھی دکھا دیں..... باہر انتظامیہ میں جا کر اسے شناختی کارڈ کی کاپی جمع کروا کر مریضہ سے اپنا رشتہ اور گھر کا پتہ وغیرہ لکھوا کر آپ ان کو لے جائیں۔“ نرس نے جلدی میں رٹے ہوئے جملے دہرائے اور آگے بڑھ گئی۔ پایا مجھے لیلیٰ کو لے کر آنے کا کہہ کر خود انتظامیہ کی طرف چلے گئے۔ ایسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی تک پہنچانے کے لیے وکیل چیر یا اسٹریچر کے بارے میں سوچنا بیکار تھا اور میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اس وقت لیلیٰ خود چل کر نہیں جاسکے گی لہذا میں نے اپنے ہاتھوں پر ہی لیلیٰ کو اٹھالیا اور پھر پاپا کے آنے

صرف تماش بین کے طور پر موجود تھے جو ایسبوالنس سے اترتے زخموں کی مدد کر رہے تھے، نہ ہی ان کے لیے اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ تک جانے کے لیے جگہ ہی بنا رہے تھے..... بلکہ ان کے بلاوجہ اسپتال میں رٹن بڑھانے کے باعث ایمرجنسی وارڈ کے باہر کچھ سکیورٹی کے لوگ باقاعدہ اپنی گن تانے کھڑے تھے جب ہم لوگ قریب پہنچے تو انہوں نے پہلے تو ہماری بات سننے کے بجائے دھکے دے کر سائڈ میں کرنا چاہا مگر پھر میں نے ان کو بتایا کہ میری بیوی گل پلازہ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی اور شاید یہاں پر زخمی حالت میں لائی گئی ہو۔ ہمارے پیچھے چند اور لوگ بھی آگئے جن میں کچھ خواتین بھی تھیں اور پھر ہم سب کے باری، باری شامی کارڈ دیکھ کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے بڑے سے ہال میں معمولی زخموں کو جگہ دی گئی تھی..... یہاں پر اسٹریچر نہ ہونے کے برابر تھے چاروں دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر زخموں کو لٹایا گیا تھا ان میں کئی ایسے بھی تھے جو ہوش میں تھے اور ہر اندر آنے والے کو غور، غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے یہاں پر اکاؤنٹنٹس کچھ زخموں کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھیں۔ میں اتنا دھواں تھا کہ بس ایک نظر ڈال کر اندر کے ہال میں دوڑ گیا تھا جہاں پر ڈاکٹروں اور نرسیوں کی فون بھاگ دوڑ کر رہی تھی یہاں پر زخموں کی تعداد زیادہ تھی اور یہ وہ بد نصیب تھے جن کی حالت نازک تھی اور کوئی بھی ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ میں نے ایک، ایک بستر پر جا کر دیکھنا شروع کر دیا میں آنے آج تک اس طرح بھی اتنے سارے زخمی ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے کبھی اس طرح اپنے ارد گرد موت کو بھاگتے دوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف چلنے اور خون کی بو پھیلی ہوئی تھی جس کو پتھر اور اسپرٹ کی بو بھی ختم نہیں کر پا رہی تھی، کئی مریضوں کی حالت دیکھ کر میں یہ بھی بھول جاتا کہ میں یہاں کس کو تلاش کرنے آیا ہوں اور ہر بار اسٹریچر پر پڑے زخمی کو دیکھ کر آگے بڑھنا بھول جاتا۔ میں ابھی آدھے ہی مریض دیکھ پایا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ پاپا تھے..... وہ

کے میری طرف دیکھا اور پھر لہری سانس لیا جس میں ابھی ہی نرس دوسری ڈرپ چلا کر گئی تھی۔ اس نے آنکھ کھول کر اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کی گرفت میں دیکھا اور ہلکا سا مسکرائی۔

”آپ کو معلوم ہے جب ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے تو میں..... میں آپ کو چھونے سے ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں آپ کو چھوؤں گی تو آپ میلے ہو جائیں گے..... کچھ ایسا ہی صاف ستھرا نکھرا ہوا سارنگ ہے آپ کا..... میں اپنا ہاتھ کبھی غلطی سے آپ کے ہاتھ پر رکھتی تو لگتا جیسے کسی نے روٹی کے گالے پر کالی سیاہی کھیر دی ہو..... اور میں آپ کو بہت پسند کرتے ہوئے بھی آپ کے قریب بیٹھنے اور ساتھ چلنے سے کترانے لگی۔“ وہ بولنے پر آئی تو کس قدر عجیب و غریب بولنے لگی..... میں گھبرا گیا۔ شاید یہ نیند کے انجکشن کے اثر میں ہے۔

”لیلیٰ؟ لیلیٰ تم سو جاؤ..... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کی بات کو کاٹ کر جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے، اب کی بار اس کے آنکھ کھولتے ہی آنکھوں میں ٹھہرے چند قطرے فک کر نیکے پر جذب ہو گئے..... مگر وہ چپ نہیں ہوئی بولتی ہی چلی گئی۔

”تصور آپ کا نہیں میرا ہی ہے..... مگر میں کیا کرتی؟ آپ کے رشتے سے انکار نہیں کر سکی، ہر طرح کی کوشش کے باوجود..... دل کے ہاتھوں مجبور ہوئی اور چند دن آپ کے ساتھ گزار کر یہی مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ کتنا سمجھا بجا کر رکھا تھا میں نے اس دل کو مگر عین وقت پر دھوکا دے گیا۔ بہت ڈرا دھوکا کر رکھا تھا اسے میں نے مگر پھر بھی بغاوت کر گیا۔ کہاں آپ جیسا خوب صورت مرد کہاں مجھ جیسی کالی صورت..... میں نے جذبات میں آخر اس کا ہاتھ چوم لیا۔“

”لیلیٰ کیا ہو گیا ہے یا؟ اس طرح کی باتیں مت کرو تم..... تم پلیز سو جاؤ..... ورنہ تم اور بیمار پڑ جاؤ گی..... لیلیٰ پلیز.....“ میں..... اس کے آنسوؤں سے

ہم دونوں مشکوں سے جھوم میں سے گزرتے اسپتال کے احاطے تک آئے اور ایک بار پھر پایا جلدی سے گاڑی قریب لانے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ ہم دونوں لیلیٰ کو لیے سیدھے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال آ گئے کیونکہ عباسی شہید سے قریب ترین پرائیویٹ اسپتال یہی تھا جہاں پر پہلے سے ہی ہماری طرح گل پلازہ سے چند زخموں کو ان کے پیارے یہاں لایچے تھے لہذا لیلیٰ کو لے کر ایمر جنسی میں پہنچنے پر فوراً ہی ٹریسٹ مل گیا۔ پایا اسی دوران دونوں بھائیوں اور گھر پر اطلاع دے چکے تھے اور ان سب کے ساتھ لیلیٰ کے گھر والے بھی اسپتال کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ بہر حال چند ہی گھنٹوں میں ڈاکٹروں کی طرف سے ہمیں اطمینان دلایا گیا اور یوں ایک دن کے لیے لیلیٰ کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔ اسی جان اور بھائیوں کے کہنے پر بھی میں لیلیٰ کو چھوڑ کر گھر جانے پر تیار نہ ہوا بلکہ میں نے باقی سب کو گھر بھیج دیا۔ وہ سب مجھے رات میں سو جانے کے ساتھ کچھ اور ہدایتیں دے کر رخصت ہو گئے۔ سب کو وہی لیلیٰ کے لیے اس طرح پریشان اور فکر مند دیکھ کر مجھے دلی اطمینان بھی ہوا کہ ابھی تک میں اپنے گھر والوں خاص طور سے اسی جان اور رابعہ کے انداز میں لیلیٰ کے لیے ناپسندیدگی ہی محسوس کیا کرتا تھا۔ لیلیٰ کو واقعی کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی پھر بھی وہ حادثے کے اثر میں تھی لہذا اس کی مرہم پٹی کر کے اسے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا گیا تھا اور میں اس کے سر ہانے بیٹھا ہوا اس کے چہرے پر پڑنے والی خراشوں کی تعداد گنتے میں ہی لگا رہا تھا۔ رات کے آخری پہر وہ گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی مگر پھر مجھے قریب دیکھ کر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

”آئی ایم سوری لیلیٰ..... پلیز معاف کر دو.....“

میں نے پہلے تو اس سے ادھر ادھر کی بات کرنے کی کوشش کی مگر جب اس کو جواب دیتے نہ پایا تو سمجھا شاید وہ مجھ سے بھلی صبح کی بات پر ناراض ہے پھر مجھے خود بھی ایک طرح کا احساس جرم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس

”آپ کو کیا معلوم کہ ایک خوب صورت مرد کی بیوی ہونا کیسا جان لیوا ہوتا ہے خاص طور سے اس وقت جب بیوی خود معمولی شکل صورت کی ہو۔۔۔۔۔ دنیا طرح طرح سے کھوجنے کی کوشش کرتی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس قدر خوب صورت مرد نے اس عورت کا انتخاب کیا۔۔۔۔۔ طرح طرح کے سوال جواب کر کے عورت کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ ایک معمولی شکل صورت کا مرد اگر ایک بہت ہی حسین خوب صورت عورت سے شادی کر لے تو دنیا بہت آسانی سے ان دونوں کو اپنائیتی ہے مگر یہ پہلوت ایک معمولی شکل صورت کی عورت کو خوب صورت شوہر حاصل کرنے کے بعد نہیں دی جاتی۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں یہ سب جانتے بوجھتے خود کو روک نہ سکی۔ میں خود کو کیوں نہیں روک سکی۔۔۔۔۔؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک مرد تو معمولی شکل صورت کا ہو سکتا ہے مگر عورت۔۔۔۔۔ عورت یا تو خوب صورت ہوتی ہے یا پھر بد صورت۔۔۔۔۔ عورت کے لیے اُن میرا سر۔۔۔۔۔ پھٹ جائے گا۔“ ایک سسکی لے کر آخر کار لیلیٰ خاموش ہوئی تھی۔

میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ میں اسے کیا بتاؤں، کیا سمجھاؤں۔۔۔۔۔ آخر اس کو سب کچھ نظر آیا نہیں نظر آیا تو میرا اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنا نظر نہیں آیا۔ میری آنکھوں میں اسے دیکھ کر جو روشنی تیرتی ہے، وہ اس نے آج تک کیوں نہیں محسوس کی۔ وہ اپنے ہی آپ میں اس قدر گرم رہی کہ مجھے ایک بار بھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی اور اب وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے میں اسے یہ احساس دلاؤں کہ ہاں واقعی وہ بد صورت ہے اور مجھے ناپسند ہے؟ وہ میرے ساتھ کہیں جانے سے کیوں کتراتا رہی اور کیوں وہ شادی کے بعد سے آج تک مجھ سے بے تکلف نہ ہو سکی؟ مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل رہا تھا مگر یہ جوابات میرے دل کو بوجھل کر رہے تھے۔ شاید لیلیٰ کو پھر سے نیند آگئی تھی اور میں بھی۔۔۔۔۔ میں بھی اب اپنے ہوش میں کہاں رہا تھا۔ مجھے آنسوؤں ہو رہا تھا لیلیٰ پر اس کی سوچ پر اور اس

سے نہیں زیادہ مجھے خود پر آنسوؤں ہو رہا تھا۔ اپنی محبت کی یوں رائگاں جانے کا دکھ۔ کیا وہ بھی نہیں سمجھ سکتی کہ میں نے یہ شادی محبت میں کی ہے۔۔۔۔۔ کیا وہ خود ترسی میں یہ بھی بھول گئی کہ اس رشتے کے لیے پہل میری طرف سے ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر اب تک کیا سمجھی اس نے محسوس نہیں کیا کہ میں اس کے عشق میں مبتلا ہوں؟

”مگر ابھی اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر لیلیٰ کو صبح ہوتے ہی گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے تو صرف لیلیٰ مجھ سے نظریں چراتی تھی اب میں بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ گھر پر ہمارا استقبال بہت خوشی اور جوش سے کیا گیا۔ رابعہ نے ہمارا کمر اچھر سے پھولوں سے سجایا تھا اور سب کے ساتھ چائے پی کر ہمیں ہمارے کمرے تک ای جان ساتھ آئیں اور بہت سی دعاں دے کر لیلیٰ کو بستر پر بٹھا کر مجھے اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ لیلیٰ بستر پر دراز ہو کر شاید پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔۔۔ مجھے اچانک کچھ یاد آیا تو میں پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ پھر تم سو جانا۔“ میں جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے سے ملحق چھوٹے سے اسٹور میں چلا آیا اور جلد ہی مجھے وہ ڈبائل گیا جس کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔۔۔۔۔ درمیانے سائز کا لکڑی کا یہ ڈبائیرے استعمال میں کچھ اس طرح رہا کہ میں اندھیرے میں بھی اسٹور میں اس ڈبے کو تلاش کرتا تو مل جاتا۔ لیلیٰ میرے کہنے پر بستر کے ہیڈ سے ٹکیہ نکالے بیٹھ چکی تھی۔۔۔۔۔ میں نے ڈبائے جا کر بستر پر الٹ دیا اور اس میں سے نکلنے والی چیزوں کو پھیلا کر خود بھی بستر پر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ بھی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ دیکھو۔ یہ ڈنگی۔ (بچوں کی کھلونا گاڑی) یہ تم نے مجھے چھٹی کلاس پاس کرنے پر گفٹ کی تھی۔۔۔۔۔ یاد آیا؟“ میں نے ایک چھوٹی سی پیپلے رنگ کی بس ڈنگی لیلیٰ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بتایا۔

”اور یہ لکڑی کا گھر۔۔۔۔۔ تم نے خود بنایا تھا اور یاد ہے تم نے یہ بناتے ہوئے اپنی انگلی پر ہتھوڑی مار لی تھی اور بعد میں مجھے دیتے ہوئے تم نے اپنی سوجی ہوئی انگلی

اور ابھی کچھ اور کہتا کہ میرے دن پر کال آنے لگی۔

صبح سے ہی جس، جس کو معلوم ہو رہا تھا وہ فون کر کے خیریت معلوم کر رہا تھا میں بہت سی کال نہیں لے رہا تھا مگر یہ میرا دوست یا سرتھا جس سے میں نے پچھلے دنوں لیلیٰ کو پاکستان کے شمال لے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر پھر لیلیٰ نے پروگرام کو آگے بڑھا دیا تھا، ظاہر ہے وہ میرے ساتھ کہیں بھی جانے سے کتراتے تھی۔ میں یا سرت کو اب تک مالتا رہا تھا اور وجہ بھی کچھ نہیں بتایا رہا تھا۔ میں نے فون اٹھایا..... ہمیشہ کی طرح یا سرت اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا اور لیلیٰ کی خیریت پوچھنے کے بعد ہمارے پروگرام کے بارے میں بات کرنے لگا کیونکہ اس کی بیوی بھی ہمارے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی جس کے اصرار پر وہ بار بار مجھے فون کر کے لیلیٰ کو منانے کی بات کرتا رہتا تھا۔ آج بھی جیسے ہی اسے لیلیٰ کی خیریت کا پتا چلا وہ پھر سے اپنے مقصد پر آ گیا تھا۔ میں نے پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر جب اس کا اصرار بڑھ گیا تو میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے آخر کار اسے ہولڈ پر رکھ کر لیلیٰ سے پوچھ لینے میں ہی اپنی جان بخشی تھی۔

”یا سرت ہے۔ وہ پوچھ رہا ہے کہ ہم لوگ کب تک شمالی علاقہ جات کے لیے نکلیں گے..... کیا کہوں؟ کیا کہہ دوں کہ ہم نہیں جاسکتے اسے جانا ہے تو خود ہی چلا جائے؟“ میں بلند آواز میں کہہ کر جیسے لیلیٰ کے جواب کو جانتے ہوئے پھر سے فون کان سے لگانے والا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

”آپ، آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ کو آفس سے چھٹی مل جائے گی؟“ لیلیٰ نے ہلکے سے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں..... میں مالک ہوں بھی..... چھٹی لے سکتا ہوں کبھی بھی.....“ میں نے امید برآتے دیکھ کر جوش سے جواب دیا۔

”تو پھر..... آپ کہہ دیں..... اگلے ہفتے نکل چلتے ہیں۔“ لیلیٰ یہ کہہ کر بھری ہوئی اشیا میں سے کلر پینل اٹھا کر کارڈ پر پہلے سے بنی ہوئی ڈرائنگ میں رنگ بھرنے لگی۔

اور یہ کارڈ اس میں تم نے پہاڑوں کا سین ڈرائنگ کیا مگر رنگ نہیں بھرے تھے، مجھے یاد ہے تم نے اس کارڈ کے ساتھ کلر پینل میں بھی دی تھیں اور مجھ سے کہا تھا کہ اس ڈرائنگ میں رنگ میں خود بھروں کیونکہ تم چاہتی تھیں کہ میں اس میں اپنی مرضی کے رنگ بھروں..... مگر میں نے اس کو ایسے ہی محفوظ کر لیا۔ ایک بار بھی میں نے اس میں رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میرا دل تھا کہ ایک دن ہم دونوں مل کر اس میں رنگ بھریں گے ایک دوسرے سے پوچھ کر ایک دوسرے کو سمجھ کر..... اور یہ دیکھو یہ گھڑی..... یہ تم نے ضیابھائی کی شادی میں پہنی تھی اور پھر اس پر پانی گر جانے پر یہ بند ہو گئی تھی تو تم نے اتار کر مجھے دی تھی کہ میں اس کو کسی گھڑی والے کو دکھا کر ٹھیک کر دوں۔ دیکھو میں نے اسے ٹھیک تو کروا لیا مگر تمہیں واپس نہیں کر سکا..... انتظار ہی کرتا رہا کہ تم کبھی مطالبہ کرو گی..... مگر تم نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی..... اور بھی چیزیں ہیں دیکھو، یہ دیکھو، یہ بھی دیکھو شاید تمہیں بھی چیزیں دیکھ کر کچھ یاد آئے؟“

لیلیٰ میرے کہنے سے پہلے ہی ہوسیدہ اور پرانی چیزوں کو اٹھا، اٹھا کر ذوق و شوق سے دیکھنے لگی تھی۔ اب میں ایک طرف ہو گیا تھا اور وہ پچھلی ہوئی اشیا سے ایک ایک چیز جن، جن کراٹھا رہی تھی میں جانتا تھا کہ اگر اسے مجھ سے واقعی محبت ہوگی تو اسے بھی ان چیزوں کے پیچھے چھپی ایک، ایک بات، ایک، ایک کہانی یاد آتی جائے گی..... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو وہ بار بار اپنی ہتھیلی سے پونچھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار بھی اسے نشو نہیں تھمایا۔ اس وقت وہ وہی چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی جسے میرے ساتھ بیٹھنے اور کھانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا..... میں جیسا چاہتا تھا لیلیٰ ڈبے سے برآمد ہونے والی چیزوں کا ویسا ہی اثر لے رہی تھی۔

”آپ نے، آپ نے یہ سب ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟“ کافی دیر چیزوں میں گم رہنے کے بعد آخر کار اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں چیزیں تو محفوظ کر لیں..... بس..... محبت ہی محفوظ نہ کر سکا.....“ میں نے بھی انفرودہ لہجہ میں جواب دیا

اف میں کنیا کرون

افشین نسیم



”بی بی.....! ایسے کبھی وزن کم نہیں ہوگا تمہارا۔ کھانا تم نہیں چھوڑ سکتی ہو نہ کم کر سکتی ہو، ورزش تم سے نہیں ہوتی، پوچا فرش پر پھیرتے تمہاری جان جاتی ہے، لے دے کے ایک یہ واک پگنی ہے جس کو کرتے تمہاری

”بھئی، نہیں ہوتی مجھ سے واک.....“ چوتھے چکر پر منال کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ وہیں قریب ہی نصب ایک سنگی بیسٹ پر یوں بیٹھی جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہو۔

ٹائلیں لٹ رہی ہیں۔ ”مکنی کو خوب ہی تپ چڑھی۔ اس کے اس طرح بیٹھنے پر..... سوکھری، کھری سنا دیں۔

”تم مجھے یہاں باتیں سنانے کے لیے لے کر آئی ہو.....“ منال نے خفگی سے خود سے دو سال چھوٹی بہن کو دیکھا۔

”نہیں، واک کرانے لائی ہوں جس کو کرتے تمہارا دم نکلے جا رہا ہے۔“

”کیا کروں.....؟ نہیں چلا جا رہا ناں مجھ سے۔“ منال نے بیچارگی سے بہن کو دیکھا۔ مکنی کو بہن پر پیار بھی آیا، ترس بھی۔

”یار، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ناں..... معلوم ہے کل جو خواتین آئی تھیں وہ بھی انکار کر گئی ہیں کہ لڑکی بہت موٹی ہے۔“ اس کے برابر بیٹھتے مکنی رسان سے بولی۔

”حالانکہ خود بھی پوری کی پوری ہتھنیاں تھیں۔ بیٹا بھی سائڈ ہوگا پورا..... لیکن لڑکی پتلی دہلی چاہیے۔“ منال غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولی۔ مکنی کی ہنسی چھوٹ گئی اس کے انداز پر.....

”تم مجھ پر ہنس رہی ہو۔“ منال کا پارہ مزید ہائی ہوا۔ ”تم نہیں، تمہارے تجزیے پر ہنس رہی ہوں۔“ مکنی بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم خود اپنے ایمان سے بٹاؤ، جتنا اور سب گھر والے کھاتے ہیں، اتنا ہی کھاتی ہوں ناں میں؟ بس لگتا صرف مجھے ہی ہے باقی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ مجھے تو لگتا ہے سب کے حصے کا مجھے ہی لگ جاتا ہے۔“ منال سخت دکھی تھی۔

”اچھا، چلو تم ٹینشن مت لو..... کوئی اور حل نکالتے ہیں اس مسئلہ کا.....“ مکنی نے تسلی دینے والے انداز میں بہن کا کندھا ہلکا ہتھ پھرایا۔

”میری وجہ سے تمہارا معاملہ بھی درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔“ منال نے کچھ شرمندہ، شرمندہ سے انداز میں مکنی کو دیکھا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر

ہلایا۔ ”میرا معاملہ نکلنے کی وجہ سے ہم ہر راتیں ہو۔“ مہر چاؤز وریا۔

”چلو، اٹھو، گھر چلیں امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ اس سے پہلے کہ منال مزید ڈپریشن میں جاتی۔ مکنی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ وہ دونوں چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی، گھر کے قریب واقع اس پارک سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

☆☆☆

چار بہن، بھائی تھے وہ..... سب سے بڑی منال اس سے دو سال چھوٹی مکنی، اس کے بعد سیف اور پھر سمیع..... ابو سرکاری ملازم، امی گھریلو خاتون، خوش باش، مسائل سے کوسوں دور چھوٹا سا گھرانہ تھا۔

بچپن میں منال ایک صحت مند بچی تھی جبکہ باقی تینوں صحت میں خاصے مانعے سے تھے۔ امی، ابو ان کی صحت بنانے کے چکر میں لپکنا ہوئے جاتے۔ ان تینوں کی صحت کو تو باوجود کوشش کے بہتر نہ کیا جاسکا۔ البتہ منال کی صحت کے حالات روز بروز ترقی کرتے چلے گئے۔

میشرک تک وہ اچھی خاصی موٹی ہو چکی تھی۔ کالج میں جا کر مزید بھیسیتی چلی گئی۔ اور اب تو دو سال ہونے کو آرہے تھے گر بچویشن کیسے بھی۔ ان دو سالوں میں وہ بے تحاشا موٹی ہو چکی تھی۔

امی، ابو کو اس کے مٹاپے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن پریشانی تب شروع ہوئی جب مکنی کی خالہ نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ مکنی بچپن سے ہی اپنے خالہ زاد ریحان سے منسوب تھی..... اب جبکہ ریحان.....

برسر روزگار ہو چکا تھا تو خالہ کی خواہش تھی کہ اس کے سر پر سہرا سجا دیا جائے۔ انہوں نے بہن سے تذکرہ کیا۔

بہن نے رسماً کچھ وقت مانگا۔ خیال تھا کہ پہلے منال کی شادی ہو جائے پھر مکنی کے بارے میں سوچا جائے اور سارا مسئلہ یہاں سے شروع ہوا۔ خاندان میں کسی نے منال کے لیے عندیہ نہ دیا۔ مجبوراً رشتے والی خالہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ رشتے والی اب تک کم سے کم پانچ فیملیوں لاپچی تھیں منال کو دکھانے کے

ماہنامہ جاسوسی طلحہ



مارچ کے موسم کی رنگینیاں
جاسوسی کے شمارے کی دلفریبیاں

وبائی دہشت

جرم کی شاندار منصوبہ بندی میں پوشیدہ ہولناک
بتابی کا ایک اور منصوبہ..... سنسنی خیز ناول کے
پے در پے واقعات..... **امجد رئیس**
کے قلم کی جادو بھری روانی.....

انکارے

دشمنوں کے قتلے میں اتنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پرکار۔ جوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

زندگی کی الجھنوں میں گرفتار ہو جانے
والوں کا المیہ۔ سرورق کی پہلی کہانی
وقت کی طغیانیوں پر چلنا آسان نہیں..... وہ ہر چال
کوڈ حال بنا رہا تھا..... سرورق کی دوسری کہانی

جینی نکتہ جینی

آپ کے تھرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور جی نئی دلچسپ باتیں... کتنا نہیں

سلسلے میں..... خواتین آتیں، کھاتی چٹتیں اور ہاتھ جھاڑ
کر یہ کہہ کر چلتی بقیں کہ ”لو کی موٹی بہت ہے۔“
اب کے صبح معنوں میں منال اور امی، ابوسمیت
سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ کتنا پیچیدہ ہے۔

منال ڈہرے احساس جرم کا شکار تھی۔ ایک طرف
اسے لگتا کہ جینی کی شادی میں تاخیر کا سبب محض وہ ہی ہے۔
دوسری طرف امی کی پریشانی، ہر وقت چہرے پر
لکھی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے تئیں وزن کم کرنے
کی کوشش کرنا چاہی مگر اس سے کسی بھی طریقے پر ٹھیک
طریقے سے عمل ہونے لگا۔

ڈانٹنگ بہ مشکل تین دن کر پاتی۔ پوچھا پھیرنے
کی کوشش کی تو دو دن ہی میں ہمت جواب دے گئی۔
ورزش کی تو ہفتہ بھر ٹانگوں کا درد ہی ٹھیک نہ ہوا۔ آخری
حربے کے طور پر جینی نے اسے گھر کے قریب واقع
پارک میں روز آدھے گھنٹے کی واک کے لیے راضی کیا۔
چراغوں، وہ چند دن بہ مشکل دس منٹ واک کر
پاتی اور دوبارہ آنے سے انکار کر دیا۔

تو مسئلہ حل ہوتا کیونکر ہو.....؟

☆☆☆

”میری اتنی سکھڑ بیٹی، ایک سے ایک بہترین
کھانا بنانا جانتی ہے۔ گھریلو امور میں طاق ہے۔ گھر کو
سجائے سنوارنے سے لے کر سلائی کڑھائی تک وہ کون
ساکن ہے جو اس میں نہیں ہے اور بس ایک مناپے کو
جواز بنا کر لوگ کیسے بے دردی سے انکار کر جاتے
ہیں۔“ وہ خاصی آزرہ تھیں۔ رشتے والی آپا کے
سامنے اپنی تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں۔

”میں بہن! آپ فکر نہیں کریں، اس بار اللہ نے
چاہا تو بات ضرور بن جائے گی۔ میں نے ان لوگوں کو
بتایا ہے کہ لڑکی تھوڑی موٹی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں
ہے، بس آپ دعا کریں اور اللہ سے اچھا گمان رکھیں۔“
رشتے والی آپا کی تسلی نے ان کے اندر دم توڑتی
امید کو از سر نو زندہ کر دیا۔

”بس آپا! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے.....“

کام بہن کیا تو ان شاء اللہ میں آپ کو جس دروں کی۔
وہ جوش سے بولیں۔
”ان شاء اللہ، ان شاء اللہ.....“ اس بار اللہ
آپ کو مایوس ہونے نہیں دے گا۔“ شمع بیگم نے صدق
دل سے آمین کہا۔
☆☆☆
وہ دو خواتین تھیں، ایک لڑکے کی ماں، دوسری ان
کی بہن یعنی کر لڑکے کی خالہ..... لڑکی کی ظاہری خوب
صورتی سے زیادہ انہیں سلیقہ مندی اور سکھڑا پاؤں کا رتھا۔
جس کا رشتہ والی آپانے انہیں سو فیصد یقین دلایا تھا۔
دوسری طرف منال تھی جو شادی طے پاتے ہی ایک
طرف تولد و جان سے ڈانٹنگ میں مصروف تھی ساتھ ہی
ساتھ صبح شام واک کے ساتھ ورزش بھی شروع کر دی تھی۔
حمی اسے دیکھ، دیکھ کر ہنستی۔
”یار، یہ تو کوئی جادو نہیں ہو گیا۔ کہاں تو تم کچھ
بھی نہ کر پاتی تھیں، کہاں یہ عالم کہ واک، ایکس سائز،
ڈانٹنگ سبھی کچھ ایک ساتھ شروع کر دیا ہے۔“ اور
منال جو اب بات بے بات مسکرائے جاتی، آج کل تو
مسکراہٹ ہی اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔
☆☆☆

”حیران کن، انتہائی حیران کن، مجھے یقین نہیں
آ رہا اونو۔“ (I can't believe)
آ نکھیں پھاڑے ویٹ مشین کو دیکھ رہی تھی۔ جو منال کا
وزن بارہ کلو کم بتا رہی تھی۔
”میرے خدا، منال اس امیزنگ یار..... تم نے
صرف دو ماہ میں بارہ کلو وزن کم کر لیا ہے۔ اور منال اس
کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔
”میں تو زیادہ سے زیادہ پانچ، چھ کلو تو قے کر رہی
تھی، اتنا تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔“ وہ خوشی سے
بے حال ہوئی جا رہی تھی۔
اب اسے انتظار تھا اپنے ہونے والے شریک
حیات کی فون کال کا جس کا نمبر اسے اس کی ہونے والی
مند نے دیا تھا۔ اور اس کا نمبر اپنے بھائی تک پہنچایا تھا۔
☆☆☆

”بہن، آپ کا گھرانا اور بچی دونوں ہی ہمیں بہت پسند
آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ بات کو آگے بڑھایا جائے۔“
شمع بیگم نے خوشی سے میاں کی جانب نگاہ کی جو
چپ چاپ ان کی بات سن رہے تھے۔
”اگر آپ لوگ برا محسوس نہ کریں تو میرا بیٹا باہر
گاڑی میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہے، اسے بلوایا
ہے، آپ بھی ایک نظر اسے دیکھ لیجیے..... اور وہ بھی
ایک نظر چچی کو دیکھ لے۔ آخر زندگی تو اس نے گزاری
ہے۔ ویسے بھی شرع میں اس کی اجازت ہے۔“ بات
مکمل کر کے انہوں نے جواب طلب نظروں سے شمع کو
دیکھا۔ شمع نے میاں کو..... دونوں کی نظریں ملیں اور شرع
کو جواب مل گیا۔
☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ
مارچ 2019ء



ناولٹ

طوافِ آرزو

طیب عنصر معمل

دوسرا حصہ

رمل کا آج عمر حسن کے آفس میں پہلا دن تھا۔ تھوڑی گھبراہٹ تو فطری امر تھا لیکن تعلیم نے اس کے اندر اعتماد کوٹ، کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی پوری محنت سے عمر حسن کی امیدوں پر پور اترے گی۔ آج رمل کا ہی نہیں ارمان کا بھی پہلا دن تھا آفس میں اور ارمان کا دماغ کچھ اور ہی منصوبے بنارہا تھا کہ جتنا ہو سکے برا اپریشن ڈالنا ہے پاپا پر تاکہ آفس سے تو جان چھوٹے۔ اب ہر روز اس کی کارکردگی کا تقابل مس رمل کے کام سے کیا جارہا تھا، ہر روز کی جھاڑ کے بعد اس کا بس نہیں چٹا تھا کہ اس رمل نام کی چیز مل کو وہ اپنی فرم سے اٹھا کر باہر پھینک دے۔



عمر حسن کے سامنے لار میں آئیں تو پہلے ہی اس کے کام پر بھروسہ تھا۔ اب جب تمام فائلز کو وہ چیک کر چکے تو انہوں نے اس کے سامنے ارمان کو سخت ست سنا دیں اور ساتھ ہی رمل کی دور اندیشی کی داد بھی دی جو ارمان کو سرتاپا سلگ گئی۔

”تو مسٹر ارمان حسن آج یہ تمام فائلز اور ان کا کمپیوٹر ورک جو خود آپ کے ہاتھوں پہلے لمبا میٹ ہو چکا ہے، آج کی رات آفس میں رہ کر ہی بالکل درست طریقہ کار سے تیار کرنا ہے۔ اور صبح مینٹنگ کے لیے بھی تیار رہیں۔ یہ پریزنٹیشن اب پیش بھی آپ کو خود ہی کرنا ہوگی۔“

”اور مس رمل حسن آپ اطمینان سے جا سکتی ہیں۔“ متانت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ اب رمل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ کانٹریکٹ ہمیں ملے پر آپ کو ڈبل پروموشن ملے گی۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں کہ آپ کی احتیاط پسندی کی وجہ سے ہم کل پیدا ہونے والی مشکل سے بچ گئے۔“ رمل نے ایک فاتحانہ نظر ارمان کے چہرے پر ڈالی تو اس کا جی چاہا کہ اس لڑکی کے حسین چہرے پر کھری مسکراہٹ کو جس نہں کر دے۔

☆☆☆☆

عمر حسن کے سینے میں صبح سے ٹھنن کا سا احساس تھا لیکن انہوں نے کوئی خاص پروا نہیں کی کیونکہ آج ایک خاص مینٹنگ تھی جسے وہ ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ارمان کو بھی آفس کے کام سے آؤٹ آف ایشن گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اب جبکہ وہ کام کے لیے خاصا سنجیدہ ہو گیا تھا اور پورا وقت آفس کو دیتا تھا تو عمر حسن کو کافی تسلی ہو گئی تھی۔ آفس میں اپنے روم میں پہنچ کر معمول کے انداز میں کافی منگوائی تو رمل بھی حسب معمول برفنگ کے لیے آگئی۔ باس سے برفنگ لیتے ہوئے وہ ان کی بدلتی کیفیت پر چونکی۔ عمر حسن کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار اور ماتھے پر پسینے کے قطرے پہلی نظر میں محسوس ہو گئے تھے۔ رمل نے دوڑ کر پانی کے جگ میں سے گلاس بھرا اور انہیں پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ پانی پی نہیں پارے تھے انہوں نے اب اپنے سینے کو مسلنا شروع

اور اس بات میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہ دوئوں عمر حسن کے آفس میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ارمان جھکے سر سے بھی رمل کو کھاجانے والی نظروں سے دیکھ ہی لیتا تھا جبکہ رمل کا چہرہ بھی غصے سے تپا ہوا تھا لیکن وہ ارمان کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ عمر حسن اپنے سامنے بڑی فائلز پر نظر آتے حروف اور ہندسوں سے نظر اٹھاتے اور دوئوں کو چاچتی نظروں سے تولتے، ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

در اصل فائلز ورک مکمل کر کے رمل کو کمپیوٹر سیکشن میں دینا تھا اور اس نے دن رات ایک کر کے تندی سے پریزنٹیشن تیار کی تھی اور ارمان نے پوری تنگ و دو سے اس کے کام کی ایسی کی تھی کر ڈالی تھی۔ یہ پریزنٹیشن کل کی مینٹنگ میں عمر حسن نے ارمان اور رمل کے ساتھ مل کر پیش کرنی تھی۔

ارمان نے منصوبے کے مطابق سارا الزام رمل کے سر ڈال دیا تھا۔ شروع دن سے پاپا کے منہ سے رمل کے کام کی تحریفیں ارمان کو تنور پر ہی بٹھائے رکھتی تھیں۔ اوپر سے اس کے کام میں سے نقص (جو وہ جان بوجھ کر کرتا تھا) کا خلاصہ بھی عمر حسن، رمل کے سامنے ہی اکثر کیا کرتے تھے۔ اس وقت رمل کی آنکھوں میں ناچتا مسخر اور ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ پڑنا چہرہ اسے مزید چڑا دیتا تھا۔ آج کے منصوبے کا رزلٹ اسے پکا لگ رہا تھا کہ رمل کی بے عزتی پکی ہے کیونکہ عمر حسن کام کے معاملات میں بہت سخت تھے۔ وہ اپنے سامنے بڑی فائل پر سے نظر اٹھا کر اب دوئوں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور پھر خلاف توقع انہوں نے رمل کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ باپ کی آواز پر ارمان جو باہر بھگنے کو بالکل تیار تھا ایک دم رک گیا۔

رمل کی ایک اچھی عادت آج اس کی خوش قسمتی بن گئی تھی۔ وہ سارے فائل ورک کی ایک کاپی اپنے پاس لازمی رکھا کرتی تھی۔ اور آج جب سارا الزام ارمان نے رمل پر ڈالنا چاہا کہ رمل کے فائل ورک کی غلطی کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے تو رمل نے اپنے پاس موجود فائلز باس

کر دیا۔ رمل کے دماغ میں فوراً خطرے کی گھنٹی بجی، اس نے جلدی سے ایبویٹنس کال کی اور دیگر کولیکٹرز کو بلوایا۔ ایبویٹنس کے آنے تک آفس ورکرز نے عمر حسن کو ابتدائی طبی امداد دینے کی کوشش جاری رکھی۔ رمل نے ان کے گھر پر اطلاع دی اور ایبویٹنس میں ان کے منتقل کیے جانے پر وہ خود بھی اس ایبویٹنس میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ خطرناکی انداز میں عمر حسن کے شفیق چہرے کو دیکھ رہی تھی جو اب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔

انہیں انجاناً کا ایک ہوا تھا بروقت اسپتال پہنچنے اور بروقت تشخیص نے ان کا علاج ممکن بنایا۔ رمل اللہ کی رحمت کی صورت اگر انہیں فوری اسپتال نہ لاتی تو شاید وہ جانبر نہ ہو پاتے۔ شائل تو اطلاع ملتے ہی اسپتال آگئی تھی۔ تھوڑی دیر تک زیریں آپا، منائل اور مشعل بھی آگئی تھیں۔ آئی سی یو کے باہر ان چاروں کے ساتھ رمل بھی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں دعا کیں پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے، زرین آپا نے استفسار انداز میں شائل سے اس کے بارے میں پوچھا۔ شائل جو ایک دو دفعہ رمل سے مل چکی تھیں جب عمر حسن سے کام کے سلسلے میں اسے گھراتا پڑا تھا۔ آج تو وہ اس کی احسان مند تھی کہ وہ بروقت انہیں اسپتال لے آئی تھی۔ تین دن انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تو وہ تقریباً مسلسل یہاں تھی۔ بس تھوڑی دیر کو گھر جاتی۔

تین دن بعد عمر حسن کو کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ رمل نے بعد اصرار شائل کو گھر بھیجا کہ وہ تھوڑا آرام کر لے۔ ”آئی سی یو آپ گھر جائیں، آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے یہاں میں ہوں اور منائل، مشعل بھی آ جاتی ہیں۔“ وہ رسانیٹ سے شائل کو سمجھا رہی تھی اور یہ کہتے ہوئے شائل کو وہ بالکل منائل جیسی لگ رہی تھی۔

شائل گھر چلی گئی تھیں۔ عمر حسن اس وقت دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں تھے۔ جب ارمان نے دروازہ کھولا تو رمل کرسی پر بیٹھی اوکھ رہی تھی۔ ایک کتاب اس کی گود میں اونٹھی رہی تھی شاید وہ بہت دیر سے اسی حالت میں بیٹھے، بیٹھے سوئی تھی۔ ارمان دبے قدموں پایا کے

پاس گیا، ان کے ہاتھ پر پیار کے تھوڑے دیر انہیں غور سے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ سے ان کے بالوں میں ہاتھ بھیرا اور پھر ایک بے ساختہ نظر رمل پر ڈالی۔ کرسی پر بے خبر ... بیٹھی یہ لڑکی اس کے دل میں اترنے لگی، بند آنکھوں سے اس کی دراز پلکیں اس کے گالوں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ کالے سیاہ بال اس وقت اٹکھے ہوئے تھے لیکن دوپٹے سے لگی دراز چوٹی کرسی سے نیچے لٹک رہی تھی سادہ اور شفاف چہرہ کسی بھی قسم کی مصنوعی آرائش سے پاک تھا۔ گلابی ہونٹ آہستہ، آہستہ لرز رہے تھے بل میں ارمان کے دل کی دنیا پلٹ گئی۔ نظروں کا ارتکاز تھا کہ رمل نے ہڑبڑا کر اپنی گھور کالی آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

”آپ..... آپ کب آئے ارمان سر.....؟“
دراصل مجھے پتا نہیں چلا اور میں شاید سوئی تھی۔ سوری سر.....“ اس کے جملے بے ربط تھے۔

اس سے پہلے کہ ارمان کوئی جواب دیتا منائل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور ارمان کو سامنے دیکھ کر جھٹ اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ارمان پیار سے اس کا سر تحکیم رہا تھا۔ رمل دور کھڑی اس منظر کو دیکھتی اور حسرت سے دیکھ رہی تھی اُردھتے کتنے خوب صورت ہوتے ہیں اور زندگی میں ان رشتوں کا ہونا کتنا حوصلہ دیتا ہوگا۔ اس نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

علی حسن بھی کینیڈا سے واپس آ گئے تھے اور ان کی تینوں بیٹیاں میکے آ کر ان کی پٹی سے لگ گئی تھیں۔ صدقے دیے جا رہے تھے، علی حسن ایکسٹنٹ ہونے کی وجہ سے بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے وہ تو بھلا ہوا اس ایک پاکستانی نوجوان ارمان کا کہ اس نے انہیں اسپتال پہنچایا اور علی حسن کے نایاب خون کے لیے اپنے خون کا فوری عطیہ بھی دیا۔ یوں تو علی حسن کے اپنے گاڑی زخمی تھے لیکن بروٹس میں ارمان نے جس طرح سے اپنے بیٹوں کی طرح ان کا خیال رکھا تو جہاں اُن کے دل میں جگہ بنائی وہیں اس خواہش نے مزید شدت اختیار کر لی کہ کاش ان کا بھی کوئی بیٹا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ

ایک چھوٹے قصبے کے پرانے مکان میں رہائش پزیر ہیں۔ آیا۔ بی کا کہنا تھا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ کوئی تو ہو جسے نکل کا پتا ہو، جو اس کا خیال رکھ سکے۔ وہ دل کی مانتا تو نکل سے ایک پل بھی دور نہ رہتا لیکن وہ ہر بات و ماغ کی ماننے لگا۔ جہاں اس کا سیاسی کیرئیر شروع پکڑ رہا تھا وہیں اس کے گھر بیٹیوں کی پے درپے ولادت نے اسے بد دل کر دیا تھا۔ دوسری شادی کا تو سوال بھی نہ اٹھتا تھا کہ رخسار آپ کی ہاں بھی اولاد دینے نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس خاندان کو کسی کی بددعا لگ گئی ہے۔ علی حسن نے آیالی کو ہر ماہ ایک معمول رقم بھجوانی شروع کر دی تھی۔

نکل نے اس دن سے آیالی کو اماں تو نہیں کہا مگر اماں کی کہنا شروع کر دیا۔ نکل کو اماں سے ماں والی کوئی انیسیت اور لگاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس کا اعتبار گویا ہر انسان، ہر رشتے سے اٹھ گیا تھا۔ وہ عجیب بے حسی کا شکار ہو گئی تھی۔ مٹی پر وہ پہلے بھی توجہ نہ دیتی تھی اب اور بھی بے پروا ہو گئی تھی۔ ٹکھنوں ایک ہی جگہ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔

”نکل بیٹا ہوش کرو..... اپنے لیے نہیں تو اس بچی کے لیے ہی کسی..... اس کو تمہاری توجہ کی ضرورت ہے۔ مجھے ماں مت سمجھو اپنی آیالی ہی سمجھ کر بات کر لیا کرو.....“

آیالی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات لگ گئی۔

”کیا بات کروں اماں!.....؟ میرے اندر سناٹے اتر گئے ہیں لگتا ہے کہ سب دھوکا ہے۔ ہر آواز، ہر چہرہ، ہر رشتہ سب فریب ہے یہاں کب کون کیا نکلے کچھ علم نہیں..... کس کا اعتبار کروں؟ مجھے چپ ہی رہنے دیں۔ بولی تو شاید جی نہ پاؤں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ جلدی سے ان کے پاس سے اٹھ گئی کہ ہماری چپ کو غنیمت سمجھو..... بولے تو قیامت ہوگی۔

☆☆☆

وقت کا پیہرا رکتا نہیں ہے چلتا رہتا ہے اور مٹی یعنی رمل اب جوانی کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی کہ اماں کی کپاٹک موت نے آہستہ آہستہ نکل کی بے حسی کی برف کو پگھلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش

لیکن اولاد دینے سے محروم رہے۔

نکل بے شک ان سے دور تھی، وہ اس کے بعد اس سے نہیں ملے تھے لیکن یہ بات وہ جان گئے تھے کہ نکل کے ہاں بھی ایک بیٹی ہی نے جنم لیا ہے۔ گوانہوں نے اس دن اس سے کبھی نہ ملنے کا عہد کیا تھا لیکن اس دل کا کیا کرتے..... اپنی طرف سے تو اس کے دل میں اپنی نفرت اتار آئے تھے لیکن اپنے دل سے وہ اس کی محبت کو نہ نکال سکے۔ ان دنوں جب وہ انگلینڈ کے سرکاری دورے پر تھے تو واپسی پر اُن کو پتا چلا کہ جس بنگلے میں انجنین آراہتی تھیں وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ اس بنگلے میں رہنے والے تمام افراد بنگلے کے ساتھ ہی جل کر رکھ ہو گئے تھے لیکن علی حسن کے خاص آدمی الطاف نے انہیں بتایا کہ ”سائیں دو لڑکیوں اور دو بی مردوں کی لاشیں ملی تھیں۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر علی حسن کو اطلاع دی اور ساتھ ہی اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی شرط پر بتایا کہ دراصل وڈے سائیں نے اس معاملے کو سیمپل پر دفن کر دیا تھا اور پولیس فائل بھی بند کر دادی تھی۔ الطاف کے اس بیان نے علی حسن کے چہرے کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔ ضبط کی شدت سے آنکھوں میں مرنی آگئی۔

”الطاف کھوج لگاؤ اس ہمارے معاملے کی کہ جو زندہ ہیں وہ کہاں ہیں الطاف۔“

”جو حکم سائیں۔“ کہہ کر وہ اگلے قدموں دروازے سے باہر نکل گیا۔

الطاف نے اس دن سے معلومات یعنی شروع کر دیں اس کی معلومات کے مطابق مرنے والی دونوں لڑکیاں نائمہ اور رائمہ تھیں۔ انجنین آراہنی حالت میں اسپتال میں زیر علاج تھیں۔ اس کا چہرہ جھلس کر ناقابل شناخت ہو چکا تھا اور وہ اپنی شناخت چھپا بھی رہی تھی کہ تاکہ وہاں سائیں کو اس کے بچ جانے کا معلوم نہ ہو سکے۔ نکل کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ علی حسن اپنے حواس کھودیتا اگر آیالی نے اسے فون کر کے یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ لوگ

کرنے لگی تھی۔ گزرتے وقت نے یادوں کے آئینے پہ
دھول جمائی تو اس نے زخموں پہ بھی مرہم رکھنا شروع
کر دیا تھا۔ دل جب تک خیریت سے گھر نہ آ جاتی تھی تو
ایک عجیب بے چینی گھیرے رکھتی اور جب دل گھر آ جاتی
تو دل اپنے آفس کی اوروں دستوں کی باتیں کرتی اور اس کو
بھی بولنے پہ اکساتی..... بکل تھوڑی بہت باتیں کرتی اور
دھیرے، دھیرے مسکراتے ہوئے اس کی سنتی رہتی۔

آج جب دل نے اسے اپنی دوست کی منگنی میں
چلنے کو کہا تو وہ صاف انکار کر گئی..... اس کی چپ نے دل
کو ہراساں کر دیا اسے لگا کہ وہ پھر سے اپنے خول میں
واپس چلی گئی ہے بکل نے بیٹی کے چہرے پر اتنی مایوسی
اور ملال کو دیکھا تو اس کے دل میں اچانک ممتا کا سمندر
ٹھا نہیں مارنے لگا۔ اس نے دھیرے سے دل کو گلے
سے لگایا تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی..... اور تھوڑی دیر
بعد بکل کے آنسو بھی دل کے بالوں کو نم کرنے لگے۔ بہت
دیر تک دونوں کے آنسو نہ تھے لیکن ان آنسوؤں نے
بکل کے اندر جے بے جی کے کلیشہ کو پگھلا دیا۔

”چل ہٹ پگلی..... ضرور جاؤں گی تیرے
ساتھ..... اٹھو اپنے اور میرے کپڑے پر پریس کر دو.....“
بکل نے اپنے آنسو صاف کرتے اس کا سر تھپکا۔

”جی اماں.....“ دل نے جلدی سے ماں کے سینے
سے سر ہٹایا اور بے یقینی سے بولی۔ اس کے چہرے پر
بارش کے بعد کی قوس قزح کے رنگ بالکل ویسے ہی تھے
جیسے بکل کی آنکھوں میں اترے تھے۔



بڑا شاندار سا گھر تھا..... اگرچہ علاقہ بہت ہی
ایلیٹ کلاس کا نہ تھا..... لیکن اچھا صاف ستھرا ٹاؤن
تھا..... گھر کے باہر بہت سی گاڑیوں کے ساتھ دل نے
اپنی (آفس سے ملنے والی) گاڑی پارک کی اور ماں کے
ساتھ سچ، سچ قدم اٹھا کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔

اگرچہ فی الحال منگنی کی تقریب تھی لیکن اندر باہر
شادی جیسی پہل پہل تھی۔ دل کی دوست ماہین نے اس
کا والہانہ استقبال کیا۔ بکل خاموشی سے بیٹھی خوب

صورت سے سجے لاؤنچ کا جائزہ لے رہی تھی۔ چھوٹی سی
تقریب تھی بس گھر کے افراد تھے۔ ماہین نے تقریبی دو قی
کی وجہ سے دل کو نوٹائٹ کیا تھا۔ بکل کی ملاقات ابھی گھر
والوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اتنے میں... جب وہ وقت
گزاری کے لیے لاؤنچ میں تھی تصویروں کو دلچسپی سے
دیکھ رہی تھی۔ اس کی اچھٹی نظریک دم ایک تصویر پر آ کر
رک گئی۔ یہ ایک مسکراتے ہوئے نوجوان کی بلیک اینڈ
وائٹ تصویر تھی۔ جس نے اس کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ
دیر وہ دور سے منگنی کی باندھے تصویر کو دیکھتی رہی۔ اتنے
میں ماہین کی ماں کی آواز نے اس کا ارتکاز توڑا۔

”یہ تصویر جس کو آپ اتنی محویت سے دیکھ رہی
ہیں۔ یہ میرے تایا سرسفر از احمد کی ہے بیچارے جوانی
میں ہی جان لیوا حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے
اور.....!“ شاید وہ اور بھی کچھ بتا رہی تھیں مگر بکل تو
وہیں صوفے پر بے ہوش ہو کر ڈھیر ہو گئی۔

”ماہین ڈاکٹر کو بلا لو.....“ دل، ماں کے ہاتھ پیر
مسل رہی تھی۔ ہوش میں نہ آتی ماں کو دیکھ کر وہ چلاٹھی۔
”ارے بلانے کی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹر گھر
میں ہی موجود ہے۔“ ماہین کا تایا زامیر اپنا فرسٹ ایڈ
بیک لے کر جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”آپ تھوڑی دیر کو سائڈ پر ہو جائیں تو میں آنٹی کو
چیک کر لوں۔“ اس نے دل کو کہا۔ دل نے بادل ناخواستہ
ماں کا ہاتھ چھوڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میسر نے بکل کو چیک
کیا اور پھر ایک انجکشن لگا دیا۔ مڑ کر دل کے ہوائیاں
اڑتے چہرے پر نظر ڈالی اور تسلی آمیز لہجہ میں بولا۔

”کافی کمزور ہیں اور لگتا ہے کہ کسی اچانک شاک
نے انہیں بے ہوش کر دیا..... آپ فکر مت کریں ابھی
ہوش میں آ جائیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا
لیکن اس کا سارا دھیان دل کے ستے ہوئے معصوم
چہرے پر تھا۔

”پلیز آپ لوگ میری امی کو گاڑی تک پہنچا دیں
تا کہ میں ان کو گھر لے جا سکوں..... ماہین کا کنٹیکشن میری
وجہ سے خراب ہو، یہ بہت برا لگے گا مجھے۔“ دل نے میسر

جب سب سے پہلے ہوا تو وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسی لڑکی تھی۔
پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ ساری عمر کا غبار تھا جو آنسوؤں
میں دھل رہا تھا۔

☆☆☆

”عمر، اب ارمان کے لیے میں نے لڑکیاں دیکھنی
شروع کر دی ہیں۔“ شامل نے کھانے کی ٹیبل پہ اپنی
جانب سے دھماکا کیا تھا۔

لیکن عمر حسن کی بے نیازی عروج پر تھی ان پر تو گویا
اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ میں سے
چاول میسٹے میں یوں مصروف تھے گویا دنیا کا سب سے
ضروری کام ہو۔

”عمر! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے جس کا جواب
آپ پر ادھا رہا ہے۔“ اب کے وہ ذرا خشکی سے بولی تھی۔
”سن لیا پیاری بیگم! لیکن لگتا ہے کہ آپ اب
بوڑھی ہو گئی ہیں دماغ کے ساتھ ساتھ آپ کی قریب کی
نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔“ عمر کے لہجے میں مصنوعی تشویش
بھری تھی۔ جبکہ ارمان وہاں اس طرح بیٹھا کھانا کھا رہا تھا
جیسے اس کی نہیں محفل والوں کی بات، ہوری ہو۔

”اس میں بھلا میری نظر کی کمزوری کہاں سے آگئی
عمر۔“ شامل نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

”بھئی سیدی سی بات ہے یہ جو مجھ پر اکثر ہمارے
گھربائی جاتی ہیں اور آپ کو تو اتنی پیاری ہو چکی ہیں کہ اگر
دو دن بھی آپ ان کا دیدار نہ کریں تو بولا لی، بولا لی پھرتی
ہیں، مجھے تو لگا کہ آپ کو ارمان کے لیے جوتی چٹائی کی
ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ اور وہ بہت مناسب لگی ہوں گی
آپ کو ارمان کے لیے..... کیوں میاں صاحبزادے؟“

”جی، جی، مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“ ارمان نے
بوکھلا کر باپ کی سمت دیکھا۔

”اُف، آپ رمل کی بات کر رہے ہیں عمر؟“ شامل نے
پُر جوش ہو کر کہا۔ ”آپ نے تو میرے دل کی بات جان لی۔“
”دیکھ لیجیے بیگم صاحبہ ہم تو آپ کو اتنا ہی زیادہ
جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ویسے پھر یہ لڑکیاں دیکھنے کا کیا
سلسلہ ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے شامل کو پیار

”کیسی فیروں جیسی بات کر دی تھیں رمل..... ہم
آئی کو اندر بیڈروم میں لٹاتے ہیں اور کوئی فنکشن خراب
وراب نہیں ہو رہا۔ ایسا تو گھر میں کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا
تھا تو کیا گھر والوں کو باہر نکال دیتے۔“ ماہین نے رمل کو
گھبراہٹ آمیز انداز میں ڈانٹا۔

دونوں نے رمل کو رمل کو بیڈ پر لٹادیا اور رمل، ماں کے
پاس پیچھے کر بے تابی سے ان کے ہوش میں آنے کا انتظار
کرنے لگی۔ ماہین نے بھی کہا کہ رسم سے پہلے تک وہ بھی
رمل کے ساتھ ہی رہے گی۔ رمل کو ہوش آیا تو ماہین کی می بھی
وہیں تھیں۔ انہوں نے ایک گہری نظر رمل پر ڈالی۔ ایسا لگتا
تھا کہ وہ کچھ، کچھ بھڑھری ہیں۔ خدا، خدا کر کے رمل کو ہوش آیا
تو اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور شرمندگی سے اٹھنے کی
کوشش کرنے لگی لیکن کمزوری نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

”اے، اے، لٹی ریپے ابھی آپ کو آرام کی
ضرورت ہے۔“ لیکن رمل کو یک دم جیسے کچھ یاد آگیا تو اس
نے بے تابی سے رمل سے اپنا پرس مانگا۔ رمل نے حیرانی سے
ماں کو دیکھتے ہوئے ان کا پرس اٹھا کر پکڑا دیا۔ رمل نے بہت
بے تابی سے پرس کو کھول کر اس میں سے جلدی سے ایک تصویر
نکال کر ماہین کی می کو پکڑائی۔ اب کی بار سکتے میں جانے کی
باری ان کی تھی۔ تصویر میں سر فراز احمد کے ساتھ انابلی یعنی
عالیہ ظفر ذہن کے روپ میں مسکرا رہی تھیں۔

☆☆☆

تویوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ڈرامائی موڑ نے بالآخر
رمل کو اپنے گھر تک، اپنے باپ کے گھر تک پہنچا ہی دیا۔
آئی تو وہ رمل کی سہیلی کی سہیلی میں تھی لیکن قسمت نے اس کو
اپنے باپ کی سہیلی سے ملوایا تھا۔ اتنا تو سر فراز کے بھائی
بھی جانتے تھے کہ سر فراز نے ایک عالیہ نام کی لڑکی سے
کورت میرج کی تھی لیکن اس کے آگے کی کہانی سے وہ
بے خبر تھے کیونکہ اس کے بعد سر فراز کی لاش ہی گھر آئی تھی
اور اس کے بعد انہوں نے وہ غلط بھی جلد ہی چھوڑ دیا تھا۔
لیکن رمل کے چچا اب رمل کو گلے لگائے رو رہے تھے اور
رمل حیرانی سے سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ چچا نے

بحری نظروں سے دیکھا۔

”ارے وہ تو میں نے محض تمہید باندھی تھی ورنہ میں ہی کیا مثالیں اور مشعل بھی رمل کو ہی منتخب کر چکی ہیں۔“
شمال نے غلٹ دکھائی۔

”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات ہم بالائی بالا طے کر ڈالیں۔ رمل اور اربان کو خود ایک بار کھل کر بات کر لینی چاہیے تاکہ رمل اپنی آبادی سے اپنی والدہ کا عندیہ لے لے، تو ہی ہم اس کا تھما سکتیں گے۔“ عمر نے شمال کو بھجایا۔
”جی بالکل! آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ شمال کو شوہر کی بات مناسب لگی۔

”تو کیوں صاحبزادے؟ آپ رمل سے بات تو کر لیں گے نا؟“

”بالکل پاپا! آپ فکر مت کریں..... صرف بات نہیں کروں گا بلکہ ہاں لے کر ہی دم لوں گا۔“ وہ جلدی، جلدی بولا تو دونوں نے اسے گھورا اور پھر یک دم مل کر قہقہہ لگایا تو اربان نے منظر سے غائب ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔

☆☆☆☆

آج آفس میں آنے کے بعد رمل کو میٹنگ کے لیے مثال ریسٹورنٹ کال کیا گیا۔ بیچ ٹائم شیڈول تھا وہ فوراً روانہ ہو گئی۔

راتے میں داسن کوہ کے خوش کن نظاروں سے لطف اندوز ہوتے، ہوتے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ سرسبز وادی کی بلندیوں پہ واقع اس خوب صورت ریسٹورنٹ پہ پہنچ گئی..... اس کا خیال تھا کہ شاید ریسٹورنٹ کا اندرونی ڈائننگ ہال میٹنگ کے لیے ریزروڈ ہوگا لیکن ویرا سے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔
ویرا کی معیت میں وہ اوپن اسٹریٹ پر حیرانی سے جہی تو ویرا نے ایک کارز پر ریزروڈ کے کارڈ والی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ ٹیبل اس وقت بالکل خالی تھی۔
آس پاس کی کرسیوں پہ کوئی براجمان نہیں تھا۔ اس نے کندھے اچکائے۔
”شاید میں جلد آگئی ہوں ابھی تک کوئی بھی نہیں

آیا۔“ وہ بڑبڑائی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اس کا راز پر بیٹھ کر وہ گہرائی میں نظر آتے اسلام آباد اور تاحہ نظر بکھرے ہزاروں کو دیکھ کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگی.....
وہ ان حسین نظاروں میں شاید گھنٹوں کھولی رہتی۔ جیسی اس کی حیویت کو ”السلام علیکم“ کی آواز نے یک دم توڑ دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی پشت پر اربان کھڑا تھا۔ اربان، کا یہاں ہونا رمل کے لیے معمول کی بات تھی ظاہر ہے کسی بھی میٹنگ میں اس کی شمولیت ضروری امر تھا۔ وہ باس کے احترام میں کھڑی ہوئی تو اربان نے اسے جلدی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود بھی اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور بلا تمہید شروع ہو گیا۔

”دیکھیے محترمہ! اگر آپ کسی غلط فہمی میں ہیں کہ ابھی اس میٹنگ میں کسی تیسرے کی تشریف آوری متوقع ہے یا کوئی چوتھا فرد بھی اس میٹنگ کا حصہ ہوگا تو آپ کی غلط فہمی میں پہلے ہی درود فرما دوں کہ ایسا سین ہرگز کوئی نہیں ہے۔“ وہ سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
”تو پھر یہ کون سی میٹنگ ہے جو صرف ہم دونوں کے درمیان آفس میں نہیں ہو سکتی تھی اور آپ کو مجھے یہاں بلانا پڑا؟“ رمل نے بھوئیں اچکا کر تکی سے جواب دیا۔

”یار! میں اپنے والد محترم کے خلاف باضابطہ طور پر بغاوت کرنے والا ہوں اور ان کی تمام جائیداد پہ جلد قاضی ہو جاؤں گا، اس سلسلے میں تمہارے ساتھ مل کر سازش کرنی تھی اس لیے آپ کو یہاں بلانے کی سنگین غلطی سرزد کر بیٹھا۔“ وہ تپتے ہوئے لہجے میں سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”کیا..... آپ یہ کرنے والے ہیں اور اس سب میں آپ نے مجھے شامل کرنے کا سوچا بھی کیسے؟ آپ کا خیال ہے کہ اس گھٹیا کام میں، میں آپ کا ساتھ دوں گی۔“ رمل۔ انگارے چباتے ہوئے لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میم..... پلیز بیٹھ جائیں یہاں کوئی سین کری ایٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہی گھماڑ ہوں جو دو جمع دو پڑھنے والی محترمہ کو پروپوز کرنے کے لیے ایک یادگار رو میٹنگ جگہ کا انتخاب کر بیٹھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس

”میرا مطلب یہی ہے۔“ رمل نے بے ساختہ کہا۔
”تو ملائیں ہاتھ۔۔۔۔۔“ ارمان نے اس کی طرف

یوں بے نیازی سے ہاتھ بڑھایا گویا شادی کی بات نہ ہو
کوئی مذاق ہو جس کی وہ تائید چاہ رہا ہو۔ رمل نے ہاتھ
آگے بڑھایا اور ارمان جو اس کا ہاتھ تھامنے والا تھا اس کا
ہاتھ خلا میں ہی رہ گیا۔ رمل نے جھپٹ کر ٹھٹھی ڈبیا کو ڈیش
بورڈ سے اٹھایا اور جھٹ سے پرس میں ڈال لیا۔ ارمان
نے ڈھلوانی سڑک پر ایک دم گاڑی کو بریک لگائے اور
ٹھٹھک کر رمل کو دیکھنے لگا۔

رمل نے اس سے نظریں ملانے کے بجائے باہر
دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر دونوں اسی پوزیشن میں
بیٹھے رہے، رمل ٹھٹھی باندھے بظاہر بے نیازی سے گاڑی
سے باہر کے مناظر میں گم تھی اور ارمان کو انہوں سے ہوا ہاتھ
کہ وہ اتنی بار اس کے سامنے آتی رہی اور اس نے اس
کے دیدار سے فیض کیوں نہیں اٹھایا۔

ضد ہی ضد میں اس کو بی بی چالا کو، بی جالو اور چچی
کے خطاب دینے والا ارمان آج تو کیا بہت پہلے ہی اس
خوب صورت ترین لڑکی کی مصیبت پر دل ہار بیٹھا۔ اب
جبکہ برداشت نے جواب دے دیا تو اس نے رمل کے
ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ رمل نے چونک کر اس کی طرف
دیکھا تو ارمان کے چہرے پر چاہتوں کا ایک جہان آباد
تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوقی کے رنگ نے رمل کے
چہرے کو گلاب کر دیا۔۔۔۔۔ اور اس نے شرما کے سر جھکا دیا۔

”تو پھر میں سمجھ جاؤں کہ لڑکی نے ہاں
کر دی۔۔۔۔۔“ ارمان گنگنایا، رمل نے ماحسوس انداز میں
ارمان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”میرے خیال میں یہ باتیں بڑوں کے درمیان
طے پائیں تو زیادہ اچھا ہے اور۔۔۔۔۔ اور میں اپنی امی سے
بات کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔“

”اچھا! تو لڑکی پھر میری انگوٹھی واپس کر وہ کس
خوشی میں اپنے پرس میں ڈال لی ہے چورنی۔۔۔۔۔“ ارمان
نے اس کے پرس کے اسٹریپ پہ ہاتھ رکھا تو رمل نے

بیبی ہاتھ دال کر ایک ہی دھپ اور دوسری دھپ
میں انکی ایک گلاب کی ادھ کھلی کلی نکال کر میز پر پھینکنے کے
انداز میں رکھی۔

رمل ایک جھٹکے سے کرسی پر گرنے والے انداز
میں بیٹھی۔ یہ بات تو کر بھی اس کے دماغ میں نہیں آ سکتی
تھی کہ ”مسٹر ارمان حسن بقول رمل کے سڑ“ رمل کو پو پو
کر رہے تھے اور وہ اتنے رویٹک انداز میں۔۔۔۔۔ اس کا
دماغ سانس، سانسیں کرنے لگا اور پھر تھوڑی ہی دیر
اسے اپنا پسندیدہ شخص جاری کرنے
میں۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ اب حال یہ تھا کہ وہ زور شور سے آنسو
بہا رہی تھی اور ارمان نشو باکس سے ٹشو نکال، نکال کر اسے
پکڑا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ متوجہ ہو جاتے، ارمان
نے غصے میں اس کا بازو پکڑا اور کھینچتے ہوئے لے جا کر
اپنی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بٹھا۔ رمل مزاحمت کرنے
کے بجائے ساکت ہوئی تھی۔ روانی سے بیٹھتے ہوئے
آنسو بھی رک گئے تھے۔ ارمان دروازہ ایک جھٹکے سے بند
کر کے دوسری طرف سے گھوم کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ
پر بیٹھ کر گاڑی کو واپس اسلام آباد کی جانب موڑ دیا۔

رمل جو دوبارہ سے سسکنے لگی تھی ایک دم رک گئی۔
”میری گاڑی وہ تو وہیں رہ گئی۔۔۔۔۔“ وہ منمنائی۔

”کچھ نہیں ہوتا رمل بی بی آپ کے ہوائی جہاز
کو۔۔۔۔۔ میرا ڈرائیور لے آئے گا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ
مجھے اتنا ناپسند کرتی ہیں۔“ اس نے ٹھٹھی ڈبیا کو ڈیش بورڈ پر
رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے، میں آپ کو اتنا ناپسند نہیں
کرتی۔“ رمل نے بیچارگی سے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔! اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے اتنا
نہیں لیکن ناپسند تو کرتی ہیں ناں۔۔۔۔۔ جھٹکس فار
انفارمیشن۔۔۔۔۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”نہیں، نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو
بالکل بھی ناپسند نہیں کرتی ہوں۔“ وہ روہا ہی ہوئی۔

”تو یوں کہیے کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔“ اس
نے دبی شرارتی مسکراہٹ کو اپنے بھرے، بھرے

کے لاکھ اصرار پر بھی رمل کے باپ اور اس کے خاندان کے بارے میں تفصیلات نہیں بتائیں۔

ارمان ایک چمکرے مورت بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ جذبات جن کو ختم لیے ابھی زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا۔ لگتا تھا کہ ان پہ برف پڑ گئی ہو۔ تھوڑے دن پہلے اسی جگہ جہاں اس نے رمل سے پہلی بار محبت کا اعتراف کیا تھا اور اس کو پایا تھا اگر معلوم ہوتا کہ آج اسی جگہ وہ اسے کھونے جا رہا ہے تو بھی رمل کی فرمائش پر آج منال ریسٹورنٹ نہ آتا۔ بلکہ آج آتا ہی کیوں؟ وہ ساکت نظروں سے رمل کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بس بولے جا رہی تھی۔

”میں نہیں چاہتی ارمان کہ ہم کوئی بھی بات ایک دوسرے سے چھپائیں۔ اور بعد میں پتا چلے کہ ہماری زندگی بے اعتباری کی نذر ہو۔ ہم ایک دوسرے سے نظر چرائیں۔“ رمل نے اپنی ذات سے وابستہ سچائیاں پر تدر پر ت ارمان کے سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ارمان کے لیے ان کا جاننا بہت ضروری ہے۔

”زندگی میں محبت بہت ضروری ہوتی ہے بہت اہم لیکن عزت تو زندگی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹوں۔“ اس نے دھیرے سے ارمان کے ہاتھ پانپانا رک سا ہاتھ دھرا۔

”ارمان!..... تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا مجھے بغیر شکایت کے منظور ہوگا۔ لیکن یہ بات تمہیں ابھی ڈیسا ایڈ کرنا ہوگی کہ تمہاری زندگی میں کس چیز کی اہمیت ہے، میری محبت کی یا دنیا کی باتوں کی۔ اپنی ترجیحات کا تعین ابھی کر لو تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔ کوئی بھی سچ کسی جھوٹ کے رنگوں سے ڈھانپا نہیں جاسکتا۔ جھوٹ کے کچے رنگ پہلی پھوار سے ہی اتر جاتے ہیں ارمان..... میں تمہیں آزاد چھوڑتی ہوں۔ اس بات کے لیے کہ تم محبت اور دنیا میں سے جسے چاہو جن لو.....“ رمل نے اپنے گرم ہاتھوں کے نیچے ارمان کے لمحہ بہ لمحہ سرد ہوتے ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں چھوڑ دیا لیکن ارمان کی طرف سے پُر امید نظروں سے دیکھا۔

”تو یہ ہے کتنے تجویں ہیں آپ چیز دے کر واپس نہیں لیتے۔“ رمل نے کھسکا کر کہا۔ دونوں پرس کو اپنی طرف کھینچنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ نتیجتاً اسٹریپ ارمان کے ہاتھ میں اور پرس رمل کے ہاتھ میں رہ گیا۔ تھوڑی دیر کو دونوں ساکت ہوئے اور پھر دونوں کے مشترکہ قہقہے پر خوب صورت مناظر، پہاڑوں اور فضاؤں نے بلانیں لیں۔

☆☆☆

”ای آپ اتنی خاموش کیوں ہیں آپ کو اگر اعتراض ہے تو میں سر ارمان کو منع کر دوں گی، وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھی نہیں لائیں گے۔“ رمل نے گل کو گم سم بیٹھے دیکھ کر بے تاب سے کہا۔

اس نے ارمان کے پروپوزل کے متعلق ماں کو بتا دیا تھا۔ رمل نے کچھ بھی کہنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ حالانکہ وہ دونوں پہلے کی طرح دور، دور، دور نہ تھیں بلکہ بہت بے تکلف ہو چکی تھیں۔ رمل اپنی سکون میں تھی کہ اسے اپنے خون کے رشتے بھی مل گئے تھے اور رمل کو اس کی طرف سے ایک اچھے علاقے میں معقول گھر بھی مل چکا تھا۔ زندگی میں کچھ ٹھہراؤ اور سکون در آیا تھا۔

”میرا خیال ہے رمل اب وہ وقت آ گیا ہے کہ کچھ سچائیاں اور بھی ہیں جو میں تمہیں بتا دوں جن کا جاننا تمہیں ہی نہیں ارمان کے لیے بھی ضروری ہے اور اس کے والدین کے لیے بھی.....“ رمل کی آواز اتنی کمزور اور پست تھی کہ لگتا تھا وہ کسی گہرے کنویں سے بول رہی ہو۔

رمل نے اپنا ہاتھ ماں کے ہاتھ پر رکھ کر یوں تھپتھپایا جیسے وہ اس کو یقین دہانی کر رہی ہو کہ وہ اس کے سچ کو پورے سچ کی صورت سننے اور ارمان تک پہنچانے کو تیار ہے۔ یہ الگ بات کہ انجانے راز جب راز سے آگاہی تک کے درمیان ہوں تو انسان برزخ میں کھڑا ہوتا ہے۔

رمل نے انجمن آرا سے اپنی ماں اور اپنی ماں اور باپ کی تمام داستان اس کے گوش گزار کر دی لیکن رمل

جیسے ابھی وہ لپے گا۔ ”مختصر یہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے، رمل یہ زندگی ہم نے گزارنی ہے، اس کے سچ لوگ کہاں سے آگئے۔ فارگیت اٹ!“ کہہ کر وہ اپنی اس کے ہاتھ تمام لپے گا ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔۔۔

لیکن ارمان.....! ارمان تو گویا ایک پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ لفظ کہیں کھو گئے تھے لیکن اس کے چہرے پر پھیلے دردناک اثرات رمل کو وہ باتیں بھی سمجھا گئے جو ارمان کے ہونٹوں نے ادا بھی نہیں کی تھیں۔ اس کی خاموشی اور جلد خاموشی رمل کے ہر سوال کا جواب دے گئی۔

یہ جو تم کو سارے سوال آتے ہیں ان کا واحد جواب میں ہی تھا رمل نے جلدی سے بیک سے کھلی ڈیبا نکالی اور میز پر رکھ کر ارمان کی جانب کھسکا دی۔ ارمان کی نگاہیں خداؤں میں تھیں، چہرے پر لمبی محسن کا احساس تھا۔ لیکن اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر کھلی ڈیبا کو دیکھا لیکن چپ تھی کہ ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ رمل نے جلدی سے سر کی کھسکا کر خاموشی سے اٹھتے، اٹھتے ایک مہر جھائی ہوئی کلی بھی ٹیبل پر رکھی اور پیچھے دیکھے بغیر چلتی چلی گئی۔ آنسو آنکھوں کے کناروں پر بے تاب کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے کالا چشمہ چڑھایا اور جلدی سے ریسیٹورنٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اب وہ مکمل کے روکتی تھی اور آج اسے سارے کا سارا رو لینا تھا تا کہ پھر وہ کبھی زندگی میں ارمان کے لیے زندہ رہے، محبت کے لیے آنسو نہ بہائے۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

شکل تو کم صم سر پکڑے بیٹھی تھیں اور ارمان کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔ محبت تو دل سے رخصت ہوئی تھی یا نہیں مگر یہ کیا تھا کہ نفرت بھی نہیں جاگئی تھی۔ تو پھر وہ کیا تھا جو محبت پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ اتنا بھی شاید۔۔۔۔۔۔ وہ محبت کی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر پابا تھا۔ ایسے بس یہ تھا کہ اسے طوائفوں سے شدید نفرت تھی۔۔۔۔۔۔ اور عورت کا یہ روپ اس کے لیے ہمیشہ سے بہت بدصورت رہا تھا۔

”میرے خیال میں ارمان بیٹا جذباتی ہوئے بغیر

سوچو تو آپ بہتر انداز میں فیصلہ کر سکتے ہو، مجھے اچھا لگا کرل نے تمام سچائی آپ کے سامنے رکھ دی تھی۔ سوچو کتنا مشکل رہا ہوگا اس کے لیے یہ سب تمہیں بتانا۔ وہ چاہتی تو یہ باتیں آپ سے چھپا بھی سکتی تھی اور ضروری نہیں تھا کہ آپ کو ہر بات کا خود ہی علم ہو جاتا لیکن اس نے پوری دیانت داری سے کام لیا۔“ عمر حسن نے ارمان کو سمجھانا چاہا۔

”لیکن پاپا میرا دماغ یہ بات قبول ہی نہیں کر پا رہا کہ اس کی ماں ایک طوائف کی بیٹی بن کر پٹی اور رمل کی پیدائش بھی اسی طوائف کے گھر پر ہوئی، جمل آنٹی ایک شریف خاندان کی بیٹی ہیں میں مان بھی لوں تو رمل کا باپ کون ہے یہ بات آخر رمل کی امی کیوں بتانے پر تیار نہیں ہیں۔ ایسے میں رمل کو اپنی زندگی کا سہمی چنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ ارمان نے اپنے اندر کی محسن کو باہر نکالا۔ اب کے شامل نے کسمسا کر ارمان کو دیکھا۔

”ارمان یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوئی کہ ہم نے کس کے گھر پہ پیدا ہوتا ہے، اب یہ تمہاری چواکس نہیں تھی کہ تمہیں عمر حسن کے گھر پیدا ہونا پڑے یہ ہمارے بھی بس کی بات نہیں تھی کہ تمہیں دنیا میں لاتے یہ طے کرتے کہ ہمیں ارمان حسن چاہیے یا منامل یا مشعل حسن۔۔۔۔۔۔ یہ وہ فیصلے ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے طے کر دیے ہوتے ہیں اور ہم۔۔۔۔۔۔ ان معاملات میں بے بس ہیں۔“ شکل جو کم گو تھیں اس وقت دھواں، دھواں چہرے کے ساتھ دلائل دیتے ہوئے ان کی آواز رندہ لگی تھی۔ عمر حسن نے پُرستائش انداز میں بیوی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

”لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔۔۔۔۔۔ میرا دماغ اس سب کو قبول نہیں کر رہا ہے، مجھے آپ لوگ اکیلا چھوڑ دیں تاکہ میں بغیر کسی دباؤ کے سوچ سکوں۔“

”بالکل! لیکن صاحبزادے ہر نفرت کا کوئی جواز بھی ہوتا ہے۔ ہم تم پر کوئی زبردستی نہیں کر رہے ہیں جب دل سے اور دماغی طور پر تم اس رشتے کو نہیں اپناتے ہم تمہیں اپنے فیصلے کا پابند تو نہیں کرتے لیکن یہ یاد رکھنا کہ بہر حال اس گھر کی بھورل ہی بنے گی ورنہ تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔“ عمر حسن کے لہجے میں قطعیت اتر آئی تھی۔

کھتے، کھتے رک گئی اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھ عترتیں بلا جواز آپ کے دل میں ڈیرا بجا بیٹھتی ہیں، ارمان بھی تھیابی میں وہ جواز ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے اتنی نفرت کیوں تھی طوائف زادیوں سے۔ اور یہ ڈھونڈنے کی بات تھوڑی تھی، یہ بات تو اس کے سامنے دھری تھی۔ پھوپھو کا آنسوؤں سے ترچرہ..... پھوپھو کی بے اعتنائی اور عمر حسن کے جتن اور ان سب پر حاوی دس عورت کا چہرہ جو بظاہر بہت حسین تھا لیکن درحقیقت بے حد مکروہ..... یوں تو اس واقعے پہ وقت کی دھول پڑ چکی تھی۔ پھوپھو اب اپنے گھر میں خوش و خرم تھیں لیکن ارمان کے بچپن میں ہونے والے اس واقعے نے پھاس کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ کس طرح پھوپھو حال سے بے حال اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر آگئی تھیں۔ سال بھر وہ اپنے بھائی کے در پر بڑی رہی تھیں تو اس کی وجہ ایک طوائف ہی تھی جس کے جلوؤں کے دام میں الجھ کر پھوپھو اپنی باوقافیہ کو بھلا بیٹھے تھے..... پھر وہ.....

بدصورت دن جب پھوپھو کنوڑس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا تو عمر حسن نے اس طوائف کو بالائی بالا ڈھیروں پیسے دے کر پھوپھو کی جان چھوڑنے کا وعدہ لیا تھا اور یہ سب ارمان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب وہ عمر حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر شیطانی منواری تھی تو اس کے مکروہ انداز ایسے تھے کہ پردے کے پیچھے کھڑے ارمان کا دل گھبرا رہا تھا کہ کہیں عمر حسن کو وہ اپنے دام میں نہ پھانس لے۔ اس کا بے ہودہ انداز اور گندالہا سب ارمان کی برداشت سے باہر تھا۔ پھر جب عمر حسن نے اسے پیسے دیتے ہوئے پھوپھو کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کو کہا تو اس عورت کا ناز و ادا سے یہ کہنا کہ ہم طوائفوں میں ایک بات بڑی اچھی ہے کہ ہم وعدے کی پکی ہوتی ہیں۔ جائیں صاحب آج سے آپ کی بہن کا

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء (78)

میاں ہم نے واپس لیا۔“ یہ واقعہ ختم ہو گیا تھا اس دن..... لیکن ارمان کے معصوم ذہن پر یہ سب جیسے چھاپ چھوڑ گیا۔ اس کے لیے دنیا میں اگر عورت کا کوئی بدصورت ترین چہرہ تھا تو وہ تھی طوائف.....

شاید عمر حسن جان گئے تھے کہ غلطی کہاں ہوئی تھی۔

☆☆☆

”پھوپھو جان اب آپ کی صحت بہت بہتر ہے، آپ کا بلڈ پریشر بھی بالکل نارمل ہے، چلیں آج کہیں کھونے چلتے ہیں۔“ سمیر نے محبت سے نکل کو دیکھتے ہوئے بٹاشت سے کہا۔ نکل نے ایک پیار بھری نظر سمیر کے چہرے پر ڈالی اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر..... بے نیازی سے نی وی دیکھتی رل کو دیکھا۔

”ارے بیٹا میں گھر میں ہی کچھ اچھا سا بناتی ہوں، باہر جا کر کیا کروں گی۔“ نکل اٹھتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں پھوپھو جان آج ہم تینوں باہر جائیں گے، آپ کی بالکل نہیں چلے گی۔ میں تو جانتا تھا کہ آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ رہیں لیکن رل کی ضد نے کام خراب کر دیا۔“

کلمجے کپڑوں اور نکھرے بالوں میں بھی رل کا حسن دوا آتش تھا۔ وہ اس وقت نی وی پر نظریں گاڑے ہوئے تھی لیکن دماغ میں وہ ڈنکن جاں ارمان براجمان تھا، کبھی جھگڑتا تو کبھی مدھم سرگوشیاں کرتا۔ اپنے نام پر ہڑبڑا کر اس نے سمیر کی طرف دیکھا۔

”کہاں گم ہو رل..... جلدی سے فریش ہو جاؤ پھر راول جھیل چلتے ہیں۔“ سمیر نے مسکراتے ہوئے اس کے حسین چہرے کی بلا میں لے ڈالیں۔

”میں امی کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ قطعیت سے روکھے لہجے میں بولی۔

”اوہ..... تو آپ نی وی میں اتنی گم ہیں کہ آپ کو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ پروگرام تو بنا ہی آپ کی امی کے لیے ہے تو کیا خیال ہے چلنا پسند کریں گی۔“ سمیر نے امید بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

رل نے تھکے، تھکے انداز میں ماں کے چہرے پر

اب ایڈوانس سیلری حاصل کریں 20 لاکھ روپے تک!



خصوصیات:

- مارکیٹ میں انتہائی مناسب ریٹ
- کوئی پیشہ و چارہ نہیں
- آسان اقساط
- تین تین پر سینگ
- حکومتی کے بعد فوری ادائیگی
- فلاحی رعایت

اہمیت:

- NBP کا ڈسٹ رکھنے والے وفاقی مصوبائی تنظیم سرکاری تنگنوں اور خود مختار اداروں کے ملازمین
- NBP کے ذریعے اپنی تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔

DON'T WAIT TO LOSE WEIGHT

وزن گھٹائیں
خوبصورت و تندرست ہو جائیں

ہر دس میں سے دو افراد
موٹاپے کی وجہ سے دل کی بیماریوں
میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔



ہر دس میں سے چار افراد
موٹاپے کی وجہ سے ذیابیطس کا
شکار ہو جاتے ہیں۔



ہر دس میں سے چار افراد موٹاپے کی وجہ سے
کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔



Phytolacca e baccis 10
10 drops thrice a day



Phytolacca americana 3x
1 tablet thrice a day



Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.



Partner
Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.

Original Medicines of Schwabe Germany, easily available
now at all Homoeo Pharmacies

<https://reading-caretofup.net>

ہوئے بھی دوسرے کے راستے دشوار کر دیتے ہیں، انابی کے ایک غلط قدم نے مجھ سے ہی نہیں، میری رمل سے بھی اس کی خوشیاں چھین لی ہیں، کاش وہ ایسا نہ کرتیں، یہ داغ، داغ چادر نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے جس چادر کو انابی نے اوزھا تھا۔ آج رمل جو اتنے سالوں سے ان کے لیے ایک ماں کی طرح سایہ بنی رہی صابروشا کر، آج وہ ان کی ضدی بیٹی بن گئی تھی۔ آج جب انہوں نے اس کو بتایا کہ وہ میر کے لیے ہاں کرنے والی ہیں تو وہ روئی نہیں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فقط اتنا بولی۔

”مجھے ہی سزا کیوں؟ آپ نے جو یہ محبت کا لمبا جوگ رکھا ہے اس کا کیا؟ آپ کیا سمجھتی ہیں محبت صرف آپ پر واجب تھی جو میں نے کی اس کا کیا؟“

”میرا معاملہ اور تھا رمل..... میں اکیلی نہیں تھی میرے ساتھ تم تھیں میری بیٹی..... اور تم سمیر اور ارمان میں سے ایک کو چننے میں تامل کیوں کر رہی ہو، ارمان تو تمہارے ماضی کو جان کر منہ موڑ گیا جبکہ سمیر سب جان کر بھی تمہیں اپنا نا چاہتا ہے، پیار کرتا ہے تم سے، خون ہے وہ میرا۔“

”تویوں کہیں ناں اماں کہ وہ آپ کا بھتیجا ہے اس لیے آپ کا ووٹ اس کی طرف ہے، آپ نے ساری عمر خود غرضی میں گزاری ہے اور اب بھی آپ صرف اپنے فیصلے پر ہی عمل کر داری ہیں تو ٹھیک ہے میں ہاں کر دیتی ہوں لیکن میں اپنے دل کو اپنے داغ کے تابع نہیں کر سکتی تو آپ کے باپ کے تابع کیسے کروں گی..... نہیں زور چلتا میرا اس پر..... نہیں مانتا ہے دل میری بات..... وہ صرف ارمان مانگتا ہے، صرف ارمان۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔ بچل نے اسے چپ کر وانے کی کوشش نہیں کی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

محبت تو کب سے رنجی ہے
سانسوں سے مہک نہیں جاتی
ابھی لفظوں میں جادو ہے
کیوں چاہت بکھر نہیں جاتی

کھلتی مسکراہٹ کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
”بس دس منٹ میں فریش ہو جاؤں گی۔“ اس نے اپنے لہجے کو زبردستی خوشگوار بنایا۔
”واہ بھئی! ایسی خاتون پہلی بار دیکھی جو دس منٹ میں فریش ہو سکتی ہیں۔“ سمیر نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ تو بچل اور رمل دونوں ہنس پڑیں۔ اور سمیر اس کی سی کی جلتے رنگ پر ہنسا ہو گیا۔

☆☆☆

سمیر کا آنا جانا روز کا معمول بن گیا تھا اور اب تو رمل کو بھی لگتا تھا کہ سمیر کا شوخ انداز اگر گھر بھر میں خوشی نہ پھیلاتا تو شاید وہ ڈپریشن کا شکار ہو کر بیمار ہو جاتی۔ وہ غیر محسوس انداز میں گھر کے فرد کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جس دن نہ آتا بچل فوراً اس کے گھر کا پروگرام بناتی۔ لیکن یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سمیر کے والدین اس کا رشتہ طلب کر لیں گے۔

”رمل میں جانتی ہوں کہ پیار کو دل سے رخصت نہیں کیا جاسکتا اور عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھلاتی ہے لیکن بہر حال عورت کو زندگی گزارنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور جب کوئی مرد عورت کو عزت سے اپنا بنانا چاہے وہ بھی اپنے والدین کی رضا و رغبت سے تو سمجھو کہ وہ عورت دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوتی ہے، مجھے لگتا ہے کہ سمیر تمہارے لیے بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگا۔“ بچل نے رمانیت سے رمل کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

رمل بند آنکھوں میں دبے آنسوؤں کو روک کر نہ سکی تو کل بھی اپنی گود میں گرتے ان آنسوؤں کی نمی سے بے خبر نہ رہ سکی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ گود میں سر رکھے لٹیٹی بیٹی کے آنسو ماں کی گود کو نم نہ کرتے، بے بسی سے بچل نے آسمان کی طرف دیکھا اور وہ آہ بھری۔ محبت کے دکھ سے نا آشنا کبھی وہ جو ان آنسوؤں کو سمجھ نہ پاتی۔

☆☆☆

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر تپتے میں جذب ہو رہے تھے، زندگی اتنی مشکل کیوں ہے، ہم نہ چاہتے

ہے، بے رحمی، بے عرس ہوتی ہے، من سے اس کو مطلب نہیں ہوتا میرا صاحب یہ بھی مشرک نہیں ہوتی، یہ بھی وحدانیت پر یقین رکھتی ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور سمیر شکستہ قدموں سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔ مرد کو شراکت کہاں راس آتی ہے؟ نہیں ناں!.....

☆☆☆

پروین کو رمل نے پچھلے دنوں ہی ملازم رکھا تھا۔ ڈور بیل کی آواز پر وہ بچکن سے نکل کر باہر کی طرف پلکی۔ بیل کی طبیعت پچھلے ہی دنوں سے خراب تھی، رمل نے آفس سے چھٹی لٹی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔ جب پروین نے اسے کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ بے دلی سے اپنے کپڑوں کی سلوٹوں کو ہاتھ سے درست کرتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ بالوں کو ہاتھ پر پلیٹ کر جوڑے میں سمیٹا۔

”یقیناً اماں کی کوئی واقف کار ہوں گی۔“ وہ سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو شائل آئی کو دیکھ کر خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”اوہ مائی گاڈ! شائل آئی آپ یہاں.....؟“ (وہ ارمان کے اس دن کے روتے کے بعد شائل آئی سے بھی ملنے نہیں جاسکتی تھی۔) وہ ہرگز ارمان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج انہیں اپنے گھر پر دیکھ کر خوشگوار سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس پر۔

”رمل تم بالکل بھی اچھی بیٹی نہیں ہو، اچھی بیٹیاں ایسے تھوڑی کرتی ہیں کہ اتنے ڈھیر سارے دن شکل بھی نہ دکھائیں۔“ رمل کو پیار کرتے ہوئے شائل نے شکوہ بھی کر ڈالا۔

”سوری آئی! میں بس آج کل میں چکر لگنے والی تھی۔ اصل میں امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بس تب سے کہیں آنا جانا ہی نہیں ہوا۔“ تھکی، تھکی آواز اور آنکھوں کے گرد حلقے اس کے غم کی داستان شائل کو بتا رہے تھے۔

”ارے تو کم از کم فون پر اطلاع تو کر دیتیں مجھے کہ تمہاری امی بیمار ہیں۔ چلو مجھے اُن کے پاس لے چلو ان کی عیادت بھی کروں اور ان سے ملاقات بھی

ہو جی! انھوں نے رمل کی کسی بھی نصیحت کو ٹون پر دیکھ، دیکھ کر زپر لب پڑھے جا رہا تھا۔ آخر کو ماشی کے ایک گم گشتہ قصبے کا موازنہ وہ اس معصوم لڑکی سے کیوں کر رہا تھا۔ یہ لڑکی جو کسی جینینے ہی مقدس تھی اس کا تقابل وہ اس عورت سے کر رہا تھا جو عورت کے نام پر گلی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا مجھے کہ میں نے اسے اس جرم کی سزا دی جو اس کی ماں کا بھی نہیں تھا۔ آخر اتنا کھٹور کیوں ہو گیا تھا میں۔“ اگلے پل اس کا ہاتھ رمل کے نمبر پر ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ اس کی کال بھی انیڈ نہیں کرے گی۔ لیکن وہ بے خبر تھا اسے نہیں پتا تھا کہ جس وقت وہ اس کو ٹیکسٹ کر رہا ہے اسی وقت وہ اس کو کال کر رہی تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

☆☆☆

رمل کی نظریں ٹی وی پر تھیں لیکن سوچیں کہیں اور کا سفر کر رہی تھیں۔ وہ سمیر کو اپنے اور ارمان کے بارے میں سب سچ سچ بتا چکی تھی اور اس کو کہہ چکی تھی کہ اگر وہ اس کو ارمان کی سوچوں سمیت قبول کرنے کو تیار ہے تو اس کی طرف سے ہاں ہے، سمیر کو لگا ایک پل میں اس کی رگوں سے خون نچر گیا ہو، ایسا تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ محبت میں شراکت مرد بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی بھی صرف عورت میں رکھی ہے، اسی لیے تو مرد کو بی چار شادیوں کی اجازت ہے۔ سمیر کو تو کچھ لمحے لگے فیصلے کرنے میں.....

”میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں رمل، کاش تم یہ سب مجھے نہ بتاتیں تو کیا ہو جاتا..... ارمان تو یوں بھی تمہاری زندگی سے جا چکا تھا۔“ وہ مرد لہجے میں بولا۔ تو رمل چیخ پڑی۔

”کس نے کہا وہ جا چکا ہے، وہ میرے دل میں ہے، دماغ میں ہے، اس کی یادیں میری رگوں میں ابوبن کر دوڑتی ہیں، اگر تم اعلیٰ ظرف نہیں ہو تو میں بھی منافقت بھری زندگی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ بھی کسی اور کا بھی نہیں ہوگا۔ محبت ایسی ہی ہوتی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت

شمارہ مارچ 2019ء
کی جھلکیاں

محسن اردو

وہ غیر مسلم تھا لیکن اس کا حکم تھا اسلامی کتب چھاپنے
سے پہلے تمام موزود و ضرور کر لیں۔ علماء کی دنیا میں
انقلاب برپا کر دیئے والے کا زندگی نامہ

شخصیات جذبات

فنی دنیا کے ایک تابندہ ستارے کی داستان جہد مسلسل

اتفاق

لوگ جسے بد قسمتی سمجھتے ہیں وہی ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے

کالا جادو

یورپ میں کالا جادو کس طرح مقبول ہوا، لکچر معلومات

کرب آشنائی

وہ سفید خون والے رشتے داروں میں گھری ہوئی تھی

اس کی عورت

بہت سی جج بیائیاں، سچے قصے اور تاریخی حقائق۔

ایسی تحریریں جو سرگزشت کی پہچان ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود

گر دیدہ ہو جائیں گے۔

ہو جائے گی اسی بہانے پر یہ تو آج میں تمہارے پیار
میں یہاں نہ آ جاتی تو تم نے تو ہمیں بالکل ہی پر ایسا ہی کر
ڈالا تھا رمل.....“

”ہمیں آنٹی، ایسا کچھ نہیں ہے بس موسم بدل رہا
ہے تو بخار ہو گیا تھا۔ میں آپ کو بتا کر پریشان کیا کرتی،
چلیے میں آپ کو امی سے ملوانی ہوں۔“ شائل کو ساتھ لے
کر وہ بجل کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”امی شاید واش روم میں ہیں، آنٹی آپ بیٹھیں میں
ابھی آتی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل کر کچن میں آئی تو پروین
وہاں نہیں تھی۔ یقیناً نماز پڑھ رہی ہوگی سوچ کر وہ جلدی سے
ٹرائی سیٹ کرنے اور چائے کا پانی رکھنے میں مصروف ہو گئی۔

ادھر کمرے میں سے رمل کے جاتے ہی بجل واش
روم سے وضو کر کے نکلی تو سامنے صوفے پر بیٹھی شائل نے
سلام کرنے کو منہ کھولا تو آدھا سلام منہ میں ہی رہ گیا۔
ادھر شائل کا سلام ادا ہوا تھا ادھر بجل کی آنکھوں میں بھی
شائستگی کی چمک ابھری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی
طرف بڑھیں اور پرتپاک انداز میں گلے لگ گئیں تھیں۔

رمل نے جلدی سے کباب اور کنکس فرائی کیے۔
بسکٹ اور کیک پیس ٹرائی میں رکھ کر ناقہ انداز میں ٹرائی
کا جائزہ لیا تو ہر چیز مکمل تھی۔ ٹرائی لے کر جب وہ بجل کے
کمرے میں داخل ہوئی تو حیرانی سے دونوں خواتین کو
دیکھا جنہیں دیکھ کر لگتا تھا برسوں پرانی سہیلیاں ہوں، وہ
مسکرا کر آگے بڑھی۔

”مجھے پورا یقین تھا شائل آنٹی اتنی ہی فریڈی
ہیں، اب تک آپ کو دوست بنا چکی ہوں گی۔ اسی لیے
مجھے تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“ وہ
بہتے ہوئے شائل کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بولی تو
شائل نے بھی محبت سے اسے گلے لگا لیا۔ اندر کے ملاں
زدہ موسم کی ٹھنکن میں کچھ امید کے بادل نظر آنے لگے تو
تینوں کی آنکھوں میں برسنے والی بارش کے قطرے بھی
جمع ہو رہے تھے۔

☆☆☆

”میں ایک بات سب کو بالکل صاف طور پر بتا رہی

... منہ پر سے ہاٹ کر اس مہاری گھر سے پیسے کی بے شمار
وہ بھی ماں ہو کر.....“ زریں پچھو جو مشعل کی بیٹی کو سلا رہی
تھیں شرارت سے ارمان کو دیکھتے گفتگو میں حصہ لیا۔
”واہ پچھو! آپ تو کمال کی چہرہ شناس ہیں۔“
منائل نے جی رانی سے منہ کھولا۔

”منائل میں کبھی تمہیں تو پتا ہوگا شمر..... (منائل کا
شوہر) نے مجھے بتایا کیا دکھایا تھا جب میں اس کے ساتھ
کلینک گئی تھی تو پتا چلا کہ ارمان میاں تو بڑھی پر گول گپے
کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی ہیں، کبھی پچھو کو تو نہ
کھلائے ارمان میاں۔“ پچھو نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔

”ارے پچھو آپ بھی ناں.....!“ ارمان نے سر
کھجایا لیکن دونوں ہمیش اپنی، اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھیں
باتھوں میں ایک، ایک کٹن بھی تھا اور اب ارمان کو اس
کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ باہر کو دوڑے لیکن یہ کہنا
ہرگز نہیں بھولا۔

”میری شادی ذرا جلدی کروادیں امی زریں پچھو تو
فیس بک والی پچھو کی طرح میری جاسوسی کر رہی ہیں، یہ نہ ہو
میری شادی درمیان میں رہ جائے۔“ وہ باہر کو لپکا، پیچھے
خواتین کی کھلکھلاہٹ کو بھی تو بچوں نے رونا شروع کر دیا۔

☆☆☆

ارمان کے ہونٹوں پر دھیمی مسکان تھی اور نظر باتھ
میں پکڑے قیمتی موبائل کی اسکرین پر تھی۔ وہ جو کافی دیر
سے رمل کو دوا لہانا میسج کیے جا رہا تھا ان کے جواب میں وہ
بس منہ چڑانے والے ایسوی میسج بھیج رہی تھی اور اب جبکہ
اس نے اس سے ملنے کے لیے ضد کی تو اس نے خوب
صورت نظم لکھ بیچی.....

ابھی وہ وقت نہیں آیا
تم کرنا تعریف جی بھر کر
میرے عارض پہ پلکوں کی
کبھی رخسار کی جاناں
کبھی پھولوں سا نہیں کہنا
کبھی گھنیری زلفوں کی
انہیں ناگن بھی کہہ دینا

ہوں کہ رات تک میں نے ہر گھنٹے میں کن مائی
نہیں کی نہ ہی مدخلت کی۔ لیکن ارمان کی شادی اگر ہوگی
تو صرف رمل سے..... میں اس گھر میں کوئی اور بہو نہیں
لاؤں گی۔“ شائل نے قطعیت سے کہا تو منائل اور مشعل
نے بھی ماں کی تائید میں سر ہلایا۔

”سن چھوٹو! تجھے اتنی اچھی لڑکی تو گھاس بھی
نہیں ڈالتی یہ تو سمجھو لو تمہاری نیک بہنوں کی دعائیں
ہیں کہ گھر بیٹھے ایک بہترین لڑکی بیوی کی صورت مل رہی
ہے۔“ منائل نے اپنے گل گو تھنے سے بیٹے عبداللہ کو کھانا
کھلاتے ہوئے کہا۔ جو کھانا کم کھا رہا تھا اور گرا زیادہ رہا تھا۔
”ایسا چھوٹو تو آپ کا بیٹا ہے اب آپ فیصلہ کر لیں
یا تو مجھے چھوٹو کہہ لیں یا میری شادی کروائیں۔ اگر چھوٹو کہہ
کر ہی شادی کروائی ہے تو اپنے اس صاحبزادے کی
کروادیں۔“ ارمان نے منہ بنا کر بھانجے کو دیکھا۔

”ارمان خیرے مت دکھاؤ اور ہمارے ارمانوں کا گلا
گھونٹنے کی کوشش مت کرو۔“ مشعل نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔
”اگر تم رمل سے شادی کے لیے نہ مانے تو امی تو
تمہاری شادی کریں گی ہی نہیں اور ہمارے ارمان تو
دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اکلوتے بھائی ہو کچھ
شرم کرو.....“ مشعل رو ہانسی ہوئی۔

”جی بالکل! آپ کے لہنگے، شرارے، غرارے
یہ سب آپ کے ارمان ہی تو ہیں جو اماں یوں میں دھرے
ہوں گے اور میری شادی کے منتظر ہوں گے۔“ ارمان جو
پہلے ہی ماں چکا تھا اور روٹھے ہوئے صدمہ کو منا بھی چکا تھا۔
اب ماں بہنوں کو محض چڑا کر لطف اٹھا رہا تھا۔

کتنے جن کر کے تو رمل کو اس نے منایا تھا۔ حتیٰ کہ
باتھ پاؤں جوڑے اور کان تک پکڑے تھے۔ گول گپے
کھلائے تھے وہ بھی ریزمی پر کھڑے ہو کر اور خود بھی
زندگی میں پہلی بار کھائے تھے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ کتنے
پانڈیلے تھے، اس نے رمل سے معذرت کرنے اور اس کو
راضی کرنے کے لیے یہ تو ہی جانتا تھا۔

”ارے تم سب تو یونہی دل جلا رہی ہو، لڑکا تو
راضی ہے کب سے اس کی بی پچھو ہوں خیر سے، ماشاء اللہ

اپنے اپنے سہما سہما کی بی بی، بی بی تیار کر رہے تھے..... وہاں ارمان کی فہرست تو سب سے طویل تر تھی۔ اس لسٹ میں ایک وفاقی وزیر کا نام بھی شامل دیکھ کر عمر حسن کو تھوڑی بے چینی سی ہوئی۔

”ارمان، سیاسی شخصیات کی شمولیت سے پروٹوکول کا مسئلہ ہو جاتا ہے بیٹا اور آپ نے تو ان کو نکاح پہ بھی مدعو کیا ہوا ہے۔“ انہوں نے کچھ فکر مند لہجے میں اس سے کہا۔

”نو بابا! وہ بہت ہی سادہ انسان ہیں، پروٹوکول کیا ان کے ساتھ تو ان کا کوئی فیملی ممبر بھی شاید نہ ہو..... دراصل یہ ان بی بی کی خواہش ہے میری شادی میں شمولیت کی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ نا ابراؤ میں وہ ایک ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئے تھے تو میں ان کو بلڈ بھی دیا تھا۔ بس جب سے انہوں نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا۔ ویسے وہ بہت اچھے انسان ہیں۔“

”او کے صاحبزادے، تم نے انوائٹ کیا ہے تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

ارمان کے نکاح کا جوڑا ان کے رواج کے مطابق ارمان کی بہنیں اور پچھو لاری تھیں..... اور جوڑے کا تو شخص نام ہی رہ جاتا تھا۔ دراصل اتنا تام جھام ہوتا تھا کہ حد نہیں..... سارے گھر کے قیمتی لباس، زیورات، دیگر تحائف، ارمان کے سرالیوں کے لیے بھی قیمتی گفٹ شامل تھے۔

اور آج ارمان والا بھتہ نور بنا ہوا تھا، پھولوں، خوشبوؤں اور روشنیوں سے سجا ہوا لان اپنی مثال آپ تھا۔ جگہ جگہ ستون بنا کر ان کو سفید پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ان پر رنگ برنگے بلب لگا کر روشنی کی گئی تھی۔ لان میں پھولوں کی بہتات تھی لیکن اس وسیع و عریض لان میں جگہ جگہ پھولوں سے سجے گیٹ بنے ہوئے تھے، بیچ میں مصنوعی فوارے تھے جن میں رقص کرتی روشنیوں کا عکس تھا اور بیچ بیچ میں راؤنڈ میبل کو سرخ اور سفید امتزاج سے سجایا گیا تھا اور کناروں پر اسٹینڈ میں شمعیں روشن تھیں، لان کے بالکل سامنے سرخ و سنہری رنگ کے امتزاج کا بڑا سا اسٹیج سجایا گیا تھا۔ درمیان کی روش میں سرخ قالین تھا جس پر چل کر دولہا، دولہن کو اسٹیج تک آنا تھا۔

کبھی آنکھوں کو بچکنو سے کبھی کا جل کو بادل سے کبھی آنسو بنادینا شبنم کا حسین قطرہ کبھی چمکتی کمر کو تم ہرن کی چال کہہ دینا لدی پھولوں کی ڈالی ہو یوں ہی سرگوشی میں کہہ دینا کبھی ناؤ بنالینا میری آنکھوں کی جھیلوں میں اترنے کو ہاں.....

سب باتوں کو دہرائنا محبت میں تم ڈھل جانا ہر دوری مٹا دینا مگر اتنا یادوں میں ابھی وہ وقت نہیں آیا ابھی حرم نہیں ہم تم ابھی آداب واجب ہیں ابھی دوری ضروری ہے ابھی رشتہ اوصور ہے سب کہنا

مگر ایجاب ہونے دو لازم اسباب ہونے دو اس نے رمل کے تصور کو آنکھوں کی چٹلیوں پر اتارا اور آنکھیں سکون سے بند کر لیں۔ کیونکہ ایجاب کا وقت دور کہاں تھا۔

☆☆☆

شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں..... شاپنگ، ہال کی بکنگ لیکن عمر حسن کا خیال تھا کہ مہندی کی رسم سے پہلے قرعہ دو ستون اور رشتے داروں کو ارمان والا میں ہی مدعو کر کے لان میں ہی رسم نکاح کا اہتمام کر لیا جائے۔

شادی کی تقریب کے لیے گھر کے سب افراد

وہاں کو بیسے ہر پتلا بھول گیا تھا۔ اسے ایسے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اسے لگا جیسے وقت رک گیا ہے یا شاید پلٹ آیا ہے۔ درمیانی برس جو صدیوں کے برابر تھے..... ایک لمحے میں گزر گئے تھے۔ یہ بچوں لگتا تھا درمیان میں تو کوئی وقت آیا ہی نہیں تھا۔ یہ شخص جو چند قدم کی دوری پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کا محرم تھا سب سے اپنا..... جس کی محبت اس کی رگوں میں خون کے ساتھ، ساتھ بہتی تھی، کبھی روتھ جاتی تھی لیکن رخصت نہیں ہوتی تھی..... لیکن وہ کیسا اپنا تھا جس کے اپنے ہونے کا وہ کسی کو بتانے سے بھی قاصر تھی۔ اسی سوچ نے اسے ہوش کی دنیا میں لا چٹا۔

ارمان اب اس بچے سے اتر کر سب سے مل رہا تھا۔ ارمان کو علی حسن کے گلے لگتے دیکھ کر کھل کی آنکھیں نم ہوئیں تو عمر حسن سے گلے ملنے کے منظر نے شائل کو تڑا دیا۔ بے ساختہ کھل اور شائل نے خوشی سے لبالب آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گلے مل کر مشترکہ خوشیوں کو بانٹ لیا۔ عمر اور علی آپس میں رکی مبارک باد کے سلسلے میں گلے مل رہے تھے جبکہ کھل اور شائل کی مبارک باد میں کتنی آگاہی اور کون سی مشترکہ خوشیاں پوشیدہ تھیں وہ صرف وہی دونوں جانتی تھیں۔

بچے کوئی نہیں جانتا شائیت ایزدی نے کب..... تار العیوب کی حیثیت سے رازوں کو پوشیدہ رکھنا ہے اور کب وہ ہر راز کو طشت از با م کرنے والا ہے۔ اس کی مضحکت وہ ہی جانتا ہے۔ انسان تو محض ایک خاک کی پتلا ہے جس کی ہر ذرہ ہلانے پر اللہ کی ذات ہی قدرت رکھتی ہے اور اس نے لمحہ موجود کو اس بات کے لیے جنم لیا تھا۔

سب کے سب حق وق کھڑے تھے جب ایک مفلوک الحال کریمہ چہرے والی بڑھیا علی حسن کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ کسی کو بھی آگے بڑھنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اس کے منہ سے نکلے الفاظ کوڑوں سے بھی بدتر تھے یوں لگتا تھا کہ اس بوڑھی جادوگر نے جادو کی چھڑی سے سب کو پتھر کر دیا تھا۔ (باتی آئندہ)

نکاح کے بعد رمل کو اس بچے پر لایا جانا تھا..... اس لیے گھر کے اندر رمل کو جس جھولے پر بٹھایا گیا وہ جھولا بھی پھولوں سے لدا تھا اور کمر بھی بھر پور سجا ہوا تھا۔

زیریں پچھو جو اچھی اپنی شبلی، نوکروں کی فوج اور بیٹہ باجے کے ساتھ بچے ہوئے نوکروں کی قطار لیے جو نوکروں نے اٹھار کھے تھے بڑی شان اور سچ و سچ سے گیٹ میں داخل ہوئیں اور اندر آ کر چیزوں کو ترتیب سے رکھوانے لگیں۔

تھوڑی دیر میں ارمان ان ہی کی لائی کا مدار کارل والی بلیک شیر والی اور آف وائٹ پاچا پھین کر کسی مغلیہ شہزادے کی آن بان کے ساتھ اس بچے پر براجمان تھا۔ میروں رنگ کی منفرد سی پگڑی میں اس کی سرخ و سفید رنگت کھل رہی تھی۔ سمیر نے ارمان کی طرف دیکھا تو دل ہی دل میں ایک ملال سا جاگا لیکن جلدی سے اس نے رمل اور ارمان کی دائمی خوشیوں کی دل سے دعا کی۔

ارمان کے خاص مہمان علی حسن کے آنے کی اطلاع ملنے پر ارمان، عمر حسن، پچھو یا صاحب اور دونوں بہنویوں کے ساتھ، ساتھ کھل کے چچا بھی ان کے استقبال کو گیٹ پر آگئے تھے۔ سب نے علی حسن کا والہانہ استقبال کیا۔ علی حسن ہی کا انتظار تھا جو واقعی وعدے کے مطابق پڑو کول کے بغیر آئے تھے، ذاتی پاڈی گاڑ ڈالہ ساتھ تھا۔

ارمان کا نکاح ہوا تو کھل اور شائل دونوں ہی ایک دم سے پیار کرنے کو آگئے بڑھیں۔ فیصلہ مشکل تھا کہ دونوں میں سے کون..... پہلے پیار کرے.....

☆☆☆☆

علی حسن جو کھل کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ پہچان بھی چکے تھے اس وقت اشقر طربا انداز میں اپنی مٹھیوں کو کھول اور بند کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت محض اسے چھو کے گزر گیا ہو، وہ تو ویسی ہی دلربا اور حسین تھی دل میں اتر جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ ہلکے گلابی سوٹ میں تازہ گلاب لگ رہی تھی۔ یہ عورت جو آج بھی ان کی بیوی تھی پر اس وقت کتنی اجنبی لگ رہی تھی۔ کھل نے ایک سرسری نظر مردوں کی ٹیمپلو کی طرف

پچھی کا دن تھا۔ وہ آفس کی فائلز میں پر پھیلے سائے لپٹ کر رکھے کام میں مشغول تھا۔ لپٹ پر مسلسل اس کی انگلیاں متحرک تھیں۔

”شہر یار! تمہیں اب سنجیدگی سے اس بارے میں سوچنا ہوگا۔“ حکیمہ بیگم لان میں قدم رکھتے ہی حکیم امینز لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”اماں جان! آپ مجھے کیوں مجبور کر رہی ہیں۔“

شہر یار بے بس سا بولا۔

”اللہ جانے ایسی کون سی محبت ہے۔ نہ جانے اس لڑکی نے کیا گھول کر پلا دیا ہے۔ ایسی کیسی بیوی دے۔“ اس کی آنکھیں اشکوں سے بالاب بھر گئی تھیں اور سامنے کا منظر دھندلا سا لگتا تھا۔

میرے لیے خدائی کافی ہے

ریمسا نور رضوان



اماں جان اپنی بیوی کے سنا بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہوں۔“ شہر یار نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔
 ”شہر یار! بچوں کے بنا زندگی ویران ہوتی ہے۔“ حکیمہ بیگم دھیرے سے بولی تھیں۔
 ”اماں جان! شکہ اور میں، ہم دونوں صحت مند ہیں۔ بس یہ اولاد دینا نہ دینا سب باری تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے جیسے چاہے نوازے۔ ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی ”کن“ کے منتظر ہیں۔ اور ابھی تو ہماری شادی کو محض تین سال کا عرصہ گزرا ہے اسپتال جا کر دیکھیں لوگوں کو دس سال، بارہ سال بعد بھی اللہ پاک اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔“ شہر یار دس دفعہ کی کبی ہوئی بات دہرا رہا تھا۔

☆☆☆

”ہمارا بندھن
 کبھی شیع کو دیکھا ہے!
 سب ہی دانے الگ ہو کر بھی

ہر دم ساتھ رہتے ہیں
 یہی تعلق ہمارا ہے
 بہ ظاہر میں الگ ہوں لیکن
 ہم دلوں میں ساتھ رہتے ہیں
 سدا ایک دوسرے کے نام کی شیع کرتے ہیں
 اسی کو روح کا بندھن
 اسی کو چاہ کہتے ہیں

اسی کو دوستی اور.....

اسی کو ساتھ کہتے ہیں“

شہر یار نے شکہ کو وائس ایپ پر شاعری بھیجی تھی۔ شکہ پڑھ کر مسکرا دی تھی۔
 ”ہیلو!“ کافی دیر گزرنے کے بعد شہر یار کا پیج آیا تھا۔

”بولو۔“ شکہ نے بھی شرارتی انداز میں لکھ دیا تھا۔
 ”اے لڑکی۔“ ایسوجی کے ساتھ اسے پکارا گیا تھا۔
 اس نے بھی کان والا ایسوجی بھیج دیا تھا۔
 ”شکہ! انگ نہ کرو یا۔“ وائس ایپج موصول ہوا تھا۔
 ”میں نے کب کیا انگ.....؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

شہر یار نے اب ویڈیو کال کر لی تھی۔

”اے ہمارے دور میں اسپتال تھا نہ ہی میاں لٹو بنے بیوی کے چیک اپ کروانے جاتے تھے۔ اب تو نیا ہی رواج چل نکلا ہے۔ ہم تو داسیہ سے علاج کراتے تھے۔ ساس، مند، جیٹھانی، پڑوسن کوئی بھی اس حالت میں سہارا بن جاتی اور مشکل وقت نکل جاتا۔ اب تو صبح اپائنٹمنٹ لو تو شام کو چیک اپ کروانے جاؤ۔ ساتھ میں میاں کا بھی چیک اپ، عجیب دور آگیا۔“

وہ عجیب انداز سے کہہ رہی تھیں۔ شکہ ویسے ہی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ بھی تو ان کی مرحومہ بہن کی بیٹی لیکن انہیں تو اپنی شایان شان بہو چاہیے بھی جو کہ شہر یار کی ضد کی وجہ سے نہ مل سکی تھی۔ شکہ، شہر یار کی بچپن کی مانگ تھی۔ اور وہ اسے بچپن سے چاہتا تھا۔

”اماں جان! زمانے کے انداز بدل جاتے ہیں وقت کا تقاضا ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ وقت کی بات ہے آپ کے دور میں ایسا نہ تھا تو کسی کا قصور تو نہیں۔ آج کا دور ایسا ہے۔ ماحول کو دیکھ کر جدید تقاضوں کے حساب سے چلنا ہوتا ہے۔“ وہ مہذب سے انداز میں بولا تھا۔

”آج کی تعلیم یافتہ نسل نے تو بے شرمی و بے حیائی پھیلا رکھی ہے۔“ وہ اپنی بات پر ہی ڈٹی ہوئی تھیں۔

سناں کر رہے تھے۔ بعد میں ہی وہ دیکھ کر حیرت منہ ہو گئی۔
 اب اسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے جانے لگی تھیں
 اور اس کے تمام ٹرینٹ کے بعد ایک ہی بات سامنے
 آئی جسے انہوں نے دیدہ دلیری سے جھٹلایا تھا۔ حکیمہ
 بیگم کے من میں یہ بات کنڈلی مارے بیٹھی تھی کہ شائلہ
 بانجھ ہے۔ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ وہ بانجھ نہ تھی بس اللہ
 پاک کے حکم کا انتظار تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی صحت
 مند تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شاداں و
 مسرور تھے۔ بس حکیمہ بیگم ہی بچوں کی رٹ لگائے رکھتی
 تھیں۔ شائلہ کے دل پر کیا گزرتی تھی انہیں اس کا
 احساس تک نہ تھا وہ سرعام اسے بانجھ کہہ دیتی تھیں اور
 یہ کہتیں کہ وہ اپنے اکلوتے لاڈلے سپوت کی دوسری
 شادی کریں گی تاکہ ان کی نسل چلے۔ اس گھر کو وارث
 ملے۔ وہ بیوں پر قفل لگائے چپ چاپ ہر بات سنتی
 رہتی اور رب کی بارگاہ میں دعا کرتی ”اے میرے رب
 پہلا آسرا سہارا تو ہے تیرے بعد میرا شوہر میرا سائبان
 ہے۔ اسے سلامت رکھنا۔ میاں بیوی کا رشتہ سلامت
 رکھنا۔“ وہ ہمہ وقت دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

☆☆☆

حکیمہ بیگم اپنی بات کسی طور منوانہیں پاری تھیں۔
 وہ بیٹے کو ہر طرح سے قائل کرتی تھیں لیکن وہ بڑے
 خوب صورت انداز میں ان کی بات رد کر دیتا تھا۔
 انہیں گھر کا سناٹا کھٹتا تھا۔ اتنے بڑے بنگلے میں تین
 نفوس رہتے تھے وہ چاہتی تھیں کہ اس گھر کے سناٹوں کو
 بچوں کی قلکاریاں توڑ دیں۔ ان کی خواہش بھی ناجائز
 نہیں تھی۔ اب انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اس
 موضوع پر بات نہیں کریں گی۔

تو اب تھک ہار کر پڑوسن (صالہ بیگم) کے ساتھ
 کسی پیر صاحب کے پاس جانے لگی تھیں۔

صالہ بیگم کسی پیر صاحب کا ذکر بڑی محبت و
 عقیدت سے کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی کہیں شادی
 نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب نے تعویذ دیے تو اس کی
 شادی چند ماہ میں ہی ہو گئی۔ بیٹے کی جاب نہیں لگ رہی

کال ریسیو ہوتے ہی اس کا ڈرا سہا چہرہ اسکرین
 پر نمودار ہوا تھا۔

”شائلہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔“ وہ پراعتماد لہجے
 میں بولا تھا۔

”وہ تو ہو لیکن بھائی بھائی سے کہہ دیں گی کہ میں
 سارا دن آپ سے باتوں میں مصروف رہتی ہوں۔ گھر
 کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔“ وہ جھگڑتی۔

”شائلہ! بی بیو۔“ شہر یار مسکرا کر بولا۔

”آپ کو نہیں معلوم کہ۔۔۔ وہ بری طرح لب
 لہجے ہوئے کچھ کہتے، کہتے رک گئی تھی۔“

”شائلہ! شہر یار خان! یہ ڈرتا درنا چھوڑو، جان شہر یار
 جینا سیکھو۔“ وہ اذنی محبت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔

شائلہ جھینپ کر ہلکا سا مسکرا دی۔

”دنیا کا کوئی بھی انسان لڑکیوں کو درپیش مسائل
 کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بن ماں باپ کی بچیوں پر آنے
 والی بھائیاں کس کس طرح ظلم و ستم روا رکھتی ہیں۔ یہ تو
 وہی جان سکتا ہے جو اس ظلم کو سہتا ہے۔“ وہ محض سوچ
 کر رہ گئی تھی۔ بولی کچھ نہیں۔

شہر یار خان اور شائلہ دونوں خالہ زاد تھے۔

شائلہ اس کی بچپن کی ماگک، اس کی محبت تھی اور اب تو
 نکاح بھی ہو چکا تھا۔

”شائلہ! میں اماں جان سے رخصتی کے لیے کہتا
 ہوں۔ لیکن یہ اماں جان بھی ناں انہیں۔۔۔ تم میں عیب
 نظر آنے لگے ہیں۔ بہر حال میں انہیں راضی کر کے ہی
 دم لوں گا۔“

شہر یار نے یک دم ہی ایک فیصلہ کیا اور اپنی
 بات منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور پھر
 محض ایک ماہ میں ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ زندگی
 میں چاہنے والے ہم سفر کا ساتھ ہو تو ہر پل پھولوں جیسی
 خوشبو و زماہٹ بھرا ہوتا ہے۔ شائلہ کی بھی ازدواجی
 زندگی پُر سکون و شادماں سی گزر رہی تھی۔ شادی کو ایک

عورت و ڈھال

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر بستی ہے... مگر یہی کمزور اور کم تر بستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

شروع کر دیتا ہے۔ کھڑکی کو معلوم ہے۔ وہ ایک ڈھال کی طرح درختے کے چوکھٹے میں فٹ ہے۔... ساکت و جامد۔... بلے کو نہیں معلوم کہ کھڑکی کے پیچھے اور کیا، کیا ہے۔ پر وہ یہ ضرور جانتا ہے کہ کسی، کسی کھڑکی کے کواڑوں میں جھریاں ہوتی ہے۔ جہاں سے جھانک کر پتا چلا یا جاسکتا ہے کہ کیا اور کتنا، کیسے اور کتنی آسانی سے مل سکتا ہے۔

عورت ایک کھڑکی کے مانند ہوتی ہے۔ ایک ہند کھڑکی اپنے پیچھے اندرون خانہ تمام راز و خفاپ کے رکھتی ہے۔ دیواروں کے نقش اور روغن کی چمک بھی، راہداریوں کی لمبائیاں اور دروازوں کے قد و قامت بھی۔... مرد ایک بھوکے بلے کے مانند ہے۔ جو ہر کھڑکی پر اپنا منہ لگا کے بوسہ گھستا پھرتا ہے پھر جہاں کہیں سے ماس کی باس اس کے تھنوں سے ٹکرائے وہیں شے گر کر ٹپکتا



گھڑی ٹوکس پتا کہ جھانکنے والا لگتا زوردار ہے پر بے کوہتا ہے کہ کچھ کھڑکیوں کی کنڈیاں بہت کمزور ہوتی ہیں۔

☆☆☆

”امی.....!“ اندھیرے میں ابھرنے والی معصوم سرگوشی بہت خوفزدہ تھی۔

”ہمم.....م.....م.....“ سرگوشی کا جواب بہت بیٹھا تھا۔

”ابو.....“ وہ رکی، ہچکچائی..... جیسے بولنے میں کوئی امر مانع ہو۔

دو مہربان بازوؤں نے اسے خود میں سمیٹ کر کچھ اور نزدیک کیا۔ اس کی ہمت بڑھی۔

”ابو..... آج بہت غصہ ہو رہے تھے۔“

”ہم.....م.....م.....“ ایک گہری سانس بولی۔

”ابو اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں؟“

”وہ مرد ہیں ناں.....“

”تو کیا سارے مرد ایسے ہی غصہ کرتے ہیں۔“

”نہیں سب تو نہیں۔“

”پھر ابو.....“

”آج میری بیٹی بہت ڈر گئی کیا۔“ اس نے سر جھکا کے اپنی بیٹی کا سہا ہوا چہرہ دیکھا۔

”مجھے تو ہر وقت ہی ڈر لگتا رہتا ہے ابو سے۔“

”ارے کیوں..... تمہیں تو کچھ نہیں کہتے وہ۔“

”پر آپ کو تو کہتے ہیں ناں..... آپ کو ان سے ڈر نہیں لگتا؟“

”نہیں میری جان..... بس یہ سمجھ لو، جو ابو زیادہ غصہ کرتے ہیں۔ وہ پیار بھی زیادہ کرتے ہیں۔“

”یہ کیسا پیار ہے؟“

”خفی گڑیا کو یہ پیار کا انداز نہ بھایا نہ سمجھ آیا۔

”آپ کیوں پریشان ہو۔ آپ کے پاس تو میں ہوں ناں!“

اس نے بیٹی کو خود سے لپٹا کے ایک محبت میں بھیگا

بوسہ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ گویا وہ اس کی ڈھال تھا جس کی آڑ میں گڑیا نے سکون محسوس کیا۔

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ — مارچ 2019ء — (94)

سالار حسن اور سامعہ کی شادی، ایک دور کے عزیز کے توسط سے طے پائی تھی۔ دونوں میں عمر کا تفاوت بہت زیادہ تھا سالار، سامعہ سے عمر میں کم و بیش پندرہ سال بڑا تھا۔ اور فقط سترہ برس میں سامعہ کی شادی کسی بوجھ کو اتار بیٹھنے والا معاملہ تھا۔ ایسی بالی عمر میں بیس سالہ مرد اور وہ بھی ایک بچی کا باپ کس لڑکی کا آئینہ مل ہو سکتا تھا سوا اس کا بھی نہیں تھا مگر زندگی میں آئینہ مل کب ملتے ہیں۔ زندگی میں تو حقیقت ملتی ہے اور حقیقت یہ تھی کہ سالار ہر لحاظ سے اچھا ہونے کے باوجود کہیں نہ کہیں برا بھی تھا۔ کہیں نہ کہیں برا ہونے کی عادت ہی اس کی اچھائیوں کو کھارہی تھی لیکن اسے اس کا ادراک نہیں تھا۔ اس کی پہلی شادی جس وجہ سے بھی ختم ہوئی اول آخر گڑیا کی ڈتے داری اسی پہ آن پڑی جسے فوری طور پر منسوخ کرنے کے لیے جو بھی اور جیسی بھی کی بنیاد پہ اس نے سامعہ کو اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنے سامنے بچی کی طرح لگتی اس لڑکی کے لیے انکار رہی کر دیتا۔

سامعہ کی اوپر تلے چھ بہنیں تھیں۔ جن کے بھاری بوجھ تلے ماں باپ کو سانس بھی رک، رک کر آتی تھی۔ ایسے میں کھاتے پیتے، خوش شکل، پڑھے لکھے داماد کا رشتہ ایک بیٹی کے دم چھلے کے ساتھ کوئی اتنا برا بھی نہ تھا۔ اور برا تو کچھ بھی نہیں تھا یا شاید قسمت ہی مٹھی تھی کہ سامعہ کو جب سب سیٹ ہونے کی شنوائی ملی تب پہلی بار اس کی ذات کے بند دروازے کسی پرانی، انجان، نانائوس دستک سے آشنا ہوئے۔ دستک اتنی زوردار تھی کہ اس کی پوری ذات ہی تھرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

اور آوارہ، بھوکے نریدے بٹے جانتے ہیں کہ کون سی کھڑکی کمزور ہے کون سا دروازہ صرف دکھانے کو کھڑا ہوا ہے۔ بچوں کا ذرا سادہ یا کوڑا پاٹوں پاٹ کھول دے گا۔ وہ دروازہ بھی کمزور تھا۔ چونکھٹ سے بس نام کو جڑا ہوا۔ دکھاوے کو کھڑا ہوا۔ ذرا سے دھکے سے کھٹا چلا گیا۔

☆☆☆

دل کی دھڑکن اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

درمیان کے چہرے پہ بے پروائی تھی ہی اس وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اور اتنی ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

وہ اپنی جگہ جم سی گئی۔ بالکل ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بس میں کر لے گا۔ قریب تھا کہ اس کی چیخ ہی نکل جاتی لیکن اسی وقت بالکل اسی وقت کوئی بے حد تیزی سے بیڑھیاں اترتا ہوا اس کے سر پہ آ پہنچا تھا۔

اس کی طرف بڑھنے والا ہیولا ایک سیکنڈ میں زن سے اس کے برابر سے نکل کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے آنے والے کو بغور نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس ہیولے کو۔۔۔۔۔

☆☆☆

گڑیا کے ساتھ سامعہ کی توجہ و محبت کی ایک ہی وجہ وہ محرومی تھی جو اسے اپنے ماں، باپ کے گھر چھٹی پڑی۔ چھ بہنوں کے بعد منوں مرادوں سے دنیا میں آنے والا اکلوتا بھائی ہی اس کے ماں باپ کی اصل دنیا تھا۔ باقی بڑی اولادیں انہیں بھلا کیا فائدہ دینے والی تھیں۔ بلکہ اور اوپر سے شادیوں کی فکریں اور جہیزوں کے خرچے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کرنے والے تھے۔

اس کے ماں، باپ کی بھی وہی روایتی سی فرسودہ سوچ تھی جو معاشرے کے ہر غریب ناخواندہ ماں، باپ کی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔

اوپر تلے پیدا ہونے والی بیٹیوں کے بوجھ سے جھکتے سر اور کمر۔۔۔۔۔ وقت سے پہلے بالوں میں اترتی چاندی، ضرورت سے زیادہ اور وقت بے وقت کھایا جانے والا ترس اور بھول کی طرح چھتی جھارت۔۔۔ ماں، باپ کو اس حاشیے سے آگے کچھ سوچنے کی اجازت دیتے ہیں اور نہ ہمت۔ بیٹی، بوجھ۔۔۔ بیٹا بازو۔۔۔۔۔

سامعہ بھی انہی جملوں کی ماری، دل میں بہت پہلے سے تجبیہ کیے بیٹھی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو کبھی ایسے بد صورت، نا انصاف رویے کی بھینٹ نہیں چڑھائے گی۔ کبھی بوجھ کی طرح سر سے اتار کر نہیں پھینکے گی جیسے اس کے ماں، باپ نے اسے ڈھونڈا اور سب سے بڑھ

سرد دھندلا سیرھیوں پہ دن میں بھی چوڑی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا رک کر اپنے پیچھے دیکھا۔

”امی“ ایک نرم اور قدرے سہمی ہوئی سی پکار بے آواز لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی۔

اوپر کی سیرھیوں سے کوئی تیز، تیز اترتا نیچے آ رہا تھا۔ اس نے آخری زینے پہ براجمان سیاہ ہیولے کو دیکھا۔ اندھیرے میں حرکت کرتا ہوا ایک ننھا سا شعلہ اس کی مصروفیت کا گواہ تھا۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ خود سے قدم بڑھا کے نیچے چلی جاتی۔ جیسی اوپر سے آواز گونگی۔

”بیٹے آپ چلو گاڑی میں، میں آ رہی ہوں کچھ بھول گئی ہوں اوپر۔“

نیچے آتی سامعہ اب اوپر ہی رک کر اسے کہہ رہی تھی۔ وہ نیچے کھڑی یہ سن کر بھی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اسے سامعہ کا انتظار تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔

زینے کے وہ چند قدم نیچے پار کر کے دوسری طرف مڑنا، گڑیا کے لیے آگ کا سمندر پار کرنے جیسا ہی تھا۔ ہیولے میں کوئی حرکت نہیں تھی لیکن سامعہ کی آواز نے اس میں جان ڈال دی۔ اس نے مڑ کر گڑیا کو دیکھا۔

نیم اندھیرے میں بھی وہ جیسے اس کی چمکتی آنکھوں میں سے جھانکتے اس عجیب سے احساس کو پڑھ سکتی تھی۔ اس نے بے ساختہ اپنی نظریں جھکا کے ان سے باہر جھانکتا خوف چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اترتی لرزش کا بھرم بھی اسی ڈوبی، ڈوبی روشنی نے رکھا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ وجود جو اسے سیرھیوں کے آخر میں بیٹھا کوئی بھوت دکھ رہا تھا، اب واپس گردن موڑ کر سابقہ مشغلے میں مصروف ہو گیا۔

سامعہ کا انتظار یہیں رک کے کرنا بے وقوفی تھی۔ گڑیا کو نہیں پتا تھا، وہ اوپر کیا چیز بھول آئی تھی۔۔۔۔۔ اور اسے ابھی کتنی دیر لگتی تھی۔ اس نے پھر خود کو سنبھالا دیا اور بے حد آہستگی سے قدم، قدم اترتی اس ہیولے کے برابر تک پہنچی،

موسیقی نے سماں باندھ رکھا تھا۔ بڑے سے لاؤنج میں کوئی مجبور قص تھا۔

اس نے دروازے کی جھری میں سے جھانک کے شہادت کا مرحلہ چوری چھپے طے کرنے کی کوشش کی۔
مورنی..... نہیں..... مورنی ہوا کے دوش پہ ایسے چکر نہیں کھاتی تھی۔

پری..... نہیں، پریاں اڑ سکتی ہیں لیکن ایسے بل کھا، کھا کے سیدھی نہیں ہوسکتیں.....
تھوڑی دیر وہ یونہی رقص کرتی بل کھاتی اس عورت کو دیکھتی رہی جو کم از کم اس وقت اس زمین کی نہیں لگ رہی تھی۔

سانچے میں ڈھلا جسم، بے حد اجلا اور بے داغ تھا۔ جسم سے جھپکے ہوئے کپڑے خوب صورت تشیب و فراز کو یوں واضح کر رہے تھے گویا آج سے پہلے کبھی ایسا خوب صورت وجود دھرتی پہ اترا ہی نہ تھا۔

کالی آستینوں میں لپٹے ہوئے ہاتھ بل کھاتے ناگموں کی طرح لہرا رہے تھے۔ پیر کبھی اٹختے، کبھی زمین پہ نکتے اور کبھی پنپوں کے بل معلق ہو جاتے۔ اس لہراتے جسم کے نچلے اور اوپری دھڑ میں الگ، الگ طرز کی حرکات و سکنات تھیں۔ کبھی اگلا حصہ ساکن تو پچھلا متحرک اور کبھی اس کے متضاد..... پھر بھی پورے وجود میں ایک عجیب سا آہنگ تھا..... ربط تھا، تسلسل تھا۔

وہ سانس روک کر سفید مخروطی انگلیوں والے ہاتھ، سفید پنڈلیوں اور آنکھیں جھپکے بناتیلی کمر کو دیکھ رہی تھی۔ موسیقی تھی تو اس طرز کی جیسے اسی رقص کے لیے بنائی گئی ہو اور وہ رقص تھا تو اس انداز کا گویا اس ساز کو سن کر ہی ایجاد کیا گیا ہو۔

اس پورے منظر میں ساکن اور متحرک تمام جاندار اور بے جان چیزوں کے درمیان ایک وجود ایسا بھی تھا جو تھا تو جاندار لیکن اس وقت بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

آنکھوں میں سرور، چہرے پہ غرور اور لبوں پہ داد دیتی مسکراہٹ، جو رقاصہ کے نغمہ اور مہارت کو عروج پہ لے جا رہی تھی۔ ساز میں تیزی آ رہی تھی اور مجبور رقص

کر بیٹے کے چکر میں بنیوں کی لائن نہیں لگائے گی۔ میزک سے آگے اسے پڑھنے نہیں دیا گیا۔ دوستیاں، سہیلیوں کا کوئی تصور نہ دیا۔ چھوٹے سے گھر کی جوتھ بیزار سے، اس بجے بنے خوب صورت فلیٹ میں آ کر چند دن تو زندگی بڑی سہانی بنی گئی تھی۔

گڑیا بے حد فرمانبردار اور من موئی صورت کی بچی تھی۔ اس کی گنتی جلدی اس سے کتنی گہری دوستی ہو گئی اسے خود بھی پتا نہ چلا۔ بس کوئی بگاڑ تھا تو وہ سالار کا مزاج..... جو بیٹیس برس میں ازادواجی زندگی کے جھگڑوں سے نمٹنے، نمٹنے چونسٹھ سال کا ہو گیا۔

سامعہ کی باتوں میں، اداؤں میں بانی عمر کا بائگن جھلکتا۔ اس کا چیللی ڈال سا جسم بل کھاتا، گھر میں یہاں وہاں گھومتا پر سالار کو دکھائی نہ پڑتا۔ وہ اپنے شوہر سے جس محبوبانہ قسم کے رومان آمیز سلوک کی متقاضی تھی۔ منہ پھاڑ کر اس کا مطالبہ تو نہ کر سکی البتہ بہک ضرور گئی پھر بیوی، خادامہ، خدمت گزار کے لیدلیوں سے الگ کر کے جس نے بھی سب سے پہلے اسے اس کی ذات کا مان بخشا، اسی کی سمت چھتی چلی گئی۔ وہ قصور وار تھی کیونکہ سمجھتی تو وہ بھی سب کچھ ہی تھی۔ صبح اور غلط اپنے تمام تر ابہام اور ان کی تشریحات سمیت اس پر بھی اتنے ہی واضح تھے۔ جتنے کسی بھی شادی شدہ عورت پہ ہوتے ہیں۔ اور وہ شاید اتنی قصور وار بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے چاہے جانے کے جہلی اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے میں سالار نا کام ہو گیا۔ اس نے سترہ سال کی نا بچھ لڑکی کو ستائیس تو کیا۔ نینتیس سالہ تجربے کا عورت پہلے دن سے ہی سمجھ لیا۔

البتہ اس سمجھنے اور نا سمجھنے کے بین، بین گڑیا پر سارہ کی توجہ اور التفات چٹا رہا۔ جو گڑیا کا حق تھا وہ اس نے اسے بخوشی دیا۔ لیکن اپنا حق صحیح جگہ سے لینے کے بجائے جہاں سے ملا وہاں سے وصول کر لیا۔

اور ہمیں سے غلطی کا آغاز ہوا۔ ہمیں سے بگاڑ کی ابتدا۔

☆☆☆

گھر کی خاموش فضا میں ایک خاص طرح کی

ابھی اسے یہ اس کی اور کوئی دکھانا تھا۔

☆☆☆

”آپ کیا بھول گئی تھیں، جو آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔“ گاڑی میں اس ہیولے سے بچتے پر اس نے سکون کی سانس لی پھر پوچھا۔

”وہ میں اپنا آئی ڈی کارڈ اندر ہی بھول آئی تھی پھر خیال آیا ایسا نہ ہو وہاں ضرورت پڑ جائے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئے تھوڑی دیر باتیں کرتے ہوئے اس نے یونہی پاؤچ کھولا تو اس کا آئی ڈی کارڈ اوپر ہی تھا۔

باقی تمام وقت الجھی، الجھی رہی۔ کارڈ کی ضرورت پڑی نہ وہاں ذکر نکلا۔ اس کا مارشل آرٹس انسٹیٹیوٹ میں ایڈمشن ہو گیا۔

یہ ایڈمشن ہی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ کوئی ایسی مار دھاڑ والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو دبو، ڈرپوک اور بزدل قسم کی لڑکی تھی۔ پتا نہیں اس کی ماں کو اسے ایڈمشن دلانے کی کیا سوچھی۔ خود ہی فیصلہ کیا اور اس کے باپ سے منوانے کے لیے ڈٹ گئی۔ حالانکہ یہ بات منوانا آسان نہیں تھا۔ وہ خود کون سا راضی تھی لیکن.....

”تم بہت ڈرپوک ہو گڑیا۔ میں چاہتی ہوں تم تھوڑی اسٹراٹگک بنو۔ اور ایسے گھر میں بیٹھ کر تم بالکل ہی دبو ہو جاتی ہو۔“

اور بہت سی باتوں کی طرح اسے اس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ بھلا اس کے بزدل ہونے میں برائی کیا تھی۔ کتنی لڑکیاں جو اپنے گھروں میں رہتی ہیں ڈرپوک ہی ہوتی ہیں اور وہ تو خود کا کروچ کو کتنی بارتقہ اجل بنا چکی تھی۔ اس کے خیال میں اتنی بہادری کافی تھی مگر اب سامعہ نے اسے بہادری کی نئی ڈیفینیشن سے متعارف کروا دیا تھا۔

وہ خود بھی اس نامی گرامی ادارے سے رقص سیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کی اس وسیع انٹلری پہ جتنی بھی حیرت ہوتی کم ہی تھی۔

ایک بات طے تھی۔ کئی سالوں کی بے زبان

وجود میں بھی۔ اس کے قدم تیزی سے دائیں بائیں بڑے سے کمرے کے طول و عرض میں یہاں وہاں تھرک رہے تھے۔

سانے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے، ہاتھ سینے پہ باندھے جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس کھڑا تھا اور گویا پورا جہاں موجود ہو۔

دفعتاً میوزک ہلکا ہوا، رقص کرتے وجود نے تین چکر کھائے، چکراتا ہوا وہ دیوار کے پاس گیا ٹیک لگایا ہوا شخص سیدھا ہوا۔ میوزک دھیمّا ہوتے، ہوتے اچانک رکا۔ ناچتے ہوئے وجود نے رک کر اپنی باتیں پھیلائیں اور ایک عجیب ناز سے بھرے انداز میں وہ اس قدر آواز وجود کی بانہوں میں بھول گیا۔ اس شخص نے بڑے موقع سے اس کو تھام لیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فضا میں کھلکھلاہٹ ابھری اور چاروں اور پھیل گئی۔ اس نے جس طرح دروازے میں چھری کھول کر جھانکا تھا اسی انداز میں آہستگی سے بند کر دیا۔

اس کے اپنے لبوں پہ بھی مسکراہٹ تھی۔ اسے ان دونوں پر عجیب طرح کا فخر ہوا۔ وہ دونوں اس منظر میں کتنے مکمل تھے۔ ایک اس کا باپ اور دوسری اس کی ماں.....

”بس بھی کرو، تم نے تو اپنے آپ کو بالکل ہیروئین ہی سمجھ لیا ہے۔“ بازوؤں میں تھامے وجود کو چھوڑ کر وہ کچھ جھینپا، جھینپا سا بول رہا تھا۔

”تو..... کیا میں لگ نہیں رہی تھی ہیروئین جیسی خوب صورت.....“ اس نے پھر ایک ادا سے اس کی طرف دیکھا۔ جواباً وہ مسکرایا۔

”اچھا شوق پورا ہو گیا ہو تو پہنچ کر لو۔ کھانا ملے گا آج؟“ اس کے ہاتھ، قدم سب کچھ سست پڑ گیا۔

”ایک لفظ..... تعریف کا ایک لفظ تک نہیں..... کیا ہوا جو میں ڈانس کر رہی تھی۔ بیوی ہوں تمہاری کوئی غیر تو نہیں۔“ دل میں سراٹھاتے شکوے کو دباتے ہوئے اس نے سامنے رکھا موبائل اٹھایا اور اپنی ویڈیو کو محفوظ کر لیا۔

خدمت کے بعد سامعہ نے اپنے شوہر کے دل میں ایسی جگہ تو بنائی تھی کہ اس سے اپنے مطالبات کسی حد تک منوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔
اس کے نقص اور گڑبائے مارشل آرٹس کا قصہ بھی ایسا ہی تھا۔ کئی دن کی بحث اور روٹھے منانے کے بعد یہ نوبت آئی تھی۔

گڑیا کو اپنے باپ سے اس سخاوت کی امید تو نہیں تھی لیکن سامعہ کا جیت جانا اس بات کی گواہی تھا کہ اس نے اپنی خدمت سے بالآخر اس گھر میں قدم جما ہی لیے تھے۔

کھاتے پیتے لوگوں کا علاقہ تھا۔ جم، فٹنس، دوسرے شارٹ کورسز کے انسٹیٹیوٹ، کالج، یونیورسٹی اور پڑھائیاں لکھائیاں اکثر گھروں میں چلتی رہتی تھیں۔ اس لیے ان ماں بیٹی کا ایڈمشن بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑی یا اچھنبے کی بات تھی اس کے باپ کا مان جانا اور یہ یقیناً سامعہ کی ان سالہا سال کی محنتوں کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ جس کا وہ خود کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی زندگی کی کہانی شروع ہی سامعہ کی آمد سے ہوئی۔ سگی ماں کون تھی کہاں تھی اور وہاں کیوں نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، اس بارے میں اس کا ذہن خاموش تھا۔ سامعہ کی آمد سے پہلے کا اگر اسے کچھ یاد تھا تو صرف اپنے باپ کا چنگھاڑنا ہوا وجود..... اس کا غصہ جیسے ایک شعلہ تھا جو رکھ تلے دبا مسلسل سلگتا رہتا اور ہل میں بھڑک اٹھتا۔

وہ خود ایک سکڑی، بھٹی، ڈری، بھٹی تھی۔ ہنسنا نہ بولنا نہ اپنے جیسے بچوں کی طرح ضد میں نہ کوئی لاڈ..... اس کی دہائی شخصیت کو دن رات کی محنت سے اگر کسی نے سجایا سنوارا تھا تو وہ بھی سامعہ..... اس کی نئی ماں..... نے جیسے خود پہ لگا سوتیلی کالیبل کھریج ڈالا تھا۔ کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ سامعہ اور گڑیا میں کوئی سوتیلہ رشتہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کا سایہ بن چکی تھیں بلکہ وہ تو گڑیا کی ڈھال تھی۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ

گڑیا کے بعد اس کے کسی اور بھائی کا دنیا میں نہ سکتا بھی تھی۔ سامعہ کے دل میں اس بات کی کتنی حسرت تھی اس کا اندازہ اسے کبھی نہیں ہو سکا کیونکہ سامعہ نے اس کے سامنے کبھی اپنی طرف سے ایسی کسی خواہش یا حسرت کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں البتہ سامعہ اور سالار کے درمیان کبھی کوئی بات ہوئی بھی تو سامعہ نے گڑیا کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ وہ اپنے اور سالار کے معاملات سے گڑیا کو بڑی حد تک دور ہی رکھتی تھی۔ وجہ وہی تھی..... سالار کا مزاج جو اگر بگڑ جاتا تو اس کی زد میں کون، کب اور کس حد تک آ جاتا، اس بات کا سالار کو کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

سامعہ نے ان کی زندگیوں میں آکر بہت کچھ بڑی حد تک بدل ڈالا تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ سنوار ڈالا تھا تو چنداں غلط نہ ہو گا مگر کچھ چیزیں اب بھی اپنی جگہ پہ پوری شد و مد سے قائم تھیں۔ جن میں سے ایک سالار کا غصہ تھا تو دوسری اس کی بزدلی..... جس سے وہ چاہے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکتی تھی۔ سامعہ اس کو اسی خامی سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ مارشل آرٹ انسٹیٹیوٹ سے ایڈوائس کورس کے بعد کو ایجوکیشن کالج میں داخلہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ وقت کا پنچھی اپنے پروں سے کتنے ہی نئے رنگ پھینکنا ان کو رنگتا، اڑان بھرتا چلا گیا۔



تینتی دوپہر کی بھید بھری تنہائی میں اسے اچانک ہی کسی نانائوس احساس نے چوڑایا تھا۔ کمرے کے باہر وہ سالار کی آواز ہی تھی جو بند دروازے کی رکاوٹ کو عبور کرتی ہوئی اس تک پہنچ کر اسے سوتے میں ہوشیار کر گئی تھی۔

صاف اور واضح الفاظ تو سمجھ نہیں آ رہے تھے البتہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے آج پھر کسی بات پہ طیش پڑھا تھا۔

اس کا دل یک دم تاسف میں گھر گیا۔ وہ شعور کی اتنی سیرھیاں پھلانگ چکی تھی کہ اب اسے کبھی، کبھی اپنی ماں کے بے ضرر وجود پہ ترس بھی آنے لگتا تھا۔ ہلکی

غزل

بادل ہوں تو سرسرائی ہوا گدگدائے مجھے
کھل کے برسے بوندوں سے گدگدائے مجھے

بن کے برسوں ساون کی ایک لمبی جھڑی
خشک مٹی ہوں نم ہوا آ کے گدگدائے مجھے

ہوں اگر خوشبو بکھرا دے ہواؤں میں یونہی
ہوں جو غنچہ تو ہر تہلی گدگدائے مجھے

بن کے گر گھاس بچھوں سبز خالچہ سالکوں
اوس میں بھیکے ہر صبح گدگدائے مجھے

ہر اماؤں میں بھی نکلے وہ قمر بن جاؤں
بن کے چاندنی کافوں چھاکے گدگدائے مجھے
شاعرہ: بطیہ غصہ مغل، راول پنڈی

اس کی سبک بہتی ذہنی رونے زبردست جھٹکا
کھایا۔ آواز بلند تھی اور اتنی بلند تھی کہ کسروں کے بند
دروازوں میں دراڑیں ڈال گئی تھی۔

وہ ڈر کے مارے وہیں اچھل کے رہ گئی۔ خوف
سرسے پاؤں تلک اس کے وجود سے سرسراتا ہوا نکلا۔
”جھوٹ..... سب جھوٹ..... بکواس..... اپنا
منہ بند کرو.....“

اسے کچکی چڑھنے لگی۔ اس نے باپ کو اس سے
پہلے بھی بے شمار بار غصے میں دیکھا تھا۔ ان کی آواز بھی
سنی تھی مگر آج..... آج کچھ تھا اس آواز میں..... جس
نے برسوں بعد اسے اس طرح خوفزدہ کیا تھا جیسے وہ کبھی
بچپن میں ہو جایا کرتی تھی۔

”یا اللہ.....“ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے بے حد
آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔

آواز میں منمنانے کے صفائیاں پیش کرتی عورت اس ماں
سے کتنی مختلف تھی جو اس کی ہمت بندھاتی اسے روزنت
نئے چیلنجز کا سامنا کرنے یہ اسکا سہمی۔
گزر اسکو ل سے میٹرک کے بعد اس نے سامعہ
کے کہنے پہ ہی کوا بھیکشن میں ایڈمیشن لیا تھا۔

دو سال ہو گئے تھے وہاں اور اب وہ پہلے کی طرح
بات بات پہ گھبرا جانے والی بچی نہیں رہی تھی۔ وہ بہت
بدل گئی تھی، بے حد خود اعتماد ہو گئی تھی۔ اپنے کالج کے
تقریری مقابلوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ گوکہ بیسٹ ڈسٹریکٹ
نہیں تھی لیکن اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اب کراؤڈ کا
سامنا کر سکتی تھی۔ اسپورٹس میں بھی اس کا نام تھا۔ لڑکوں
کو دیکھ کر پہلے کی طرح اس کے سینے نہیں جھومتے تھے۔

اپنے بچپن میں وہ جس نام نہاد ہیولے سے خوف
کھاتی تھی وہ کب کا وہاں سے شفٹ کر گیا تھا۔ اب
اس بلڈنگ میں کوئی بندہ ایسا نہ تھا جس کی موجودگی
اسے آتے جاتے ہر سال کرتی اور یہ سب سامعہ کی
وجہ سے ممکن ہوا تھا لیکن سامعہ..... کبھی، کبھی اسے لگتا وہ
اول روز سے اس گھر میں اسی مقام پہ کھڑی تھی جہاں
سے اس نے اپنا ازدواجی سفر شروع کیا تھا۔ سالار کی
بیوی کی حیثیت سے معاشرے میں اس کا مقام اور
عزت سالار کے ہی ہاتھوں خاک میں مل جاتی تھی۔

اس کا دل کیا کہ جائے باپ کو روکے یا کچھ بھی نہ
کہے بس اسے اپنی موجودگی کی خبر دے دے تو شاید اس
کی تیزی سے چلتی زبان کو جو ان اولاد کا لحاظ آجائے۔
وہ خیال کر کے ابھی بھی مگر پھر کسی خیال نے
اسے تمام لیا۔ ہو سکتا ہے سامعہ کو یہ بات پسند نہ آئے۔

کچھ معاملات میں اس نے اول روز سے اسے
دور، دور ہی رکھا تھا۔ گڑیا کو اب یہ بات عجیب محسوس
ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا ایسا کر کے سامعہ اسے گھریلو
الگھنوں سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ جو یقیناً صرف اور
صرف اس کے باپ کے حوالے سے ہی ہو سکتی تھیں۔

بھلا اس کے علاوہ اور کیا.....
”بکواس بند کرو.....“

”اوہ.....“ حیرت کی زیادتی سے اس کے رو جھکنے کھڑے ہو گئے۔

سالار، سامعہ کو باہر کی طرف گھنٹ رپا تھا۔
”یا اللہ..... آج کیا ہو گیا ابو کو..... پاگل ہو گئے ہیں بالکل.....“

اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا لیکن یہ حقیقت ہی تھی..... شاید آج..... آج کوئی ایسی بات ہو گئی تھی جس میں سامعہ واقعی قصور وار تھی۔

سالار کے ہاتھ میں سامعہ کا موبائل تھا۔ جس پہ تیل ہوئی۔ مدھری رنگ لون گوئی۔

سالار نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑا اور اپنے ہاتھ میں تھا موبائل پوری قوت سے زمین پر پٹنا۔ نازک سا سیل فون ایک چھتا کے سے کئی حصوں میں بٹ گیا۔

گڑیا کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ ایسی نوبت تو کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ اب دوبارہ اسے باہر کی طرف کھینچ رہا تھا۔ سامعہ اس کی منتیں کر رہی تھی۔

یہ منظر بہت بد صورت ہونے کے باوجود اسے عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا۔ ہمیشہ کی طرح سالار کے بگڑنے پہ سامعہ کے لبوں پہ مسکراہٹ ہوتی

اور زبان پر صفائیاں پھر آج، ایسے پتھیں کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔ کیا آج سچ سچ اس سے کوئی نا قابل معافی قسم کی غلطی ہو گئی تھی۔

اس کی پچھلی ہوئی پٹیوں میں کئی منظر یک ساتھ ابھرے۔

☆☆☆

”عامرہ کا لنگ“ کے الفاظ بہت دیر سے موبائل اسکرین پہ چمک رہے تھے۔ مسلسل بجتی تیل اس کی پڑھائی میں غلغل ڈال رہی تھی۔

”امی..... کب سے فون بند رہا ہے۔ پلیز دیکھ لیں۔“ اسے سامعہ کا فون اینڈ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ نہ ضرورت تھی لیکن اس سے بڑھ کر اسے اجازت بھی نہیں تھی۔

اس نے سامعہ کے محبت بھرے رویے سے اسے اپنا سب کچھ مان کر کبھی اس سے بحث کرنے کی کوشش

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 100

نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سامعہ کی طرف سے پرائیویسی کے نام پہ لگائی گئی یہ معمولی پابندیاں کبھی بری لگتیں نہ محسوس ہوتی تھیں۔ ویسے وہ جب چاہے ضرورت پڑنے پر اس کے فون سے کال کر سکتی تھی۔ لیکن عام حالات میں سامعہ کے فون پہ ہمیشہ پیٹرن یا پاس ورڈ ہوتا تھا۔ جو اس کا خیال تھا کہ سالار کے علم میں تو ہو گا ہی.....

”سوری بے بی میری وجہ سے آپ ڈسٹرب ہو گئیں۔“ نہادھو کے نکلی ٹھہری تروتازہ سامعہ نے بڑے شگفتہ انداز میں اس سے کہہ کے فون اٹھایا۔ گڑیا جو اس کا سر ابا دیکھ کے سوچنے لگی تھی کہ امی میری امی کہیں سے نہیں لگتیں۔ اس کی بات سن کر مسکرا اٹھی۔

تجھی اس کے مسکراتے لب بالکل اچانک سڑ گئے۔ فون کے دوسری طرف سے کسی کے بولنے کی بہت لمبی سی آواز آئی تھی۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اسپیکر آف ہونے کے باوجود کبھی، کبھی دوسری طرف کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ مگر گڑیا کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ آواز کسی مرد کی تھی۔ جبکہ فون پہ عامرہ کا لنگ کے الفاظ اس نے خود پڑھے تھے۔

☆☆☆

زندگی کی بہت میں کہیں، کہیں کوئی گرہ غلط لگ جاتی ہے۔ ہم بے دھیانی میں جتنے چلے جاتے ہیں اور جب سارا ڈیزائن الجھ جاتا ہے تب سلجھانے بیٹھیں تو پتا چلتا ہے کہ صرف ایک نہیں کئی ایک گرہیں الٹی ہیں۔

کہیں غلط مل کہیں بے ضرورت گھر پھندے ڈالے ہوئے ہیں۔ ان کو سلجھانا کتنا ٹھن ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے جو الجھنوں اور الجھنوں کے اس جوہم سے گزرا ہو، اک ذرا سی بے پروائی وقت کے گھوڑے کو سر پٹ دوڑا کے کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔

اس سے بھی بے دھیانی ہوئی۔ بے پروائی ہوئی..... ایک نہیں کئی بار.....

جب بہت سال پہلے مارشل آرٹس میں ایڈمشن کے وقت سامعہ کا آئی ڈی کا ڈسٹ اس کے اپنے بیک میں ہی تھا تو وہ کیا لینے اور پرک گئی تھی؟ اس نے دھیان نہیں

caretofun

معاذیں مانگ رہی تھی۔

اس کی ماں، جو اس کی ڈھال تھی۔ جو کم عمر تھی اگرچہ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی لیکن اس کے لیے سگی سے بڑھ کر تھی۔

اس کے قدموں نے میکا کی انداز میں حرکت کی اور جا کے باپ کے سامنے ٹھہر گئی۔
سارا منظر ٹھہر گیا۔ الفاظ چپ، گہری خاموشی، سناٹا..... بس چند بل کے لیے۔
پھر آنکھوں کے آگے اندھرا چھا گیا۔

☆☆☆

کچھ حادثات انسان کی زندگی میں باہر جتنی خاموشی سے ہو گزرتے ہیں، اندر اتنی ہی تباہی مچاتے ہیں۔

اس کی زندگی کے قریب ترین دونوں رشتوں اور خود اس کے اندر بھی اتنی ہی اٹھاٹھ ہوئی کہ اعصاب جواب دے گئے۔ صرف اس کے اپنے لیے نہیں اس کے باپ کے لیے بھی یہ گمان رکھنا کہ ان کی زندگی میں سب سے نزدیک موجود عورت بے ایمان بھی باکسی بھی معاملے میں ان دونوں کے علاوہ بھی کسی کی راز دار بھی، ایک بیدار قیاس امر تھا.....
پھر اسے حقیقت تسلیم کر لینا اور بھی مشکل۔

اس گھر میں رہنا، آتے جاتے ملنے ملانے والوں کی نظروں اور معنی خیز فقروں کا سامنا باپ بیٹی کے لیے محال ہو گیا۔ غلطی کسی اور کی جینا ان کا حرام ہوا۔ گھر چھوٹا، پڑھائی چھوٹی۔ سارے رنگ پھیکے پڑ گئے اور سب سے بڑھ کے وہ خود کتنی اکیلی رہ گئی۔

دن بھر تنہا گھر، نئی جگہ یہ خود سے لڑتے جھگڑتے، اسی ادھیڑ بن اور خود کو یقین دلاتے گزرتے کہ وہ جسے ساری زندگی برا سمجھتی رہی، وہ اس کا باپ تو صرف ظاہر ابرا تھا کیونکہ وہ مصروف غصے کا تیز تھا۔

”اور سامعہ..... میری ماں.....؟“

اس کے بے سمت دوڑتے خیالات میں کہیں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ایک دل کہتا کہ نہیں، انہوں نے میرے ساتھ کیا برا کیا۔ میرے لیے تو وہ اچھی ہی تھیں۔ اسی لمحے کوئی پکار اٹھتا کہ برا کیا تب ہی بری بنی ناں.....

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء

دیا۔ اپنے آپ ہی توجیہات دے دلا کہ خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ اسی طرح ایک اور وقت جب سامعہ، سالار اور وہ کہیں سے واپس آئے تو دروازے پر کچرا پڑا تھا۔
سالار کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ اس نے وہیں دروازے پہ ہی سامعہ سے جواب طلبی کی۔

”میں نے آج گڑیا سے کہہ دیا تھا۔ یہ شاید بھول گئی۔“
اس کی آنکھیں پھٹنے والی ہو گئی تھیں۔

سامعہ نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ صفائی کا کام بلکہ زیادہ تر گھر کے کام خود ہی کرتی تھی۔ وہ تو اسے اکثر سالار کی ڈانٹ سے بچا لیا کرتی تھی پھر اس نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔ وہ تو اس کی ڈھال تھی پھر کیوں اسے خود ہی سے وار کے سامنے کر دیا تھا۔

”دروازے پہ کھڑے ہو کر ابو مجھے ڈانٹتے آپ کو اچھا لگتا کیا؟“ بعد میں سامعہ نے محسوس سامنے بنا کے اس کے پوچھنے پہ الٹا جو سوال کیا، اس سے گڑیا کے دل سے ساری شکایت جاتی رہی۔

”کیا ہوا جو امی نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ذرا سا جھوٹ بول دیا۔“

لیکن یہ ذرا سا جھوٹ اس کے سامنے نہیں کسی اور کے سامنے انسلٹ سے بچنے کے لیے بولا گیا تھا۔ گڑیا کو کبھی پتا نہیں چل سکا کہ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہیں ان کے درمیان، ان تینوں کے بیچ اور بہت قریب..... صرف ایک ولیز کا ہی تو فاصلہ تھا۔

آمنے سامنے کے دو دروازوں اور دو چوکھٹوں کے درمیان فقط تین قدموں کے فاصلے پہ گھات لگائے بیٹھا بلا..... ایک آوارہ بلا جو کمر و کھر کی کے ہلنے قبضوں سے امد، امد کرائی تازہ گوشت کی باس پا گیا تھا۔

یہ تو اسے آج معلوم ہوا تھا۔ اتنی دیر سے، اب..... اب کہیں جا کے.....

اس کی سیدھی سادی زندگی الجھ گئی تھی۔ سارے ٹانگے لٹے پڑ گئے تھے۔

اس کا باپ چلا رہا تھا۔ انگلیاں اٹھا، اٹھا کے اس طرف اشارے کر رہا تھا۔ اس کی ماں رو رہی تھی،

شوہر، گھر اور بچی کے ہوتے ہوئے کسی اور مرد کے ساتھ..... اس کے لیے پوری بات سوچنا ہی ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

قصہ مختصر کہ وقت سے بڑا بے وفا آج تک دریافت نہ ہو سکا کہ یہ کسی کے لیے رکنا نہیں۔ نہ دادرسی کے لیے، نہ دل جوئی کے لیے، نہ شدید حیرت کے سے پر، نہ گہرے دکھ پر اور خوشی کی شکل دیکھ کے تو ویسے ہی سر پٹ بھاگتا ہے۔

سامعہ..... سالار اور گڑیا کی زندگی میں جیسے خوشبو کے جھوکے مانند آئی تھی ویسے ہی آوارہ بادل کی طرح کہیں چلی گئی۔ کہاں، اسے معلوم نہ ہو سکا۔ نہ جانے اور کھوجنے کی ہمت ہی پڑی۔ اسے آج بھی اپنے باپ سے خوف آتا تھا۔

سامعہ کے جانے نے اس کی شخصیت پر دوسری بار گہرا اثر چھوڑا۔ پہلی بار اس کے آنے پہ اس نے مسکراتا سیکھا تھا۔ خوف بھگاتا سیکھا تھا۔ اب اس کے جانے نے اسے سناٹا سکھا دیا۔ وہ ننھی بچی کی طرح ڈری ضرور لیکن اس خوف پر خود کو حاوی کرنے کے بجائے اک خول میں سٹ گئی۔ باپ بیٹی ایک ہی چھت تلے مانوس اجنبیوں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ اس نے خود ہی دل بہلانے کے لیے پڑھا کی دوبارہ شروع کر دی۔

آنرز کے بعد تنہائی میں یہاں وہاں پھرتی سوال کرتی پر چھائیوں سے تنگ آ کر جا ب ڈھونڈ لی۔

وہ سوال ہوتے ہی اتنے اذوق تھے کہ وہ ان کے جواب ڈھونڈ کر خود کو ہلکان کرنے کی ہمت خود میں ہی نہیں پاتی تھی۔

ایک عورت اپنے شوہر کو دھوکا دے سکتی ہے؟

کتنے سال تک.....

قصہ کس کا تھا.....

احساس محرومی انسان کو کتنی ہستی تک لے جاسکتا ہے۔

کیا بلندی پہ بھی لے جاسکتا ہے.....؟

مردوں کو معاشرے میں اتنی کھلی چھوٹ کیوں ہے؟

اس دوسرے کو کبھی کسی نے دھکا مارا ہوگا.....

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 102

اس پہ بھی انگلیاں اٹھیں ہوں گی.....
میری ماں کو کیا کمی تھی، کون سی محرومی تھی.....
مرد عورت سے کیا چاہتا ہے.....
صرف مرد کے لیے زندگی بھر کا نانا توڑنا اتنا آسان ہوتا ہے.....

عورت کیا چاہتی ہے مرد سے.....
اُف..... اُف..... اُف..... کتنے سوالات اس کے معصوم ذہن میں گھبراتے رہتے۔

☆☆☆

”محترمہ باس آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“
”کیوں؟“ صبح پینشنی، کی کیا ضرورت آگئی ہے۔
”شاید آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“
”لیکن کیوں؟“ اس عجیب سے جواب پر حیرانی کم پریشانی زیادہ تھی۔

”آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کے اپائنٹمنٹ کے وقت باس ملک میں نہیں تھے۔ وہ سارے نیوکمرز کے ساتھ میٹنگ کر چکے ہیں۔“
”اوکے.....!“ جائے بنا چارہ نہ تھا۔

لمبی چوڑی میز کے دوسری طرف جوہتی تشریف فرام تھی اگر وہ رتی برابر جانتی کہ یہ باس ہیں تو یہاں کے بجائے سیدھا باہر کا رخ کرتی۔

وہ مرد تو اسے نہ پہچانتا لیکن وہ خوب پہچان گئی تھی۔ وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی وہ چہرہ جس نے اس کی زندگی تلپٹ کر کے رکھ دی تھی۔

ملاقات تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ اس کا دماغ اس قدر ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی بات کا ٹھیک سے جواب نہیں دے سکتی.....

باس کی بھی اس کے بارے میں رائے اچھی نہیں

رہی۔ کرے سے باہر نکلنے وقت وہ یہ جا ب چھوڑنے کا مکمل ارادہ کر چکی تھی۔ اس نے اسی روز سے دوسری جگہوں پہ دیکھنا اور اپلائی کرنا شروع کر دیا۔ آفس میں اس کا سنجیدہ رویہ مشہور ہو رہا تھا ہی، وہ کچھ اور لیے دیے رہنے لگی۔ اس کی ایک وجہ باس کی آفس میں شہرت بھی

بناوٹ آمیز تھا۔

”کوئی خطا ہوگئی ہم سے..... آپ کہیں..... ہم ابھی تلافی کیے دیتے ہیں۔“

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بس..... اسی لمحے فیصلہ ہو گیا۔ اس نے بے حد سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا..... اور دوسرے ہاتھ کا زوردار پینچ اس کے جڑے پہ رسید کر دیا۔ برسوں پرانی کرائے کی پریکٹس جو کسی بے مہر کی مہربانی تھی، کب جا کے کام آئی تھی۔ اس کا گڑیا کو اندازہ نہ تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ کرسی دھکیل کر دوسری جانب سے کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ مخالف سمت میں ہلکا سا جھٹکا کھا گیا۔ لمحے بھر میں اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

”سالی تیری اتنی ہمت.....“

زخمی بھیڑیے کی طرح وہ بل کھا کے پلٹا۔ وہ پہلے ہی تیار تھی۔ وہ اس پہ لپکا۔ گڑیا نے جھکائی دے کے جھٹ سے اس کا بازو پکڑ کے پیچھے کی طرف موڑ دیا۔

بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمری تک آتے، آتے بڑا فرق آ جاتا ہے۔ اس سے دونوں ہی نے اس فرق کو محسوس کر لیا۔

”میں اس سے زیادہ بھی ہمت بھی کر سکتی ہوں۔ مجھے سامعہ بھگنے کی غلطی ہرگز مت کیجیے گا۔“

دُہرے ہوتے وجود کو گھسنے کی مدد سے آگے کی سمت دھکیلتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے ایک ہلکی ضرب اس کی گردن کی پشت پر لگائی۔ وہ آگے کی جانب دھکا کھا کے پلٹا تو اس کے چہرے پہ تکلیف اور حیرت ایک ساتھ نمایاں تھی۔

اس نے بنا کچھ کہے اپنا بیگ اٹھایا اور تیر کی سی تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

بہت سے سوال اب بھی آنکھیں کھولے اس کی راہ تک رہے تھے لیکن ایک بات کا انکشاف آج خوب ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ڈھال سامعہ خود شکار ہو گئی تھی لیکن جاتے، جاتے اسے اپنی حفاظت کرنا سکھا گئی تھی۔

تھی۔ اکثریت کے خیال میں وہ ایک قدرتی آدمی تھے۔ ان کے شراب و شباب کے شوق کا آدھا اسٹاف گواہ تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات بھلا اور کون جان سکتا تھا۔ اس کا تو گھر اسی نے ڈس لیا تھا اور اس کے زہر کی ٹیلا ہٹ سالوں گزر جانے کے بعد بھی اس کے خوابوں کو بد رنگ کیے ہوئے تھی۔

عمر میں اضافے کے ساتھ بالکل معمولی سے بھاری جسم کے ساتھ اس شخص میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”پتا نہیں امی کیسی اور کہاں ہوں گی..... ظاہر ہے۔ اس دھوکے باز شخص نے ان سے شادی تو نہیں کی ہوگی۔“

اسے رہ، رہ کر اس بندے پہ پیش آئے جاتا۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھنے پہ اس کے زخم کھرچ سے گئے تھے۔ اوپر سے آئے دن کا بڑھتا الثقات..... اس کا دل چاہتا کہ اس کی بتی تو ڈر کا ہاتھ میں رکھ دے۔ اس نے کتنی ہی بار اس بے اختیار خواہش کو دبایا تھا۔ لیکن پھر ایک دن توحہ ہو گئی۔

وہ اس کے پاس تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس کے مالک ہی بن جاتے۔

”سر پلیز اگر کام کی بات کرنی ہے تو کریں..... ورنہ پلیز میرا ٹائم ویسٹ مت کریں۔ مجھے سب کام واسٹاپ کرنا ہے آج ہر حال میں۔“

اس کا لہجہ سچ تھا لیکن اس پہ رتی برابر اثر نہ ہوا۔

”ارے نس، پتا نہیں آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے۔ کبھی ہمارے لیے بھی ٹائم نکال لیا کریں۔“ ایک اعزاز دلہرانہ سے کہتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے بالکل برابر میں ٹیبل پہ ذرا کی ذرا ٹک گیا۔

اس کی سانس چڑھنے لگی۔ ٹیڈ گلاس وال لگووانے کی ہلکی وجہی کہ وہ سب کو دیکھ سکے لیکن کوئی اسے نہ دیکھ پائے۔

”اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں مس تبسم!“ اس نے دل میں پہلی بار اپنے نام سے شدید نفرت محسوس کی۔

”میں ریزائن کر رہی ہوں ابھی اسی وقت.....“

”اوہو، ہو..... اتنا غصہ.....“ اس کا تعجب



اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا..... آس پاس ٹھہرے
مردوں کا رویہ مؤدبانہ ہو گیا اور وہ ایک طرف ہونے
لگے۔ پانی کی ڈولی شانہ اور صفہ کو ملی تو دنیا کی عظیم ترین
مہمان نوازی یہ تازہ، زندہ، زندہ کر دینے والا پانی لگا۔
عورتیں جو اکٹھی ہوئی تھیں وہ واپس نہ گئیں بلکہ
ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو عورتیں، مسلم
کتابی، سب ملی جلی ہوئی تھیں یہ تو بعد میں شہر یا ر منگر یو
نے ان کے علم میں اضافہ کیا کہ مقامی لوگ روٹی پانی
کی خاطر مشریوں، این جی اوز یا کسی بھی دیا لو کے بن

وہ پرنسپل محترمہ عائشہ صبیحہ انزہری تھی؟ جیسے ایک
نامحسوس تصدیق سب کو الہام ہوئی ہو..... صفہ کو یاد
آگیا۔ وہ قدم بوسی، چرن چھوٹا، ناپسند کرتی تھیں ہمیشہ
ایک مکمل سلام..... ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ.....“
برسوں پیچھے سے صفی کی آواز زمانہ موجود میں لوٹی۔
اس جھونپڑی میں واحد کشش پانی سے گیلال لال
مٹکا (کھڑا) تھا جو چھینکے میں دھرا ہوا تھا۔ (غالبا ہوا
لگ کر ٹھنڈا ہونے کو) اس کے اندر کوری مٹی کی ڈولی
ڈال کر اماں نے اپنے ہاتھ سے اذان، منکر یو کو پانی دیا



وہ جنت ہے۔“

تھری باشندے کو لفظ پانی کی سمجھ آئی تو آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر پھر جھگی کی طرف اشارہ کر کے دُہرانے لگا۔ ”پانی، پانی“ مگر یونے اس کا کندھا تھکا دونوں مسکرائے پھر وہ واپسی، بڑول اور کھانے پینے کی اشیاء کے کارشن کی بات کرنے لگے۔ جیب کی طرف صفحہ کے کہنے پر پانی والی اماں نے اپنے مرید بچے (جو اصل میں مرد تھے) حفاظت کے لیے روانہ کر دیے تھے۔ اب ہلکی، ہلکی ہوا چلنے لگی تھی جو گرم نہ تھی بلکہ خوشگوار تھی جسے رات کے گزرتے ہر پہر کے ساتھ ٹھنڈا ہونا تھا۔ اندھیرا اچھا گیا تھا۔ چاند اور تاروں کی ضو کا پہلی بار احساس ہو رہا تھا۔ تھری باشندہ کھانا لینے چلا گیا تھا۔ بھوک سے آنتیں قل حوالہ پڑ رہی تھیں۔ شبانہ اپنی چادر کو خود پر پھیلا کر بچتے اذان کے ساتھ لیٹ رہی تھی۔ مگر یو کو نیند کی جھپکیوں میں روٹی کا انتظار سونے نہ دیتا تھا۔

صفحہ پانی والی اماں کے ہاتھ سے مٹھی بھر بھجوریں، آب خورہ بھر پانی لے کر ایسا پڑ پاش ہوئی کہ وہیں فرش پر گہری نیند سو گئی۔ یہ نیند اڑھائی گھنٹے کی تھی۔ وہی اڑھائی گھنٹے جو شبانہ، اذان اور مگر یو نے اینٹھ، اینٹھ کر کھانے کے انتظار میں گزارے۔ جب جو کی روٹیاں، خشک گوشت کا شوربہ اور دودھ پر مشتمل کھانا آیا جو کہ غریب بستی کی طرف سے ممکن حد تک مہمان داری تھی تو وہ نندیدوں کی طرح اپنے حصے، اپنی تھالی پر ٹوٹ پڑے۔ ویسے یہ دستور بھی خوب تھا کہ بندوں کے حساب سے رکابیاں چار اور روٹیاں بارہ تھیں۔ تین، تین روٹیاں مردوں کے لیے، دو، دو مہمان عورتوں کے لیے۔ ایک اماں اور ایک اس کی بیٹی کے لیے، پانی والی اماں نے دودھ کا کنورا اور روٹی لی، بیٹی کو شوربہ روٹی پہ مل دیا۔ (یہ ان کا معمول ہوتا ہوگا) سب کھا چکے، جس نے پسند کیا دودھ پیا، صفحہ نے پانی کا آب خورہ بھر کر ساتھ رکھ لیا۔ اب بستی کی طرف سے ایک چار پانی بھی لا دی گئی تھی (جو دونوں مہمان خواتین

پھر چھوڑ دیتے، اس اول بدل میں پوجا پاٹ دل مل گئی تھی۔ اول پیٹ پوجا پھر کوئی کام دو جا قانون فطرت تھا۔ ان کے درمیان بستے ہوئے انسان کا درد..... انسان کی مدد اور مدد ادا سب سے بڑا آئین تسلیم ہونے لگا، وہاں دور سے آنے والے مہمانوں کی آمد کو روپوں کی تقسیم، فلم، فوٹو، کے عمل کا ڈھراؤ سمجھ کے منتظر جھولیاں اور تارکتی آنکھیں کھل جاتیں۔ مگر ”پانی والی اماں“ نے اپنے کسی انداز و الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ان کی خاص مہمان ہیں..... اور اب وہ مؤذوب اور مرعوب ہونے لگیں۔ اور بکھرنے لگیں۔ یوں بھی شبانہ اور صفحہ ساز و سامان والی پھر تیلی فیشی نہ لگیں۔ شام وصل گئی تھی۔ کٹھور ریت اب پاؤں تلے مہریان ہو گئی تھی۔ جھوپڑی کے باہر ایک بڑے کھٹولے پر درری بچھادی گئی جہاں اذان اور مگر یو ٹانگیں پھیلا کر لیٹے تھے۔ کوئی پانی والی اماں کا معتقدان کی ٹانگیں دبار ہاتھا اور قے سنار ہاتھا ان کی روٹی پانی کا بند و بست بستی کے اندر کسی کے گھر ہو رہا تھا۔ کیونکہ جھگی کے قریب بنا ہوا اینٹوں کا چوٹھا بے جان پڑا تھا۔ اس میں پڑی تھوڑی سی راکھ اپنے منہ بولی تھی کہ اس کے جلنے کی نوبت کبھی کبھار آتی ہے۔

شبانہ اذان کی طرف آگئی وہ کچھ پریشان ہو رہی تھی۔ ”یہاں کوئی چار پانی نہیں ہے، لگتا ہے ہمیں نیچے سونا ہوگا، میں بہت تھک گئی ہوں، بھوک بھی لگی ہے۔“ اذان نے پاس رکھے ایک برتن کا ڈھکن اتار اور شبانہ پچھو کو بڑھایا اس میں بھجوریں تھیں۔

”نہیں، مجھے روٹی، سالن چاول والی منہ بھر کھانے کی بھوک لگی ہے۔“ انکار کر کے بھی اس نے چند بھجوریں اٹھالیں اور کھانے لگی۔

مگر یو آسمان پر مٹے، مٹے تارے کھوجتے ہوئے شکر سے لبریز آواز میں بولا۔

”خدا کی قسم..... ہمیں تو اللہ نے دنیا میں جنت دے رکھی ہے، کسی محنت، کسی تھکاوٹ کے بغیر اتنا سایہ، ٹھنڈک، پانی ہم مانیں یا نہ مانیں جہاں ہم رہتے ہیں

ہوتی ہے کہ جس کا ڈر ہنسنے نہ دے، سب سے بڑا خوف پانی سے ترس کے مرنا ہے، یہاں کی عورت کو سارے دن میں ایک کام کافی ہے، پانی لانا، پانی سنبھالنا اور پھر پانی لانا..... دو تین گھڑے پانی جو پیاس کے مارے گھر پہنچتے تک پی لیا جائے..... مگر اسے بچا، بچا کے گھر لانا ہے کیونکہ وہاں جگر گوشے راہ تک رہے ہیں..... سیکینہ نے بتایا کہ کوئی جو بڑی رئیس زادیاں ہیں وہ گدھا رڑھے یا گدھے کی پشت پر پانی کے گھڑے رکھ لاتیں اور تھپی ایسی ہوتیں جو انہیں رنگ کی نگاہ سے دیکھتیں، بارش برس جائے تو بارش کا پانی سونے کے زیور سے زیادہ قیمت سنبھال کے رکھا جاتا ہے۔ مینہ کا کیسا ہوتا ہے بھلا..... جس میں مینڈک تیرتے ہیں، کیڑے کوڑے ہوتے ہیں جس کا دلہنی رنگ ہوتا ہے اس کو کپڑے سے چھان کر چھینکے میں برتن رکھا جاتا ہے اس مجھے اس بچی سیکینہ نے..... چھوٹے ہوتے سنا تھا..... کسی کو ایک گلاس پانی پلانا تو نفل ثواب ہے..... یعنی وہ پانی جو چند قدم تک گھر میں صاف ستھرا موجود ہے۔ پیاس کے جنگل میں پانی کا پیڑ لگانا..... میرا جی کھل اٹھا۔ باغوں، باغوں ہو گیا..... مگر صفہ..... اس راہ میں ایک نہیں، دو نہیں، ان نعمت رکاوٹیں تھیں۔“ وہ دونوں مست خرام تھیں، صحرا کی روضیں چل رہی تھیں۔ شفاف آسمان پر چاند چل رہا تھا۔ لائق رات چل رہی تھی۔ مجید بھری ہوا چل رہی تھی۔ مگر سناٹا ایسا تھا کہ اپنی سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔

”یہاں کوئی آواز نہیں ہے.....“ صفہ نے کہا۔
 ”اب تو یہاں رب کا فضل ہی فضل ہے۔ جانور پرند آتے ہیں..... فجر سورج نہیں کنویں پہ لے جاؤں گی۔“
 ”آپ نے کیسے کھدوا لیا؟“

”اللہ نے میرے ذریعے کھدواتا تھا۔ اللہ..... میری حیات ترا سجدہ..... میری سانس..... تیرا سجدہ..... ہنسون، ہنسون..... کتنا ہنسون..... روؤں، روؤں..... کتنا روؤں..... جتنا ہنسون ترا شکر ہنساتا،

کے لیے تھی) شانہ تو اس پر لپٹتے ہی سو گئی۔ صفہ عشا کی نماز ادا کرنے لگی۔ ایک اندھیا راسکوت، سیاہی مائل، نیلا آسمان، تاجہ نظر لہریہ ریت..... یہ نماز جدا گانہ احساس تھی کبھی بلندیوں کی طرف تاجہ نظر کبھی قدموں کے آگے تاجہ نظر..... مگر حد نظر تھی ہی کیا؟ سلام پھیرا ہی تھا کہ تھر کی نمائندہ آواز وہی ”پگنی“ کی آواز دور سے آنے لگی۔ وہ اب کہیں دور تھی۔ ”پار کردی پدمنی..... اور..... پیہا..... پانی“ کے لفظ سمجھ آتے تھے۔ یہاں بھی حسن کے گیت، مہور، پیہا کی رنگوں اور آواز میں خوشیوں کی بشارتیں تلاش کی جاتی تھیں۔ پانی کا لفظ تو دلوں کی تراوٹ سے ادا ہوتا تھا۔ اللہ کے راز بندہ کیا جانے، اس نے برف سے لدے پہاڑ بنائے۔ سبز ج علاقے سجائے، پانیوں کے جھاگ اڑاتے دریا بہائے، اور ترستی پیاسی ریت کے تاجہ قدم صحرا بچھائے۔ اللہ کی مخلوق ہر جا بہتی ہے، یہاں بھی بہتی ہے..... مگر سرشاری عاقلہ صبیحہ یہاں کیوں آہستہ؟ یہ راز کیا ہے؟ آگے خلوتوں بھری رات تھی۔ یاران نکتہ داں کی ملاقات تھی، کئی کنھن کوس پار کر کے اضطراب لایا تھا۔ یہی وہ پہر تھا جو نایاب تھا۔ وہ دونوں بیٹھی تھیں..... سر کے اوپر نیلا ہٹ ہی نیلا ہٹ..... پاؤں کے نیچے سرمئی ریت..... نیلا ہٹ ایک گمان تھا..... سرمئی رنگ ایک سراپ تھا۔ جو سوال صفہ کے ہونٹوں پر ابھی آیا نہیں تھا وہ آنکھوں سے پڑھ لیا گیا۔

”تو سنو..... درس گاہ میں ایک طالبہ سیکینہ ساندھی ضلع سے آکر داخل ہوئی تھی..... میں اس کو دیکھتی، وہ پانی کو کبھی زمین پر گرنے نہیں دیتی تھی۔ پانی پیتی تو بچا ہوا قطرہ سر میں تھپک لیتی..... خالی گلاس کو آنکھوں پر پھیرتی، ایک دن میں نے اسے بلا کر پوچھا۔

”سیکینہ..... غلام غلام..... سیکینہ بی بی کر بلا..... کہاں سے آئی ہو؟“ اس کی آنکھیں چمک پڑیں..... جو حال سنایا وہ میری آنکھیں کھول دینے کو کافی تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ ہم تو کھاتے بیٹے لوگ شمارے ہوتے ہیں مگر کھانا پیتا ہوتا کیا ہے، یہ مجھے شہر آکر پتا چلا۔ بھوک وہ

جتنا روؤں ترا شکر مڑلاتا۔۔۔“ وہ خود کلام ہو گئیں۔ صفحہ
نے پھر متوجہ کرنے کی جسارت کی۔

”پھر بھی آپ نے اکیلے کیسے کر لیا مرشدی؟“
”لیکنہ ساندہ کی باتیں سن کر میرا دل منبر، محراب کی
شوکت سے اٹھ گیا بلکہ ایک احساسِ زیاں نے روح کو گھیر
لیا۔۔۔ صفحہ۔۔۔ یاد رکھ۔۔۔ بہت مشکل ہوتا ہے۔۔۔ خود
کے لیے یہ جانچنا کہ جو ہم اچھا کر رہے ہیں، وہ اچھا
بھی ہے۔ کبھی، کبھی موٹے بادام کے اندر سے سوکھا سڑا
بادام نکلتا ہے ناں۔۔۔ وہ ایک سڑی دوپہر کو روزے کی
حلق میں اتری پیاس تھی جس نے مجھ سے فیصلہ کرایا اور
میں نے لیکنہ ساندہ کو کہا۔۔۔ مجھے تیرے تھر کے بغیر میں
پانی پہنچانا ہے۔۔۔ وہ حیران ہو کے تنکنے لگی۔۔۔ ”تم
میری کیا مدد کر سکتی ہو؟ روپے پیسے کی مدد نہیں چاہیے۔“
وہ سوکھی سانولی پیاری بھی بولی۔ ”میں آپ کی ہر
ممکن مدد کر سکتی ہوں۔“ اس کا ایک بڑا بھائی جعفر افسکل
انجینئرنگ پڑھا تھا۔ پڑھائی والا گھرا تھا۔ اس کا نام
سلیم ساندہ تھا۔ اس کو اپنے علاقے کی محرومی کا درد تھا۔
اس کو بدلے اس کی پیاس مٹانے کے خواب تھے تجویزیں
تھیں۔ وہ مہم جو اور باہر شباب تھا مگر وسائل نہ تھے۔
میں پیسے والی بڑھیا تھی۔۔۔ پھر میں نے اپنا گھر چھ
دیا، زیور بیچ دیے، سب کچھ ڈال دیا۔۔۔ میں
بولی۔۔۔ ”سلیم ساندہ چل آگے بڑھ۔۔۔ عثمان غنیؓ کی
پیروی کر۔۔۔ اس نے کمر کس لی۔۔۔ ٹیم لے کے ہستی،
بستی معائنہ کرایا۔۔۔ ادھر پانی کی امید نکلی۔۔۔ دو سو فٹ
کھدائی ہوئی۔۔۔ کوئی پانی نہیں۔۔۔ تین سو فٹ
کھدائی۔۔۔ جدید اسرارٹ مشین مگر۔۔۔ مزدوری تو
مزدوروں نے کی، مفت کھانا دیتی، ہر دوسرے دن
اونٹ ریزے اگلے پڑاؤ تک جاتے، سلیم ساندہ
مزدوروں کو کہتا کہ جو تھک گیا پلٹ جائے نہادھو کہ پھر
لوٹے۔ مگر غربت اتنی ہے کہ وہ مٹیں کرتے، نہانا تو
بارش کے بارش ہوتا تھا، ٹوبے کے پانی پر نہانے میں
جھگڑے ہوتے۔ چراگاہ کا یہاں تصور
نہیں۔۔۔ مریل بھیڑیں، ادھ موٹی بکریاں، اونٹ بھی

لاچار سے۔۔۔ گردوں کی پتھری یہاں عام بات
ہے۔۔۔ ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ۔۔۔ کبڑا ہو جاتا، آبی
لاچاری، میں نے ساٹھ سال کی عمر میں نہ دیکھی تھی جو
یہاں آکے دیکھ لی۔۔۔ ساندہ کہتا۔ ”اماں یہاں 70 فیصد
اسکیسین فیل ہو جاتی ہیں۔“ میں ہمت دلاتی، موقع
دینے والا موقع بند نہ کرے پاس ہم ہو کے دکھائیں
گے۔۔۔ چانس باقی رہے امید باقی رہے ناں۔۔۔ خدا تو
آزمانے کے ہزاروں طریقے رکھتا ہے۔ ہم جن کے
خلیے پانی سے تر ہوتے ہیں پیٹ چھل، چھل پانی سے
بھرے، ہم پر چھوٹی سی تنگی آئے تو بڑی دلیری سے سوال
کرتے ہیں۔ ”یا اللہ میں نے کیا گناہ کیا؟“ انسان نے
اگر کوئی بھی گناہ نہ کیا ہو تو بھی اتنا گناہ کافی ہے کہ وہ
دوسرے دکھی انسانوں سے بے پروا رہے۔۔۔ وہ دونوں
اب ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھی تھیں۔

”صفحہ۔۔۔ جس دن مجھے خبر ملی۔۔۔“ اماں ہم پانی
تک پہنچ گئے۔“ تیری یہ گناہ گار، پیاس سے
خائف۔۔۔ استاد چل پڑی، ادھر آکے جھکی لگالی۔
جینے کے لیے ایک چھت، ایک گھڑا، مٹھی بھر نہ تو تھپلا
بھرا تاج اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ تو ہم بندوں نے
کھڑا گ پھیلا لیے۔۔۔ میں یہاں آ گئی۔۔۔ ریت مٹی
ہو کے جینا آ گیا۔ دستارِ فضیلت چھوڑ دی۔ علم جتنا تھا
وہ تو ساتھ تھا۔۔۔ بھلا اسے کون لے جاتا (بچ بات ہے
علم سے بڑا کوئی خزانہ نہیں) اب سن صفحہ۔ میری
پاکیزہ شاگردہ۔! نیلی، نیلی بالٹیاں تھیں، نئے
ڈیزائن کا کنواں تھا۔۔۔ جب بالٹیوں میں جھاگ دار
شغاف پانی بھرتا تو پیاسے لبوں کے منہ میں پانی بھر
آتا۔۔۔ کئی اینٹوں والے تھلے پر رکھے گھڑوں کی قطار
بھرتی جانی۔۔۔ پانی کے تھلکنے سے جو آس پاس ریت
گیلی ہوتی اس پر چٹھے ہوئے تپتے پاؤں انسان رکھتے
تھے اور۔۔۔ ان کے دھنسنے ہوئے گال ہستے تھے۔
سوندھی، سوندھی گیلی مہک تھنوں میں بھرتے۔۔۔ وہ
سوکھے ڈھانچے جن کی دھنسی ہوئی مرجھائی آنکھیں
تھیں۔۔۔ اور ہڈیوں پر منڈھی کھال والے چہرے

لے دعا لی بات کی اس کا کم نے مجھ سے جواب سنا؟ تم اتنی جلدی میں کیوں ہو؟

”جی ہاں..... میں بہت بوڑھی ہوگئی ہوں..... یہ سچ ہے۔“ صفہ نے چٹائی پر اپنا جسم دھیرے سے سیدھا کیا۔ کمزور جھریوں والے چہرے پر جو دو آنکھیں تھیں وہ آج بھی اتنی روشن تھیں جتنی تیس برس پہلے جن میں دیکھنے کی تاب نہیں ہوتی تھی۔ وہ دو با علم آنکھیں صفہ کو دیکھ رہی تھیں۔ صفہ کو ایک دم کچھ اہم ترین یاد آیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

”محترمہ عالیہ.....“

”نہیں..... اماں، پانی والی اماں!“

”پانی والی اماں، مجھے دعا چاہیے..... خنبہ کے لیے۔“ انک، انک کر بہت کم لفظوں میں خنبہ کا بتایا، بتا بھی چکی مگر پانی والی اماں جیسے ابھی تک سننے کی کیفیت میں تھیں۔ آنکھوں پر کچھ بد بداتے ہوئے ایک سمت کو سر جھکا کر دور کی آواز سننے کی کوشش کرتے ہوئے..... صفہ خاموش رہی، دور سے تو جھلی کی اللہ، اللہ، اللہ کسی جھینگر کی ہلکی آواز کی طرح سنائی دیتی تھی..... شاید وہ رک، رک کرتا ہی بھی بجاتی تھی۔

صفہ کی سوچ کا زاویہ بدلا یہاں عورت اتنی محفوظ ہے، ایک پگلی جدھر منہ کرے چلی جائے تمدن کی ترقی نے انسان کا اخلاق زوال پزیر کر دیا۔ یہاں عورت کو انہوں نے ہر کسی کا ج کرتے دیکھا تھا۔ درختوں کے اوپر چڑھی بکریوں کے لیے پتے چھانٹتی، محترمہ مرشدی نے یہاں شروع میں مشکلات تو بہت سہی ہوں گی..... پھر اپنے سلوک، اخوت سے دل جیت لیے اولیا کرام بھی کچھ کرتے چلے آئے..... صفہ کے لب داہوئے ایک دم بولتی چلی گئی۔

”آپ نے جو کام کرنا تھا..... کر دیا..... اب آپ واپس چلی جائیں، اپنا علم پھیلائیں، اپنے آپ کو آرام دینا آپ کا حق ہے..... آپ کے یہاں سے جانے کے بعد بھی یہ کنواں چل رہے گا..... آپ یہاں کم نام نہ ہوں.....“

”تم مجھے یہ بتاؤ، تھوڑا رکو..... پہلے تم نے خنبہ کے

”وقت کم ہے..... میرے ساتھ آنے والوں کا بڑا احسان ہے، میں ان کو بخیر واپس پہنچانا چاہتی ہوں..... آپ امید کر سکتی تھیں کہ آپ کی برسوں پرانی، بھولی برسی بوڑھی شاگرد..... آپ کو یہاں ڈھونڈ لے گی؟“

”یہ ایک اور سوال.....؟“

”معاف کر دیجیے گا یہ مجھ سے ہوتا چلا جا رہا ہے، صبح رواگنی کا وعدہ ہے، خنبہ کی روک ٹل جائے تو کیا میں کپکے کروں کی روشنی، شغذک، رشتے، رواج، نفسی سماجی دباؤ سے آزاد ہو جاؤں گی؟ میں کیوں ڈرتی ہوں؟“

”لڑکی..... چپ..... جب تک میں نہ کہوں اب ایک لفظ نہ بولوگی۔“

وہ سہم کر چپ ہوگئی، وہ تو چپ ہوئی مگر یہ بھی چپ ہو رہی ہیں..... سکوت چھا گیا، پگلی نے بھی گویا چپ کا حکم سن لیا تھا..... تا در صفہ نظر پڑا جھکائے، کان لگائے، سر نیو اڑے بیٹھے رہنے کے بعد اب کن آنکھوں سے دیکھا..... کیا ہوا ہے یہ کیوں نہیں بولتیں..... ساکت وجود ہلا، آواز آئی۔

”تمہارے پاس بھی اللہ کی بندیاں دعا کروانے آتی تھیں، آتی رہی ہوں گی..... تم ان کو سمجھایا کرتی ہوگی اللہ سب کا ہے..... (صفہ حیرت کے ساتھ عداوت میں ڈوب گئی) صفہ..... جو دکھی ہوتا ہے، وہ اپنے تئیں ہر ممکن تدبیر سے دکھ کی خلاصی چاہتا ہے، البتہ یہ ہر ممکن تدبیر بعض اوقات اسے غلط راہ پر بھی لے جاتی ہے..... ہر بندہ اپنے خیال میں اپنے سے اچھے سے دعا کروانا ہے..... یعنی جسے وہ اچھا خیال کرتا ہے، اللہ کس کو اچھوں میں رکھتا ہے یہ بندہ نہیں جانتا، تم نے مجھے کہا..... یہاں مجھ سے اچھا بھی ہے، میں اسے کہوں گی۔“

”ان سے اچھا اور یہاں؟“ صفہ کا دل نہ مانا..... پھر رک کر حکم دیا۔

”صفہ..... اندر چھیکے میں گھڑولی رکھی ہے، مجھے پانی پلاؤ..... خود بھی پی لو.....“ صفہ نے اندر قدم رکھا

ہی تھا کہ نیند سے جھوکی شانہ آئی دھلائی دی۔
 ”پانی، پانی.....“ وہ خشک گلے سے کھائیں رہی تھی۔
 ”میں دیتی ہوں۔“ صفہ نے گھڑولی اتاری،
 آب خورہ بھر کر شانہ کو دیا اس نے کھڑے، کھڑے خالی
 کر دیا..... ایسی وحشت کی پیاس تھی کہ یہ تک نہ کہا میں
 خود بھر لیتی ہوں حالانکہ وہ بخاری باجی کے ہاتھوں سے
 پانی لے کر کبھی نہ پیتی..... پانی پی کر کہا۔

”اذان کو بھی دینا ہے..... لاؤ میں یہ لے جاتی
 ہوں۔“ کیسے پیاس انسان کو خود غرض کرتی ہے یہ بھی
 نہ سوچا صفہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔
 ”ٹھہرو، شانہ..... میں اماں صاحبہ کے لیے نکال لوں۔“
 ”کوئی اور پانی نہیں ہے اور..... اندھیرے
 میں پتا بھی نہیں چلتا..... مجھے اتنی پیاس ہے کہ میں سارا
 پانی پی لوں.....“

”یہ لو..... میں نے ایک ڈولی اماں کے لیے نکالی
 ہے..... باقی لے جاؤ..... مگر دھیان سے برتنا..... ہم
 اس پانی کے مالک نہیں ہیں۔“

شانہ نے منہ ہی منہ میں کوئی ہاں نہ کی اور گھڑولی
 لے کر چلتی بنی..... اذان نے پانی مانگا تو پانی لفظ کان
 بڑتے ہی منگر پونے بھی مانگ لیا۔ صفہ کے لیے پانی
 نہیں بچا تھا۔ مگر ایک تسلی تھی کہ صبح کنوئیں پر جاتا ہے،
 اماں نے پانی پیا اور چٹائی پر لیٹ رہی، وہ ایک انگلی
 کھڑی کر کے آسمان کی طرف ہلاتی رہی..... صفہ سمٹ
 سٹنا کے پاؤں کی طرف بیٹھ رہی۔

”ڈر تو مدت ہوئی نہیں لگتا، ڈر کو قنب لگانے کے
 لیے نکرہ در مقام چاہیے ہوتا ہے، میرے پاس چھن جانے کا
 کچھ نہیں ہے، بڑھی پھولیں غریبی، دستار، عطر، جبہ، عبا جائز
 ہے..... مگر فکس ان میں بھی کمر مار کر دیک جاتا ہے۔“

صفہ کے اندر سے آواز آئی۔ ”کچھ پانی مل جاتا۔“
 ”سب کو کہہ رکھا ہے..... حکم دے رکھا ہے،
 میں مر جاؤں تو اس ریت کے ذروں میں شامل ہونے
 دینا..... جو کسی نے جھنڈا گاڑا، نشان بنایا تو کنواں سوکھ
 جائے گا۔“ اپنی دھمکی پہ وہ خود نہیں۔

”کنواں سوکھ جائے گا؟ ان کو اندازہ ہی
 نہیں پیاس کیا ہوتی ہے۔“ صفہ اپنی مرشد کی ہنسی سے
 ہنسی نہ ملا سکی۔

”بھگوان والے بولے بھگوان نہ کرے..... رحمن
 والے بولے اللہ نہ کرے..... صلیب والوں نے سینے پر
 صلیب پھینچی..... اچھی عورتیں ہیں بیجاری، کام میں جی
 رہتی ہیں نمود و نمائش نہیں..... نیت سیدھی ہے، راضی
 برضا..... تھوڑے پر قانع، رحمت کی آس باندھے رکھنے
 والیاں، اب دیکھو بارش کی دعا کون نہیں مانگتا، بندے تو
 بندے چرند پرند، جھاڑ گھاس تک مانگتے، رب کی طے شدہ
 رحمت میں ایک رمز جغرافیہ بھی ہے..... اس میں تبدیلی عقل اور
 عمل سے لائی جاتی ہے..... رب چاہتا ہے کہ اب وہ عقل
 استعمال کرو جو میں نے دی..... اور عمل کرو۔“

پیاس کا صحرا کر بلا، کتنے پیارے، رب کے
 پیارے، نبی کے پیارے، جگ کے پیارے، ننھا سا
 پیارا، جوان سا دلدار، اندر والیاں، باہر والے، کاش
 ایسا نہ ہوتا، پانی تو ہوتا..... صفہ کی سوچیں پانی کھوجتی
 اس مرکزی جگ تک جا پہنچیں..... اسے خود خبر نہ تھی اور
 اس کی دونوں آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں..... کسی نے
 کندھے سے ہلایا۔

”اے..... اے.....“ وہ ڈر کے
 چوکی..... ہلکی تھی..... پانی کی بوتل لیے کھڑی تھی۔ اس
 کی طرف بڑھا کے بولی۔ ”لو.....“ اور اب صفہ نے
 بالکل شانہ کی طرح لپک کر بوتل لی اور غنا غٹ پینے
 لگی..... نہیں سوچا کہ پانی والی اماں سے اجازت
 لوں، پانی لا کر دینے والی کا شکر یہ ادا کروں..... اور یہ
 بھی نہ سوچا کہ اس کو خیال کیونکر آیا..... ہلکی اب آرام
 سے اماں کے پیچھے جگہ بنا کے سو بھی گئی تھی۔ اب اماں
 سے نظر ملی، عجب طرح سے وہ مسکرائیں۔ جیسے کہہ رہی
 ہوں ”مجھ سے اچھی مل گئی ناں؟“ پھر کہا۔

”صفہ، اتنی باتیں، رات بھر میں کبھی کرتی
 نہیں..... تم بہت دور سے آئی ہو..... تم باہر نکلنے والی
 نہیں ہو..... شاید ہم پھر کبھی نہ ملیں۔ میری بات سختی
 ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

دے دیے۔ اذان کی دوسری طرف نہانے چلا گیا عورتوں کے غسل کے لیے دیوار دے کر جگہ بنی ہوئی تھی۔ مگر صفہ اور شبانہ نے بے پردگی کے امکان کے پیش نظر خواہش کے باوجود غسل نہ کیا۔

”یہاں ابھی ساری بستی کے مرد عورت آتے رہیں گے۔ میں رات کو کنواں بند کروادیتی ہوں ورنہ جھگڑے ہوتے تھے۔“ نماز کے بعد اماں نے کہا۔ پھر صفہ کے ملگجے چلیے کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

”نہا الوصفہ۔ میں خیال رکھوں گی۔“ جہاں مرشد خیال رکھنے والی ہوں وہاں کیا انکار۔۔۔۔۔۔ ان دونوں نے نہا کر تازہ اور اچھا محسوس کیا۔ صفہ نے جھکی میں آکر خشک کھانے پینے کے سامان کے بند ڈھے، پانچ ہزار کے لفافے۔ اور وہ گلابی سوٹ اماں صاحبہ کے قدموں میں لا کر رکھ دیا۔ اماں صاحبہ نے قبول کرتے ہوئے صفہ کو ساتھ بٹھایا۔ اس کے سر پر دایاں ہاتھ رکھا، یہ بہت قیمتی الفاظ تھے جو ادا ہوئے۔

”صفہ۔۔۔۔۔۔ ما سوا سے قلب کو خالی کرو یا لفظ حلال، فقرای قریت، صدقہ، مسلسل صدقہ۔۔۔۔۔۔ مخلوق میں جسم سے موجود ہو مگر نیت سے پوشیدہ اور چدل۔۔۔۔۔۔ جو ترے پاس رب کی طرف سے آئے بانٹ دے۔ دولت ہی نہیں۔۔۔۔۔۔ عزت، توقیر، محبت، رحمت، ہر نعمت آگے بانٹ۔ سلوک کی راہ مرد پر سیدھی ہے، عورت پر سیدھی تر ہے۔ شریعتی بلند ترین رتبہ ماں ہے تو تصوف کی بلند سیرجی پہنچ چکی۔ عورت مخلوق کی ماں ہے۔ ماں کیا ہوتی ہے، ماں ہونا کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ معافی دینے والی، درگزر کرنے والی کھلانے والی، کھلا کر خوش ہونے والی۔۔۔۔۔۔ دعا میں بے ریا گڑ گزرنے والی۔۔۔۔۔۔ اصلاح کے لیے سختی کرے تو ڈونگا پیار کرے، بڑی سے بڑی پیچیاں، جنت کی سرداریں، کیا ہوئیں؟ مومنین کی امہات۔۔۔۔۔۔ ماں ایک صفت ہے ایک نسبت ہے یہ بھی سن۔ کبھی، کبھی جہنم دینے والی صفاتی ماں نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ اور کبھی نکاح تک نہ کرنے والی صفاتی ماں ہو جاتی ہے، صالحات،

سیری ہے، اندر سے اس کی پکی دھن رہو۔۔۔۔۔۔ خود کو مرجانے والوں میں رکھو۔۔۔۔۔۔ آج رکھ دو گی کل مشکل نہ ہوگی۔ فلاں کو فلاں مصیبت آگئی۔۔۔۔۔۔ بیچارہ، ہم سب بیچارے ہیں۔۔۔۔۔۔ بیچارگی کو رب کے حضور تسلیم کر دو۔ ہر ظرف کا ظرف ہوتا ہے کچھ ظروف ایسے ہوتے ہیں دیکھ کے لگتا ان میں سیر بھی نہیں سائے گا۔۔۔۔۔۔ مگر اندر د اندر دیر سا جاتا۔“ صفہ کی نگاہ ریت پر جمی تھی، پتلی ناگوں والے چست مکوڑوں کی ایک لمبی قطار چل رہی تھی۔ پھر سے سوچا میں نے کچھ سوال کیے تھے پلٹ کر دیکھا۔ اماں تو خراٹے بھر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ پل بھر میں سو گئیں۔ ابھی تو کہہ رہی تھیں۔

”مجدوب وہ بچہ ہے جو مالک لاشی لہرائے تو بھی بھاگتا نہیں، بدکتا نہیں۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ مار کے بھی تو ہی منائے گا۔۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تو اپنی مارا کٹھی کرتا رہتا ہے، مار ہوگی تو پیار ہوگا۔“ صفہ نے تھکن سے جھائی لی۔ ”میں کہاں سوؤں؟“ پھر مکوڑوں کی قطار سے اپنے تئیں دور ہو کے بازو کا تکیہ کر کے دوپٹے کو خود پر پھیلا کر لیٹ گئی۔ صحرا کی پچھلے پہر کی پروانے اسے گہری نیند سلا دیا۔

وہ اذان فجر تھی۔

وہ مسجد صفہ کی اذان فجر تھی، کان میں پڑی تو ایک دم آنکھ کھل گئی۔۔۔۔۔۔ میں یہاں نیچے کہاں ہوں۔۔۔۔۔۔ تہجد نکل گئی، لنگی پر نگاہ پڑی شعور بیدا ہوا۔۔۔۔۔۔ اماں صاحبہ جگمی سے نکل رہی تھیں۔

”آ جاؤ۔۔۔۔۔۔“ اسے جاگتے دیکھ کر اشارہ کیا۔

وہ خاموش آگے چل رہی تھیں، صفہ پیچھے تھی، وہ سامنے کھجوروں کے جھنڈ کے بعد کنواں تھا۔ اندھیارے میں عورتیں پہنچ چکی تھیں، وہ پانی والی اماں کو اپنی، اپنی طرز میں سلام کرتیں۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں پکی کھال (پختہ بڑی تالی) بروصو کرنے لگیں۔ قریب ہی نماز کے لیے چٹائیاں بچھی تھیں، اماں نے بچھوائی ہوں گی کیونکہ اور تو کوئی وہاں نماز پڑھتا دکھائی نہ دیا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

طبیات، تابعات (اطاعت کرنے والیاں) مہشات..... یہ خوشبو چاروں اور پھیلی ہے.....“

”یا آقا مرشدی..... میں کس میں ہوں؟“

”تمہارے آس پاس چاروں خوشبوئیں ہیں۔“

”چاروں؟“ (ہم تو تین ہیں) صفہ نے بہت

سوچا، دور تک سوچا۔

”مہشرہ تو ہو جاتی ہے کوئی یا نصیب.....“ پھر

ایک دم لہجہ معمول پر آگیا۔ ”ناشتا کرو..... ہمیں دیر نہ

ہو تو بہتر ہے۔“

منگر پو بھی کہہ رہا تھا جتنی جلدی ہو سکے واپسی کا

سفر اختیار کر دو..... ناشتا آگیا تھا۔ کجور کی چمڑیوں سے

سے روٹی دان میں روٹیاں، لسی کا جگ، رکابی میں ملی

جلی دال تھی، ناشتا لانے والی مقامی عورتیں مہمانوں کو

دیکھنے کے شوق میں بیٹھ گئیں۔ اماں صاحبہ نے انہیں

بھی کھانے کی دعوت دی مگر انہوں نے ہاتھ باندھ کر

انکار کر دیا۔ شاید یہ شکر ہے کہ اشارہ تھا۔ جھگی کی اوٹ

میں بیٹھے مردوں میں کوئی مقامی مرد سرائیکی سندھڑی

رہی ملی بولی میں بول رہا تھا۔

”قہر دی پچان چار چیزاں، ریت، اونٹ،

اکوڑ، زقوم۔“

”اکوڑ کیا؟“ اذان کے پوچھنے پر بتانے لگا وہ

پھول جو انہوں نے کنویں کے گرد دیکھے ہوں گے

(سفید پھول بیٹنگی کنارے)

”کنوئیں والی جگہ کتنی اچھی ہے، ٹھنڈک اور

سکون..... مگر دوپ تو وہاں بھی آ جاتی ہوگی۔“ لسی پی

کر گلاس رکھتے ہوئے شبانہ کی آواز نے متوجہ کیا۔

”صحرا کے دورو پ ہیں محبتی جہالی، بھسم کر دیے

والا جہالی۔“

اماں صاحبہ نے دو گھنٹہ بھر کر لسی کا گلاس رکھا۔

وہاں پینے والی چیزیں ٹھہر، ٹھہر کر پیتے تھے، صفہ نے ان

کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”میں یہ لے لوں؟“

”اول ہوں..... تم ایک دفعہ لے چکی ہو.....“ یہ

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

113

اشارہ کب اور کس طرف تھا۔ صرف وہ دونوں جانتی

تھیں۔ پھر وہ شبانہ کو مخاطب میں شامل کر کے بولیں۔

”یہاں کچھ عورتیں رلی، جازم، قالین بناتی ہیں

مٹھی میں پیچتی ہیں۔ وہ لیتی جاؤ، سکیئہ ساند کو پتہ چلا دیتا۔“

شبانہ نے تین رلیاں خود خریدیں۔ منجہ باجی، بخاری

باجی اور عبد اللہ کے لیے..... ”عبد اللہ، منجہ؟“ یہ نام

کان پڑے تو جیسے صفہ کو بہت اہم بات یاد آئی..... اماں

صاحبہ نے اسی وقت لگی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر صفہ کی

طرف اشارہ کر کے کہا۔

”دعا کرو.....“

لگی نے اپنا پھٹا پرانا پوچھٹن (دو پٹا) پھیلا دیا

جیسے خیرات مانگتے ہیں۔ یہ نہ پوچھا کہ کیا دعا کروں؟

”مجھ سے اچھا بھی یہاں ہے میں اسے کہوں گی۔“ کانوں

میں گونج اٹھا۔ اب صفہ کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر

تھا۔ اماں صاحبہ اس کے کان کے پاس منہ لا کر جانے کیا

کہہ رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کیے رلی رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے..... کون کس کے لیے دعا

کر رہا ہے.....“ شبانہ کے چہرے پر سوال تحریر تھا۔ اور

یہ عام تمام سی میلی عورت جو کچھ نہ کچھ گاتی رہتی ہے، یہ کیا

دعا مانگے گی، دنیا عجائب خانہ ہے، شبانہ کی تربیت ایسی

تھی کہ دخل اندازی یا مذاق اڑانے کا تصور نہ ہوتا تھا۔

اسے صفہ بخاری کی معرفت کا یقین تھا۔

وقت رخصت آگیا تھا۔ شہر یار منگر پو نے

بحفاظت سر کی دعا مانگ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی

تھی۔ شبانہ اب مقامی عورتوں سے ملنے لگی۔ صفہ کو چند

آخری پل راز و نیاز کے مل گئے۔

”مرشدی..... اس کا مقام کیا ہے؟“

”میں نے ایک صبر کیا تھا..... اس نے چھ

کے.....“ اب پوچھنے کو کچھ تھا بھی تو وقت نہیں تھا۔ صفہ

نے وہ پوچھا جو مزید کا وقت دیتا۔

”اب کب ملیں گی آپ؟“ یہ سوال ایک آنسو تھا۔

بے ڈھنگے، بے رنگ لمبوس میں سفید بالوں والی

بڑھیا نے اپنے جیسے بے رنگ چوٹے والی ”جوان

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

113

جہاں بار غطا ہوئی مگر ان لفظوں کے ساتھ۔

”صفہ..... ہم تم رخصت ہوئے۔“

دل ایسے دھڑکا جیسے ٹھکانا چھوڑ دے گا۔ بھونچکا بے روح، بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پاؤں اپنی جگہ سے آگے حرکت کرتے تھے نہ پیچھے۔ کوئی واضح عندیہ دے دیا گیا تھا۔ صفہ نے شبانہ کی طرف رخ کر کے ابھی کہنا ہی تھا کہ ”میں نہیں جاؤں گی، تم جاؤ۔“ مجھے بھول جاؤ۔“ کہ محترمہ عائشہ صبیحہ کے لہجے میں حکم آیا۔

”صفہ تم جاؤ۔“

اس کا رخ ادھر سے اُدھر مڑا۔ حکم رخصت کا تھا قیام کا نہ تھا۔ اور وہ لا تعلق ہو کے جھکی کو پلٹ گئی تھیں۔ وہ پشت کر کے جانتی تھیں یہ رورہی ہے، یہ پشت دیکھے جانتی تھی مرشد غم زدہ ہے۔ دونوں کو حکم تقدیر تسلیم کرنا تھا۔ شبانہ نے بت بنی صفہ بخاری کو متوجہ کیا۔

”آئیں بخاری باجی۔ آئیں۔ دھوپ چڑھ جائے گی۔“ وہ گاڑی تک آگئی۔ شبانہ اشیائے ضروریہ، پانی، کھانے کی فراہمی کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ صبح کی چمک گرد و نوح کو واضح کرنے لگی تھی۔ صفہ کی گردن پیچھے دیکھتے، دیکھتے پلٹی نہ تھی۔ جیب اشارت ہو گئی تھی۔ وہ سامنے وہی جھکی ”پانی واری ما“ بالکل ویسے کھڑی تھیں جیسے آتے سے انہوں نے دیکھا تھا۔

”کھڑی ہوں میں بیکڑی۔“ ہر آواز بیکڑی ہے۔ ہر ہندی بیکڑی ہے۔ ہر روح بیکڑی ہے۔

وہ جارہے تھے یا آرہے تھے؟ صحرا آوازیں دیتا تھا، صحرا کی آواز اور باس الگ ہوتی ہے، صحرا میں جیسے خدا بولتا سنا کی دیتا ہے، صحرا حریص نہیں اس میں لو بھ نہیں، اس میں حسد نہیں، شوق چڑھت نہیں اپنے آپ میں مست، گمن رہتا ہے، صبر در صبر کھن در کھن۔ تنہا جینے کا سبق پڑھانے والا، تارک الدنیا کا من پسند سیارہ، گم کر دینے والا۔ سراب در سراب۔ سراب واقعی ہوتا ہے دور کے دیکھے پر بھروسہ کرنا سکھانے والا۔ جیب میں مکمل خاموشی

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

بہت، سب سے زیادہ مریں مریں فرما رہے تھے، بہت بعد کو کوئی چیز گری، ٹھکنے کے آواز نے سکوت توڑا۔
”اچھے لوگ ہیں مہمان نواز۔۔۔“ منکر بولوا۔
”اللہ کی شان ہے، پانی نے بستیاں ببار بھی ہیں اس لبق و دق میں۔“ اذان کی آواز آئی۔
”مجھے تو ایسی گہری نیند آئی، صبح اٹھ کے اتنی شرمندہ ہوئی، آپ نیچے سوئی تھیں، اماں صلیب نیچے سوئیں۔“ شبانہ، صفہ سے مخاطب تھی۔
”زمین پر نہیں سونا چاہیے، سانپوں کا خطرہ ہوتا ہے۔“ اذان نے کہا۔

صفہ، شبانہ کے جواب میں بے جان سی مسکرائی۔ دل اتنا اداں کبھی نہیں ہوا تھا۔ دل جیسے پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ یونہی باہر دیکھے جا رہی تھی۔ چلی باریک ریت کہیں، کہیں خود رو چڑی بوٹیاں، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ۔ پانی کے لیے جاتی عورتیں۔ آتے اور جاتے ہوئے وہی ایک سی زندگی تھی۔ شاید زندگی ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے۔

پھر وہ جگہ آئی جہاں انسانوں کی لمبی قطار ایک رے سے یکساں کھینچی تھی۔ دن کے نونج رہے تھے اور نوکیلی دوپہر کا راج شروع ہو گیا تھا۔ جیب کو گزرتا دیکھ کے لوگ رک کر دور تک دیکھتے تھے۔ گرم خشک سفر کبھی، کبھی کسی بات اور زیادہ تر خیر کی دعا کے ورد کے ساتھ جاری تھا۔ مٹی کے قریب موبائل کے سسٹنلڑ ملنے لگے۔ کچھ اور واضح ہوئے تو شبانہ نے عبد اللہ کو فون ملایا۔

عبد اللہ کے طویل جوابات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوش اور پر جوش ہے، آواز کٹ بھی جاتی تھی۔ اس لیے شبانہ نے مٹی سے نکل کر کال ملانے کے وعدے پر بات ختم کر دی۔ مٹا کی بیاشت نے شبانہ کو تروتازہ کر دیا۔

قصبہ مٹی آ گیا۔ یہاں جیب نے بھی اور جیب کے سواروں نے آرام کرنا تھا۔ سیکنہ ساند تک امانتیں پہنچانا تھیں۔ اس کا پتا منکر یو کے پاس تھا مگر پہلے وہ کسی ڈھنگ کی جگہ رک کر خود کو تروتازہ کرنا چاہتے تھے۔ چند گھنٹوں کے لیے ہوٹل کے دو کمرے بک کرائے، دونوں خواتین نے خود کو عمارت سے آزاد کر

ڈالا..... اور بھی جو پچھ ان کے پاس تھا سچ ڈالا۔ سلیم بھائی کو بھی جنون تھا، اللہ کا شکر ہے ہمارے گھرانے میں دھوکا، فریب، بے ایمانی نہیں ہے، سلیم بھائی کی اسی وجہ سے تو محترمہ اماں صاحبہ اتنی قدر کرتیں۔ یہ ان کا بڑا پین ہے، عظیم تو اصل میں وہ ہیں..... آپ مل کر آ رہی ہیں؟

آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا..... پیاسوں، غریبوں کے لیے خود کوریت، مٹی کر ڈالا۔ کنویں کی کامیابی ہو گئی..... الحمد للہ

..... میں نے اتنی منت سماجت کی یہاں میرے پاس مٹھی آجائیں، مدرسے میں طالبات کو میں تجوید، تفسیر، حدیث پڑھاتی ہوں، دو استانیات اور بھی ہیں، ناظرہ قرآن والے بچے بہت ہیں..... میں انہیں صدر مغلہ کی پیشکش کرتی رہی ہوں.....

”مکرمات تو سیدی ہے سیکنہ ساند اگر انہوں نے ملازمت جاری رکھنا ہوتی تو اتنی بڑی درس گاہ کیوں چھوڑتیں۔“

”سبحان اللہ.....! آپ نے خوب کہا مگر میری دینی بہن! علم والے کو علم کا چشمہ جاری رکھنا چاہیے۔“

دنیا کے اصولوں کے موافق وہ درست کہہ رہی تھی۔ صفہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پانی والی اماں صاحبہ کے روحانی مقام سے آگاہ نہیں، ایک بچی ”امی“ بلاتی ہوئی اندر آئی۔ شبانہ نے روک کر پیار کیا۔

”آپ کی بیٹی ہے ماشاء اللہ.....!“

”الحمد للہ..... میری دو بیٹیاں ہیں، یہ چھوٹی ہے۔“ سیکنہ نے اس کا اسکارف کھینچ کر ماتھے پر درست کیا۔ شبانہ کا لایا ہوا بڑا اشراف کھول کر چادریں وغیرہ گن کر الماری میں سنبھالنے شاپرنگ تہ لگا کر اندر رکھنے کے بعد الماری کو تالا لگا کر اس نے مدرسہ کی پیشکش کی۔

تدریس والے کمرے کی دیوار پر باہر کی طرف ”مدرسہ البنات“ لکھا تھا۔ آنگن میں مجبور کا جڑواں درخت تھا۔ اس کے چھدرے سائے میں چچا تاتیاں پکانے کا تنور تھا۔ مٹی کی برات تنور پر اونٹنی رکھی تھی کیونکہ یہ روٹی کا وقت نہ تھا۔ تنور کے ساتھ والی دیوار پر ایک کوا کائیں، کائیں کر رہا تھا۔ کیونکہ تنور کے پاس سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ سیکنہ ساند نے ٹکڑا اٹھا کر

کے منہ پکھا کھول کر آرام کیا۔ کھانے پینے کی سادہ ٹوک نہ رہی۔ ایسی گہری نیند آئی کہ دستک پر ہی آنکھ کھلی۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے اذ ان کھانا لایا تھا۔ انہوں نے وضو کیا نماز ظہر ادا کی۔ کھانا کم ہی کھایا گیا۔ اب وہ سیکنہ ساند کے گھر جا رہے تھے۔

وہ ایک درمیانہ درے کا پکا مکان تھا۔ جس کے باہر درخت بھی تھا۔ استانی سیکنہ ساند کا نام یہاں اکثر جانتے تھے۔ وہ دروازے پر کے، تدریس والے کمرے میں صفہ اور شبانہ جبکہ بیٹھک میں مردود کو بٹھا گیا۔

سیکنہ ساند سانولے رنگ کی دہلی پتلی چھتیس ساہ شادی شدہ عورت تھی۔ محبت اور تپاک سے ملی۔ ایک لڑکی ٹھنڈے شربت کے گلاس رکھ کر سلام کر کے چلی گئی۔

شبانہ نے اپنا اور صفہ بخاری کا تعارف کرانے کے بعد سستی سے بیٹھا گیا مال اس کے حوالے کیا۔ صفہ بخاری کے بارے میں یہ جان کر کہ وہ محترمہ عائشہ بیگم لائبریری کی شاگرد رہی ہے، وہ بہت خوش ہوئی۔ اور زیادہ تر بات چیت اس سے کرنے لگی۔ شادی اور بچوں کی تعداد جیسے سوالات سے گریز کے پیش نظر شبانہ نے پہلے ہی بتا دیا کہ وہ بیوہ ہے اور بخاری بی بی غیر شادی شدہ ہیں۔

”کیا آپ بھی مغلہ ہیں؟“ صفہ کا جواب سیکنہ ساند کے لیے کچھ حیران کن تھا۔ وہ یقین کر رہی تھی کہ محترمہ کی یہ ذہین شاگرد سینئر مغلہ ہوگی بہر حال جب موضوع سخن محترمہ اللہ ہری کا پانی والی اماں بن جانے کی طرف پلٹا تو سیکنہ ساند کی دلچسپی، احترام اور ستائش بھر پور تھی۔

”انہیں دیکھ کے مجھے شروع دن سے لگا تھا کہ وہ الگ سی ہیں۔ ان کا دیدہ بہ تو بہت تھا، سادہ اور نرناثیر رہتیں اور بوتیں..... پتا نہیں کیسے انہوں نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا میں تحر سے آئی ہوں..... مجھے بلا کر بات کی۔ میرے علاقے کا سن کر مسائل پوچھے..... پانی کی کمی، پانی کے وسائل یہ میرے انجینئر بھائی کی فیلڈ تھی..... بس انہوں نے اچانک ہی کنواں کھدوانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کا کراچی میں اچھی خاصی مالیت کا گھر تھا۔ وہ سچ

میں حاضر رہتا تھا۔ اس جذبے نے سکون گرمی اور سفر کی محنت، آرام کی خواہش کسی کا اچھا خواہ وہ خوراک ہو، تعلق ہو، مکان ہو، اپنا گھر اپنا ہو..... بے معنی سا ہوا۔ پانی کے گلاس... سب کر دیتی ہوئی شبانہ نے اس سے پانی کا پوچھا جواب نہ پا کر گلاس سامنے کیا۔

”پانی پی لیں.....“

پانی پی کر واپس کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
”کتنی دیر ہے؟“ گلاس تھا۔

”بس ایک گھنٹے کا سفر اور ہے.....“ انسان کو بہن منزل پر پہنچنے کی خوشی اور جلدی ہوئی ہے لیکن جسم سے شدہ منزل کے قریب ہونے کے خیال میں ہولناکی ایسے میں کوئی آگے بتائے کہ بس ایک گھنٹے کی مسافت تو کیلچا منہ کو آجائے گا..... بیچارہ انسان..... غیب کی رات تمام کے کیسے دن رات کرے وہ تو حاضری حیات کے پیدا ہوا ہے۔ اللہ انس کو معاف کر دے جو..... معاف ہو جائے کتنا ٹھنڈا ٹھنڈا آسودہ لگتا ہے۔

”آپ کس بات پر مسکرائیں بخاری باجی؟“
”ٹھنڈا پانی جو پیا ہے۔“ یہ بھی سچ تھا، شبانہ مسکرانے لگی۔

”ہاں جی..... اور نخبہ باجی، عبد اللہ سے ملنے کی خوشی بھی تو ہے۔“ اب جیب گھر والی گلی کی جانب مڑ رہی تھی۔ صفحہ مسجد کے گنبد نظر آنے لگے تھے، مغرب کی اذان کی صدا..... ”آؤ نماز کی طرف.....“ شبانہ کے ذہن میں جو سوچ آتی کہہ دیتی تھی۔

”بخاری باجی..... اذان سننا کتنا اچھا لگ رہا ہے..... اذان کے بغیر دن خالی، خالی لگتا ہے۔“
”ہاں، شبانہ بخاری بہن.....“ پھر وہ اگلی سیٹ والوں سے مخاطب ہوئی۔

”منگرو پو بیٹا میں نے ماما جی کو فون کر دیا تھا۔ کھانے کا انتظام ہے، واپسی میں جلدی نہ کرنا..... نہانا آرام کرنا، رات گزار کر صبح جانا۔“

”ہاں جی پچھو جی، اب تو بٹنے کی بھی سکت نہیں

کنوری کسی شاگرد لڑکی کو دے کر کہا۔“ پانی ڈال رکھو.....“ ہر علاقے کا ایک تمدن ہوتا ہے، زندگی جہاں بھی ہو کشش رکھتی ہے۔ مدرسہ دیکھ چکے کے بعد صفحہ نے مدرسے کے لیے، سب آبادیوں، بستیوں، گھروں، اداروں، لوگوں راستوں کے لیے پُر خلوص دعا کی۔ ہاتھ اٹھا کر شبانہ، سیکنہ ساند اور کچھ طالبات نے ساتھ دیا۔ چندہ بکس میں صفحہ نے نوٹ ڈالے، نوٹ نکال کر گئے نہ دیکھے، جتنے ہاتھ میں آئے والٹ سے نکال کر ڈال دیے۔ یہی وہ وقت تھا جب سیکنہ ساند کے چہرے پر سمجھنے کی کوشش اور آنکھوں میں متاثر ہونے کا عکس تھا۔ مزید سوالات کی نوبت نہ آئی۔ صفحہ نے اجازت لی۔
شبانہ کو سیکنہ ساند کا نمبر لے کر محفوظ کرنے کو کہا۔

”پانی والی اماں کی خیریت سے آگاہ کرتی رہیے گا..... اللہ جزا دے گا۔“

”انشاء اللہ العزیز.....“

ان کا بقیہ سفر شروع ہوا۔ اب خشک بے آب و گیہاہ ریتیلے علاقوں سے رفتہ رفتہ درختوں، کھیتوں اور آبادیوں کی طرف پیش قدمی تھی۔ جاتے ہوئے ہر کلو میٹر پر خود کو استقامت دلانے کی کاوش تھی، آتے ہوئے ہر کلو میٹر پر شکر ہی شکر تھا۔ اذان نے اپنے گھر فون کر کے خیریت کی اطلاع دی۔ پھر منگرو کا فون بجنے لگا۔ اینوں میں لوٹ آنے کی اسٹنگ نے سفر کی رفتار میں جوش سا پیدا کر دیا۔ شیشے کے پاس ہنستے ہنستے آبادیوں کو دیکھتے صفحہ نے گہری سانس لی۔ مل آنے کا احساس رگ رگ جاں میں تقویت کا گھر وندا تھا۔ پھر ایک اخروی احساس کہ جب نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا، بندہ خوشی، خوشی اہل خانہ کی طرف آئے گا..... کیسا، کیسا خوش ترین وقت ہوگا..... ابدی تسلی اور..... اہل خانہ..... ایک بھرا، بھرا سا جذبہ اندر اترا..... جبر کے غم کو چھوڑ دو، ملنے کی مسرت چھوڑ دو، اس جگہ میں بس معاف کرو..... سچ نکلو..... معاف کرتی جاؤ، غیب کے حاضر بننے سے پہلے غیب

آئے زباں پہ بر ملا صل علی صل علی
دل کو نشاط ہو ذرا صل علی صل علی
تو ہی خدا کا نور ہے تو ہی نبی آخری
محبوب رب دوسرا صل علی صل علی
تو صاحب قرآن ہے تو ہی خدا کی شان ہے
تجھ پر درود مصطفیٰ صلی علی صل علی
تو نے اٹھائے دکھ سبھی امت کے واسطے نبی
دکھی دلوں کا ہم نوا صل علی صل علی
کرتی رہوں بیاں ترا اپنی زباں سے بار بار
میرا قلم لکھے سدا صل علی صل علی
حشر کے روز جبکہ ہو مخفی برائے احتساب
کانوں میں گونجے یہ صدا صل علی صل علی
عقیدت گزار: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

انسانیت کابل

ایک مرتبہ میں ہانی وے پر ایک ہوٹل کے باہر
کھانا کھانے کے لیے رکا۔ جونہی کھانے کا آرڈر دیا تو
دو بچوں پر نظر پڑی وہ میری طرف بڑی رحم دلانہ
نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید بھوکے ہوں گے،
میں نے انہیں قریب بلایا، وہ تھوڑا ہچکچائے پھر پاس
آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ ”کچھ کھاؤ گے؟“
انہوں نے جو کہا میں نے منکوا لیا، میرے پاس
پیسے کم تھے، میں نے سوچا کہ اگر پیسے بچے تو میں بعد
میں کھالوں گا، جب وہ کھانا کھا چکے اور شکریہ ادا کر
کے چلے گئے تو میں نے بچے کو اشارے سے بل لانے
کو کہا۔ وہ بل لے کر آیا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی
رہ گئیں۔ کافی دیر تک حیران ہو کر اس چھوٹے سے
ہوٹل فیجر یا مالک کا منہ نکلتا رہا۔ لکھا تھا ”انسانیت
کابل ہم لگا ہی نہیں سکتے۔“

مستنصر حسین ہاروڑ

انتخاب: ساجدہ ظفر، کمالیہ

ہے، صبح ہی نہیں کے۔ جیپ یٹ پرری۔ وصو بنا۔
کے تیلے چہرے سے عبد اللہ باہر آ رہا تھا۔ سب کو باری،
باری سلام کیا۔ پھر شانہ نامی کو لپٹ کر کہا۔
”میں بہت اداس ہو گیا تھا۔“ شانہ نے سر ماتھا
چوم، دعائیں دیں، صفہ بھی شکر ترقی رہی۔ پھر وہ نماز
کے لیے بھاگا۔

”جماعت کھڑی ہوگئی ہوگی۔“

”السلام علیکم۔“ ادھر نخبہ برآمدے میں نہال

ہوتی موجود تھی۔

”آؤ میری رونقیں۔۔۔۔۔ میری پیاریاں۔۔۔۔۔
میرے دل کی رانیاں۔۔۔۔۔“ وہ دونوں کو دائیں بائیں
لپٹاتی تھی۔ تینوں خوش تھیں۔ ملنے ملانے کے فوراً بعد
تینوں نماز کے لیے ادھر ادھر ہو گئیں۔ باہم مل بیٹھنا
رات کے کھانے پر ہوا۔ دیکھی تھی کے تر کے والا
ساگ، بکھن، سلاو، بکرے کے گوشت کا تورما اور روٹی
سے دسترخوان سجا ہوا تھا۔ اگرچہ صفہ کا کھانا قلیل اور
مختلف ہوتا تھا اور نخبہ پر ہیزی کھاتی تھی۔ عبد اللہ اپنے
اسکول، اکیڈمی اور مسجد کے اوقات کار کے حساب میں
الگ کھانا تھا مگر آج کسی کو اصول چلانے نہ دیا گیا۔
شانہ نے بیٹھے ہی وضاحت کر دی۔

”ماماجی نے سب چیزوں میں سے حصہ نکال کر
پڑوسیوں میں حق ادا کیا ہے۔ بخاری باجی۔۔۔۔۔ آپ
بے فکر ہو کر آج ہمارے ساتھ تناول فرمائیں۔“ پھر
گزرے دنوں کے بارے سوال ہونے لگے۔

”کیسا ہاسفر۔۔۔۔۔؟“ گھر والوں نے پوچھا۔

”وہ علاقہ کیسا تھا؟ مشکلات تو پیش آتی ہوں

کی۔“ ادھر سے بھی سوالات تھے۔

”تمہاری طبیعت کیسی رہی؟ امیر بی بی، شہناز آتی
رہیں؟ شہناز کھانا درست بناتی تھی؟ عبد اللہ میاں کا
عال چال؟“ وہ طرفہ جوابات ملتے رہے، شانہ ویسے تو
سب کو پیٹ بھر کر کھانے کی تلقین کر رہی تھی پر نخبہ کی
پلیٹ دیکھ کر گزر زبان پر آگئی۔

”نخبہ باجی۔۔۔۔۔ یہ سالے والا سالن۔۔۔۔۔؟ اللہ

”خالہ کی صحت کیسی ہے؟ ملے آئی ہوں گی۔“

صفہ نے پوچھا۔

”امی کی صحت ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے، ہماری جائیداد کے حسابات رچتے تھے کچھ اثاثے سیل کرنا چاہتی ہیں، ملے تو آئی تھیں مگر پھر آبائی گھر چلی گئیں۔ سب کچھ منسا کر آئیں گی۔“

”وہ تمہارے متعلق فکر مند ہوں گی ناں۔“

صفہ بولی۔

”تو بتا تو میرے متعلق کیا کہہ رہا تھا۔“ شبانہ، عبداللہ...

کو کہنی مار کے چبکی۔

”ہاں عبد اللہ چاند، میں خوش ہوں، ہم سب خوش نصیب اور اللہ کے نوازے ہوئے لوگ ہیں، ہمیں اندازہ نہیں کہ اللہ نے ہمیں کتنا کچھ بنانا سکے دے رکھا ہے اور دے رہا ہے، مانگنا تو کجا ہمیں اس کا اور اک بھی نہیں ہوتا خبیہ باجی، ان دنوں زبان اور حلق خشک پانی کو ترس گئے تھے۔ تازہ دے کر بیخ پانی سے نہانے دھونے کو ترس گئے تھے۔ تھر چولستان دیکھ لینے کے بعد پانی بہت قیمتی لگتا ہے۔“

عبد اللہ کے ہاتھ سے بخ بستہ بوتل پکڑی نہ گئی۔ اس نے دھیرے سے واپس رکھ دی۔ خبیہ نمناک ہو گئی، کہنے لگی۔

”تاریخ میں پڑھا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام حسینؑ کے فرزند حضرت امام زین العابدینؑ کے سامنے جب بھی پینے کو پانی آتا، انگبار ہو جاتے۔“

”لا اکھوں درود آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔“

”مجھے اپنی نماز کی جگہ پر لوٹنا شاد ماں کر گیا۔“

صفہ اٹھنے لگی۔

”خالہ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟ کیا کہتی تھیں۔“ شبانہ نے خبیہ سے برتن لیتے ہوئے پوچھا۔

”عبد اللہ کو سامنے پا کر حیران ہو گئیں۔ کہنے لگیں یہ تو ننھا مولوی لگتا ہے۔ مگر جب اس نے انگلش شروع کی اور لا کی باتیں کیں تو پھر کھتی تھیں بننا بنایا

”شبانہ، آج تو کھانے دے، عید یاراں ہے۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا بچہ لیا ہے۔ ویسے میرا ہاضمہ کچھ بہتر ہو رہا ہے۔“

”تو، تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ مگر احتیاط کرو۔“ صفہ نے سلا دلیا۔

”اس سے بھی بڑی خوشی کی خبر ہے میرے پاس۔“

”لیں ماما۔۔۔۔۔ آپ وہ تو بتائیں۔“ عبد اللہ کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولنے لگا۔ شبانہ نے اس کا ہاتھ روکا۔

”یہ چار دن میں شہزادے نے نئی، نئی عادتیں بنالیں۔ کولڈ ڈرنک کھانے کے ساتھ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ آپ تو جانتے ہو بیٹا۔“

”جی امی۔۔۔۔۔ مگر آج تو آج ہے، سارے کام آج روٹین سے ہٹ کر ہو رہے ہیں، صفہ خالہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔ ماما نے ساکن لیا ہوا ہے اور آپ۔۔۔۔۔“

”اور میں کیا؟“

”ایک تو خوشی کی یہ خبر ہے کہ شبانہ کے لیے عربی بول چال کے پھر کا انتظام ہو گیا ہے۔“ خبیہ جو سلا دلیے صوفے سے ٹپک لگا کر بیٹھی تھی۔ اس نے بات ٹوک دی۔

”میل بچہ ہے؟“

”ہاں صفہ۔۔۔۔۔ مگر ادھیڑ عرش شریف بندہ ہے، ماہر مضمون ہے۔“

”نہیں خبیہ۔۔۔۔۔ شبانہ کسی جماعت میں ہوتی تو حرج نہ تھا۔“

”ماما۔۔۔۔۔ یہ گڈ نیوز تو آپ کی شوں ہو گئی۔۔۔۔۔“

عبد اللہ ہنسنے لگا۔

”میٹھا لے آئیں۔“ امیر بی بی کو جھوٹے برتن پکڑاتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

”میٹھا بھی ہے؟“ کہیں سے آواز آئی۔

شبانہ اور صفہ بھی اب دسترخوان سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھیں۔

”ماما۔۔۔۔۔ اب دوسری گڈ نیوز بھی سنا دیں۔“ عبد اللہ نے یاد دلایا۔

”میری امی آئی ہوئی ہیں جرمنی سے۔“

جدا ہوا۔ پھر اس نے اپنے دوست کے ساتھ
وہ خاموشی سے اٹھی اور لاؤنج کے صوفے پر جا بیٹھی۔ منشی
ماما، عبداللہ کے ساتھ کھنکھار کے داخل ہوئے، دعا دے کر
کوٹے میں منہ کر کے بیٹھ رہے، مسجد کے رنگ دروغن اور
باتھ رومز کی مرمت کے متعلق تفصیلی بتایا۔

”اسٹیشن کے کلر کارڈ لایا ہوں..... رنگ آؤٹ
ڈور کے لیے پسند فرمائیں۔“ کارڈ عبداللہ کو دیا پھر کہا۔
”ایک بات اور ہے پچھلے دنوں کوئی وکیل آیا تھا،
آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں بی بی کا
مختار عام ہوں اور بی بی گھر پر نہیں ہیں۔ اس نے ایک
فائل دکھائی، عرصہ پانچ سال پہلے..... آپ کو شاید یاد
ہو..... چودھری واصف فوت ہو گیا تھا۔ حادثے میں
فوت ہوا تھا۔ چک نمبر ایک سو چھیالیس ایل میں اس
نے چار کنال اراضی مسجد صفہ کے نام
کرائی..... حادثے سے پہلے ہی کرائی..... اس کا
موجودہ ریٹ تقریباً تین، چار کروڑ ہے، مرحوم کے تین
بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ وارثین خاموشی سے یہ رقبہ
آپس میں بانٹ لینا چاہتے تھے کہ ایک بیٹی نے یہ بات
مشہر کر کے آؤٹ کر دی..... وہ بچی جو ہماری شبانہ کو
انگریزی سکھانے آئی تھی ناں کیا بھلا سامان تھا؟“

”طارم.....“ عبداللہ نے یاد دلایا۔
”مرحوم کی وہ بیٹی طارم کی..... سہیلی تو خیر
نہیں، کالج والی تھی۔ تو..... اس کا مطلب ہے طارم نے
کہیں مسجد یا بی بی کا ذکر کیا ہوگا۔ یوں دیکھا جائے تو وہ
بیٹی انیس سال کی ہے ماڈلنگ کرتی ہے۔ یہ اسی وکیل
نے بتایا..... اس کے بھائی، بہن مسجد کا حق ہڑپ کرنا
چاہتے تھے، وہ اس کو بے غیرت کہتے اور بول چال
نہیں تھی۔ اللہ جس کے دل میں نیک کام کی توفیق ڈال
دے اس کی مرضی.....“

”منشی ماما! مسجد میری ملکیت نہیں ہے، اسے
فرسٹ چلاتا ہے۔“
”جی بی بی..... ٹرسٹ بھی آپ اور خبیہ بی بی ہیں،
باہم مشورہ کر لیں آپ.....“

”مادر آئیں گی۔“
اگلے دن اذان اور منگرو کو موسیقی بھلون کی
پیشیاں و دیگر تحائف کے ساتھ محبت و شکریے سے
رخصت کیا۔ یوں یہ ٹرپ مکمل ہوا۔

فرصت یا کر منشی ماما نے سلام عرض کرنے کی
اجازت طلب کی۔ منشی ماما اگرچہ کافی بوڑھے ہو چکے
تھے، وہ ستاون سالہ صفہ بخاری سے ایکس بائیس سال
بڑے تھے۔ مگر صحت درست تھی کسی قسم کی جسمانی
معذوری یا جتنا جی نہ تھی۔ نگاہ کم پڑنے لگی تو کھٹ پڑھت
چھوڑ دی پھر بھی حافظہ اتنا اچھا تھا کہ یہ نیک بتا دیتے کہ
پچھلے سال کس باغ سے کتنا پھل اتر ا تھا، عشر کتنا
بنا..... موجودہ گزشتہ میں نفع یا نقصان کیا ہے، عمر بھر
دیانت داری سے کام کیا تھا، بلقہ مطال کیا تھا اور بخاری
صاحب مرحوم کی بیٹی سے با احترام وفاداری کی تھی۔
آنے والے جمعے سے مسجد صفہ میں رنگ دروغن کا
کام شروع کر دیا چار ہاتھ۔ اس ضمن میں بھی منشی ماما کی
بات چیت متوقع تھی۔ ادھر سفر سے واپسی کے بعد شانہ
کو بخار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ منشی
ماما، عبداللہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ صحن میں رکھی
کھٹولی پر بیٹھا تھا کہ چھوٹا گیٹ کھلا۔

”شانہ ہے؟“ کسی خاتون نے جھانک کر پوچھا۔
”وہ بیمار ہے سو رہی ہے۔“ مر اٹھائے بغیر منشی ماما
نے جواب دیا وہ تھوڑی دیر تذبذب میں ٹھہری پھر کہا۔
”ان سے کہہ دیجئے کہ طارم کی امی آئی تھی۔
ویسے مجھے خالہ خالہ بھی کہتے ہیں..... (وہ ہنس پڑی)
پھر آؤں گی۔“ وہ چلی گئی۔

منشی ماما کو اس کے نام سے دلچسپی تھی نہ آنے
جانے سے۔ عبداللہ کے آتے ہی اسے بلا لیا۔
”پتر ادھر آ..... جا کے اپنی بخاری خالہ کو خبر
کر دے کہ منشی ماما حاضری کی اجازت مانگ رہا ہے۔
وہ اجازت دے، دے تو پھر آ کے میرے ساتھ چل۔“
عبداللہ نے کتابیں میز پر رکھیں اور منشی ماما کا فرمان

شبانہ بن کر مل اسی۔

”یہی تو عبد اللہ بتائے آیا تھا۔“

”اتنی لاڈ بھری باتیں سن کر شبانہ ای خوش ہو گئی ہیں۔“

”شبانہ..... مرلیض کی دعا قبول ہوتی ہے، تم خنبہ

کے لیے دعا کرو، عبد اللہ کے لیے دعا کرو، میرے لیے

دعا کرو..... فشی ماما کے لیے دعا کرو۔“

”میں ان سب کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں باجی۔“

”کیا کھایا ہے؟“

”میری زبان کا ذائقہ بہت کڑوا ہے..... کچھ

اچھا نہیں لگتا۔“

”سیب کاٹ دیتی ہوں، کوئی پھل جو کھو نکلوادوں؟“

”اگر آپ کہتی ہیں تو سیب کھا لیتی ہوں.....“ عبد اللہ

... لپک کر سیب تھالی میں رکھ کر چاقو لے آیا..... وہ چاہتا

تھا صفہ خالہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہیں شبانہ نے خود

کاٹنا چاہا مگر صفہ کے روکنے پر اسے کاٹنے دیا..... سیب

کی قاشیں بناتے ہوئے صفہ شیریں گفتار ہوئی۔

”حضرت ام العلاء بیان کرتی ہیں کہ میں بیمار تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کو تشریف

لائے اور فرمایا اے ام العلاء خوش ہو جاؤ کیونکہ مسلمان

کی بیماری کی وجہ سے اللہ اس کے گناہ اس طرح ختم

کر دیتا ہے جس طرح آگ سونے اور چاندی کی میل

ختم کر دیتی ہے.....“

”جزاک اللہ..... آپ نے مجھے دُہری خوشی

دی، آپ نے میرا خیال رکھا، مجھے حدیث سن کر خوش

کیا..... سچ میں، میری آدمی بیماری ختم ہو گئی۔“ پھر فشی

ماما کی کھٹکھار اور چاچا سنائی دی تو وہ اٹھ گئی۔ فشی ماما

نے آکر بیٹھی کا حال پوچھا۔

”پتری، تمہیں بی بی نے چودھری واصف مرحوم

کے عطیے کی بات بتائی ہے؟ مجھے یقین ہے نہیں کی

ہوگی۔“ شبانہ کی لاعلمی کے اظہار پر انہوں نے تمام

بات کہہ سنائی۔

”بابو لے گیا ہوگا.....“ ان کی پرانی گاڑی پرانا بوڑھا

ڈرائیور جس کو کبھی، کبھار گاڑی چلانے کا موقع ملتا تھا۔

”مما جب آئی تھیں تو ہمارے لیے نئی گاڑی

کیراج میں چھوڑ گئی تھیں۔ پرانی والی کو لے گئیں.....

کہا تھا اسے بکوا دوں گی۔“

”نئی ہو یا پرانی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لو

جی صفہ کو اس بات کی پروا تک نہیں ہوئی۔ لوگ نئی

گاڑی کی خوشیاں مناتے ہیں۔

”کب آنیں گی ماما؟“

”پرسوں آئیں گی۔“

”شبانہ جب آئے مجھے کھلوادینا۔ میں اب نہانا

چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھ گئی۔

”شبانہ کا بھی یہی حال تھا، سفر سے آکر دن میں

دو، دو دفعہ نہاتی ہے وہ، اب تو موسم خاصا خشک

ہے..... کیزر چلوادوں۔“ وہ انکار میں سر ہلا کر مسکرائی۔

شبانہ کی طبیعت اب بہتر تھی، وہ اپنے کمرے

میں لیٹی تھی، برابر والے بیڈ پر عبد اللہ بیٹھا انگریزی

پہیلیاں بچھوارہا تھا۔ پہیلیاں کیتھیں ادھوری سطریں

اپنی مرضی سے بامعنی الفاظ لگا کر مکمل کی جاتیں۔ شبانہ

تھوڑی دیر ساتھ دے کر تھک گئی۔

”بیمار ماں کو تھکا رہے ہو..... کوئی آسان گیم کھیلو۔“

ہنستے، ہنستے عبد اللہ دروازے کی طرف دیکھ کر ختم سا گیا۔

شبانہ کی نگاہ نے تعاقب کیا۔ صفہ اندر داخل ہو رہی تھی۔

”صفہ خالہ..... زبے نصیب۔“ عبد اللہ ایک دم

شرارتی ہو گیا۔ وہ مسکرائی۔ صفہ نے شبانہ کی پیشانی پر

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اشارہ دیا۔ وہ اٹھنے لگی تو منع

کیا۔ اس کے بستر کی پائنتی پر بیٹھنے لگی تو شبانہ تڑپ اٹھی۔

”بخاری باجی، پلیز مجھے گناہ گار نہ کریں۔“

”تم کیوں گناہ گار ہو گئی، یہ باتیں گناہ نہیں

ہوتیں، اللہ تمہیں صحت عطا فرمائے۔ تم میری بہت

بیماری بہن ہو، تم ہی تو اس آگن کی چکار ہو.....“ اچھی

اور امید والی لطیف باتیں تیار داری کا حصہ ہوتی ہیں،

میں کوئی سزا ملے رہا ہوں۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔
 گئے۔“ پھر وہ بتانے لگا کہ اذان کو بھی بخار ہو گیا ہے۔

”اور ہاں سندی کا فون آیا تھا۔ تم تو جانتی ہو وہ بات کیسے کرتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے یہ گزرنے لگی آپ تو بڑے بڑھے ہیں، آپ ہی سمجھداری کر لیا کریں۔ قتل صحرا میں میرے بچے کو بچھڑا دیا۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے بخاری باجی نے ایک تم نوکر ہو، دوسری شبانہ۔۔۔۔۔ زندگی اس کے نامے لگے کیسی ہے، تیسرا اذان تیار ہو رہا ہے۔“

”یوں کہہ رہی تھی وہ؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہی الفاظ تھے۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”کیا کہتا۔۔۔۔۔ خیر ہے، مگر بیٹھے بھی بخار ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے بات نہیں کرتے، سمجھایا اسے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔۔۔۔۔ رہی بات میری۔۔۔۔۔ تو میرے لیے صفہ بخاری اپنوں سے بڑھ کر ہے وہ میری ماں، بہن، بھیلی سب کچھ ہے پھر میرا یہ اونہارنا بچہ دار پیارا بیٹا ہے۔ یہ میرا سہارا ہے، مجھے یہاں کیا نہیں ملا۔“

”اللہ اسے نیک صالح بنائے۔ پتہ رہی! میں نے سنا ہے تم عبداللہ کے ساتھ مصر چلی جاؤ گی۔“

”قادرہ، مٹی ماما جان۔۔۔۔۔ میں جامعہ الازہر میں ایڈمیشن لوں گا، میں لائینن قانون پڑھوں گا۔۔۔۔۔ ہر مذہب کا۔۔۔۔۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ جھلی وہاں کیا کرے گی؟“

”ماماجی۔۔۔۔۔ میں اب جاہل جھلی نہیں رہی۔۔۔۔۔ عمر بھی سکھاتی ہے۔۔۔۔۔ پھر میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔“

”پھر بھی۔۔۔۔۔ تو کرے گی کیا؟ تو بھی جامعہ میں داخلہ لے گی؟“

”دونوں کو مٹی ماما کی سادگی پر ہنسی آگئی۔

”میں اپنے بچے کا خیال رکھوں گی۔۔۔۔۔ اس کی گارڈین (سرپرست) ہوں گی۔“

”رہی ناں جھلی۔۔۔۔۔ بچہ تو ہاشل داخل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تو کیسے خیال رکھے گی۔“ اس سوال کے جواب پر شبانہ نے غور نہیں کیا تھا۔ اسے یہی پتا تھا کہ بخاری باجی بیسے گی تو بہتری کے لیے ہی ہوگا۔

”اچھا چلوں، تم چلو ہوں۔“

”آپ کیوں چلتے ہیں، سوتے تو آپ جلدی نہیں ہیں، مٹی ماموں جان۔۔۔۔۔“ عبداللہ اپنی کتابیں سیٹ کر رہا تھا۔

”آرام تو کر لیتا ہوں کمر سیدھی کر کے۔“ وہ چلے گئے۔

”شبانہ امی۔۔۔۔۔ آپ بھی سو جائیں۔۔۔۔۔ میں یہ ٹیبل لیپ جلا کے لائٹ آف کر دیتا ہوں۔“ شبانہ نے کروٹ بدل کر کبل اور پرکھنچ لیا۔

☆☆☆

اب موسم خشک ہو چکا تھا۔ اسے کی بند ہو گئے تھے، پتھروں کی البتہ ضرورت رہتی، نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔ نخبہ نے آج خیرات کے طور پر بریانی کی دیکھیں اتروائی تھیں۔ امیر بی بی محلہ بھر میں جاننے نہ جاننے والوں میں بانٹ رہی تھی۔ گاؤں سے نئے موسم کا تازہ ساگ کاٹنے، دھونے، ابلانے کے مراحل کے بعد بھیجا گیا تھا۔ شبانہ اسے دیکھی تھی، سوکھی مریج کا بگھار لگا رہی تھی۔ نخبہ کو کاموں میں دلچسپی لیتا دیکھ کر صفہ ایسے خوش ہوتی جیسے ڈاکٹر اپنے مریض کی صحت یابی پر مطمئن ہو، خوش ہوتی صفہ اس وقت زینے پر بیٹھی جو اس کا کبھی، کبھی ٹھکانا بنتا تھا۔ سفید ردا کا ہالہ اس کے چاندی جیسے چہرے کے گرد تھا۔ کلانیوں تک آتے آستین سے نکلے کمزور ہاتھ میں گل ریحان کی خوشبودار پتیوں تھیں۔ جنہیں بے دھیانی میں مسلتے ہوئے سونگھ لیتی اور کوئی معطر سا روزبان پر رہتا۔ چھوٹا گیٹ کھول کر طارم کی امی نے جھانکا۔ پھر اندر قدم رکھا۔

”آنکس۔۔۔۔۔ تشریف لائیں۔“

اسکارف سے ڈھانپے سر اور کمزور نقاہت زدہ چہرے والی نخبہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ وہیں قریب بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان احوال پرسی کا تبادلہ، شبانہ کا اندر سے جوس کا گلاس لا کر دینا پھر اس کا کوئی لباسا حال سنانا، نخبہ کا سر ہلاتے ہوئے ہنستے رہنا۔ شبانہ کا آتے جاتے ایک آدھ بات کر لینا۔ امیر بی بی کا بڑی ٹرے میں تھا لیاں بھر، بھر کر رکھنا ان کو ابلے دسترخوان

”طارم کی امی؟ یہ کوئی نئی جہانی ہے۔“ اب شبانہ متوجہ ہوئی۔

”طارم کی امی تو صفہ بخاری سے بہت متاثر ہیں بتا رہی تھیں کہ پہلے مجھے بخاری لی بی سے چڑھی میں نے اس سے ٹکرا کر بھی کی تھی کہ میری بیٹی کو ملانی بنا دیا ہے..... زمین جو عطیہ دی گئی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ چوہدری مرحوم کے بیٹوں نے دبا رکھی تھی۔ مرحوم کی بیٹی حاجی جو ماڈلنگ کرتی ہے اس نے یہ خبر آؤٹ کی.....

سے ڈھانپ کر اٹھانا جانا صفہ کی سرسری نظر پڑی رہی، کسی شخص یا کرید کے بغیر..... اس کی سانسوں کی آمد و رفت میں اسائے حسرت پے ہوئے تھے، اب تو وہ زبان سے ادا نہ بھی کرتی تو قلب تسلیج کرتا۔ طارم کی امی اب جا چکی تھیں۔ خیرات کی ایک دیگ خالی ہو گئی۔ باقی یتیم خانے اور مدارس کو بھجوا دی گئیں۔ منجہ بہت تھک گئی تھی اپنے کمرے میں معمول کی ڈھیر ساری دوائیں کھا کر لیٹ گئی۔ بہت دیر بعد شبانہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اب وہ بیدار ہو چکی تھی۔

”فارغ ہو گئی ہو۔“ منجہ نے روکا۔

”جی..... آپ کو کچھ کیجا جس نکال دوں.....؟“

”نہیں ڈیر..... آؤ بیٹھو.....“

”طبیعت کیسی ہے تھک گئی ہوں گی۔“

”کام تو تم میرے بعد گھنٹوں کرتی رہی ہو.....

ہاں مگر میں تھک گئی..... شبانہ، تم نے چوہدری واصف کے مسجد کے لیے عطیہ کا مجھے نہیں بتایا۔“

”ہائے اللہ..... میں تو بھول ہی گئی..... مگر ماما جی

نے بخاری حاجی کو بتایا ہوا ہے، وہ بھی میری طرح آپ کو بتانا بھول گئی ہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”جی.....“

”مگر عجیب سی بات ہے۔“

”کون سی بات؟ مسجد کے لیے عطیہ دینا؟“

شبانہ کے سوال میں تعجب تھا۔

”چوہدری واصف کا قصہ یاد ہے نا؟ صفہ بخاری کے لیے رشتہ دیا تھا..... پھر اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔“

”جی ہاں..... مگر عطیہ تو جیتے جی دیا ہو گا نا!“

”میں کیا کہہ رہی ہوں کہ مرنے کے بعد دیا ہے۔

شبانہ تم شبانہ ہی رہو گی۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تو پھر آپ اس پر اتنا غور کیوں کر رہی ہیں؟“

”مجھے اس مرحوم کی سمجھ نہیں آتی۔“

”آپ کو ماما جی نے بتایا ہو گا۔“

”نہیں..... مجھے تو طارم کی امی نے بتایا ہے۔“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

بیک اسٹال کا نام جہاں پر چادریاں بند ہو۔

بیک اسٹال اور علاقے کا نام۔

بیک اسٹال ہو تو بیک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

راہیے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا شمس عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 نیو ایسٹینشن ویسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوئی روڈ مارکیٹ

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 123

سیم۔ ”شانہ نے بھی ہوں اعرابی میں کہا۔

”wao a daily women can speak such a noble english“

کشور جہاں نے اپنے تئیں تحسین کی مگر نخبہ جانتی تھی کہ شانہ کو ڈیلی وومن (یعنی تنخواہ دار ملازمہ) کے معنی معلوم ہیں اور یہ تو بین آئیز ہے، فوراً اماں کو ٹوکا۔

”مما۔۔۔ آپ پلیز کسی کے بارے میں جانے بغیر رائے مت دیں۔ یہ عبد اللہ کی امی ہے، عبد اللہ آپ کے الفاظ سے بہت رنجیدہ ہوگا۔“ پھر شانہ کو بلا کر ساتھ بٹھاتے ہوئے وضاحت کی۔

”مما جان۔۔۔ جب آپ کی بیٹی کو ڈاکٹروں نے لا علاج بتا دیا تھا، میرے تین سالہ بچے کو اس نے متا کی محبت دی۔ اتنی کہ میں عبد اللہ کی جانب سے مطمئن اور بے فکر ہو گئی۔ یہ وہی شانہ ہے جس کے متعلق آپ سے باتیں کرتی رہی تھی۔۔۔ جب پچھلے دنوں آپ آئیں تو یہ اور صفہ یہاں نہیں تھیں۔ اب صفہ بھی آگئی ہے۔“

”سوری سویت شانہ۔۔۔“ کشور جہاں کی معذرت پر خلوص تھی۔

”میری اچھی ماں۔۔۔ صفہ بھی اب، وہ میری کلاس فیلو صفہ چاہیے گا اسے وہ معرفت، روحانیت کے مقام پر ہے۔ اور خیال رکھیے گا۔“

”ہاں، ہاں ضرور ملوں گی۔ دعا کروں گی۔“ شانہ اجازت لے کر چائے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

عبد اللہ اپنی گرینڈ ما کے پاس آ بیٹھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور وہ گھر پر تھا۔ وہ اپنے ماموں زاد بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔

”تم تو میرے ساتھ چلو۔۔۔ گرینی کی بات مان لو۔۔۔ پاکستان میرا بھی وطن ہے، میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں مگر تم اپنا کیرئیر بناؤ۔۔۔ یہاں کیا ہے؟“

”گرینی، میں Egypt پڑھنے جاؤں گا۔۔۔ جامعہ الازہر۔۔۔ میں ایڈمیشن لوں گا اور یہ اتنا ایزی نہیں ہوتا۔۔۔ دعا کریں ایڈمیشن ہو جائے۔“

ماجی ٹارم کی میس بک فریڈ ہے۔

”نخبہ باجی۔۔۔ ہماری صفہ بخاری کی شہرت کہاں، کہاں تک ہے۔“

”کہاں، کہاں تک کوئی نہیں۔۔۔ ہماری صفہ بخاری تو مجذوب بندی ہے۔ مجذوب خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم جو اس کے اتنے قریب ہیں، ہم پر بھی ظاہر نہیں ہے۔ اصل میں وہ ہے کیا؟“

☆☆☆

تجربہ سے اشراق، چاشت تک جاگتے رہنے کے بعد صفہ کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ وہ سو رہی تھی جب گھر کے باہر بڑی سی گاڑی آرکی۔۔۔ شو فرنے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سفید بال مگر بوائے کٹ، لوز لائٹ شرٹ اور جینز۔۔۔ یہ نخبہ کی امی کشور جہاں تھیں جن کی عمر لگ بھگ اسی کے قریب تھی۔

پہلے امیر بی بی سشدر ہوئی پھر شانہ حیران ہوئی، یہ حیرانی اور پریشانی عبد اللہ کے اچانک نکل کر آنے اور گرینی کے نعرے سے دور ہوئی۔

”اچھا۔۔۔ یہ نخبہ باجی کی مما ہیں۔“ شانہ نے بے آواز بلند سوچا۔ امیر بی بی ایک بار پھر دیکھنے لگی۔ شانہ آگے بڑھ کر ملی اور رہنمائی کرتی ہوئی نخبہ کے کمرے تک لائی۔

نخبہ جو اپنے بیڈ پر نیم دراز تھی خوشی سے ایک دم اٹھی پھر ہائے کر کے کمرہ تمام لی۔

”بیٹھی رہ۔۔۔ بیٹھی رہ۔“ اس کی ممانے اسے تمام کر بٹھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

شانہ نے سکھ کی سانس لی کہ یہ اردو بول لیں گی۔ ”گڈ گاڈ۔ کیا حال ہو گیا ہے تر۔۔۔ سچ میں تجھے چھوٹے، سامنے بٹھا کر دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اب بڑا اس کے بقایا معاملات نمشا کر آئی ہوں۔“ پھر ادھر، ادھر دیکھ کر بولیں۔

”چنانچہ، کیسا مزاج ہو گیا ہے، مجھے تو گرینی لگ رہی ہے۔“

”آپ یہاں کے موسم کی عادی نہیں رہیں گی۔“

بیوی نے شور مچا دیا۔ "جیسے آج آکھ بھولی کھینے ہیں، اگر آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا تو ہر شاہین پر جائیں گے۔"
"شوہر۔ اگر میں آپ کو ڈھونڈ نہ سکا تو؟"
بیوی۔ پیار سے بولی۔ "جانو! ایسا نہ کہو میں دروازے کے پیچھے تو چھپی ہوئی گی۔"
مدرسہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کا خوف میرے تعاقب میں تھا اور وقت کی پونجی ختم تھی۔ یہ نہ پوچھا صفہ نے..... کیوں آئی ہو؟ کیوں میری حویلی میں رہنا چاہتی ہو؟ کیوں نہیں ماں، بھائی کے پاس چلی جاتیں؟ اس کے پاس کتنے کیوں تھے، اس نے ایک بھی کیوں نہ اٹھایا۔ ماما آپ بتائیں؟ آپ کے پاس، ہمارے پاس کوئی یوں آکر رہنے لگے۔ چاہے آپ کی فریڈ ہو، میری فریڈ ہو، ہم رہنے دیجئے؟ ہمیں کتنے ٹھگ پڑتے۔" غصہ نے تھوڑا پانی گلاس میں کر گھلا کر کیا۔

"پھر ماما..... اس کا ایک اور رخ میرے سامنے آیا۔ وہ میرے لیے دعا بن گئی۔ اس نے یہ دعا اپنے ذمے یوں لے لی جیسے اس سے قصور سرزد ہو گیا ہو، صفہ کی دعا میرے عیسوں کی دعا نہیں ہے، نہیں ہوسکتی، اس نے اللہ کے ذکر پر عمر، مال، جوانی، خواہشات ٹار کر دی ہیں، ماما جان یہی عمر، مال، جوانی، خواہشات ہم دنیا والوں کے خدا ہیں، آپ بھی جانتی ہیں، میں بھی جانتی ہوں..... آسان نہیں ہوتا ان کو کرش کر دینا اور میں؟ کہاں میں یہ ترک کر سکتی تھی؟ مفلوک کی ٹانگ نہ اٹھ سکے تو دوڑ میں حصہ نہ لینا اس کا فیصلہ نہیں ہوتا..... البتہ..... یہ مصلحت ربانی ہوتی ہے..... مصلحت وہ فلسفہ ہے جس کے ظاہر میں اندھیرا ہے اور باطن میں راستہ ہے۔"

"سب باتیں ٹھیک ہیں، مجھے تو تمہاری باتیں سن کر یہی خیال آتا رہا کہ company makes a man تم کتنی بدل گئی ہو..... تم واقعی بدل گئی ہو۔" کشور جہاں نے انکو کا دانہ تو ذکر منہ میں رکھتے ہوئے کمرے پر نظر دوڑائی۔ "یہ بتاؤ..... وہ صفہ کی سادات

اوسے..... اوسے..... کشور جہاں کو یہ باتیں کوئی نہ تھیں مگر بچے سے بحث کرنا مناسب نہ جانا۔ عبداللہ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اسے چند کھیلوں، جسمانی ورزش اور صحت مند سرگرمیوں کی اجازت تھی۔ کشور جہاں، پنجہ کے پاس آ بیٹھیں، اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آب دیدہ ہو گئیں۔

"ہبی..... مجھے تیرے نصیب پر رونا آتا ہے، کیسی ماڈل جیسی خوب صورت تھی، کیا حال ہو گیا..... میری جان۔ لوگ ابھی علاج کے لیے بڑے ملکوں میں جاتے ہیں اور یہ گناہ نہیں ہوتا..... تو یہاں پسماندہ علاقے میں آکر بس رہی..... ڈاکٹروں نے تجھے لا علاج بتایا تھا، یہ کہا تھا کہ جینے کو پندرہ سال جی سکتی ہے، چھ مہینے بھی نہ جی سکے یہ بھی ممکن ہے۔"

"ڈاکٹروں نے کہا تھا ناں..... جرمی میں ہوتی تو ڈاکٹر جیت چکے ہوتے، ماما! انسان..... جس ایمان پہ ہوتا ہے اسی دھیان پر چلتا ہے، اس کو شاید میڈیکل سائنس ول پاور رکھتی ہوگی..... یہ پاور ایک اور پاور ہے، ویسے قسم سے میں بھی حیران ہوئی ہوں، مجھے کب امید تھی کہ عبداللہ کو پندرہ سال کا ہوتا دیکھوں گی۔"
"شکر ہے اللہ کا۔"

"ہاں تو یہ اللہ کا ہی کرم ہوا ناں....."
"اچھا اب میرے ساتھ چلو..... میں نے گھنٹا گھر والا مکان سیل کر دیا اور ترے ابو کے جو دفتر تھے ناں فیصل آباد والے ان کے واجبات نکل آئے، اب میں اپنا حصہ رکھ کر باقی تجھے اور نجیب کو دے دوں گی..... ترا عبداللہ کا اثر ٹکٹ تو اس میں سے ہی نکل آئے گا۔" کشور جہاں نے یوں مسئلہ حل کیا گویا سارا مسئلہ ہی اثر ٹکٹ کا ہے۔

"پیاری ماما..... listen to me just listen to me just..... وہ بہت اہم ہے میرے لیے۔ جب میرے سر پر دھوپ ہی دھوپ تھی۔ اس نے مجھے سامنے میں سمیٹ لیا۔ جب کڑوا ہی کڑوا چکھا تھا دنیا والوں سے..... مجھے شیرینی کا احساس یہاں ملا..... خالی دامن

خوبی کی وہ اپنی رہا سی۔ وہ یوں چھوڑ دیا۔ (کوئی جی کشور جہاں کو سمجھانا مشکل تھا) اور تم اپنا لباس دیکھو۔ اس دن تم نے اپنی وارڈ روپ دکھائی۔ کوئی حال نہیں۔ میں تمہارے لیے آٹھ دس ڈریسز خرید کر لے آتی پھر سوچا پسند اپنی، اپنی ہوتی ہے۔“ نخبہ جا کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ کشور جہاں آٹھ کر اس کی ڈریسنگ ٹیبل کا تنقیدی جائزہ لینے لگیں۔ ایک کونے میں کئی چند چیزیں رکھی تھیں۔ لوٹن، پرفوم، کریم کو باری، باری ہاتھ لگا کر دیکھا۔ پھر غم میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

”کیا لیول ہے یہ۔ کیا ہے یہ سب؟ یہ تری ڈریسنگ ٹیبل ہے، تو تو جیتے جی مٹی ہو گئی ہے۔ ایسی چیزیں تو ڈسٹ بن میں پھینک دیا کرتی تھی۔“ وہ نشو و نما پہنچ کر اپنی آنکھیں تھپتھپاتے ہوئے سنگار میز کے اسٹول پر بیٹھ رہیں۔ نخبہ کو ماں پر ترس آ رہا تھا۔ وہ ماں کے جذبات سمجھ سکتی تھی۔ ماں کی محبت سے انکار نہ تھا۔ وہ اسی ماں کو ناپسند آنے والے کاسمیٹکس بغیر استعمال لوٹا دیا کرتی تھی۔ وہ ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیا کرتی تھی۔ ”تری عمر کوئی پچھین ستاون برس ہے، میں اٹھتر پار کر چکی ہوں۔ تو خود کو دیکھ۔ مجھے دیکھ۔ بیہاری نے ترا دل مار دیا۔“ انہوں نے سنبھل کر پھر بات کی۔ کشور جہاں کے ڈریس سے سختی قیامت مہک، گلے میں پڑا سفید موتیوں کا ٹیکس، ایک کلائی میں پرل کا بریلست دوسرے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی، کانوں میں وائٹ گولڈ کے ٹاپس، پاؤں میں دیدہ زیب جوتے، ہر چیز اپنی جگہ فٹ تھی۔ اور ادھر عام سوئی، ملائم کاشن کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سر کے بال جگہ، جگہ سے گرے ہوئے کے سبب سر پر اسکارف آنکھوں کے گرد حلقے، ہاتھوں پر جھیریاں۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ کوشش میں لگی رہتی تو اس وقت بھی اپنی عمر سے بیس سال چھوٹی لگ سکتی تھی۔ ظاہری چمک لگے رہنے سے ملتی ہے ورنہ وقت تو ایک سا بے رحم ہے۔ کھیت میں گندم کاشت کی چالیس سالہ مشق عورت ساٹھ کی لگتی ہے جبکہ مارننگ شو کرنے والی سیلبرنی پچاس سال کی ہو کر

کی میں سے امی کے کشور جہاں سے تری کی ایک مریضہ اس دودھ میں کس جگرے سے لگتی اور لگتی بھی تو احمق ہوتی۔ کچھ دیر تک افسوس کرنے کے بعد کشور جہاں کو یہ بات سمجھ آنے لگی۔ پھر وہ خاموشی سے دوسرے بیڈ پر جا کر لیٹ رہیں۔ پھر وہ اپنے شوہر اعوان صاحب (نخبہ کے ابو) کے زمانے کی یادیں دگرہانے لگیں۔ ماضی کی باتوں کی پٹاری کھل گئی۔

”تری شادی اس خبیث، کم ظرف آدمی سے کرنا ان کی ایسی غلطی تھی جس کا پچھتاوا اعوان صاحب کی صحت چاٹ گیا۔ ہم اس کی ظاہری شان و شوکت سے متاثر ہو گئے۔“

”اب اسے گالی مت دیں۔ اللہ اس کی بھی مغفرت کرے۔“

”یہ تو بھلا ہوا وہ بھی اعوان تھا۔ عبداللہ کا نام عبداللہ۔۔۔ اعوان اسے دونوں طرف سے بچا گیا۔“

”صفہ جاگ گئی ہے؟“ شبانہ اس دوران کسی کام سے آئی تو نخبہ نے پوچھا۔

”ابھی تو نہیں جا گئیں۔“ دوسری بار شبانہ ظہرانے کے لیے ہدایات لینے آئی تو بتایا کہ بخاری باجی کے لیے تہہ بہ تہہ رہی ہوں، ان کے سر میں درد ہے۔

”اب اس کی باری آگئی۔“

”کیوں، کیا ہوا۔۔۔؟“ کشور جہاں نے لینے، لینے پوچھا۔

”پچھلے دنوں شبانہ کو تیز بخار چڑھا تھا۔ اب اللہ خیر کرے صفہ کے سر میں درد بتا رہی ہے۔“

”نخبہ، تم نے بتایا نہیں جب میں آئی تھی یہ دونوں کہاں گئی تھیں؟“

”مما۔۔۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔۔۔ یہاں کا اپنا آسمان اور اپنی پروازیں ہیں، آپ کو بتاؤں گی تو سوال پہ سوال کریں گی۔“

”میرے حساب میں تو بھی محظوب ہو چکی ہے۔“ کشور جہاں نے کبھی سانس خارج کی۔ ”اس گھر کا نام محظوبان داؤدرا ہونا چاہیے۔ ساری کالیاں ایک

انہیں صفہ سے ملنا تھا۔ شبانہ نے صفہ کو نخبہ کی والدہ کی آمد اور ملنے کی اطلاع دی۔

کشور جہاں اس سادہ سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ صفہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ اس کا ٹھنڈا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کشور جہاں کے جسم میں ایک لہری دوڑی گئی۔ اس کیفیت میں حیرانی لبالب بھری ہوئی تھی۔ کل کی ایک لڑکی (ان کی نظر میں وہ بی بی کی ہم جماعت سہیلی تھی) تارک الدنیا، ولی بی بی ہوئی۔ اس ضمن میں پوچھنا تاچھنا کیا تھا نخبہ کی زبانی سن رکھا تھا۔ کشور جہاں مرعوب تھیں۔

”بی بی بی بی..... آپ تشریف رکھیں۔“

”بی بی..... نہیں بیٹی۔“ صفہ کی پہچان وہی ایک نرم مکان..... کشور جہاں بات کرنے کا سراغ تلاش کرنے لگیں۔ بہت سے خیال آئے، دعاؤں کی فرمائش، نصیحت کا تقاضا، اصلاح احوال کی خواہش، نخبہ کے بارے میں تشویش، عبداللہ کا مستقبل، الجھے ریشم کو سلجھائیں پر کیسے؟

”میری ماں بس میری طرح دنیا داری بندی ہیں..... اس وقت نفسیاتی دباؤ میں ہیں..... میں بھی ان کی جگہ ہوتی تو اسی حالت میں ہوتی۔“ نخبہ نے پہل کی۔

”آپ کیسی ہیں خالہ؟“ صفہ نے اعتماد بحال کرانے میں مدد کی۔

”میں ٹھیک ہوں..... میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے رہتے ہیں..... باقی اچھے کام بھی اپنے حساب میں کر لیتے ہیں مگر ہم آگے کیوں نہیں نکل پاتے.....“ سوال بے موقع بھی تھا اور بے وزن بھی۔

”ہم کسی ریس میں نہیں ہیں ماما.....“

”میرا مطلب یہ تھا..... اللہ معاف کرے ہماری تو نمازیں بھی اٹھک بیٹھک ہوتی ہیں..... نماز شروع کرو تو غنڈہ آنے لگتی ہے، سلام پھیر کر اٹھو تو غنڈہ غائب..... مگر یہ

ہمارا سورتہ نہیں.....“ کوئی چاہتا ہو۔

نخبہ نے ادھر، ادھر ہو کے ماں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا..... وہ بے سرو پا بول رہی تھیں، وہ خاموش ہوئیں۔

”خالد صلیبہ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھو ڈیر.....“ صفہ نے نخبہ کو مخاطب کیا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں اپنے گھر سا آرام نہیں ملے گا۔“

”ڈونٹ وری صفہ بیٹی..... میں ٹھیک ہوں.....“

آپ کے والدین کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بات پرانی سہی مگر میں تو آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔“ کشور جہاں ایک بار تکلف سے بولنے لگیں۔ مگر چھوٹے ہی دوسرا انتہائی ذاتی سوال داغ دیا۔

”آپ نے شادی کیوں نہ کی؟“

نخبہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی ماں کو کیسے چپ کرائے، صفہ کے شہین چہرے پر کوئی جوابی لکیر تک نہ پا کر کہا۔

”اچھا..... جیسے آپ کی مرضی..... شادی سنت ہے میں نے تو نخبہ کو سمجھایا تھا۔ پھر یہ بیمار پڑ گئی.....“

یورپ میں اس عمر کو تک ایج سمجھا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی تک نظر ہے..... مایوس کن ہے۔“

”ماما.....!“

”میں اپنے نواسے عبداللہ کی وجہ سے فکر مند رہتی ہوں..... یہ میری بیٹی آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ ہزار بار اسے کہا بیٹے کو میوٹ بھیج دو۔ کوئی اس کا کیئریر بنے..... یہاں رہ کر تو وہ الگ سا دکھتا ہے۔ صفہ بخاری بیٹی! میں تو دنیا دار ہوں مگر یہ دنیا اللہ نے ہمارے لیے بنائی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھا جاسکتا ناں..... جینا ہے تو آگے بڑھنا ہوگا۔“

”آگے کہاں؟“ دو لفظی سوال بہت وزنی تھا۔

”میرا مطلب ہے ترقی.....“

”آپ کو مجھ سے شکایت ہے؟“ مسکرا کر پوچھا تو نخبہ فوراً بولی۔

”نہیں صفہ، تم سے شکایت کا کیا سوال، میں خود تمہارے پاس آئی تھی۔ تم نے مجھے نہیں بلایا تھا..... اور امی یہ بات جانتی ہیں۔“

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

127

جھاگی، محفل حجب دیکھ کر پلٹ جانے کو بھی نہ منجھہ بلالیا۔
اس پر بھی کشور جہاں نے تادیبی نظروں سے
دیکھا وہ بہر حال اسے ایک عزت دی گئی ملازمہ گردانتی
تھی۔ شبانہ نے پھر سے ایک بار انگریزی میں وار کیا۔
”میم آپ کے لیے کوئلہ کافی تیار ہے۔“ منجھہ کو
اس وقت شبانہ نجات دہندہ لگی۔

”مما آپ چلیے..... میں آتی ہوں۔“ اس نے
ماں سے کہا۔

”میں پھر آپ سے بات کروں گی۔“ کشور
جہاں اٹھتے، اٹھتے کہہ گئیں۔ وہ چلی گئیں۔ منجھہ نے صفہ
کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کلبا جت سے معذرت کی۔

”اچھی بہن..... امی کی باتوں کو دل پر نہ لینا..... وہ
چاہتی ہیں کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“
”انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اچھی نہ
ہو..... منجھہ تم جاؤ اور زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزارو.....
ان کا تم پر بہت حق ہے۔“ منجھہ ریلیکس ہو گئی۔

”ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟“

”میں حیران ہوں کہ میں، اب اس اذیت
میں نہیں ہوں..... یہ میری زندگی کا معجزہ ہوگا اگر میں
میڈیکل کی سو فیصد پیش گوئیوں کو رد کر کے صحت یاب
ہو جاؤں..... اور یہ صرف تمہاری دعاؤں سے ہوگا.....
ہم صحت یاب ہو کے مل کے رہیں گے.....“

”الحمد للہ.....“ صفہ نے سر جھکا کر گفتگو کا سلسلہ
منقطع کر دیا۔

☆☆☆

”کیا رکھا ہے جامع الا زہر میں..... نام ہی اتنا مشکل
کہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ عبد اللہ..... یہ سائنس، ٹیکنالوجی کا
زمانہ ہے، تمہیں لائف میں کچھ بننا ہے یا صفہ مسجد منجھہ لوگ؟“
کشور جہاں غلی نہیں بیٹھیں اب عبد اللہ کو گھیر لیا۔

”ڈائیر گرینی..... جامعہ الا زہر میں سائنس،
ٹیکنالوجی تمام subjects ہیں۔ صفہ خالہ نے
میرے لیے بہتر سوچا ہے۔“ عبد اللہ نے فرق سے

”بیٹا..... ان کی دنیا محدود ہے..... ان کی
ساری زندگی ایک چار دیواری میں گزری..... انہیں کیا
پتا کون سا ادارہ ٹاپ کا ہے، کس مضمون کی ڈیماڈ
ہے۔“ عبد اللہ چپ رہا تو کشور جہاں کو لگا ویل اثر
کر رہی ہے مزید محبت سے کہا۔

”میرے پیارے بچے، نجیب اکل سے مشورہ
کر لو..... میرے ساتھ چلو ایک پتھر لگا لو..... بڑے
ملک اور حیرتوں کو ملو گے، دیکھو گے تو وژن بڑھے
گا..... انگریز امر ہو چکے فارغ تو ہو.....“

”ماما سے پوچھ لیجیے..... لیکن میں شبانہ امی کے
بغیر نہیں رہ سکتا..... گرینی پلیز مجھے ان کو cheat
کرنا مت بتائیے گا۔“

کشور جہاں اگلی بات یہی کرنے والی تھیں، وہ تو
نواسے کو ”خود ساختہ، ماں کے فرانس سے نکالنے کا
عزم لے کر آئی تھیں۔ برا وقت تھا گزر گیا اب کیا
ساری عمر ساتھ جوڑے رکھیں۔ انہیں افسوس تھا کہ دس،
گیارہ سال کا یہ عرصہ منجھہ کو فری ہینڈ دے کر غلطی کی۔
اب عرصہ اتنا گزر چکا تھا کہ ذہن بدلنا آسان نہ تھا۔

کشور جہاں نے سنگار میز پر رکھے پرفیوم کو اٹھایا۔
اس کو آنکھوں کے قریب لا کر نام پڑھا..... پھر اپنے
دائیں بائیں چھڑکا پھر برا سامنے بنا کر رکھ دیا۔ وہ عبد اللہ
کے پاس آ کر اس کے سر پر ہاتھ چھپتھا کر بولیں۔

”مامی سویٹ سن..... تم نے تو مجھ سے زیادہ
اسلام کو اسٹڈی کیا۔ اسلامی ماحول کی تربیت لی، تم
جانتے ہو گے اسلام میں منہ بولے رشتوں کی کوئی
قانونی شرعی حیثیت نہیں..... منہ بولی ماں، ماں نہیں
ہوتی، رضاعی رشتوں کو اسلام نے مقام دیا ہے منہ سے
کہے ہوئے کو نہیں.....“

اسی وقت کمرے میں داخل ہوتی شبانہ کے قدم
وہیں تھم گئے۔ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”اچھا اخلاق، خدمت، محبت اپنی جگہ مگر اس
سے رشتہ نہیں بن جاتا۔ تمہاری ماں صرف وہ ہے جس

نے ہمیں ہم دیا..... پائے پونے کے لیے نوادہ، آیا
فوسر مدر ہوئی رہتی ہیں..... اللہ نے قرآن میں ہمیں
حکم دیا کہ دایہ، ماں کے برابر ہے؟“
الفاظ صحیح تھے یا تو صحیح صحیح، شانہ کی سماعتوں پر
بھڑکتے تیزاب کا لالہ گر اور اندر جسم کرتا چلا گیا۔ ہاتھ
میں عبد اللہ کے استری شدہ کپڑوں کا بگڑتھا سے وہیں
کمرے کے دروازے کے ساتھ رکھے سجاوٹی گلدان پر
ڈال کر اندھا دھند اپنے کمرے کو بھاگی شعور نے ایک ہی
حکم دیا بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ، مٹ جاؤ، پردہ پوش
ہو جاؤ..... کمرے کا دروازہ بند کیا۔ ٹکیہ بڑا تھا
سانے..... ٹکیہ دو بوج کے فرش پر پھسکر مار کے ڈھے گئی۔
”منہ بولی ماں، ماں نہیں ہوتی۔“

نہنے سے عبد اللہ کا خنبہ کی انگلی پکڑے سادات
حویلی میں داخل ہونا..... شانہ کا لپک کر اسے سینے سے
لگا لیتا۔ اٹھائے، اٹھائے پھرنے کے ان گنت مناظر،
طرح طرح کے کھیل بنا کر عبد اللہ سے کھیلنا، اس کی
خوشی کی خاطر جھلی بن کر پھرتا۔ صبح شام اس کو مزے،
مزے کی اول بدل کر چیزیں بنا کر کھلانا، اس کو سنانے
کی خاطر کہانیوں کی کتابیں خریدنا، کبھی زبردستی سنانے
کی کوشش نہ کرنا، اس کو ٹانگوں پر جھلاتے ہوئے اس
کے نہنے قہتہوں پر فٹس، فٹس کرنا رہنا۔ اس پر پڑھ،
پڑھ کر پھونکنا، اس کو دعاؤں کا محور اول و آخر بنالینا، اس
کی کامیابیوں کی منیتیں، معمولی موہی بیماری پہ صحت
یابیوں کی منیتیں، اس کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی کلام
اللہ کا حصار، گھر کے اندر قدم رکھتے ہی بسم اللہ، بسم اللہ
کا استقبال، اس کے ساتھ جانے کی خاطر انگریزی
سیکھنا اور پھر عربی سیکھنا..... وہ اس کا کہنا ”شانہ امی“
اور شانہ کا جوانی ”امی صدقے.....“ مگر پھر بھی وہ ماں
نہیں تھی۔ اس کو رب نے ماں نہیں بنایا تھا۔ اس کے
بطن میں انکار رکھا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ ماں بننے کے
تروں میں عمر بتا دی..... اس کے قدموں تلے عبد اللہ
کی جنت نہیں تھی۔ منہ بولی ماں کا طمانحہ اس کی روح
سنگسار کر گیا تھا۔ اس کا دل زخمی ہو گیا تھا اور اب وہ ٹکیہ

حمد
اللہ کہوں یا علت اولی کہوں اسے
یزداں کہوں یا ایزد اعلی کہوں اسے
وہ متمکن علی العرش العظیم ہے
وہ ذوالجلال و الاکرام ہے
لا یزال اور آفریدگار ہے وہ
مجیب الدعوات اور معبود حقیقی ہے وہ
صفت الہی اور خدائی سب اسی سے ہے
ربوبیت اور معبودیت سب اسی سے ہے
لا محدود طاقت اور وحدت کا مالک وہی خدا ہے
حاکمیت اعلیٰ اور ابدیت کا خالق وہی خدا ہے
واحد اور ہستی مطلق ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
متبرک اور معبود ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
وہ رزاق اور مسبب الاسباب بھی ہے
وہ حلیم، کریم، رحیم اور بصیر بھی ہے
حکمت، نیکی اور عدل سب اسی سے ہے
حق، محبت اور رحم سب اسی سے ہے
وہ منعم حقیقی اور خالق کل کائنات ہے
وہ اعلم الغیوب اور محافظ حقیقی ہے

کاوش: نعیم حیدر

انتخاب، صہانور، لہ

کھجور کھائیں..... لمبی عمر پائیں

رسول اللہ کا مبارک ارشاد ہے.....
جس نے سات کھجوریں صبح اور سات شام کو
کھائیں وہ دن بھر (تمام بیماریوں سے) محفوظ رہے گا۔
عالمی ادارہ صحت میں وبائی امراض کے ماہر ڈاکٹر عمر
سلمان محمد جن کا تعلق سوڈان سے ہے، ان کا کہنا ہے۔
”ہمارے علاقے میں لوگوں کی عمریں بڑی لمبی
ہوتی ہیں، وہاں لوگ سو سال سے بھی زیادہ عمر پاتے
ہیں اور آخری دم تک صحت مند اور توانا رہتے ہیں،
میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ
غذا میں کھجور کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔
ایک تحقیق سے اقتباس۔ اڈ: آسیہ عامر، کراچی

”خالہ کی صحت کیسی ہے؟“ ملنے آئی ہوں گی۔“
صفہ نے پوچھا۔

”امی کی صحت ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے، ہماری چانداد کے حسابات رجب تھے کچھ اٹائے سیل کرنا چاہتی ہیں، ملے تو آئی تھیں مگر پھر آبائی گھر چلی گئیں۔ سب کچھ نمنا کر آئیں گی۔“

”وہ تمہارے متعلق فکر مند ہوں گی ناں۔“
صفہ بولی۔

”تو بتا تو میرے متعلق کیا کہہ رہا تھا۔“ شبانہ، عبداللہ.... کو کہنی مار کے چکی۔

”ہاں عبد اللہ چاند، میں خوش ہوں، ہم سب خوش نصیب اور اللہ کے نوازے ہوئے لوگ ہیں، ہمیں اندازہ نہیں کہ اللہ نے ہمیں کتنا کچھ بنانا سکے دے رکھا ہے اور دے رہا ہے، مانگنا تو کجا ہمیں اس کا ادراک بھی نہیں ہوتا نخبہ باجی، ان دنوں زبان اور حلق ٹھنڈے پانی کو ترس گئے تھے۔ تازہ بے دریغ پانی سے نہانے دھونے کو ترس گئے تھے۔“ تھرچولستان دیکھ لینے کے بعد پانی بہت قیمتی لگتا ہے۔“

عبداللہ کے ہاتھ سے رخ بستہ بوتل پکڑی نہ گئی۔ اس نے دھیرے سے واپس رکھ دی۔ نخبہ نمناک ہو گئی، کہنے لگی۔

”تاریخ میں پڑھا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام حسینؑ کے فرزند حضرت امام زین العابدینؑ کے سامنے جب بھی پینے کو پانی آتا، اٹھ کر ہو جاتا۔“
”لاکھوں درود آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔“
”مجھے اپنی نماز کی جگہ پر لوٹنا شادماں کر گیا۔“
صفہ اٹھنے لگی۔

”خالہ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟ کیا کہتی تھیں؟“ شبانہ نے نخبہ سے برتن لیتے ہوئے پوچھا۔

”عبداللہ کو سامنے پا کر حیران ہو گئیں۔۔۔۔۔ کہنے لگیں۔ تو ننھا مولوی لگتا ہے۔ مگر جب اس نے انگلش شروع کی اور لاکی باتیں کیں تو پھر جتنی بھی بنا بنایا

”شبانہ، آج تو کھانے دے، عید یاراں ہے۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا بچہ لیا ہے۔ ویسے میرا ہاضمہ کچھ بہتر ہو رہا ہے۔“
”تو، تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ مگر احتیاط کرو۔“ صفہ نے سلا دیا۔

”اس سے بھی بڑی خوشی کی خبر ہے میرے پاس۔“
”یس ماما۔۔۔۔۔ آپ وہ تو بتائیں۔“ عبداللہ کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولنے لگا۔ شبانہ نے اس کا ہاتھ روکا۔

”یہ چار دن میں شہزادے نے نئی، نئی عادتیں بنالیں۔ کولڈ ڈرنک کھانے کے ساتھ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ آپ تو جانتے ہو بیٹا۔“

”جی امی۔۔۔۔۔ مگر آج تو آج ہے، سارے کام آج روٹین سے ہٹ کر ہو رہے ہیں، صفہ خالہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔ ماما نے سامان لیا ہوا ہے اور آپ۔۔۔۔۔“
”اور میں کیا؟“

”ایک تو خوشی کی یہ خبر ہے کہ شبانہ کے لیے عربی بول چال کے نیچر کا انتظام ہو گیا ہے۔“ نخبہ جو سلا دلیے صوفے سے ٹپک لگا کر بیٹھی تھی اس نے بات ٹوک دی۔
”میل نیچر ہے؟“

”ہاں صفہ۔۔۔۔۔ مگر ادھیڑ عمر شریف بندہ ہے، ماہر مضمون ہے۔“
”نہیں نخبہ۔۔۔۔۔ شبانہ کسی جماعت میں ہوتی تو حرج نہ تھا۔“

”ماما۔۔۔۔۔ یہ گڈ نیوز تو آپ کی شوں ہو گئی۔“
عبداللہ ہنسنے لگا۔
”میٹھا لے آئیں۔“ امیر بی بی کو جھوٹے برتن پکڑاتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

”میٹھا بھی ہے؟“ کہیں سے آواز آئی۔
شبانہ اور صفہ بھی اب دسترخوان سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں۔

”ماما۔۔۔۔۔ اب دوسری گڈ نیوز بھی سنا دیں۔“ عبداللہ نے یاد دلایا۔

”میری امی آئی ہوئی ہیں جرمی سے۔“

ہیں..... ضرور آئیں گی۔“

اگلے دن اذان اور منگرو کو موسی پھلوں کی پٹیاں و دیگر تحائف کے ساتھ محبت و شکریے سے رخصت کیا۔ یوں یہ ٹرپ مکمل ہوا۔

فرصت پا کر منشی ماما نے سلام عرض کرنے کی اجازت طلب کی۔ منشی ماما اگرچہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے، وہ ستاون سالہ صفہ بخاری سے اکیس بائیس سال بڑے تھے۔ مگر صحت درست تھی کسی قسم کی جسمانی معذوری یا بھتاجی نہ تھی۔ نگاہ کم پڑنے لگی تو لکھت پڑھت چھوڑ دی پھر بھی حافظہ اتنا اچھا تھا کہ یہ تک بتا دیتے کہ پچھلے سال کس باغ سے کتنا پھل اترا تھا، عشر کتنا بنا..... موجودہ گزشتہ میں نفع یا نقصان کیا ہے، عمر بھر دیانت داری سے کام کیا تھا، لقمہ حلال کھایا تھا اور بخاری صاحب مرحوم کی بیٹی سے با احترام وفاداری کی تھی۔

آنے والے جمعے سے مسجد صفہ میں رنگ و روغن کا کام شروع کر لیا چار ہاتھ۔ اس شخص میں بھی منشی ماما کی بات چیت متوقع تھی۔ ادھر سفر سے واپسی کے بعد شانہ کو بخار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ منشی ماما، عبداللہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ صحن میں رکھی کھٹولی پر بیٹھا تھا کہ چھوٹا گیت کھلا۔

”شانہ ہے؟“ کسی خاتون نے جھانک کر پوچھا۔

”وہ بیمار ہے سو رہی ہے۔“ سر اٹھا کر بغیر منشی ماما نے جواب دیا وہ تھوڑی دیر تذبذب میں ٹھہری پھر کہا۔
”ان سے کہہ دیجیے گا طارم کی امی آئی تھی۔
دیے مجھے خالہ خالہ بھی کہتے ہیں..... (وہ ہنس پڑی)
پھر آؤں گی۔“ وہ چلی گئی۔

منشی ماما کو اس کے نام سے دلچسپی تھی نہ آنے جانے سے۔ عبداللہ کے آتے ہی اسے بلا لیا۔

”پتر ادھر آ..... جا کے اپنی بخاری خالہ کو خبر کروے کہ منشی ماما حاضری کی اجازت مانگ رہا ہے۔
وہ اجازت دے، دے، تو پھر آ کے میرے ساتھ چل۔“

عبداللہ نے کتابیں میز پر رکھیں اور منشی ماما کا فرمان

”ایملٹن کے کلرز کارڈ لایا ہوں..... رنگ آؤٹ ڈور کے لیے پسند فرمائیں۔“ کارڈ عبداللہ کو دیا پھر کہا۔
”ایک بات اور ہے پچھلے دنوں کوئی وکیل آیا تھا، آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں بی بی کا مختار عام ہوں اور بی بی گھر پر نہیں ہیں۔ اس نے ایک فائل دکھائی، عرصہ پانچ سال پہلے..... آپ کو شاید یاد ہو..... چودھری واصف فوت ہو گیا تھا۔ حادثے میں فوت ہوا تھا۔ چک نمبر ایک سو چھیالیس ایل میں اس نے چار کنال اراضی مسجد صفہ کے نام کرائی..... حادثے سے پہلے ہی کرائی..... اس کا موجودہ ریٹ تقریباً تین، چار کروڑ ہے، مرحوم کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ وارثین خاموشی سے یہ رقبہ آپس میں بانٹ لینا چاہتے تھے کہ ایک بیٹی نے یہ بات مشتہر کر کے آؤٹ کر دی..... وہ بچی جو ہماری شبانہ کو انگریزی سکھانے آئی تھی ناں کیا بھلا سانام تھا؟“

”طارم.....“ عبداللہ نے یاد دلایا۔

”مرحوم کی وہ بیٹی طارم کی..... سبیلی تو خیر نہیں، کالج والی تھی..... تو..... اس کا مطلب ہے طارم نے کہیں مسجد یا بی بی کا ذکر کیا ہوگا۔ یوں دیکھا جائے تو وہ بیٹی انیس سال کی ہے ماڈلنگ کرتی ہے۔ یہ اسی وکیل نے بتایا..... اس کے بھائی بہن مسجد کا حق ہڑپ کرنا چاہتے تھے، وہ اس کو بے غیرت کہتے اور بول چال نہیں تھی۔ اللہ جس کے دل میں نیک کام کی توفیق ڈال دے اس کی مرضی.....“

”منشی ماما! مسجد میری ملکیت نہیں ہے، اسے ٹرسٹ چلاتا ہے۔“

”جی، بی بی..... ٹرسٹ بھی آپ اور نخبہ بی بی ہیں،
باہم مشورہ کر لیں آپ.....“

مجھے حشر میں بھی گود میں سر رکھ کے رونے نہ دیں گی۔
جب تک مجھ سے اس کا جواب طلب نہ کر لیں..... مگر
میں نے تو بھلا دیا تھا۔ بھلا دینا بہر حال سچ نہیں
ہوتا..... میری ساری حیاتی اس ایک دوپٹے پر رک
گئی..... وہ دوپٹا ایک واقعہ بن گیا جس کے تجور پر عمل،
رؤ عمل کا تانا بانا بنا جاتا رہا..... تو یوں مقدر رقم ہوتے
ہیں..... ایک مرکزہ اور..... زوال و عروج، بعد و
ما بعد..... اماں جان اور میرے درمیان یہ دیوار کب
تک ہے..... کتنی دیر کے لیے ہے..... جتنی دیر میں اوپر
نہیں اٹھتی..... جتنی دیر دیوار نہیں گرتی..... جتنی دیر
درمیان وقت ہے۔ کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک
دے کر عبد اللہ نے جھانکا۔

”صفہ خالہ..... میں شائد امی کو لے کر کلینک
جار ہا ہوں.....“ اس نے سر ہلا دیا۔ پیچھے ہی غنچہ آگئی۔
”یہ نہیں پوچھا..... کس کی گاڑی میں؟“
”کس سے پوچھوں؟“ وہ ذہنی طور پر حاضر تھی۔
”عبد اللہ اور شانہ گاڑی میں ڈاکٹر کے کلینک
جار ہے ہیں۔“ غنچہ نے مکمل وضاحت کی۔
”کیوں؟“

”صفہ.....“ غنچہ حیرت سے پکاری، گلاس میں
پانی ڈال کر بڑھایا۔
”پانی؟ پانی تو نہیں مانگا.....“ اس نے گلاس
لے کر رکھ دیا۔

”شانہ کو بخار ہو رہا ہے تیز.....“ غنچہ نے پھر
اطلاع دہرائی۔
”میں دیکھتی ہوں.....“ وہ اٹھنے لگی۔
”کیا دیکھتی ہوں پیاری بہن..... وہ ڈاکٹر کے
پاس گئی ہے۔“

صفہ نے گلاس اٹھایا آنکھوں پر پانی کے چھینے
مارے پھر کہا۔
”میں نے عبد اللہ بیٹے سے کہا تھا کہ شانہ امی کی
دوائے آؤ.....“

”میں تو یہ سوچتا ہوں کہ مرنے والا اپنے لیے
چار بیکٹری کے تحت یہ فیصلہ کر گیا۔ اس پر عمل ہونا
چاہیے..... رقم کافی بڑی ہے، مسجد کیوں رو کرے۔“
”ہاں جی صفہ خالہ..... مسجد کو سنٹرل انٹیر کنڈیشنڈ
کر والیں گے اور دائیں طرف والے نور انصاری اگر
مکان بچیں تو شامل کر لیں گے۔“

”عبد اللہ، آپ خاموش رہیں یہ منصوبہ بندی قبل از
وقت ہے۔“ صفہ کے منع کرنے پر وہ چپ ہو کر شش
ماما کو دیکھنے لگا جو پہلے ہی خاموش تھا۔
”شش ماما..... آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟
راتوں میں آپ کو اکٹھا کھاتے سنتی ہوں..... آپ بہتر
علاج کرائیں رحم کا مسئلہ نہیں۔“ بات پلٹ دی گئی تھی۔
”بخاری بی بی..... اس عمر میں کھانسی آنا زندگی
ہوتی ہے، ویسے میں ٹھیک ہوں..... کھانا بس جینے
جوگا..... پیٹ کو سہولت، سانس کو سہولت.....“

”آپ کا ساتھ ایسا احسان ہے جس کا بدلہ
میں نہیں دے سکتی۔ اللہ دے گا۔“

”اللہ مہربان ہے، اللہ آپ کی دعا سے مجھے بخش
دے..... اچھا بی بی پھر میں چلتا ہوں، آپ مشورہ کر کے
مجھے حکم دے دینا۔“ شش ماما سلام عرض کر کے چلا گیا۔

صفہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں چاروں
طرف نظر دوڑائی جیسے کسی کی تلاش ہو، وہاں تو ایک
چار پائی تھی، نیچے ایک ایسی جانماز جس کے پاؤں
رکھنے کی جگہ سے تیلیاں گھس گئی تھیں، دو کرسیاں اور
ایک میز، میز پر قرآن پاک، رحل میں رکھا ہوا، پانی کا
گلاس، پانی کی بوتل..... ”پانی والی اماں، پانی والی
اماں..... میں آپ کی گود میں سر رکھ کر رونا چاہتی
ہوں۔ اس رونے پر رونا چاہتی ہوں کہ میں کیوں نہ
روئی.....“ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئی..... مجھے تو اماں
جان کے زانو پر سر رکھ کے سونا ہے سو جاتا ہے..... میرو
خالہ کہتی ہیں الماری کھول کر نیلے ڈبے کے پیچھے سے
اٹھاؤ..... وہ میرا پیلا دوپٹا تھا..... جب وہ میرے

گئے۔“ پھر وہ بتانے لگا کہ اذان کو بھی بخار ہو گیا ہے۔
 ”اور ہاں سندری کا فون آیا تھا۔ تم تو جانتی ہو وہ بات کیسے کرتی ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے بگڑنے لگی آپ تو بڑے بڑھے ہیں، آپ ہی سمجھداری کر لیا کریں۔ نخل صحرا میں میرے بچے کو بیچ دیا۔ پتا نہیں کیا گھول کر ملا دیا ہے بخاری باجی نے ایک تم کو کر ہو، دوسری شبانہ۔۔۔۔۔ زندگی اس کے تارے لگا کے بیٹھی ہے، تیرا اذان تیار ہو رہا ہے۔“
 ”یوں کہہ رہی تھی وہ؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ یہی الفاظ تھے۔“
 ”پھر آپ نے کیا کہا؟“
 ”کیا کہتا۔۔۔۔۔ خیر ہے، مگر بیٹھے بھی بخار ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے بات نہیں کرتے، سمجھایا اسے۔“
 ”آپ نے ٹھیک کہا۔۔۔۔۔ رہی بات میری۔۔۔۔۔ تو میرے لیے صفہ بخاری انہوں سے بڑھ کر ہے وہ میری ماں، بہن، بھیلی سب کچھ ہے پھر میرا یہ ہونہار تاجدار پیارا بیٹا ہے۔ یہ میرا سہارا ہے، مجھے یہاں کیا نہیں ملا۔“
 ”اللہ اسے نیک صالح بنائے۔۔۔۔۔ پتری۔۔۔۔۔! میں نے سنا ہے تم عبداللہ کے ساتھ مصر چلی جاؤ گی۔“
 ”قاہرہ،“ مٹی ماما جان۔۔۔۔۔ میں جامعہ الازہر میں ایڈمیشن لوں گا، میں لائینی قانون پڑھوں گا۔ ہر مذہب کا لا۔۔۔۔۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ جھلی وہاں کیا کرے گی؟“
 ”ماما جی۔۔۔۔۔ میں اب جاہلی جھلی نہیں رہی۔ عمر بھی سکھاتی ہے۔۔۔۔۔ پھر میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔“
 ”پھر بھی۔۔۔۔۔ تو کرے گی کیا؟ تو بھی جامعہ میں داخلہ لے گی؟“ دونوں کو مٹی ماما کی سادگی پر ہنسی آگئی۔
 ”میں اپنے بچے کا خیال رکھوں گی۔۔۔۔۔ اس کی گارڈین (سرپرست) ہوں گی۔“
 ”رہی ناں جھلی۔۔۔۔۔ بچہ تو ہاشل داخل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تو کیسے خیال رکھے گی۔“ اس سوال کے جواب پر شبانہ نے غور نہیں کیا تھا۔ اسے یہی پتا تھا کہ بخاری باجی جیسے کی تو بہتری کے لیے ہی ہوگا۔

☆ ☆ ☆
 اب موسم خشک ہو چکا تھا۔ اسے سی بند ہو گئے تھے، پنکھوں کی البتہ ضرورت رہتی، نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔ نخبہ نے آج خیرات کے طور پر بریانی کی دیکھیں اتروائی تھیں۔ امیر بی بی محلہ بھر میں جانے نہ جانے والوں میں پائٹ رہی تھی۔ گاؤں سے نئے موسم کا تازہ ساگ کاٹنے، دھونے، ابلانے کے مراحل کے بعد بھیجا گیا تھا۔ شبانہ اسے دیکھ گئی، سوکھی مریج کا بگھار لگا رہی تھی۔ نخبہ کو کاموں میں دلچسپی لینا دیکھ کر صفہ ایسے خوش ہوتی جیسے ڈاکٹر اپنے مریض کی صحت یابی پر مطمئن ہو، خوش ہوتی صفہ اس وقت زینے پر بیٹھی جو اس کا کبھی، کبھی ٹھکانا بنتا تھا۔ سفید ردا کا ہالہ اس کے چاندی جیسے چہرے کے گرد تھا۔ کلائیوں تک آتے آستین سے نکلنے کمزور ہاتھ میں گل ریحان کی خوشبودار پتیوں تھیں۔ جنہیں بے دھیانی میں ملتے ہوئے سونگھ لیتی اور کوئی معطر سا دروزبان پر رہتا۔ چھوٹا گیٹ کھول کر طارم کی ای نے جھانکا۔ پھر اندر قدم رکھا۔
 ”آئیں۔۔۔۔۔ تشریف لائیں۔“

اسکارف سے ڈھانپے سر اور کمزور نقاہت زدہ چہرے والی نخبہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ وہاں قریب بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان احوال پرسی کا تبادلہ، شبانہ کا اندر سے جوں کا گلاس لا کر دینا پھر اس کا کوئی لمبا سا حال سنانا، نخبہ کا سر ہلاتے ہوئے ہنسنے رہنا۔ شبانہ کا آتے جاتے ایک آدھ بات کر لینا۔ امیر بی بی کا بڑی ٹرے میں تھالیاں بھر، بھر کر رکھنا ان کو ابلے دسترخوان

طارم کی ای؟ یہ یوں ہی لہائی ہے۔ اب شبانہ متوجہ ہوئی۔

”طارم کی امی تو صفہ بخاری سے بہت متاثر ہیں بتا رہی تھیں کہ پہلے مجھے بخاری بی بی سے پڑھنی میں نے اس سے نگرار بھی کی تھی کہ میری بیٹی کو ملانی بنا دیا ہے..... زمین جو عطیہ دی گئی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ چوہدری مرحوم کے بیٹوں نے دہائی بھی۔ مرحوم کی بیٹی ماحی جو ماڈلنگ کرتی ہے اس نے یہ خبر آؤٹ کی.....

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادر دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیضان ایجوکیشنل اینڈ سٹاکس اتھارٹی میں لاگتی رجسٹریشن

مندرجہ ذیل مینی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سے ڈھانپ کر اٹھانا جانا، انا، صفہ کی نظر پڑی رہی، کبھی تجسس یا کرید کے بغیر..... اس کی سانسوں کی آمدورفت میں اسمائے حسرتاں پہے ہوئے تھے، اب تو وہ زبان سے ادا نہ بھی کرتی تو قلب تسخیر کرتا۔ طارم کی امی اب جا چکی تھیں۔ خیرات کی ایک دیگ خالی ہو گئی۔ باقی جہنم خانے اور مدارس کو بھجوا دی گئیں۔ نخبہ بہت تھک گئی تھی اپنے کمرے میں معمول کی ڈھیر ساری دوائیں کھا کر لیٹ گئی۔ بہت دیر بعد شبانہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اب وہ بیدار ہو چکی تھی۔

”فارغ ہو گئی ہو۔“ نخبہ نے روکا۔

”جی..... آپ کو کتنی کا جوس نکال دوں.....؟“

”نہیں ڈیر..... آؤ بیٹھو.....“

”طبیعت کیسی ہے تھک گئی ہوں گی۔“

”کام تو تم میرے بعد گھنٹوں کرتی رہی ہو.....

ہاں مگر میں تھک گئی..... شبانہ، تم نے چوہدری واصف

کے مسجد کے لیے عطیہ کا مجھے نہیں بتایا۔“

”ہائے اللہ..... میں تو بھول ہی گئی..... مگر ماما جی

نے بخاری ماجی کو بتایا ہوا ہے، وہ بھی میری طرح آپ

کو بتانا بھول گئی ہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”جی.....“

”مگر عجیب سی بات ہے۔“

”کون سی بات؟ مسجد کے لیے عطیہ دینا؟“

شبانہ کے سوال میں حجب تھا۔

”چوہدری واصف کا قصہ یاد ہے ناں؟ صفہ بخاری

کے لیے رشتہ دیا تھا..... پھر اس کا ایک سیڈنٹ ہو گیا۔“

”جی ہاں..... مگر عطیہ تو جیتے جی دیا ہو گا ناں!“

”میں کیا کہہ رہی ہوں کہ مرنے کے بعد دیا ہے۔

شبانہ تم شبانہ ہی رہو گی۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تو پھر آپ اس پر اتنا غور کیوں کر رہی ہیں؟“

”مجھے اس مرحوم کی سمجھ نہیں آتی۔“

”آپ کو ماما جی نے بتایا ہو گا۔“

”نہیں..... مجھے تو طارم کی امی نے بتایا ہے۔“

"wao a daily women can speak such a noble english"

کشور جہاں نے اپنے تئیں تحسین کی مگر نخبہ جانتی تھی کہ شہانہ کو ذیلی وومن (یعنی ننھا دار ملازمہ) کے معنی معلوم ہیں اور یہ تو تین آمیز ہے، فوراً اماں کو ٹوکا۔

"مما..... آپ پلیز کسی کے بارے میں جانے بغیر رائے مت دیں۔ یہ عبد اللہ کی امی ہے، عبد اللہ آپ کے الفاظ سے بہت رنجیدہ ہوگا۔" پھر شہانہ کو بلا کر ساتھ بٹھاتے ہوئے وضاحت کی۔

"مما جان..... جب آپ کی بیٹی کو ڈاکٹروں نے لاعلاج بتا دیا تھا، میرے تین سالہ بچے کو اس نے مبتلا کی محبت دی۔ اتنی کہ میں عبد اللہ کی جانب سے مطمئن اور بے فکر ہوئی۔ یہ وہی شہانہ ہے جس کے متعلق آپ سے باتیں کرتی رہی تھی..... جب پچھلے دنوں آپ آئیں تو یہ اور صفہ یہاں نہیں تھیں۔ اب صفہ بھی آگئی ہے۔"

"مسوری سویت شہانہ....." کشور جہاں کی معذرت پر خلوص تھی۔

"میری اچھی ماں..... صفہ بھی اب، وہ میری کلاس فیو صفہ نہ جائے گا اسے وہ معرفت، روحانیت کے مقام پر ہے..... اور خیال رکھیے گا۔"

"ہاں، ہاں ضرور ملوں گی..... دعا کراؤں گی۔" شہانہ اجازت لے کر چائے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

عبد اللہ اپنی گریڈ ما کے پاس آ بیٹھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور وہ گھر پر تھا۔ وہ اپنے ماموں زاد بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔

"تم تو میرے ساتھ چلو..... گرنی کی بات مان لو..... پاکستان میرا بھی وطن ہے، میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں مگر تم اپنا کیریئر بناؤ..... یہاں کیا ہے؟"

"گرنی، میں Egypt پڑھنے جاؤں گا..... جامعہ الازہر..... میں ایڈمیشن لوں گا اور یہ اتنا ایزی نہیں ہوتا..... دعا کریں ایڈمیشن ہو جائے۔"

"نخبہ باجی..... ہماری صفہ بخاری کی شہرت کہاں، کہاں تک ہے۔"

"کہاں، کہاں تک کوئی نہیں..... ہماری صفہ بخاری تو مجذوبہ بندی ہے۔ مجذوبہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم جو اس کے اتنے قریب ہیں، ہم پر بھی ظاہر نہیں ہے۔ اصل میں وہ ہے کیا؟"

☆☆☆

تجربہ سے اشراق، چاشت تک جاگتے رہنے کے بعد صفہ کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ وہ سو رہی تھی جب گھر کے باہر بڑی سی گاڑی آرکی..... شوفر نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سفید بال مگر بوائے کٹ، لوز لائٹ شرٹ اور جینز..... یہ نخبہ کی امی کشور جہاں تھیں جن کی عمر لگ بھگ اسی کے قریب تھی۔

پہلے امیر بی بی سشدہر ہوئی پھر شہانہ حیران ہوئی، یہ حیرانی اور پریشانی عبد اللہ کے اچانک نکل کر آنے اور گرنی کے نعرے سے دور ہوئی۔

"اچھا..... یہ نخبہ باجی کی مہمیں....." شہانہ نے یہ آواز بلند سوچا۔ امیر بی بی ایک بار پھر دیکھنے لگی۔ شہانہ آگے بڑھ کر ملی اور رہنمائی کرتی ہوئی نخبہ کے کمرے تک لائی۔

نخبہ جو اپنے بند پر نیم دراز تھی خوشی سے ایک دم اٹھی پھر بائے کر کے کمرہ تھامی۔

"بیٹی بیٹی رہ..... بیٹی بیٹی رہ....." اس کی ممانے اسے تھام کر بٹھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

شہانہ نے سکھ کی سانس لی کہ یہ اردو بول لیں گی۔ "گندہ گاڈ..... کیا حال ہو گیا ہے ترا..... سچ میں تجھے چھوٹے، سامنے بٹھا کر دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اب بڑس کے بقایا معاملات منشا کر آئی ہوں....." پھر ادھر، ادھر دیکھ کر بولیں۔

"پتا نہیں، کیسا مزاج ہو گیا ہے، مجھے تو گرمی لگ رہی ہے۔"

"آپ یہاں کے موسم کی عادی نہیں رہو..... گی

شاہدنگ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”چلیں آج آکھ پھولی کھیتے ہیں، اگر آپ نے مجھے دھوڑ لیا تو ہم شاہنگ پر جائیں گے۔“
 ”شوہر۔ اگر میں آپ کو دھوڑ نہ سکا تو؟“
 بیوی۔ پیار سے بولی۔ ”جانو! ایسا نہ کہو میں دروازے کے پیچھے تو چھپی ہوں گی۔“
 مرسلہ: ہر دین افضل شاہین، بہاول عمر

کا خوف میرے تعاقب میں تھا اور وقت کی پوچھی ختم تھی۔ یہ نہ پوچھا صف نے..... کیوں آئی ہو؟ کیوں میری حویلی میں رہنا چاہتی ہو؟ کیوں نہیں ماں، بھائی کے پاس چلی جاتیں؟ اس کے پاس کتنے کیوں تھے، اس نے ایک بھی کیوں نہ اٹھایا۔ ماما آپ بتائیں؟ آپ کے پاس، ہمارے پاس کوئی یوں آکر رہنے لگے۔ چاہے آپ کی فریڈ ہو، میری فریڈ ہو، ہم رہنے دیے؟ ہمیں کتنے شک پڑتے۔“
 نے تھوڑا پانی گلاس میں لے کر کھاتر کیا۔

”پھر ماما..... اس کا ایک اور رخ میرے سامنے آیا۔ وہ میرے لیے دعا بن گئی۔ اس نے یہ دعا اپنے ذمے یوں لے لی جیسے اس سے قصور سرزد ہو گیا ہو، صف کی دعا میرے پیسوں کی دعا نہیں ہے، نہیں ہو سکتی، اس نے اللہ کے ذکر پر عمر، مال، جوانی، خواہشات تار کر دی ہیں، ماما جان یہی عمر، مال، جوانی، خواہشات ہم دنیا والوں کے ناخدا ہیں، آپ بھی جانتی ہیں، میں بھی جانتی ہوں..... آسان نہیں ہوتا ان کو کرش کر دینا اور میں؟ کہاں میں یہ ترک کر سکتی تھی؟ مفلوج کی ٹانگ نہ اٹھ سکے تو دوڑ میں حصہ نہ لینا اس کا فیصلہ نہیں ہوتا..... البتہ..... یہ مصلحت ربانی ہوتی ہے..... مصلحت وہ فلسفہ ہے جس کے ظاہر میں اندھیرا ہے اور باطن میں راستہ ہے۔“

”سب باتیں ٹھیک ہیں، مجھے تو تمہاری باتیں سن کر یہی خیال آتا رہا کہ company makes a man تم کتنی بدل گئی ہو..... تم واقعی بدل گئی ہو۔“
 کشور جہاں نے انکوڑ کا دانہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے کمرے پر نظر دوڑائی۔ ”یہ بتاؤ..... وہ صف کی سادات

مگر بچے سے بحث کرنا مناسب نہ جانا۔ عبداللہ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اسے چند کھیلوں، جسمانی ورزش اور صحت مند سرگرمیوں کی اجازت تھی۔ کشور جہاں، غنچہ کے پاس آئینہیں، اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آب دیدہ ہو گئیں۔

”ہی..... مجھے تیرے نصیب پر رونا آتا ہے، کیسی ماڈل جیسی خوب صورت تھی، کیا حال ہو گیا..... میری جان۔ لوگ اچھے علاج کے لیے بڑے ملکوں میں جاتے ہیں اور یہ گناہ نہیں ہوتا..... تو یہاں پسماندہ علاقے میں آکر بس رہی..... ڈاکٹروں نے تجھے لا علاج بتایا تھا، یہ کہا تھا کہ جینے کو چندہ سال جی سکتی ہے، چھ مہینے بھی نہ جی سکے یہ بھی ممکن ہے۔“

”ڈاکٹروں نے کہا تھا ناں..... جرمنی میں ہوتی تو ڈاکٹر جیت چکے ہوتے، ماما! انسان..... جس ایمان پہ ہوتا ہے اسی دھیان پر چلتا ہے، اس کو شاید میڈیکل سائنس ول پاور کہتی ہوگی..... یہ پاور ایک اور پاور ہے، ویسے قسم سے میں بھی حیران ہوتی ہوں، مجھے کب امید تھی کہ عبداللہ کو چندہ سال کا ہوتا دیکھوں گی۔“
 ”شکر ہے اللہ کا.....“

”ہاں تو یہ اللہ کا ہی کرم ہونا ناں.....“
 ”اچھا اب میرے ساتھ چلو..... میں نے گھنٹا گھر والا مکان سیل کر دیا اور ترے ابو کے جو دفتر تھے ناں فیصل آباد والے ان کے واجبات نکل آئے، اب میں اپنا حصہ رکھ کر باقی تجھے اور غنچہ کو دے دوں گی..... ترا عبداللہ کا انٹرنل ٹو اس میں سے ہی نکل آئے گا۔“
 کشور جہاں نے یوں مسئلہ حل کیا گویا سارا مسئلہ ہی انٹرنل ٹو کا ہے۔

”پیاری ماما..... listen to me just listen to me just..... آپ صف سے ٹی نہیں ہوؤ، وہ بہت قیمتی ہے میرے لیے..... وہ بہت اہم ہے میرے لیے۔ جب میرے سر پر دھوپ ہی دھوپ تھی۔ اس نے مجھے سائے میں سمیٹ لیا۔ جب کڑوا ہی کڑوا چکھا تھا دنیا والوں سے..... مجھے شیرینی کا احساس یہاں ملا..... خالی دامن

جی کشور جہاں کو سمجھنا مشکل تھا) اور تم اپنا لباس
دیکھو۔ اس دن تم نے اپنی وارڈ روب دکھائی۔ کوئی
حال نہیں..... میں تمہارے لیے آٹھ دس ڈرامہ خرید کر
لے آتی پھر سوچا پسند اپنی، اپنی ہوتی ہے۔“ ننگہ چاکر بیڈ
پر لیٹ گئی..... کشور جہاں اٹھ کر اس کی ڈریسنگ ٹیبل کا
تنقیدی جائزہ لینے لگیں ایک کونے میں کئی چند چیزیں
رکھی تھیں۔ لوٹن، پرفیوم، کریم کو باری، باری ہاتھ لگا کر
دیکھا۔ پھر غم میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

”کیا لیول ہے یہ..... کیا ہے یہ سب؟ یہ تری ڈریسنگ ٹیبل ہے، تو، تو جیتے جی مٹی ہو گئی ہے۔ ایسی چیزیں تو ڈسٹ بن میں پھینک دیا کرتی تھی.....“ وہ ٹشو پیپر پھینچ کر اپنی آنکھیں پتھپتھاتے ہوئے سنگار میز کے اسٹول پر بیٹھ رہیں۔ نچو کو ماں پر ترس آ رہا تھا۔ وہ ماں کے جذبات سمجھ سکتی تھی۔ ماں کی محبت سے انکار نہ تھا۔ وہ اسی ماں کو ناپسند آنے والے کا سیمپلس بغیر استعمال لوٹا دیا کرتی تھی۔ وہ ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیا کرتی تھی۔

”تری عمر کوئی چھپن ستاون برس ہے، میں اٹھتر پار کر چکی ہوں..... تو خود کو دیکھ..... مجھے دیکھ..... بیماری نے تیرا دل مار دیا۔“ انہوں نے سنبھل کر پھر بات کی۔

کشور جہاں کے ڈریس سے اٹھتی تیشی مہک، گلے میں بڑا سفید موتیوں کا میپلس، ایک کلائی میں پرل کا بریسلٹ دوسرے ہاتھ میں ہیرے کی انگٹھی، کانوں میں وائٹ گولڈ کے ٹاپس، پاؤں میں دیدہ زیب جوتے، ہر چیز اپنی جگہ فٹ تھی۔ اور ادھر عام سوئی، ملائم کاشن کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سر کے بال جگہ جگہ سے گرے ہونے کے سبب سر پر اسکارف آنکھوں کے گرد دھلتے، ہاتھوں پر بھریاں..... یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ کوشش میں لگی رہتی تو اس وقت بھی اپنی عمر سے بیس سال چھوٹی لگ سکتی تھی۔ ظاہری چمک لگے رہنے سے ملتی ہے ورنہ وقت تو ایک سا بے رحم ہے..... کھٹ میں گندم کا مٹی چالیس سالہ مشقعی عورت ساٹھ کی لگتی ہے جبکہ مارننگ شوکر کرنے والی سیلینی پچاس سال کی ہو کر

ایک مریضہ اس دوڑ میں کس جگہ سے لگتی اور کتنی بھی تو
 احمق ہوتی۔ کچھ دیر تک افسوس کرنے کے بعد کشور جہاں
 کو یہ بات سمجھ آنے لگی۔ پھر وہ خاموشی سے دوسرے بیڈ
 پر جا کر لیٹ رہیں۔ پھر وہ اپنے شوہر اعلان صاحب
 (منجھ کے ابو) کے زمانے کی یادیں دہرانے لگیں۔
 ماضی کی باتوں کی پٹاری کھل گئی۔

”تری شادی اس غیبت، کم ظرف آدمی سے کرنا ان کی ایسی غلطی تھی جس کا چھپتا و اعوان صاحب کی صحت چاٹ گیا۔ ہم اس کی ظاہری شان و شوکت سے متاثر ہو گئے۔“

”اب اسے گالی مت دیں..... اللہ اس کی بھی مغفرت کرے۔“

”یہ تو بھلا ہوا وہ بھی اعوان تھا۔ عبد اللہ کا نام عبد اللہ
 ۔۔ اعوان اسے دونوں طرف سے بچا گیا۔“
 ”صفہ جاگ گئی ہے؟“ شبانہ اس دوران کسی کام
 سے آئی تو منجھنے پوچھا۔
 ”ابھی تو نہیں جاگیں۔“ دوسری بار شبانہ ظہرانے
 کے لیے ہدایات لینے آئی تو بتایا کہ بخاری باجی کے لیے
 قبوہ بنارہی ہوں، ان کے سر میں درد ہے۔
 ”اب اس کی باری آگئی.....“
 ”کیوں، کیا ہوا.....؟“ کشمور جہاں نے لیٹے،
 لیٹے پوچھا۔

”بچھلے دنوں شبانہ کو تیز بخار چڑھا تھا۔ اب اللہ
خیر کرے صندے کے سر میں درو بتا رہی ہے۔“
”نخچہ، تم نے بتایا نہیں جب میں آئی تھی یہ
دونوں کہاں گئی تھیں؟“
”مہما... آپ نہیں سمجھیں گی..... یہاں کا اپنا
آسمان اور انہی پروازیں ہیں، آپ کو بتاؤں گی تو سوال
یہ سوال کریں گی۔“

”میرے حساب میں تو بھی مجذب ہو چکی ہے۔“ کشور جہاں نے لمبی سانس خارج کی۔ ”اس گھر کا نام مجذوباں واڈرا ہونا چاہیے۔ ساری کاکیاں ایک

نخبہ نے ادھر، ادھر ہو کے ماں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔۔۔۔۔ وہ بے سرو دیا بول رہی تھیں، وہ خاموش ہوئیں۔

”خالہ صاحبہ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھو ڈیئر۔۔۔۔۔“ صفہ نے نخبہ کو مخاطب کیا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں اپنے گھر سا آرام نہیں ملے گا۔“ ”ڈونٹ وری صفہ بیٹی۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ آپ کے والدین کا بہت انفس ہوا تھا۔ بات پرانی تھی مگر میں تو آپ سے پہلی پارل رہی ہوں۔“ ”کشور جہاں ایک بار تکلف سے بولنے لگیں۔ مگر چھوٹے ہی دوسرا انتہائی ذاتی سوال داغ دیا۔

”آپ نے شادی کیوں نہ کی؟“

نخبہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی ماں کو کیسے چپ کرائے، صفہ کے متین چہرے پر کوئی جوابی لکیر تک نہ پا کر کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ شادی سنت ہے میں نے تو نخبہ کو سمجھایا تھا۔ پھر یہ بیمار پڑ گئی۔۔۔۔۔ یورپ میں اس عمر کو یک اتن سمجھا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی تک نظر ہے۔۔۔۔۔ یاپس کن ہے۔“ ”مما۔۔۔۔۔!“

”میں اپنے نواسے عبداللہ کی وجہ سے فکر مند رہتی ہوں۔۔۔۔۔ یہ میری بیٹی آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ ہزار بار اسے کہا بیٹو کو میوٹ بھیج دو۔ کوئی اس کا کیئریر بنے۔۔۔۔۔ یہاں رہ کر تو وہ الگ سادھتا ہے۔ صفہ بخاری بیٹی! میں تو دنیا دار ہوں مگر یہ دنیا اللہ نے ہمارے لیے بنائی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھا جاسکتا ناں۔۔۔۔۔ جینا ہے تو آگے بڑھنا ہوگا۔“

”آگے کہاں؟“ دو لفظی سوال بہت وزنی تھا۔

”میرا مطلب ہے ترقی۔۔۔۔۔“

”آپ کو مجھ سے شکایت ہے؟“ مسکرا کر پوچھا تو نخبہ فوراً بولی۔

”نہیں صفہ، تم سے شکایت کا کیا سوال، میں خود تمہارے پاس آئی تھی۔ تم نے مجھے نہیں بلایا تھا۔۔۔۔۔ اور امی یہ بات جانتی ہیں۔۔۔۔۔“

انہیں صفہ سے ملنا تھا۔ شبانہ نے صفہ کو نخبہ کی والدہ کی آمد اور ملنے کی اطلاع دی۔

کشور جہاں اس سادہ سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ صفہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہاتھ مٹانے کے لیے بڑھایا۔ اس کا ٹھنڈا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کشور جہاں کے جسم میں ایک لہری سی ووزی تھی۔ اس کیفیت میں حیرانی لبالب بھری ہوئی تھی۔ کل کی ایک لڑکی (ان کی نظر میں وہ بی بی کی ہم جماعت سیکلی تھی) تارک الدنیا، ولی بی بی ہوئی۔ اس ضمن میں پوچھنا تا چھٹا کیا تھا نخبہ کی زبانی سن رکھا تھا۔ کشور جہاں مرعوب تھیں۔

”بیٹھیں بی بی۔۔۔۔۔ آپ تشریف رکھیں۔“

”بی بی۔۔۔۔۔ نہیں بیٹی۔۔۔۔۔“ صفہ کی پہچان وہی ایک نرم مکان۔۔۔۔۔ کشور جہاں بات کرنے کا سرا تلاش کرنے لگیں۔ بہت سے خیال آئے، دعاؤں کی فرمائش، نصیحت کا تقاضا، اصلاح احوال کی خواہش، نخبہ کے بارے میں تشویش، عبداللہ کا مستقبل، الجھے ریشم کو سلجھائیں پر کیسے؟

”میری ماں بس میری طرح دنیا داری بندی ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت نفسیاتی دباؤ میں ہیں۔۔۔۔۔ میں بھی ان کی جگہ ہوتی تو اسی حالت میں ہوتی۔“ نخبہ نے پہل کی۔

”آپ کیسی ہیں خالہ؟“ صفہ نے اعتماد بحال کرانے میں مدد کی۔

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔

باقی اچھے کام بھی اپنے حساب میں کر لیتے ہیں مگر ہم آگے کیوں نہیں نکل پاتے۔۔۔۔۔ سوال بے موقع بھی تھا اور بے وزن بھی۔

”ہم کسی ریس میں نہیں ہیں ممما۔۔۔۔۔“

”میرا مطلب یہ تھا۔۔۔۔۔ اللہ معاف کرے ہماری تو نمازیں بھی اٹھک بیٹھک ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ نماز شروع کر تو نیند آنے لگتی ہے، سلام پھیر کر اٹھو تو نیند غائب۔۔۔۔۔ مگر یہ

اور شہانہ، اجاڑے دروازہ کھول کر

جھانکی، محض جی دیکھ کر پلٹ جانے کو تھی کہ نخبہ نے بلالیا۔
اس پر بھی کشور جہاں نے تادیبی نظروں سے
دیکھا وہ بہر حال اسے ایک عزت دی گئی ملازمہ گردانتی
تھی۔ شہانہ نے پھر سے ایک بار انگریزی میں وار کیا۔
”میم آپ کے لیے کوئلہ کافی تیار ہے۔“ نخبہ کو
اس وقت شہانہ نجات دہندہ لگی۔

”مما آپ چلیے..... میں آتی ہوں۔“ اس نے
ماں سے کہا۔

”میں پھر آپ سے بات کروں گی۔“ کشور
جہاں اٹھتے، اٹھتے کہہ گئیں۔ وہ چلی گئیں۔ نخبہ نے صفہ
کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر الجابت سے معذرت کی۔

”اچھی بہن..... امی کی باتوں کو دل پر نہ لینا..... وہ
چاہتی ہیں کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“
”انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اچھی نہ
ہو..... نخبہ تم جاؤ اور زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزارو.....
ان کا تم پر بہت حق ہے۔“ نخبہ ریلیکس ہو گئی۔

”ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟“

”میں حیران ہوں کہ میں، اب اس اذیت
میں نہیں ہوں..... یہ میری زندگی کا معجزہ ہوگا اگر میں
میڈیکل کی سو فیصد پیش گوئیوں کو رد کر کے صحت یاب
ہو جاؤں..... اور یہ صرف تمہاری دعاؤں سے ہوگا.....
ہم صحت یاب ہو کے مل کے رہیں گے۔“

”الحمد للہ.....“ صفہ نے سر جھکا کر گفتگو کا سلسلہ
منقطع کر دیا۔

☆☆☆

”کیا رکھا ہے جامع الا زہر میں..... نام ہی اتنا مشکل
کہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ عبد اللہ..... یہ سائنس، ٹیکنالوجی کا
زمانہ ہے، تمہیں لائف میں کچھ بنانا ہے یا صفہ مسجد منجھا لو گے؟“
کشور جہاں غلجی نہیں بیٹھیں اب عبد اللہ کو گھیر لیا۔

”ڈائیر گرنی..... جامعہ الا زہر میں سائنس،
ٹیکنالوجی تمام subjects ہیں۔ صفہ خالہ نے
میرے لیے بہتر سوچا ہے۔“ عبد اللہ نے فریج سے

جس نکال کر سونوں سے بیٹھے ہوئے کہا۔

”بیٹا..... ان کی دنیا محدود ہے..... ان کی
ساری زندگی ایک چار دیواری میں گزری..... انہیں کیا
پتا کون سا ادارہ ٹاپ کا ہے، کس مضمون کی ڈیماڈ
ہے۔“ عبد اللہ چپ رہا تو کشور جہاں کو لگا دلیل اثر
کر رہی ہے مزید محبت سے کہا۔

”میرے پیارے بچے، نخبہ انگل سے مشورہ
کر لو..... میرے ساتھ چلو ایک چکر لگا لو..... بڑے
ملک اور جینٹری کو ملو گے، دیکھو گے تو وژن بڑھے
گا..... انگریز اسز ہو چکے فارغ تو ہو.....“

”ماما سے پوچھ لیجیے..... لیکن میں شہانہ امی کے
بغیر نہیں رہ سکتا..... گرنی پلیز مجھے ان کو cheat
کرنا مت بتائیے گا۔“

کشور جہاں اگلی بات یہی کرنے والی تھیں، وہ تو
نواسے کو ”خود ساختہ، ماں کے ٹرانس سے نکالنے کا
عزم لے کر آئی تھیں۔ برا وقت تھا گزر گیا اب کیا
ساری عمر ساتھ جوڑے رکھیں۔ انہیں افسوس تھا کہ دس،
گیارہ سال کا یہ عرصہ نخبہ کو فری ہینڈ دے کر غلطی کی۔
اب عرصہ اتنا گزر چکا تھا کہ ذہن بدلنا آسان نہ تھا۔

کشور جہاں نے سنگار میز پر رکھے فریو کو اٹھایا۔
اس کو آنکھوں کے قریب لا کر نام پڑھا..... پھر اپنے
دائیں بائیں چھڑکا پھر برا سامنہ بنا کر رکھ دیا۔ وہ عبد اللہ
کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ تھپتھا کر بولیں۔

”مائی سویٹ سن..... تم نے تو مجھ سے زیادہ
اسلام کو اسٹڈی کیا۔ اسلامی ماحول کی تربیت لی، تم
جانتے ہو گے اسلام میں منہ بولے رشتوں کی کوئی
قانونی شرعی حیثیت نہیں..... منہ بولی ماں، ماں نہیں
ہوتی، رضاعی رشتوں کو اسلام نے مقام دیا ہے منہ سے
کہے ہوئے کو نہیں.....“

اسی وقت کمرے میں داخل ہوتی شہانہ کے قدم
وہیں تھم گئے۔ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”اچھا اخلاق، خدمت، محبت اپنی جگہ مگر اس
سے رشتہ نہیں بن جاتا۔ تمہاری ماں صرف وہ ہے جس

نے جنہیں جہنم دیا۔ پالنے پوسنے کے لیے تو دایہ، آیا
فوسٹر مدد ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ہمیں
حکم دیا کہ دایہ، ماں کے برابر ہے؟“

الفاظ صحیح تھے یا تو بیخ صحیح تھی، شبانہ کی سماعتوں پر
بہزکتے تیزاب کا الاؤ گرا اور اندر بھسم کرتا چلا گیا۔ ہاتھ
میں عبد اللہ کے استری شدہ کپڑوں کا بیگنگر تھا سہ و ہیں
کمرے کے دروازے کے ساتھ رکھے جاوٹی گلدان پر
ڈال کر اندھا دھند اپنے کمرے کو بھاگی شعور نے ایک ہی
حکم دیا بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ، مٹ جاؤ، پردہ پوش
ہو جاؤ۔ کمرے کا دروازہ بند کیا۔ تکیہ بڑا تھا
سانے۔ تکیہ دیوچ کے فرش پر پھسکا مار کے ڈھے گئی۔
”منہ بولی ماں، ماں نہیں ہوتی۔“

نہنے سے عبد اللہ کا نجبہ کی انگلی پکڑے سادات
حویلی میں داخل ہونا۔ شبانہ کا لپک کر اسے سینے سے
لگا لیتا۔ اٹھائے، اٹھائے پھرنے کے ان گنت مناظر،
طرح، طرح کے کھیل بنا کر عبد اللہ سے کھیلتا، اس کی
خوشی کی خاطر جھلی بن کر پھرنا۔ صبح شام اس کو مزے،
مزے کی اول بدل کر چیزیں بنا کر کھلانا، اس کو سنانے
کی خاطر کہانیوں کی کتابیں خریدنا، کبھی زبردستی سنانے
کی کوشش نہ کرنا، اس کو ناگوں پر جھلاتے ہوئے اس
کے نہنے قہقہوں پر ہنس، ہنس کر کٹا رہنا۔ اس پر پڑھ،
پڑھ کر پھونکنا، اس کو دعاؤں کا محور اول و آخر بنا لینا، اس
کی کامیابیوں کی منیتیں، معمولی معمولی بیماری پہ صحت
یابیوں کی منیتیں، اس کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی کلام
اللہ کا حصار، گھر کے اندر قدم رکھتے ہی بسم اللہ، بسم اللہ
کا استقبال، اس کے ساتھ جانے کی خاطر انگریزی
سیکھنا اور پھر عربی سیکھنا۔ وہ اس کا کہنا ”شبانہ امی“
اور شبانہ کا جوابی ”امی صدقہ۔۔۔۔۔“ مگر پھر بھی وہ ماں
نہیں تھی۔ اس کو رب نے ماں نہیں بنایا تھا۔ اس کے
بلطن میں انکار رکھا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ ماں بننے کے
ترلوں میں عمر بتادی۔۔۔۔۔ اس کے قدموں تلے عبد اللہ
کی جنت نہیں تھی۔ منہ بولی ماں کا طمانچہ اس کی روح
سنگسار کر گیا تھا۔ اس کا دل زخمی ہو گیا تھا اور اب وہ تکیہ

حمد

الہ کہوں یا علت اولی کہوں اسے
یزداں کہوں یا ایزد اعلیٰ کہوں اسے
وہ متمکن علی العرش العظیم ہے
وہ ذوالجلال و الاکرام ہے
لا یزال اور آفریدگار ہے وہ
مجیب الدعوات اور معبود حقیقی ہے وہ
صفت الہی اور خدائی سب اسی سے ہے
ربوبیت اور معبودیت سب اسی سے ہے
لا محدود طاقت اور وحدت کا مالک وہی خدا ہے
حاکمیت اعلیٰ اور ابدیت کا خالق وہی خدا ہے
واحد اور ہستی مطلق ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
متبرک اور معبود ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
وہ رزاق اور مسبب الاسباب بھی ہے
وہ حکیم، کریم، رحیم اور بصیر بھی ہے
حکمت، نیکی اور عدل سب اسی سے ہے
حق، محبت اور رحم سب اسی سے ہے
وہ منعم حقیقی اور خالق کل کائنات ہے
وہ اعلم الغیوب اور محافظ حقیقی ہے

کاوش: نعیم حیدر

انتخاب، صبا نور، لید

کھجور کھائیں۔۔۔۔۔ لمبی عمر پائیں

رسول اللہ کا مبارک ارشاد ہے۔۔۔۔۔

جس نے سات کھجوریں روز اور سات شام کو
کھائیں وہ دن بھر (تمام بیماریوں سے) محفوظ رہے گا۔
عالمی ادارہ صحت میں وبائی امراض کے ماہر ڈاکٹر عمر
سلمان محمد جن کا تعلق سوڈان سے ہے، ان کا کہنا ہے۔
”ہمارے علاقے میں لوگوں کی عمریں بڑی لمبی
ہوتی ہیں، وہاں لوگ سو سال سے بھی زیادہ عمر پاتے
ہیں اور آخری دم تک صحت مند اور توانا رہتے ہیں،
میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ
غذا میں کھجور کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔
ایک تحقیق سے آفتاب س۔ از: آسیہ عامر، کراچی

کو دیر رہے رو رہی تھی۔
 بڑی دیر ہو گئی تھی۔ شبانہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ امیر بی بی کام کرتے یہی سوچ رہی تھی۔ عبداللہ نظر آیا تو پوچھا۔

”چھوٹے میاں..... شبانہ باجی کہیں گئی ہوئی ہیں؟“
 ”نہیں.....“

”سورہی ہوں گی.....“ امیر بی بی نے قیاس دوڑایا..... روٹی جو شبانہ کو یاد آیا، بخاری باجی کے لیے ترکاری منگاتا تھی۔ خدمتوں کے الارم تو اس کے اندر فٹ رہتے تھے۔ کبھی کسی کو انتظار نہیں کرایا تھا۔ وہ الماری سے پیسے نکال کر امیر بی بی کو دیئے نکلی ہی تھی کہ سیزھیوں میں سفید ہولہ سا لگا..... یہ بخاری باجی اس وقت یہاں؟ اُدھر سے اشارے سے بلایا گیا۔

”شبانہ.....“ صفہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے دھمے سے پچکارا۔ بس ایک ہی پکار جیسے سب کچھ معلوم ہونے کی خبرداری سے بھری تھی۔ شبانہ کی آنکھیں بھرا آئیں۔ صفہ زینے پر بیٹھ رہی اسے داکیں جانب آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت پیاری بہن..... کیا ہوا ہے؟“
 ”بخاری باجی.....“ وہ آنسوؤں کے گولے لنگل کر بولی۔ ”آج پتا چلا ہے کہ میں ماں نہیں ہوں، میں منہ بولی ماں ہوں، میں ماں نہیں ہوں، قانون میں نہ شریعت میں نہ سوسائٹی میں.....“ غصہ باجی کی امی عبداللہ کو سمجھا رہی تھیں۔ صبح سمجھا رہی تھیں۔ یہ تو میرا گناہ ہے میرے کان پر اتو میں نے چھپ کر سنا۔“
 صفاس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی رہی۔

”اچھا، پانی لا دوں..... پانی پیو گی؟“ وہ آنکھیں پونچھ کے سیدھی ہو بیٹھی اس خیال سے نادم ہو گئی کہ بخاری باجی اس کے لیے پانی لائے۔

”مہربانی ہے بخاری باجی..... پانی سے زیادہ مجھے آپ کی بات سے تسکین ملے گی۔“

”ممبر سے بات سنو شبانہ..... تم نے جو عمر بلکہ عمر کا بڑا حصہ میری خدمت، خاطر اور خیال میں گزاری، وہ

بچے کے طرز شریعت اور قانون میں، میں تمہاری کچھ نہیں ہوں..... غصہ میرے پاس آئی، کس رشتے سے آئی، غصہ نے خود اپنا بیٹا تمہارے حوالے کیا۔ ہمارا عادی بنایا، ہم سب کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، انسانیت کا رشتہ، اخوة کا یعنی بھائی، بھائی کا ہے، شریعت کا رشتہ چچا زاد اخوت کا ہے۔ یعنی باپ کا باپ بھائی ہو تو اولاد چچا زاد ہے۔ حضرت علیؑ نے جب فرمایا دنیا دار بھڑکھانے والے درندے کے مانند ہے، تو پہلی سوچ یہی تھی کہ یہ سخت الفاظ ہیں..... مگر نہیں..... یہ حق الفاظ ہیں..... دنیا دار اس زبان، جببہ، tongue سے بھڑکھاتا ہے۔“

”آپ نے ہر لفظ سچ کہا مگر باہر کی دنیا انگلیاں اٹھاتی ہے میں جب گاؤں جاتی تھی تو ایک، ایک مجھے بٹھا کر سمجھاتا..... آپ نے سندری اور لالہ کا حال تو دیکھا تھا ناں.....؟“

”تو تمہیں لگا کہ وہ سچے ساتھی ہیں؟ تم نے ان کی مان لی؟ مسومن کا مسومن سے مفادے بالا تر ہو کر اللہ کی محبت میں جڑا ہونا وہی رشتہ ہے جس کی مثال حدیث پاک میں جسم کی دی گئی ہے جس کے ایک عضو کی تکلیف سارے جسم کی بے چینی بن جاتی ہے۔“
 ”جی.....!“

”شبانہ..... تم نکاح کر سکتی تھیں، راستے کھلے تھے، بھائی کے ساتھ رہ سکتی تھیں، راستے کھلے تھے، تمہارا فیصلہ درحقیقت رب کا فیصلہ تھا، اس کے فیصلے پر راضی ہو تو جس نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی اسے معاف کر دو..... بس اپنا دل صاف اور نرم رکھو..... اللہ بہتر سے بہتر کرے گا۔“

”آپ کا ساتھ نعت ہے..... آپ کی باتیں سن کر ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے۔ ممبر آ جاتا ہے بلکہ ممبر اچھا لگتا ہے، صفہ باجی! عبداللہ میرے پاس رہے یا نہ رہے..... میرے دل میں بستا رہے گا..... وہ جہاں رہے خیر خوشی سے رہے۔“

شبانہ ایسی ہی صابر اور سمجھوتا کرتی تھی۔
 (باقی آئندہ)



۲ گمنام

کشف بلوچ

سے چابی کو نکال کر قفل میں گھمایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ماضی بہم کرواپس صندوق میں چپ چاپ لیٹ گیا اور وہ یوں بدک کر پیچھے ہوئیں جیسے کسی نے پیچھے سے ان کی کپٹی پر پستول رکھ دیا ہو۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھیں تو نیچے اترتے ہوئے چار پائی پر پتھی سفید چادر کی جھال میں اٹکھٹھا پھنس گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر اٹکھٹھا تو نکال لیا مگر غلٹ کے باعث صندوق الماری کے اوپری حصے پر رکھتے

صندوق کھلتے ہی ایک مخصوص خوشبو خاتون بیگم کے نھنوں سے نکرائی۔ ہر بار صندوق کھلتے ہی گزرا زمانہ گویا ہر نکل آتا۔ صندوق میں قید یادیں باہر نکل کر ان کے سامنے چوکڑی مار کر بیٹھ جاتیں۔

کاش ماضی، حال اور مستقبل وقت کے صندوق میں مقفل ہوتے اور یاد کی چابی گھماتے ہی سب منظر بھر سے چلنے لگتے۔

انہوں نے گلے میں ہمہ وقت لٹکتے لاکٹ کی چین

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک انہیں اور زیادہ بوکھلا رہی تھی۔

”کون ہو بیٹا..... تمہاری گیند ادھر نہیں آئی؟“

وہ کمرے میں موجود چیزوں سے بچتی بچاتی دروازے پر پہنچیں۔ گھڑی بھر کے لیے سانس ہموار کیں اور مخاطب کے بولنے سے پہلے ہی جواب دے کر گویا جان چھڑائی۔

انہیں چپ کے خول میں بند ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اتنا لمبا عرصہ کہ اب انہیں بولنا یا رگراں لگنا۔ زبان پر گہری پڑ جاتی۔ اس لیے ان کی حتی المقدور کوشش ہوتی کہ وہ دوسروں کے بولنے سے پہلے ان کا مطلوبہ جواب دے کر سوالات کو جنم لینے سے روک دیں۔

اکثر عین اسی وقت کلی میں کھیتے بچوں کی گیندان کے گھر میں اڑتی ہوئی آ جاتی۔ کبھی بکھارہ گیند دیوار کے پار پھینک دیتیں اور کبھی جلدی میں ہونے کے باعث ٹکا سا جواب دے کر واپس مڑ جاتیں۔ دیوار کے پاس ترتیب سے رکھے گملوں کے پاس پلاسٹک کی ٹوکری رنگ برنگی گیندوں سے بھری پڑی تھی۔

”دروازہ کھولے خاتون امی، یہ میں ہوں۔“
خلاف معمول اس وقت رباب کی متعطل اور تھکن سے بھرپور آواز سن کر کچھ دیر پہلے کی بھگائی ہوئی گھبراہٹ، دوبار عود آئی۔

دروازہ کھول کر بند کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آنے تک خاتون بیگم کے ہاتھ پیر بھول گئے۔
”ارے خاتون امی آپ گھبرا کیوں گئیں؟“

سیاہ عبایا جس کے کف اور گھبر میں کاڑھے گئے بہت سے پھولوں کے درمیان ننھے، ننھے شیشے جڑے تھے۔ اسے تہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے رباب کی نظر ماں کے اترے ہوئے چہرے پر پڑی تو پوچھ بیٹھی۔
”ارے نہیں بیٹا گھبرانا کیسا۔“ انہوں نے جھٹ چہرے پر ہاتھ پھیر کر گھبراہٹ کے آثار مٹانے چاہے مگر سوائے پسینے کے ننھے، ننھے قطرؤں کے مزید کچھ

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء [132]

”تم اس وقت بھی گھرائی ہی نہیں تو حیرانی ہوئی۔“
رباب کو گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر انہوں نے کچھ وضاحتی انداز میں کہا۔

باوجود کوشش کے بھی ان کی آواز میں لرزش شامل تھی۔ انہوں نے تپائی پر رکھے جگ میں سے گلاس بھر کر خود پینا اور دوسرا اس کے لیے بھر کر آگے بڑھیں۔
”تم آج دفتر سے جلدی کیوں آ گئیں؟“ لہجہ

سرسری تھا مگر فکر مندی سے ان کا ہاتھ اب تک کانپ رہا تھا۔ کپکپاہٹ کے مارے تھوڑا سا پانی چھلک کر صوفے میں جذب ہو گیا۔

”طبیعت خراب ہو رہی تھی۔“ ایک ہاتھ سے اپنا سر دباتی رباب نڈھال لہجے میں بولی اور پھر بیٹھے، بیٹھے ہی اُن سے پانی لیا اور آہستہ، آہستہ پینے لگی۔

”الہی خیر۔“ ماں کو سینے پر ہاتھ رکھے پریشانی سے کہتے سناتو رباب کی بیماری جیسے اڑ چھو ہوئی۔ وہ آگے بڑھی اور جھٹ ان کے گلے میں بائیں ڈال کر ان کی پیشانی چوم لی۔

”فکرمات کریں۔“ وہ مسکائی۔

”میں بھلی چٹکی ہوں اے حسین خاتون۔“
رباب نے تھکن دور بھگاتے ہوئے بشت سے کہا تو ان کی جان میں جان آئی۔

”ویسے میں کبھی بکھار سوچتی ہوں کہ آپ اس عمر میں بھی اتنی حسین ہیں تو عالم شباب میں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔“ رباب نے آگے بڑھ کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر یوں شرارتا کہا جیسے وہ ان کی ہم جولی ہو۔
شاید رباب نے یہ بات ماں کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے کی تھی لیکن رباب کی بات سن کر خاتون بیگم کا چہرہ ایک دم تاریک ہوا۔ اس کا ہاتھ جھٹکا اور نظریں چراتے ہوئے آگے بڑھیں۔ گھبراہٹ، شرم یا پھر شرمندگی تھی کہ بوکھلاہٹ میں سانسے پڑی کرسی سے جا کرائیں۔ رباب جس کی شوخی اُن کے ہاتھ جھٹکنے پر ہو رہی تھی۔ ان کو کرسی سے ٹکراتا دیکھا تو فوراً ان کی

لیکن رباب تو یہ سوچ کر اڑ گئی کہ تہجد کے وقت
اٹھتی ہیں۔ اندھیرے کے باعث کہیں گر گئیں تو مشکل
ہو جاتی۔ مگر خاتون بیگم نے نہایت نرمی سے اس کے
ہاتھ سے عبایا لے کر واپس الماری میں رکھ دیا۔

بالآخر رباب ہار مانتے ہوئے اپنے بیگ کی
طرف بڑھی۔ کاغذ پر کچھ لکھا اور ان کے ہاتھ پر رکھتے
ہوئے رساں سے کہا۔

”اچھا تو پھر یہ لیجیے دکان کا پتا اور خود جا کر لے آئیں۔“

یہ سننا تھا کہ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اور رہے سبے اوسان تک خطا ہو گئے۔ ہاتھ اپنے
سے بھیگ گیا۔ پٹیلی پر رکھا کاغذ لرزش کی تاب نہ لاتے
ہوئے زمیں بوس ہو گیا۔

کئی برس پہلے جب انہوں نے پہلی بار رباب
کے ابا کے ساتھ اس آئینے میں قدم رکھا تو دنیا کو باہر ہی
چھوڑ آئیں۔ دنیا سے کٹ کر خود کو گھر تک محدود کر دیا۔
اس روز کے بعد خاتون بیگم کبھی کسی سے ملنے گئیں اور نہ
ہی کسی کو اپنے ہاں بلایا۔ گویا خود کو ڈوبے میں بند مرغی
تصور کر لیا۔ رات ہوئی تو ڈوبے میں بند اور صبح ہوئی تو
کھول کر باہر۔ اور یہ سب اپنی مرضی سے کیا۔ کسی قسم کی
زور زبردستی نہیں تھی۔ سسرال کے نام پر ایک شوہر تھا۔
نہایت نرم گفتار اور شریف۔ ان کی پھیانی گیٹ کے
نزدیک نان چھولوں کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اگر وہ باہر
جانے کی فرمائش کرتیں تو ان کا شوہر اپنی سائیکل پر بیٹھا
کر انہیں شہر بھر گھمائے پھرتا۔ اور بھولے سے بھی
شکایت کا کلمہ زبان پر نہ لاتا۔ بلکہ شکایت تو دور وہ بیچارہ
تو بھیکے ہوئے چنوں کی طرح خوشی سے پھولے نہ ساتا۔
مگر خاتون بیگم کے یوں چھپ کر رہنے کا کیا راز
تھا۔ خود ان کی بیٹی تک نہ جان پاتی۔ اسکول جانے کی
عمر آئی تو ابانے فارم بھر کر اسے داخل کر دیا۔

باہر سے ضرورت کی کوئی چیز لانی ہوتی تو ہمیشہ ابا
حاضر ہو جاتے۔ اسکول سے رباب کی تعریف آئی تب
بھی پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے ابا پہنچے اور جب کبھی کوئی
شکایت آتی تب بھی ابا ہی جاتے۔

طرف لپکی۔ دو قدم آگے بڑھ کر ان کو تھام لیا۔

”کب سے کہہ رہی ہوں نیا چشمہ بنوادو اب تو
پاس کی چیز بھی صاف دکھائی نہیں دیتی۔“

انہوں نے مصنوعی غصے سے رباب کو دیکھا اور
بچے گرا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ کمرے سے نکل
رہی تھیں کہ رباب کی آواز پر پھر ہری گئیں۔

”معاف کر دیں خاتون امی! آپ کا نیا چشمہ
آج دکان سے لانا بھول گئی۔ اس بخار نے تو میری
مت ہی مار دی۔“ کہہ کر وہ الماری کی جانب مڑی۔

خاتون بیگم کو پشیمانی نے آگھرا۔

”اب ایسی بھی کیا جلدی۔ دھندلا سی مگر نظر تو

آہی رہا تھا۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے اتار لے پین پر
کڑھیں اور آگے بڑھ کر رباب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو
الماری سے اپنا عبایا نکال چکی تھی۔

”رہنے دو، اب اس بخار میں جلتی بھتی بازار
جاؤ گی کیا؟“ انہوں نے خود ساختہ شرمندگی سے نکلتے
ہوئے اسے ڈپٹ کر کہا۔

”صبح دفتر سے واپسی پر لیتی آتا اب مجھ بڑھیا نے

کون سے موتی ستارے ٹانگتے ہیں۔ وہی دال چاول اور

آلو بخارے والی چٹنی اور صبح کو دو پھلکے ڈالنے ہیں۔ بھلا

اس میں نظر کا کیا کام۔ دروازے سے لے کرے اور

کمرے سے لے کر باورچی خانے کے راستے میں رکھی ہر

ایک چیز سے برسوں سے واقف ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے

وہ ہنس دیں۔ یہ ہنسی بے پروائی کا انداز لیے ہوئے تھی۔

”دکان والے انگل نے کہا تھا کہ دفتر سے گھر جاتے

ہوئے آج ہی لازمی جانا ورنہ اگلے بیٹھے ان کی بیوی کا

آپریشن ہے۔ شاید وہ دکان چند روز تک نہ کھولیں۔“

وہ عبایے کے بیٹن کھولتے ہوئے بولی تو خاتون

بیگم شش و پنج میں پڑ گئیں۔

کچھ دیر تو یو پی انگلیاں چٹاتی رہیں۔ جیسے ہاں

اور نہ کے بیچ پھنس گئی ہوں پھر اچانک صاف انکار کر

دیا۔ بس رہنے دو جب دکان کھلے میرا چشمہ لیتی

آنا، میں کون سا اندھی ہوں۔“

ذکر کے سامنے لا کھڑا لیا۔ وہ سمجھیں کہ انہوں نے خود کو قید کر کے وقت جیسے منہ زور کھوڑے کی لگام بھینچ لی مگر باہر نکلتے ہی احساس ہوا۔ بس ان کی زندگی ہی رک گئی تھی۔ باقی کی دنیا تو اسی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے گھر میں لگا کیلیڈر رجلا کر سمجھا کہ دنوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

دیوار پر ٹک، ٹک کرتی گھڑی کا گلا گھوٹ کر وقت کو مار دیا۔

رباب لا کھ چنچنی کہ چوبیس تاریخ کو اس کا... سہ ماہی امتحان تھا۔ تاریخ معلوم نہ ہونے پر اس نے چھٹی کر لی اور اگلے دن خوب ڈانٹ کھائی مگر خاتون بیگم کان لپیٹ کر آگے بڑھ جاتیں۔

آئے روز شوہر لا کھ احتجاج کرتا کہ اس مولیٰ گھڑی کے سیل تبدیل کر دو، سات بج گئے اور میں ابھی تک چھ بجنے کے لیے کب سے اس منوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینتی۔ کئی سال ہوئے انہیں وقت کے حساب کتاب سے خود کو آزاد کہے ہوئے۔

کہنے والا دن رات کی قید سے آزاد ہو کر عدم سدھار گیا مگر نہ ہی انہوں نے گھڑی کے سیل بدلے اور نہ ہی گھڑی نے کبھی چھ بجائے۔

رباب کے بچپن میں گھر کا پرانا ٹیلی وژن جس پر کبھی کبھار وہ دونوں باپ بیٹی کوئی ایک آدھ ڈراما دیکھ لیتے تھے وہ بھی ایک روز گھر آنے پر معلوم ہوا کہ صفائی کرتے ہوئے ان کا ہاتھ لگنے سے فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اگلے دن وہ ٹوٹا ٹیلی وژن سیٹ رباب منہ بسورتے ہوئے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر آئی۔

گھر میں موجود پرانے زمانے کا ریڈیو کا بھی ایسا ہی حشر ہوا۔ اباریڈیو کے شوقین تھے۔ فارغ اوقات میں کبھی کوئی تازہ ترین خبر سن لیتے یا پھر کسی فرمائشی پروگرام میں کوئی بھولا بھرا فلمی گانا سنائی دیتا تو جس بھری فضا میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا سا آ جاتا مگر ان پر بھی خاتون بیگم معترض ہوئیں کہ عین اذان کے وقت

یہ دیکھ کر رباب نے باہر کے کاموں کی لسٹ میں سے ماں کا نام ہی خارج کر دیا۔ اسکول سے سرٹیفکیٹ لینے سے لے کر کالج داخل ہونے اور کالج سے نکلنے کے بعد نوکری کرنے تک کے سارے کام خود سر انجام دیے۔

بھلا ان سے کسی کام کی کیا توقع رکھتی جو بیمار ہونے کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس اس ڈر سے نہیں جاتیں کہ کلینک گلی کے کٹڑ پر سہی مگر جانا تو باہر ہی تھا۔

جب کبھی پیٹ میں درد ہوا اباحکیم سے دوائی لے آتے اور وہ پچانک کر درد بھگا دیتیں۔ معمولی بخار اور نزلہ، زکام پر گھر بیٹھو نکلے آزمائیتیں۔

ایک دو بار مجبوری کی حالت میں گھر سے نکلیں بھی تو یوں خود کو برقع میں لپیٹ کر دیوار سے لگ کر چلتیں جیسے لوگ رستے میں انہیں زبردستی روک لیں گے۔ اور پھر ان کا نقاب الٹ کر تاک پر انگلی رکھنے والے انداز میں کہیں گے۔

”اچھا تو یہ تم ہو۔“

نہ جانے کیوں اس دن کئی برسوں سے اپنے درد کو پس پشت ڈالنے والی خاتون بیگم سے بیٹی کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ رباب کو آرام کا کہہ کر الماری کے نچلے خانے میں موجود اپنا عبا یا نکالا۔ اس وقت شاید عبا کے بجائے دو ڈوریوں کو چہرے کے نیچے باندھنے والا برقع تھا۔ جس کے پیچھے لٹکتے دو باریک پلوؤں کو نقاب کی طرح چہرے پر گرا دیا جاتا۔ غالباً پہلی بار پہن کر آئیں تو نہ لگا کر الماری میں رکھ دیا۔ جیسی تو نیا کپڑا تھا۔ کبھی استعمال ہوتا تو کپڑے کا رنگ پھیکا پڑتا یا پھر ڈوریاں کثرت استعمال سے ٹوٹنے لگتیں۔

خاتون بیگم گھر سے اتنے برس بعد نکلیں تو سورج جیسے آنکھوں میں مہس آیا۔ تیز روشنی کے باعث آنکھیں چنہا چنہا سی لگیں۔

”ڈر کا آسیب ایک بار وجود سے چمٹ جائے تو پھر لا کھ جھکیں، پیچھا نہیں چھوڑتا۔“

خاتون بیگم جس چیز سے خوف زدہ ہو کر کنویں کی مینڈک بن کر رہ گئیں وقت نے انہیں ہاتھ پکڑ کر اسی

رومیٹک گانا گادیتے ہیں۔

پتا نہیں ماں کو چڑا نا مقصود تھا یا پھر ضد کر رہا ہے۔
نے اس دن کے بعد انہیں خاتون امی کہا شروع کر دیا۔
دکان سے چشمے لے کر وہ نکلیں تو انہیں رہا باب کی
تاکید یاد آئی۔ فوراً اسے کال کر کے جلدی لوٹنے کی
اطلاع دی۔

دوسری طرف رہا باب نے سکھ کی سانس لی۔ کتنے
سال ہو گئے تھے انہیں باہر کی دنیا کو خیر یاد کیے ہوئے۔
ابا کی وفات کے بعد فاتوں کی نوبت آئے گی۔ رہا باب
ان دنوں تازہ، تازہ کالج سے فارغ ہوئی تھی۔ اسے لگا
اب خاتون امی خود پر لگا کی یہ خود ساختہ پابندیاں ہٹا
دیں گی۔ پر وہ تو مرنے کے اس آخری بزدل چوڑے
کے مانند ہوئیں جو مرنے کے ٹھوٹے مارنے کے باوجود
خود ہی انڈے کی تہ میں دم سادھ کر بیٹھا رہتا ہے۔
رہا باب نے تنہائی کے انڈے میں قید خاتون بیگم کو باتوں
کے کئی ٹھوٹے مارے مگر بے سود۔

ناکامی کے بعد اس نے خود کو باہر کی دنیا کے
حوالے کر دیا۔

اس کی ملازمت کے بعد گھر میں چھائی بد حالی
اور نان چھو لوں کی مہک آہستہ، آہستہ دور ہوتی گئی۔
”اردو بازار کے نزدیک پہنچ گئی ہوں، فکر مت
کر وہاں ساری دکانوں پر لکھے نام اور ان کے اوپر ٹنگے
سارے بل بورڈ آسانی سے پڑھ لیے ہیں۔“

اب کی بار خاتون امی کی چمکتی آواز سنائی دی تو
رہا باب نے اطمینان سے ایک طویل انگڑائی لی اور چار پائی
سے اٹھی۔ ارادہ ہار چچی خانے میں جا کر چائے بنانے کا
تھا مگر نیچے پیر رکھتے ہی کوئی چیز پیر میں چھپی تو اس چیز کو
ہاتھ میں دیکھ کر چائے بنانے کا ارادہ موقوف کر دیا۔

نیا چشمہ لگاتے ہی دھندلے منظر ایسے صاف
ہو گئے جیسے چھما چھو مینہ برسے اور شہر بھر کے دھول
بھرے شجر، رستے اور منظر یک دم شفاف ہو جائیں۔

زمانے نے کیسے اطوار بدل لیے۔ یہ انہیں بل
بورڈ دیکھ کر اندازہ ہو گیا۔ شہر کی اصل صورت ویسی نہ
رہی تھی۔ جیسی ان کے دور میں ہوا کرتی تھی۔ انہوں

یوں پہلے پہل ریڈ یو گھڑی دو گھڑی کے لیے بند
ہوا پھر نامحسوس طریقے سے کھٹنے دو کھٹنے کے لیے۔
اگلے دن ایک آدھ دن کے لیے صحن سے ریڈ یو کی آواز
گم ہوئی۔ اس کے چند روز بعد طویل تر خاموشی چھا
گئی۔ آخری بار رہا باب نے اسے الماری میں دیکھا تھا۔
اس کے بعد وہاں سے نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔
”خاتون امی دکان پر پہنچ کر اطلاع دیجیے گا۔
انکل کی دکان حسینیہ چوک کے دائیں جانب نیو فرموسی
بیکری کے ساتھ والی ہے۔“

دو بار راستہ بھول کر وہ کسی راہ گیر کی مدد سے
حسینیہ چوک پہنچیں تو موبائل کی اسکرین رہا باب کی مس
کالز سے بھر چکی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے فٹ ہاتھ پر سستاتے ہوئے
اس کی میسجوں کا اٹھائی تو اس کی فکر مند آواز سن کر انہیں
بہنی پر جی بھر کر پیار آ گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد مجال
ہے جو انہیں کسی قسم کی تنگی دکھائی یا پھر تکلیف دی ہو۔

جی کیا اڈر کمال کے بائیں جانب مین اسی جگہ پر
پیار کر رہے جس پر زندگی میں پہلی بار چائنا سید کیا تھا۔
”بھئی اردو کی ورک بک میں اپنی، اپنی ماؤں کے
نام لکھ رہے ہیں اور میں اس خانے میں جا کر لکھ دوں
میری ماں کا نام خاتون ہے۔ کتنا ہنس گئے ناں سب
نچر زکرا آج تک کسی خاتون کا نام خاتون سنا ہی نہیں۔“

زندگی میں پہلی بار رہا باب اپنی ماں کے سامنے
بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔ اس بات پر پھر کھڑا کر سامنے
پڑی میز کے کونے سے ٹکرا کر ماتھے پر نشان لگوایا مگر
دوبارہ یہ ذکر ان کے سامنے نہیں کیا۔

دغم بھر گیا مگر نشان رہ گیا۔ اکثر آئینہ دیکھتے
ہوئے یہ بات رہا باب اور اس کا ماتھا چومتے ہوئے
انہیں بھولتی نہیں تھی۔

اگر چہ وہ بی دن تک چپکے چپکے ابا سے ان کا اصل
نام اگلوئے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ خاموش رہے۔ وہ
خود بھی انہیں خاتون بیگم کے نام سے ہی پکارتے تھے۔

اپنی زندگی سے کی سال ایک بازاروں اور موڑوں...
 کاروں میں ایسے ہی برقع میں گزارے۔ تب انہیں نظر
 کا چشمہ نہیں لگا تھا۔ وہ چہرے پر دونوں نقاب گرائے
 بہ آسانی تنگ اور رش والی گلیوں سے نکل جاتیں۔
 تیرہ سال کی عمر میں ایک قرض دار کے ہاتھوں
 اپنے باپ کے قتل اور گئے رشتوں کے منہ موڑنے کے
 بعد وہ اپنے گھر کا باپ بن گئی۔ وہ جس کی خاطر باپ
 بنی تھیں اس نے غربت زدہ زندگی سے اعلان جنگ
 کرتے ہوئے چوری چکاری شروع کر دی۔

چند دن کی امارت نے اس کے بھائی سے یوں
 بدلہ لیا کہ اسے ہمیشہ کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے
 وہی پتلی دال کھانے پر مجبور کر دیا۔ جسے آخری بار وہ
 لات مار کر اپنے حالات سنوارنے لگا تھا۔

”وقت کا کھیل بھی بڑا عجیب ہے۔ جہاں رک
 جائے تو لگتا ہے کہ کھڑے، کھڑے صدیاں بیت گئیں اور
 جب بدلے پر آتا ہے تو اپنے پیچھے نشان تک نہیں چھوڑتا۔“
 اس کے بعد خاتون بیگم اور ان کی ماں نے
 قدرے سہل زندگی گزار لی۔ ماں کے مرنے کے بعد
 ان سے وہ نان چھوڑوں والا لکرا گیا۔ جس کے گھر میں
 آتے ہی انہوں نے بیرونی دنیا سے ناتا توڑ دیا۔
 انہوں نے جیسے وقت سے بدلہ لیا۔ جتنے برس گھر
 سے باہر گزارے اتنے ہی شادی کے بعد اندر بیٹائے۔
 گویا حساب چکنا کر دیا۔

رباب کو جب پہلی تنخواہ ملی تو کئی روز تک ضد پکڑ
 کر بیٹھ گئی کہ وہ اس کے ساتھ باہر نہیں اچھی سی جگہ پر
 کھانا کھانے چلیں مگر وہ ٹال گئیں۔

باہر کے نام پر خوف سے ان کے ہاتھ جبرن
 ہو جاتے۔ سر چکرانے کے ساتھ، ساتھ آنکھوں کے
 سامنے اندھیرا چھا جاتا۔

رباب کو لگتا کہ ان کی یہ حالت یکسانیت کے
 باعث ہو جاتی تھی۔ وہ منہ سے نہیں بولتی تھیں مگر اسے
 یقین تھا کہ انہیں یکسانیت کی دیمک چاٹنے لگی ہے۔

بھلا کئی سالوں سے ایک جگہ رہتے، رہتے

طبیعت ادب نہیں جانتی ہے۔ رک پانی لعفن زدہ ہو جاتا
 ہے۔ وہ تو پھر جیتی جاگتی انسان تھیں۔

خاتون بیگم کو بھی یہی لگتا کہ رباب سچ کہتی ہے مگر
 یہ سب اندرونی یکسانیت کے باعث نہیں تھا۔ وہ اکثر
 چپ چاپ اس کی بات سن لیتیں۔ کچھ کہتیں تو اس سے
 جڑی کہانی بھی تو سنانی پڑتی۔ جس کی وہ تحمل نہیں ہو
 سکتی تھیں۔

وہ کہانی جسے برسوں سے صندوق میں مقفل
 کر کے سمجھ بیٹھی تھیں کہ کہانی دفن ہو گئی۔ ماضی وقت کی
 دھول میں گم ہو گیا مگر نہیں۔ رباب کے ذہن میں ان
 کی پراسرار شخصیت کے متعلق جو گتھیاں موجود تھیں۔
 انہیں سلجھانے کے لیے وقت کی دھول میں اتنی اس کہانی
 پر سے گرد جھاڑنی تھی۔

چار پائی سے اترتے وقت اس کے پیروں میں جو چیز
 چھپی وہ خاتون بیگم کے گلے میں ہمہ وقت جھولتے
 لاکٹ کے ساتھ بندھی صندوق کی جانی تھی جو شاید غلبت
 میں یا پھر نظر نہ آنے کے باعث نیچے گر پڑی۔ رباب
 نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے یہ صندوق اس
 کے گھر میں موجود تھا۔ کسی مقدس مذہبی کتاب کے مانند
 جو الماری کے اوپر پڑا رہتا تھا۔ جسے خاتون بیگم کی
 انگلیوں کے سوا کسی اور نے چھوا تک نہیں تھا۔

آج وہی صندوق رباب کے سامنے کھلا پڑا تھا۔
 اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے گنگ بیٹھی تھی۔

سامنے پڑے رسالے کو دیکھ کر وہ نظریں ہٹاتا
 بھول گئی۔

رباب ہاتھ میں ایک پرانا رسالہ ”ستاروں کا
 جبرمٹ“ لیے بیٹھی تھی۔ سرورق پر اپنے وقت کی مشہور
 ادکارہ ایک اداسے براجمان تھی۔

رباب نے بڑی بے صبری سے رسالے کے
 اندرونی صفحات پر سرورق کی شخصیت کا نام ڈھونڈا۔ وہاں
 سرورق کی شخصیت کے آگے جسے تبسم کا نام جگہ گرا تھا۔
 بالآخر وقت نے کہانی پر پڑی دھول اڑا دی تھی۔



ناولٹ

پریم دیش جی

ایلیا علی غفار

”لالہ تمہاری زندگی میں دو مرد آئیں گے اور دونوں کو ہی تم سے محبت ہوگی اور تم ان میں سے ایک کو دوسرے کی وجہ سے چھوڑ دوگی۔“ میں نے گل کی پیش گوئی کو سچے ہوتے دیکھ لیا تھا..... ایسا ہی تو ہوا تھا۔ گل کو اشارے سمجھ میں آتے تھے، وہ وادی کی ذہین ترین لڑکی تھی..... آج چار سال بعد میں نے کھلے دروازے کے پار اسے کھڑا پایا تھا۔ سنہری رنگت، روشن پیشانی، بڑھے ہوئے فکڑا لے بال اور لمبوں پر وہی چار سال پرانی والی

یہ دیکھ کر سب نے ہنسنے لگا۔ وہ اپنے
چہرہ پر میرے سامنے کھڑا تھا..... میں نے پلکیں جھپکائی
تھیں..... وادی کے جھرنے، نالے اور دیباہری آنکھوں
سے رواں ہونے کو تھے۔ ہاں..... یہی وہ شخص تھا جس
سے میں محبت کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

پہاڑی چوٹی پر ہم سب کا جھوم اکھیلیاں کر رہا ہوتا
اور پہاڑ ہماری شرارتوں سے تنگ آ جاتے..... گل
پہاڑی کے بڑے پتھر پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔ زرمینہ
ہمیشہ کی طرح چو لھا ہائے اس پر لذت کھمبیاں تل رہی
تھی..... کبھی، کبھار اگر کھمبیاں زہریلی نکل بھی آتیں تو
ہم حکیم کا چورن ساتھ رکھتے تھے جو ہم سب کے دوپٹوں
کے پلوؤں سے بندھا ہوتا تھا۔ رباب بانسری ہونٹوں
سے لگائے سر کھینچنے میں مگن تھی..... میں جڑی بوٹیاں
اکھاڑنے کے ساتھ، ساتھ سوچوں کے سفر پر روانہ
ہو چکی تھی۔ کھمبیوں پر کئی ہوئی چھریں چھریں زرمینہ نے
بغور مجھے دیکھا۔

”لالے، آج کل تمہارے حواس تمہارے نہیں
لگتے۔“ ہمارے سروں سے بادل گزرتے جا رہے تھے۔
”زری..... بس مجھے آج کل اپنی یہ زندگی کچھ اچھی
نہیں لگ رہی۔“ میں نے نیچے وادی میں جھانکا، سبزے
کی چادر تھی..... موسیٰ ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔
”لالے..... کیسی اجنبی باتیں کرتی ہے۔“

”دیکھو ناں..... یہاں زندگی کیسی دیران اور رکی،
رکی سی ہے..... پانچ سال بعد بھی یہ لوگ وہی کر رہے
ہوں گے جو آج کر رہے ہیں..... وہی بھیڑ بکریاں، وہی
گھروں سے اٹھتے کڑوے دھوئیں، پتھروں والی لگیاں،
اونچے لمبے درخت اور بس۔“ مجھے نہیں علم تھا میرے لہجے
میں کیا تھا کہ جس نے زری کے چلتے ہاتھوں کو روک دیا
تھا۔ وہ ہی ہو کر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

”یہ غصہ یہ بغاوت اور بیزاری..... لالے، پہاڑی
لڑکی ہو دماغ ٹھکانے رکھو۔ پناہ گاہوں سے بیزاری نہیں
رکھتے۔ یہ پانیوں سے بھرے نیلے شفاف بادل، پُرسکون

تھیں، سبزے، سبزے اور دیوار،
کے شاہانہ مقدس بیڑ، باہر کے لوگ یہ دیکھتے یہاں
دوڑے، دوڑے آتے ہیں اور تم ہو کہ بس.....“ درختوں
کی خوشبو دار چوٹیاں جھوم رہی تھیں۔ میرے وجود
جانے کب اور کیسے بغاوت در آئی تھی..... رباب
ہمارے پاس آ کر گر گئی تھی۔

”ہائے کب میری بانسری کی دھن پر انگریز
شہزادے رستے بھولیں گے۔“ انداز میں کافی حسرت
اور غم تھا۔ وہ انگریزی شہزادوں کی ڈائی پارٹ فیر
تھی۔ آج برابر کرتی زری کھی، کھی کرتی نہیں تھی۔
”تمہیں دیکھیں گے تو پچھارے اگلے جہان سدھار
گے۔“ رباب بانسری پتھروں سے رگڑنے لگی۔

ہم چاروں کا بچپن ساتھ، ساتھ گزرا تھا۔
پہاڑوں پر بندروں کے مقابلے میں کودتے
پھاندتے ہم جوان ہوئے..... دیو داری چوٹیوں پر
بچی ہم چڑھ چکے تھے..... ندی، تالوں میں غوطے
بھی لگا چکے تھے۔ جھولیوں میں خشک لکڑیاں اکٹھی
کر کے ہم جنگل میں بڑے پتوں پر بیٹھے بیر رکے
کھاتے ہوئے شان سے چلتے تھے..... بندروں کے
منہ چڑاتے انہیں غصہ دلانے میں ہر بار ہم کامیاب
ہو جاتے۔ غصے سے لال جھسکا ہوتا بندر کبھی،
کبھی تو ہمارے دوپٹے جھپٹنے اور چیر پھاڑ دیتے
تھے..... پہاڑی چوٹیوں کے ساتھ سر ملا کر ہم گاتے
تھے..... اگر آس پڑوس میں کسی کی شادی ہوتی تھی
تو مایہ بے گانے کی ذمہ داری ہم چاروں کی ہی
ہوتی تھی۔ ہمیں نہایت عزت اور احترام سے مدعو کیا
جاتا تھا۔ کشمیری چائے اور اخروٹ کے حلوے سے
تواضع کی جاتی تھی..... رباب بانسری بجاتی میں اس
کا ساتھ دیتے ہوئے دف بجاتی تھی..... ہم جب
سماں باندھتے تو بڑی بوڑھیاں دوپٹے منہ
میں دبائے شرم سے گلابی ہو جاتیں اور اپنے ماضی
میں گم ہو جاتیں۔

دور کہیں بھاری پتھر لڑھکا تھا..... گل کا آسن شور

کے ساتھ ٹوٹا تھا۔
 ”میرا آسن توڑنے کی جرأت کس نے کی ہے؟“
 کبھی کا کلام نہ میں رکھتی رہا اب ہنسی تھی۔
 ”یہ جرأت پہاڑوں کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔“ وہ چلا نک مارنی ہماری طرف آ رہی تھی۔
 ☆☆☆
 سالار کی مٹھی دھیرے سے کھلی تھی اور میری جان حلق میں آگئی تھی۔ پہاڑوں نے لاوے اگلے تھے، زمین پھٹنے کو تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ میری سوچ کے دائروں سے باہر ہو کر ملا کرتا تھا۔ سادگی سے پیاری ہنسی ہستا وہ ہتھیلی پر میری پائل کا ٹھنکرو رکھے کھڑا تھا، سالار قیس کو لا جواب کرنا آتا تھا مگر مجھے لا جواب ہونا نہیں آتا تھا۔ وہ اتنا سادہ تھا کہ لوگ دکھاوے کی ہنسی سے اسے خرید لیتے تھے اور وہ بکنے کو تیار ہو جاتا۔ پہاڑ کی چوٹی سے میں نے پائل کا ٹھنکرو نیچے وادی میں پھینکا تھا اور سالار قیس کو ڈھونڈنے کو کہا تھا، وہ مجھے ٹھنکی باندھے دیکھتا رہ گیا تھا۔
 ”لالے۔۔۔۔۔ بس اتنا چھوٹا سا کام۔۔۔۔۔؟“ یہ چھوٹا کام ہرگز نہیں تھا میری آنکھیں باہر اٹکنے کو تھیں۔ وہ ہفتوں تلاش کرتا رہتا، ٹھنکرو اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا مگر وہ کیسے مسکرایا تھا۔
 ”لالے۔۔۔۔۔ سالار کے دل اور چھوٹے سے ٹھنکرو کا مقابلہ کرتی ہے۔ ٹھنکرو بے شک چھوٹا سہی مگر سالار کا دل بہت بڑا ہے۔“ کالی آنکھوں والا، بڑے دل والا، ٹھنکرو نہیں جیسے دنیا کا خزانہ سامنے رکھے کھڑا تھا۔۔۔۔۔ وادی میں دھند چھانے لگی۔ باورچی خانوں کے دھوئیں سے گلیاں بھر گئیں۔ سہ پہر کا گیا اب شام سے لائین کے ساتھ لوٹا تھا۔ مسافر کی آنکھوں کے سرخ ڈورے ٹھنکرو سے بے حال تھا۔ اس نے ٹھنکرو میری مٹھی میں دبایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔
 ”لالے۔۔۔۔۔ امتحان لینا نہ چھوڑنا تب تک۔۔۔۔۔ جب تک دل نہ ہار جاؤ۔“ میں پیچھے ہٹنے لگی تھی۔
 ”ایسا نہیں ہوگا۔“

خود کو لاوے میں جھونک دوں گا۔“ لائین تھا سہ وہ دھوئیں سے بھری گلی میں عجب شان بے نیازی سے چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ کم بخت، چلتا تھا تو سارے زمانے کو ٹھوکروں میں رکھتا تھا۔ گل تختی حسرت سے کہا کرتی تھی۔
 ”لالے۔۔۔۔۔ تیرا انگیر دل کا بڑا سادہ ہے مگر چلتا ہے تو بڑی آن بان سے۔۔۔۔۔ پہاڑوں کی مٹی اس کے آگے گزرا ہوئی جاتی ہے۔“
 ”گل۔۔۔۔۔ میرا دل نہیں مانتا۔“ عرق کی بوتل تھا سہ اس نے مجھے عجب نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”چھوڑ کیوں نہیں دیتی اسے۔۔۔۔۔؟“ میری جان جیسے حلق میں لٹکی تھی۔
 ”پہاڑوں کی لڑکیوں کو یہ زیب نہیں دیتا۔“
 ”لالے، دل سے بیزاری نکال کر تو دیکھ۔۔۔۔۔ ایسا سچا اور کھرا مرد قسمت سے ملا کرتا ہے۔ نظر میں حیا رکھتا ہے، دل کا اتنا سادہ کہ اگلے کو سوم کر دیتا ہے۔ وادی میں اس جیسا کوئی ایک بھی نہیں۔۔۔۔۔ وادی میں آج تک ایسا مرد پیدا نہیں ہوا جو پائل کا ٹھنکرو ڈھونڈ کر ہتھیلی پر لا کر رکھ دے۔“ میں نے ٹھنکرو کو ہتھیلی پر رکھے دیکھا۔
 ”زر گل۔۔۔۔۔ دل کا کیا کروں۔۔۔۔۔؟“ وہ گھاگرا سیمپٹی غصے سے ابھی تھی۔
 ”زری کو کہوں گی کھمبیوں کے ساتھ، ساتھ لالے کا دل بھی تو بے پر بھون کر رکھ دے۔“ دلدل میں گری تھی میں تو جیسے عزت، آسودگی، سب تو مل رہا تھا مگر یہ دل۔۔۔۔۔؟ یہ کیا چاہتا تھا؟
 ☆☆☆

جھیل کے پانی میں وہ سنہری عکس کس کا تھا۔۔۔۔۔ دل میں گھنٹیاں بج اٹھی تھیں اور میرا وجود آگ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ دیودار کے درختوں کے سامنے کیمرا ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہ اتنی بے نیازی اور شان سے ٹھٹھا آ رہا تھا کہ بس۔۔۔۔۔ گل کہتی تھی اگر نظر ہٹنے سے انکاری ہو تو دل پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔۔۔۔۔ دل یونہی ہاتھوں سے چپ چاپ کھسک جاتے ہیں۔۔۔۔۔ نہ نظر پر اختیار رہا تھا

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء 139

میں اس پتھر پر بیٹھ سکتا ہوں؟“ اپالو دیوتا کی مدد سے
آواز نے مجھے کچھ بھی سوچنے نہ دیا تھا۔

”جی بیٹھ جائیں۔“ وہ کیرا گود میں رکھتا اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔ کسی مرد کے اتنے پیارے نقوش بھی ہو سکتے ہیں.....؟ اپنے جوتے اتارتا وہ پاؤں پانی میں ڈالے بیٹھا تھا۔ شفاف پانی میں اس کے چہرے کی پیارے لگ رہے تھے۔ میں دھکتی رہی تھی۔

”آپ اسی وادی میں رہتی ہیں؟“ وہ جگنوؤں کی روشنیوں کا سا روشن شخص مجھ سے مخاطب تھا۔

”جی..... اسی وادی میں رہتی ہوں۔“

”بے بے انتظار کر رہی ہوں گی.....“ میں گھبرا گھبرا ٹھیک کرتی، دوپٹا سر پر بٹھاتی واپسی کی طرف مڑی تھی..... وہ وہیں کھڑا تھا میں نے پیچھے سے اس کی آواز سنی..... وقت رک گیا تھا..... خوشبوؤں کے ٹولے جھیل پر اتر آئے تھے۔

”کیا آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“ میں نے پہاڑوں میں وراثتیں پڑنی دیکھی تھیں۔

”لالہ.....!“

”گرٹ بہت پیاری جگہ ہے۔ ہے ناں!“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کل تک جو میں بحث کرتی تھی اور پہاڑوں سے آکٹھٹ کا مظاہرہ کرتی تھی آج کیسے میرا لہجہ اور الفاظ بدل گئے تھے۔ یوں اچانک؟

☆☆☆
 ”آپ کا نام بہت پیارا ہے۔“ شام سے ذرا سا پہلے کا وقت تھا..... پہاڑوں کی چوٹیاں تاریکی ہو رہی تھیں..... کونجوں کی ڈاریں قطاروں میں بیٹھی تھیں۔
 روشنیوں کے سارے رنگ جمیل کے پانیوں میں اتر آئے تھے..... وہ آج بھی وہیں پتھر کے اوپر چڑھا کیمرہ اٹھائے کچھ capture کر رہا تھا۔

”جی..... مہربان پہاڑوں کی اس وادی میں بہت سکون ہے..... ویو دار اور چمڑے کے خوشبودار مقدس جڑ ہیں..... اور پتا ہے یہاں شرابی بندر بھی ہیں.....“ وہ اجنبی تھا تو اس کے لیے میرے چہرے پر مسکراہٹ کیوں تھی..... وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”بے بے کو بھی میرا نام بہت پسند ہے..... کہتی ہیں ایسا نام پوری وادی میں کسی کا بھی نہیں.....“

میں نے پانی اوک میں بھرا.....

”واقعی.....“

”آتے ہوئے میری گاڑی کے شیشے پر اتنے بندر چڑھ گئے کہ انہیں اتارنا مشکل ہو گیا تھا۔“

جھیل کے پانی میں گلابی پھول تیرتے ہوئے آرہے تھے..... اس نے ہاتھوں میں پانی بھر کر اپنے منہ کی طرف اچھا لٹھا۔ پانی کے قطرہوں میں وضو پ کا عکس جم گیا تھا۔

”اور آپ کا نام کیا ہے؟“ وہ کیرا کو انجیوں کی ڈارپرفکس کرچکا تھا۔
 ”شاہ زین.....“ کیسی شیرینی مھولتا سا نام تھا
 تاس اس کا.....

”آپ شہر سے آئے ہیں؟“ وہ کمرے کا لینز
فوکس کرتا مجھے دیکھنے لگا تھا۔

”آپ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔“ کیمرا ہٹا کر اس نے مجھے دیکھا تھا۔

”جی شہر سے آیا ہوں..... میں ایک فوٹو گرافر
ہوں..... شہر کی بھاگتی دوڑتی روئین سے فرار چاہتا تھا
بھی ادھر بھاگ آیا۔“ جینز کے پانچے فولڈ کیے وہ پانی
سے کھینے میں مگن تھا۔

”لالہ..... میرے نام کی تعریف کرنا ضروری نہیں تھا۔“ میرے چہرے پر جھینپی سی ایک مسکراہٹ

”آپ کو شہرا چھا نہیں لگتا؟“

بازگشت نے ہمیں نڈھال کر دیا تھا..... گرم قبوے کے سپ لیتے ہم دائرے میں بیٹھ گئے تھے..... رباب نے گل کے سامنے پھیلی پھیلائی تھی۔

”میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھو اور بتاؤ کہ میری ہانسی کی مٹھن پر کب انگریزی شہزادے رستے بھولیں گے۔“ وہ کتنا انتظار کیا کرتی تھی کبھی، کبھی تو اس پر سنووائے کا گمان ہونے لگتا تھا۔

”انگریزی شہزادے پہاڑوں کی طرف نہیں آئیں گے رباب، یہ امیدیں کبھی پوری نہیں ہوں گی..... دل کو سمجھا لو.....“ رباب ہانسی تھا گے گم سمی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ہر بار ایک ہی جواب ملتا تھا۔ زری نے تاسف سے اپنے مہندی رنگے ہاتھوں کو سامنے کیا تھا۔

”لکیریں تو مہندی کے رنگ میں چھپ گئی ہیں گل۔“ گل نے حنا رنگی پھیلی پھیلائی تھی۔

”میں مہندی کے رنگوں میں لکیروں کے رنگ یہاں ڈھونڈ نکالوں گی۔“ واقعی زرگل نے ڈھونڈ نکالے تھے..... فاتحانہ سراٹھایا تھا۔

”جلد تمہارے ہاتھ اسے محرم کے رنگوں کی مہندی سے جھیں گے..... جلد تم اگلے گھر سدھا رو گی۔“ ”پہاڑوں اور وادیوں کے سارے رنگ زری نے کے ہیں.....“ اس نے شرم سے سرخ چہرے کے ساتھ ہاتھ واپس کھینچ لیے تھے۔

”اللہ کرے سچ ہو.....“ میں اطمینان سے قبوہ بیٹی انہیں دیکھے گی۔

”لالہ..... تم اپنے ہاتھ آگے کرو۔“

”میں.....؟“ میرے سوال پر رباب نے میری پھیلی آگے کر دی تھی۔ گل کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے اور ہر رنگ مجھے خوف میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ ”لالہ..... تمہاری زندگی میں دوسرا آئیں گے اور دونوں کو بھی تم سے شدید محبت ہوگی اور تم ان میں سے ایک کو دوسرے کی وجہ سے چھوڑ دو گی۔“

☆☆☆

”تیری خالہ شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی

پھیل گئی تھی۔ پھر وہ میری پہلی سی ہنسی نہ رہی تھی..... شاہین مراد اپا لوی دیوتا پھر میرے خوابوں میں آنے لگا تھا..... نیندوں میں اس کی جاگ پڑ گئی تھی..... ہم دونوں نے اب جھیل پر ملنا شروع کر دیا تھا..... جھیل ہمارا انتظار کرتی..... پہاڑوں کی کونجیں ہم کو گھٹکی باندھے دیکھا کرتیں۔ وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس سے میں متاثر ہوئی تھی، اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکتا بھول جاتا تھا..... ہم دونوں چٹانوں پر ساتھ ساتھ بھاگتے تھے۔

”لالے، خیال سے گر جاؤ گی۔“

”میرے خیال راستے بھٹک گئے ہیں۔“ جھیل میں پتھر پڑا تھا۔

”کس نے پہاڑوں کی لالہ کے خیال میں دخل اندازی کی؟“ صنوبر پر بیٹھی پہاڑی چڑیوں نے سر جھٹک کر نیچے دیکھا تھا۔

”شہر سے آنے والے مسافر نے میرے خیالوں میں خلل ڈالے ہیں۔“ وہ میرے پاس کھڑا مجھے دیکھتا رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے تم دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔“ پہاڑوں کا سرخ رنگ مجھے چڑھ گیا تھا..... میں رگٹی ہوئی تھی..... بہار راستوں میں تھی۔

اب بھی پہاڑ ہم چاروں دوستوں کا انتظار کرتے تھے..... پہلے ہم نے بھی پہاڑوں کو انتظار نہیں کرایا تھا..... زری نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے خوب، خوب لٹا دیا تھا۔

”لالہ..... مہربان پہاڑوں کو انتظار نہیں کراتے..... پھر پہاڑ تالیوں کی بازگشت چھین لیتے ہیں۔“ مجھے پہاڑوں سے بے پناہ عشق تھا..... اور پہاڑوں کی بازگشت میری محبت..... میں نے زری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”چلو زری، میں پہاڑوں کو تاراض نہیں کر سکتی، کبھی نہیں.....“ اس دن ہم چاروں پھر سے اکٹھے ہوئے تھے اور جب تک پہاڑی دامن میں تالیاں پیٹتے رہے جب تک ہماری پھیلیاں لال نہیں ہو گئیں۔

ہیں۔“ بے بے نے دھوئیں کے بادل کے پار مجھے دیکھا تھا۔

”بے بے..... ایسے کیسے؟“ میری سانس پر انگارہ آ گیا تھا۔ میرے انداز کو جرت سے دیکھا گیا تھا۔

”لالے..... تو کیسی باتیں کرتی ہے..... کب تک تجھے ہم بٹھا کر رکھیں گے۔“ میں نے ککڑیوں کے ٹھنڈ کو پرے دھکیلا تھا۔

”بے بے، ابھی مجھے نہیں کرنی شادی وادی.....“ بے بے بڑبڑاتی ہوئی آگ درست کرنے لگیں۔

اور اگلے دن وہ آ گیا تھا۔ سورج سے پہلے رات کے بعد.....

”کیوں شادی نہیں کرنا چاہتی ہو؟“ دروازے سے لگ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”سالار..... ابھی میرا دل نہیں مانتا.....“

”دل کو منانے میں اتنی مدت تو نہیں لگتی.....“

”مجھے لگے گی۔“

”کتنی؟“

”ابھی مجھے اندازہ نہیں ہے..... مگر وقت دو مجھے.....“

”تمہیں میری محبت پر شک ہے؟“ اس کا لہجہ سو کاچ کے ککڑیوں میں بٹاتا تھا۔

”نہیں.....“ میں نے دروازہ دہاڑ سے بند کر دیا تھا۔

”گھر کا دروازہ بند کرنے کا اختیار رکھتی ہو مگر تمہارے دل کی چابی اپنے پاس رکھوں گا۔“ دروازے کی جھری سے وہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا..... آخر کیوں نہیں تھکتا تھا وہ اتنا کچھ کر کے؟ میں تھکنے لگی تھی.....

کبھی، کبھی محبت بھی تو انسان کو تھکا دیتی ہے ناں..... وہ چھلاؤں کی طرح میرے راستوں میں آ جاتا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”تمہیں دیکھنے آیا تھا.....“

”دیکھ لیا..... اب جاؤ.....“

”دل نہیں بھر رہا میرا.....“

”بھاڑ میں جائے تمہارا دل.....“ سالار ہٹکا ہٹکا

سا کھڑا رہ گیا تھا۔

”اپنے شوہر کو پہاڑی لڑکیاں ایسے نہیں کہتیں.....“ میں نے اپنی پائل کے ٹھنڈو م کرنے شروع کر دیے تھے۔ شاید کہ وہ تلاش سے تھک جائے.....

تھم جائے یا پھر رک ہی جائے مگر میں غلط تھی..... وہ ہر بار ہی ٹھنڈو لے کر حاضر ہو جاتا تھا۔

میں زچ ہونے لگی۔

”کیسے ڈھونڈ لیتے ہو تم؟“ وہ سادگی سے ہنستا تھا۔

”لالے..... تیری پائل کے ٹھنڈو مجھے ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں، میری تلاش میں رہتے ہیں..... میں ہی تو

آخر ان کا حقدار ہوں.....“ سالار برا نہیں تھا مگر وہ میرے دل کو کچھ خاص اچھا بھی تو نہیں لگتا تھا..... اصل بات تو پھر دل ہی کی ہوا کرتی ہے..... خشک لکڑیاں کاٹ کر وہ ہمارے گھر کی چھتوں پر اکٹھی کر رہا تھا..... بار بار

چوری دیکھ بھی لیتا تھا، میں نے پیٹھ موڑ لی تھی۔

”مہربان پہاڑیوں کے واسطے اپنے دیوانے کی طرف دیکھ لو.....“ وہ دہائیاں دیتا رہ گیا۔ مگر میں نے ہرگز بھی اپنی پیٹھ سیدھی نہیں کی۔

”لالے..... محبت کرنے والوں کو ایسا روگ نہیں دیتے۔“ اخروٹ کی چھال پرے پھینک کر میں نے تند نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی..... بھاگ جاؤ.....“

”مگر کیوں..... آخر کیوں؟“ وہ دنیا جہان کا مسکین ترین شخص بن گیا تھا۔

”کیونکہ..... کیونکہ میرا دل تمہاری چاہت نہیں رکھتا۔“ میرے لفظوں نے اس کے چہرے کو کالا کر دیا تھا۔ وہ چھت کے عقبی جانب اتر گیا تھا..... جانے

میرے دل میں کیوں ہلکی سی اداسی چھا گئی تھی..... پھر وہ مجھے کچھ روز نظر ہی نہیں آیا..... بے بے اگلی شام کو ذکر کرتی نظر آئی تھیں۔

”سالار کو تاپ چڑھ گیا ہے۔“

اس دن کے بعد وہ پھر بادام والا حلو دینے آیا تھا اتنا چپ وہ مجھے پہلے تو کبھی نظر نہیں آیا..... بے بے

سے سر جوڑے چوڑھے کے پاس بیٹھا رہا۔ جانے لگا تو میں سامنے دیوار کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیوں کر رہے ہو ایسا؟“

”کیا کر رہا ہوں؟“

”یہی سب کچھ.....“ وہ ادا سی سے ہنسا۔

”لالہ..... میرا دل بہت چھوٹا ہے اسے بڑے

انتہانوں کے حوالے نہ کیا کر.....“

”ڈرتے ہو.....؟“

”نہیں.....“

”تو کچھ.....؟“

”تمہارے غرور کو بچانا چاہتا ہوں۔“

”تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔“

”سالار، بالکل اسی طرح تم سے محبت کرنا بھی

میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ سن ہو کر رہ گیا میں

نے پتھر کو ٹھوک کر سے اڑا دیا تھا۔

وادی کی بڑی بوڑھیاں سالار کو دعا کہیں دیتے

ہوئے کہتی تھیں۔

”تیرے گھر آنے والی لڑکی تجھ سے محبت کرے گی۔“

وہ اعتبار چھوڑ بیٹھا تھا..... اور میں شاہ زین پر

اعتبار کر بیٹھی تھی..... ہاں محبت اور اعتبار.....

☆☆☆☆

دف کا شور تھا..... دیوں کی ٹٹمٹاتی ہوئی روشنیاں

تھیں اور وادی پر ہلکے بادل اتر آئے تھے..... زمین

ماپوں کے زرد جوڑے میں بھی ہوئی سرسوں کے پھولوں

کی طرح دمک رہی تھی..... رہا اب کوئی میسویں بار

میرے کانوں میں سرگوشی کر چکی تھی۔

”بائے لالے..... زری اتنی پیاری ہوگی، میں

سوج بھی نہیں سکتی تھی۔“ میں نے اسے دھوکا بڑا تھا۔

”دفع ہو جاؤ تم۔“ آج تم اسے نظر لگا کر ہی

رہو گی..... گل منی کے دیکھ دیکھتی تھوے کا کپ

تھا سے کھڑی تھی۔

”لالہ..... اب کھمبیاں کون تلے گا.....“ بھرائی

ہوئی آواز۔

”جب چیزیں اور لوگ دسترس میں ہوتے ہیں تو

ان کی تب قدر کیوں نہیں ہوتی تب ہی کیوں ہوتی ہے

جب یہ ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔“ رہا اب نے نفی

میں سر کو ہلاتے ہوئے زرگل کو جیسے تسلی دی تھی۔

”دو گلی چھوڑ کر تو اس کا گھر ہے۔“ قبوہ مڑک،

مڑک پتی گل گھم گئی تھی۔

”پہلے وہ باپ کی چوکھٹ سے قدم باہر رکھ کر پتی

تھی، اب وہ شوہر کی چوکھٹ کیسے پار کرے گی

رہا اب..... عورت کے لیے باپ اور شوہر کے گھر میں بڑا

فرق ہوتا ہے۔“ خوف کنڑلی مارے روشنیاں لنگھنے کو تھا۔

”تو کیا وہ اب کبھی ہم سے نہیں ملے گی؟“

سوال زہر تھا..... سوالی نیلا پڑ گیا۔

”کیا خبر۔“

”تو کیا وہ مقدس پہاڑوں کے بلاوے پر بھی

نہیں آئے گی؟“

”پہاڑوں نے اب اسے اپنے سحر سے آزاد کر

دیا ہے۔“ ہم سے دور..... تھوڑی ہی دیر میں زری موتی

چور لڈو منہ میں ڈالے ہنس رہی تھی..... کیسی باغی

مسکراہٹ تھی، قصور اس کا بھی تو نہیں تھا ناں..... ہم

تینوں کی آنکھیں آنسوؤں سے مھر گئیں۔

دیوار کی چوٹیوں میں آگ لگ گئی تھی.....

پہاڑوں کے بلاوے پر اب ہم تینوں جاتی تھیں.....

اب بھی زرگل آسن جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ رہا اب اور

میں کھمبیاں اکٹھی کرتے..... اور تل کر کھاتے.....

رہا اب نے بانسری بجانا بالکل ہی چھوڑ دی۔

”رہا اب، تہباری بانسری کے سرگرم ہو گئے کیا؟“

میں اسے کر پیتی رہتی ہوں۔

”لالے، انگریزی شہزادوں نے راستے بدل لیے

ہیں..... پہاڑ خفا ہیں مجھ سے اور پہاڑوں کی چڑیا خفا.....“

”تو تم انہیں منا کیوں نہیں لیتیں؟“

”مڑکی موت سے ہی وہ راضی ہوں گے۔“

بانسری نذر آتش کر دی گئی اور رہا اب سارا دن ہنستی رہی

نہتی..... وحشت بھری ہنسی..... اس کے گھر کے سامنے لے

چڑیاں ہمارے سروں پر دیوانہ وار منڈلانے لگیں۔
رباب بچکان لیتی قبوے تلے آگ برابر کرتی رہی۔
”دیکھو لالے..... پہاڑوں کی چڑیاں میری
ہانسی کی مرگ پر قہقہے کرتی ہیں۔“

”پہاڑی لڑکیوں کے خواب لاوے میں پکتے ہیں..... ابلتے ہیں۔“ قبوہ کناروں سے باہر اچھل رہا تھا۔

”لالہ..... میں بھی زری کے جیسی دہن بنوں گی
اں.....؟“ رہاب کا لہجہ اور تیور ایسے تھے کہ میں کٹ

کر رہی تھی..... اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ گھر اسانوارنگ
سے کہیں سے بھی پہاڑی دو شیرہ ثابت نہیں کرتا

.....مرد اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے اور مردوں کی
.....میں نظریںوہ ڈھل رہی تھی۔

”ممبر لہور باب..... وقت تمہارے مخالف چل رہا ہے۔“ شہد کڑوا ہو گیا تھا..... گل آسن توڑتی پاس

”جوڑ، جوڑے کی طرف آ نکلتے ہیں..... وہ بھی

”کب آئے گا زور گل؟“

انتظار زندہ رکھ لیا تھا اور میں انتظار پلو سے ہاندھے

پانچھولوں کے پار سے آتا نظر آ گیا تھا۔

”غلام معذرت چاہتا ہے.....“ شہری لباس

”کہاؤ، بیٹے، تمہاری بہن کی کیا بات تھی؟“

”میں نے تمہارا انتظار زندہ رہنے دیا.....“ وہ

”جاء..... مجھ پر۔ نہیں کہ نہ تھی“

”مرجائے گا شاہ زین.....“ میرے دل کی میر

2019-2020

”اسے چھوڑ آئی ہوں۔ گوشت کی مہک اس پتھر کے گھر میں پھیل رہی تھی۔“
 ”کیا بیکواس کر رہی ہے لالے؟“ ان کا لہجہ لرز رہا تھا۔ جوان بیٹی کی ماں تھیں وہ، آئے روز دھڑکے لگے رہتے۔

”بے بے..... ابھی اس کا کام باقی تھا۔“

”قبوے والے برتن کہاں ہیں؟“

”اس نے ابھی قبوہ نہیں پیا تھا۔“

”ہونے والا شوہر ہے وہ تمہارا، اس کی ہر خواہش اور رضا کا احترام کیا کرو یوں منہا کھاندا آجایا کرو۔“ جب میں بچی بیٹا رہی تھی تبھی وہ اندر آیا اور سیدھا بے کے پاس موڑھے پر آکر بیٹھ گیا۔

”خالہ..... مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”خالہ صدقہ، کہو..... کہو.....“ بے اس کی بلائیں لیتی قربان ہونے لگی تھیں۔ ٹھکروڑو حوٹ کر ہر بار میری تعظیم پر رکھ دینے والے اس مرد نے کریناک نظروں سے مجھے دیکھا اور کہہ دیا۔

”میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆

محبت کی کہانی میں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کوئی کردار قصے کو اچانک درمیاں سے چھوڑ کر

رستہ بدل کر

ممکنہ انجام سے پہلے کہانی کا سراپی موڑ دیتا ہے

تو پھر امید کے موسم میں ناامید ہونے کی صلیبوں

پر ٹکلتا دوسرا کردار

قصے میں کئی صفحات خالی چھوڑ دیتا ہے

اگرچہ بعد اس کے بھی کہانی چلتی رہتی ہے

مگر اس کی عبارت سننے والوں کو بیدار نہیں کرتی ہے

سمجھ میں آئے بھی کیسے

شاید

وہاں وصل کا ایک باب آتا تھا

”محبت کرنی ہو سکی اور؟“ وادی کے سارے پہاڑ میرے اوپر آن گرے تھے۔ میں کسی بھی طور پر نہ سکی تھی۔
 ”نہیں..... میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔“
 ”تم نہیں کر سکتیں لالے..... مگر تمہارا دل تو کر سکتا ہے ناں۔“

”تم غلط سوچ رہے ہو سالار.....“ چینی کی پیالی میں رکھے قبوے سے بھاپ اٹھ رہی تھی، ابھی تک اس نے پیالی سے ایک گھونٹ تک نہ بھرا تھا۔ ہواؤں کا راز دار مات کھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”لالہ، تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں..... کسی اور سے محبت نہیں کرتیں۔ اس کا تو مجھے بھی مطلب نظر آتا ہے کہ تم یہ دونوں کام کرتی ہو..... بچپن سے اپنا اور تمہارا نام ایک ساتھ سنتا ہوا آ رہا ہوں، کیا تمہیں مجھ پر زس بھی نہیں آتا۔ تمہیں یاد ہے کبھی ہم اچھے دوست بھی ہوا کرتے تھے..... گھبریلوں کو اخروٹ چھپاتے رکھا کرتے تھے، چیری کھاتے تھے..... دھوکیں سلگا کر شہد کے چھتے اتارتے تھے..... صنوبر کے جنگل میں خشک پتوں پر چلتے تھے۔ جیسے، جیسے ہم بڑے ہوتے گئے تم بدلتی گئیں یا پھر تمہارا دل..... میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا، ہم چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔ ایسے بغیر کسی چھوٹی یا پھر بڑی وجہ کے محبت کیسے چھوڑی جاسکتی ہے لالہ..... کیسے؟“ مطلع ابر آلود تھا..... پہاڑ ہر روز بادل سر پر تاج کی طرح پہنے رکھتے تھے۔ ہر لحظہ برسنے کو تیار..... میٹروں کے نو لے میڑھی میڑھی پگڑیوں پر چلے جا رہے تھے اور ان کے گلوں میں ہندو گھنٹیوں کے مدھر سے شور کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے اٹنے پاؤں واپس پلٹ آئی تھی وہ اونچائی پر ٹھنڈے قبوے کی پیالی پکڑے مجھے دیکھتا رہا اور میں جانتی تھی کہ وہ تب تک مجھے دیکھتا رہے گا جب تک میں اسے نظر آنا بند نہیں ہو جاتی۔
 ”سالار کہاں ہے؟“ گوشت اباتی بے بے نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

بیٹے کے لیے میرا چہرہ بھرا گیا تھا۔

”لالے..... شہر سے آئے ہوئے مسافر اکٹرو باز ہوتے ہیں، وعدے پلو سے باندھ کر جاتے ہیں پھر واپس کا رستہ بھول جاتے ہیں۔ تم میرا گھوڑا ہو.....“ دیوتاؤں کی سی آن بان والا وہ شخص میرے سامنے آ گیا تھا۔ پھر وہی صنوبر کا گھٹا اور خوشبودار جگر تھا اور ہم دونوں تھے۔

”میرا کام بس تھوڑا سا رہ گیا ہے..... یہ مکمل کر کے میں چیتوں کو جمع کر کر واپس لوٹ آؤں گا..... جنگل ستاروں سے روشن ہو گیا تھا۔

”کب تک آؤ گے شاہ.....؟“ میرے لیے کی بے قراری اور بے تابانی پر وہ دھیسے سروں میں ہنسا تھا۔

”بہت جلد..... اتنا جلد کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں.....“

”میں کتنا انتظار کروں؟“ میں اپنی لالہ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا..... یقین ہے ناں مجھ پر؟“ اس نے اپنے بازو میرے گرد باندھ لیے تھے۔

”خود سے بھی زیادہ یقین ہے۔“ خشک پتے چرچراتے رہے اور ہم چلتے رہے تھے۔

”ای، ابو جان مان تو جائیں گے ناں؟“ میرے دل کا خوف صنوبر کی چوٹیوں سے بھی اوپر اٹھنے لگا تھا۔

”ضرور مانیں گے اور انہیں ماننا ہی ہوگا..... اور تم ہو ہی اتنی پیاری کہ انہیں مانتے ہی بنے گی.....“

سوکھے درخت کے تنے پر ہم بیٹھ گئے تھے۔

”اب اتنی بھی پیاری نہیں ہوں میں.....“

”خود کو میری نظر سے دیکھو تو تمہیں خبر ہو.....“

”شاہ زین، جلد آنا..... جتنی جلد ہی ہو سکے، پہاڑ والے طویل انتظار نہیں کر سکتے.....“ میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں اور وہ آنسو پونچھنے پر کمر بستہ نظر آنے لگا تھا۔

”دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے..... آنکھوں کا کا جل تم خشک ہی رکھا کرو.....“ جانے وہ کیسا جادوگر تھا جو مجھ پر حادی ہو گیا تھا۔ مجھے سب بھول گیا تھا..... ہر لمحہ، ہر پل اس کا خیال میرے ساتھ، ساتھ رہنے لگا تھا..... بے بے نے

”تم نے وادی کے سب سے شریف اور سادہ

مرد کے لیے انکار کر دیا لالے..... مگر کیوں؟“ رہا ب پھٹ پڑی تھی۔ وہ کبھی ایسا نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں بھی بیوقوف ہو سکتی تھی..... میں نے گھائروں، رائے پیروں کے گرد پھیلا لیا تھا اور ڈھلتے سورج کے رنگ کو دیکھنے لگی تھی..... زرگل کی نظریں مجھ پر تھیں اور ان نظروں کا ارتکا ز میرے ارادے متزلزل کر رہا تھا۔

”وہ دوسرا مرد کون ہے لالہ.....؟“ اس سے پہاڑوں کی ساری برف گل کے لہجے میں درآئی تھی.....

جس نے میرا سرا وجود ٹھنڈا کر کے رکھ دیا تھا۔

”گل..... وہ.....“

”بات کو نا موت.....“

”میں تمہیں کیسے بتاؤں؟“

”راز رکھنا چاہتی ہو؟“ میں چپ رہی تھی..... وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھا سے نیچے وادی کی طرف جانے لگی تھیں۔ میں نے بھاگ کر انہیں روکا تھا۔

”شاہ زین نام ہے اس کا.....“ وہ دونوں وہیں سرخ زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔ وادی کے گھروں سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ غبار سا پھیننے لگا۔

”کہاں کا رہنے والا ہے؟“

”شہر سے آیا ہے.....“

”ملازمت کرتا ہے؟“

”ہاں، کسی ٹی وی چینل کے لیے کام کرتا ہے۔“

”کہاں ملا تھا؟“

”جھیل پر.....“

”خوب صورت ہے؟“

”بہت زیادہ، دیوتاؤں کا حسین ہے۔“

”بیادہ کرے گا تم سے؟“ یہ حسرت سے لبریز سوال رہا ب کی طرف سے آیا تھا۔

”ہاں، کرے گا.....“

”کب تک یہاں ہے وہ.....؟“

”دو ہفتوں تک.....“ زرگل نے ہاتھوں کے

جان تمنا

تجھ سے چمکز کر جان تمنا ہم بھی چین نہ پائیں گے
روگ لگا کر دل کو اپنے ہم جوگی بن جائیں گے

یاد آئیں گے تیرے وعدے یاد آئیں گی تیری قسمیں
بھولنے کی کوشش میں بھی ہم تجھ کو بھول نہ پائیں گے

چاہت کا اظہار تمہارا اور وہ اپنا شرمنا
رہ، رہ کر وہ مضر سارے تیری یاد دلائیں گے

چہرہ مکنا، ہاتھ پکڑنا، ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنا
رات کی تنہائیوں میں ہم کو بہت ترپائیں گے

ہم کو کیا پاس ہے ورنہ آجائیں ہم تیرے پاس
جج تو یہ ہے تجھ سے چمکز کر ہم تو جی نہ پائیں گے

گروش حالات نے فرحت ہم کو کر دیا ہے جدا
اپنے خیالوں کی دنیا میں تیرا ساتھ نبھائیں گے

کاوش: فرحت احمد، گلشن حدید

غزل

ہر طرف ہے حبس پھیلا اور ہوا خاموش ہے
حالتِ انسان پہ سوچو کیوں خدا خاموش ہے

امت پرور آدمی نے ظلم کیسا کر دیا
فاختہ کی آہ سن کر بھی فضا خاموش ہے

کیا ہوا ہے ماجرا اور کیا سبب اس کا بنا
ایسی الجھن دیکھ کر اب قافلہ خاموش ہے

چھاری ہے ہر طرف اک رُت گریباں چاک کی
پھر بھی اک دیوانہ پاگل آشنا خاموش ہے

اہل دنیا کی یہ کیسی رسم ہے خاتمِ بنا
بے خطا سولی چڑھا اور پُر خطا خاموش ہے

کلام: فریدہ خاتم، لاہور

زور سے چٹائیں پر ہاتھوں پر مارا تھا۔

”لالہ..... شور باز زیادہ گاڑھا ہو گیا ہے، یہ آج
کل تیرا دھیان کدھر ہوتا ہے۔“ اگر جو کبھی بے بے کو
میرے دھیان کی خبر ہو جاتی تو.....؟

”جانے کس پہاڑی چنڈال نے سالار کا دل
اپنی طرف پھیر لیا ہے۔“ وہ اب اٹھتے بیٹھتے آنسو

پونچھتی کہتیں..... یہ عیب اور راز پردوں میں ہی رہے تو
بہتر ورنہ تو سچ چوراہے ذلیل کر دیتے ہیں..... اب

اس نے میرے راستے میں آنا چھوڑ دیا تھا کوئی ایک
آدھ بار اتفاق سے سامنے آجھی گیا تو منہ پھیر کر اپنی

راہ بولیا تھا اور جانے کیوں میرے دل کو اک دھکا سا
لگا تھا..... چاہے جو کبھی تھا ہمارا بچپن ساتھ، ساتھ گزرا

تھا..... ایک بار پھر میں قبوہ لے کر گئی تو غصے ہوئے لگا۔
”آئندہ آپ قبوہ لے کر نہ آیا کریں۔“ جانے

یہ زندگی کے کس مقام پر میں تم سے آپ ہو گئی تھی۔
”کیوں نہ لے کر آیا کروں.....؟“ وہ سرخ

چھوٹے پتھر اٹھا، اٹھا کر وادی کی طرف پھینکنے لگا۔
”قبوہ زہر ہو جاتا ہے۔“ اس نے نہایت

الٹینان سے میرے قدموں تلے سے زمین نکالی تھی
میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی مجھ سے اس

لجھ میں بھی بات کرے گا..... میں پلٹنے لگی تھی جب
پیچھے سے سالار کی آواز آئی تھی۔

”لالے..... وہ بہت محبت کرتا ہے تم سے؟“
میں تڑپ کر مڑی تھی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔

”کون..... کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ بغور
مجھے دیکھنے کے بعد بس معمولی سا ہنس دیا تھا۔

”نام بھول گئی ہو کیا اس کا..... شاہ زین.....“
”تم کیسے جانتے ہو اسے؟“ سرخ منی کے بادل

اڑے تھے۔ ذرا دیر کو تو نظر آنا بھی جیسے بند ہو گیا تھا۔
”سارے پہاڑ جانتے ہیں.....“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو.....؟“
”کبھی اس کی آنکھیں غور سے دیکھنا لالہ.....
وہاں جہیں مجھ سے زیادہ محبت نظر نہیں آئے گی.....“

بھئی ہم دونوں چلا کرتے تھے۔ صنوبر کا وہ جنگل صرف ہمارا تھا..... صرف ہمارا.....“

”مگر میں تمہاری نہیں ہوں سالار.....“ وہ پہاڑی مرد سرخ آنکھوں سے مجھے تاک رہا تھا۔

”پوری پائل بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اچھا لوگی ناں وہ بھی ڈھونڈ کر نہیں لاپائے گا۔“

”نفرت کرتی ہوں میں تم سے..... اور سالار سے محبت ہو ہی نہیں سکتی..... شاہ زین سے محبت ہے مجھے۔“ اس کا قبوہ زہر، زہر کر کے میں پلٹ آئی تھی۔

م چاروں نے پھر محفل لگائی تھی زری شوہر کی چوکھٹ سے باہر آئی تھی، بار، بار وقت کی قلت کا رونا روتی تھی۔ رباب کو غصہ آیا۔

”زرمینہ..... آج کیوں پرانی ہو کر آئی ہو؟“ زری دیر سے سے ہنسی تھی اور اس پل وہ ہمیں ہماری زری نہیں لگتی تھی..... مجھے لڑ لگا تھا جیسے وہ کافی عرصے بعد ہنسی تھی..... اس کی پلکیں بوجھل ہوئی تھیں۔

”کچھ ہوا ہے کیا؟“ گل کے آسن ختم ہو گئے تھے۔ رباب کی بانسری کے سازبک کے مر گئے تھے۔

”باپ کے گھر تھی تو مجھے راضی رکھا جاتا تھا، گلے گھر مجھے ہر کسی کو راضی کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ وقت نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ زندگی ویسی جانے کیوں نہیں رہی پہلے جیسی۔۔۔۔۔ وہ شائیں کیوں نہیں ہیں۔۔۔۔۔ زر گل کے آسن، میری اور تمہاری اکٹھی کی ویسی کسمبیلوں کا شور با اور رباب کی بانسری کی بے سُر کی نہیں۔۔۔۔۔ آ نکلیں چھٹک نکلیں۔

”پہاڑوں نے اب چپ اوڑھ لی ہے۔ غضب ناک رہتے ہیں لاوے اگلنے میں..... دیودار کی چوٹیوں پر بیٹھی چڑیاں بھی جھرت کر گئی ہیں۔“ گل بھائی کے ساتھ جھڑپ کے بعد بازو جھلا بیٹھی تھی..... رو، رو کر آنکھیں سوچ چکی تھیں..... وہ غم خوردہ سے لہجہ میں نہی تھی۔

ماہنامہ پاکیزہ — مارچ 2019ء

”لالہ..... رشتوں سے، چیزوں سے، سب سے برکت اٹھ گئی ہے، برکت اٹھ جائے تو لوگ پاگل اور دیوانے ہو جاتے ہیں۔“ اس کی ظالم بھائی بیٹے کو جہنم دے کر مر گئی تھی..... چھوٹے سے ننھے بچے کو گل اپنے ساتھ لٹکائے رکھتی تھی۔

”مجھے وہ چڑیل ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی مگر دیکھو اس کی اولاد میرے دل میں گھر کر گئی ہے۔“

”جب پہاڑی ماؤں کی بیٹیاں چوٹھ پر بیٹھی ہوں تو ان کے شور بے گاڑھے ہو رہی جاتے ہیں۔“

بے بے راکھ کریدنے لگی تھیں۔

دبے کا سالن مجھ سے ہر بار خراب ہو جاتا تھا۔

بے بے سارا سارا دن لرزتی رہتی تھیں۔

”ہائے نی لالہ..... اپنے سواد کسے دے آئی ہے..... کس کا انتظار کرتی ہے؟“

”نہ، بے بے نہ.....“ دل میں چور ہو تو ذائقے باقی ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

سرخ پہاڑی گھاگرے میں بیسوں رہا بنے ہماری طرف دیکھا تھا اور مسکراتی تھی..... جانے زندگی ہم چاروں کو سولی چڑے قیدیوں کی طرح کیوں مسکراتا دیکھ رہی تھی..... رہا بنے زریضہ کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”ذرا میرا جھومر دیکھو..... اور میری تیاری.....

میں تم سے بھی زیادہ اچھی دلہن بنی ہوں ناں.....؟“

ہم تینوں نے اکٹھے سر ہلایا تھا۔

زیتون کے تیل میں پکا شور بہہ پتی ہم تینوں اس کے چہرے پر اصل خوشی تلاش کرنے کی کوششوں میں تھیں۔ شاید زرگل سچ ہی تو کہا کرتی تھی۔ ”ہماری خوشیاں ہجرت کر گئی ہیں۔“

”رہا بے وہ تیرے باپ کی عمر کا ہے۔“

بوڑھیوں نے رہا بے کے سامنے کہنا شروع کیا تھا۔

”مگر میرا باپ نہیں ہے وہ..... سمجھے آپ لوگ.....“

وہ روتی ہوئی لرزتی رہی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”انگریزی شہزادے نہیں آئے تو میرا کیا تصور.....

”میں جلد امی، ابو کو لے کر آؤں گا لالے..... تم راستوں پر نظر رکھنا.....“ اور میں راستوں پر نظر رکھنے والی تھی۔

سفری بیک اس کے کندھے پر تھا..... شاہ زین نے میری پیشانی پر دھیرے سے بوسہ دیا تھا..... میں نے اس کی آنکھوں میں دور، دور تک دیکھا۔ وہاں میں ہی میں تھی..... دل فخر سے دھڑک اٹھا تھا..... وہ مجھے اپنے ساتھ لگائے گئے جنگل سے راستہ بناتے ہوئے گزر رہا تھا۔

”ہمارا اپنا ایک گھر ہوگا..... اپنی گاڑی ہوگی، ہر شام ہم باہر سیر کو جایا کریں گے..... اُس کریم کھائیں گے..... ہر دن ایک یادگار دن ہوگا۔“ راستے گلزار ہو گئے تھے، انتظار ابھی سے شروع..... اور پھر وہ آگے چل دیا..... میں ٹھٹکی باندھے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔

وہ بار بار پلٹ کر دیکھتا اور مسکراتا بھی تھا..... میں آنسو پونچھتی پٹی تھی اور وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہاں سالار.....

”اپنی آنکھیں صاف کر لو لالہ.....“ میں آگے کو مڑی تھی۔

”کیوں؟“

”مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ میں نے آنسوؤں کو بہنے دیا تھا..... وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ وقت رک سا گیا تھا اور میں کھوسی گئی تھی..... ہر دستک وہ تھا..... ہر بارش اس کا گمان، میری آنکھیں راستوں پر تھیں..... مسافر..... جانے والا نہ جانے کب آئے گا.....؟ دن، ہفتے، مہینے اور سال..... سوا لاکھ نشان.....

میں اکیلی خود کو تسلیاں دلا سے دیتی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتی ہاتھوں کا چھبنا بنا کر دیکھتی..... پہاڑ ہتھتے تھے اور صنوبر پر بیٹھی چڑیاں روتی تھیں..... میں اپنی تھیلی گل کے سامنے پھیلا دیتی۔

”زرگل..... دیکھو..... وہ آئے گا ناں؟“ وہ خالی، خالی آنکھوں سے بس مجھے دیکھ جاتی تھی۔

”لالے..... اب مجھے لکھروں نے اشارے دیئے بند کر دیے ہیں.....“ میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی گل کو دیکھ گئی..... وہ کیسی باتیں کرنے لگی تھی..... ہم میں سے کوئی بھی پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ گل ایسے کب بہتی تھی؟

اور اس جہل میں کیے گئے سارے وعدے اور قسمیں آگ کے شعلوں کا رزق بن گئے ہیں۔“

☆☆☆

اور آج وہ چار سال بعد میری چوکھٹ پر آکھڑا ہوا..... جب صنوبر کا جنگل جل چکا..... انتظار مر چکا۔
 ”کیسی ہولال.....؟“ اس کی آواز تو آج بھی ویسی کی ویسی ہی ہے..... دلکش اور سحر انگیز، پہاڑی لڑکیوں کو راستوں سے بھٹکا کر رکھ دینے والی..... مگر میں تو ویسی نہیں رہی ہوں، چار سال پہلے جیسی..... زندگی میں اگر تغیر نہ ہو تو زندگی عذاب ہوتی جاتی ہے۔ شکر کہ تغیر زندگی کا حصہ تھا..... میں نے شاہ زمین کو اسی وقت نوک دیا تھا۔

”صرف لال نہیں..... پورا نام لو..... لالہ سالار.....“ حیرت اس کے چہرے پر چند ثانیے کھلتی رہی تھی پھر وہ گویا ہوا۔

”تو تم آگے موو آن کر چکی ہو..... خوب، بہت اچھا کیا..... میں بھی تمہیں یہی کہنے آیا تھا کہ تم میرا انتظار ختم کر کے اب اپنی زندگی میں آگے بڑھ جاؤ..... میں بھی آگے بڑھ چکا ہوں..... میں نے اپنے جیہٹل کے اوزن کی بیٹی سے شادی کر لی ہے مگر یقین رکھو تمہاری محبت کا حق میں نے اسے نہیں دیا۔“

وہ پہاڑوں کو ”گواہ“ کر کے گیا تھا..... پہاڑ جھوٹے نہیں ہوتے..... مسافر جھوٹے ہوتے ہیں..... مرد ہر بار عورت کو محبت کا یقین دے کر پیچھے کیوں ہو جاتا ہے..... اور عورت جو گمنام اپنی زندگی عذاب کیے رکھتی ہے..... دل چاہا اسے ایک پھڑوے ماروں جو کہہ رہا تھا کہ اس نے میری محبت کا حق اپنی بیوی کو نہیں دیا..... کیا لطیفہ ہے ناں یہ..... جس پر ہنسی اور رونا سا تھا، ساتھ ساتھ آتا ہے۔

”میں جھیل پر تمہارا انتظار کروں گا..... آؤ گی ناں؟“ اب کیا پانی رہ گیا تھا..... میں کس نا تے اس سے ملنے جھیل پر جاتی..... آخر کیوں.....؟ بہت جتن کر کے تو میرے دہنے کے سالن میں ذائقہ آیا تھا..... بے بے

”رہ باب تمہارا کوئی قصور نہیں..... سارے قصور شہزادوں کے ہوتے ہیں۔“

دل چاہتا ہوں، چاروں پہاڑوں کی چوٹیاں گھیر لیں، تالیاں پیئیں اور بازگشت سے مدحال ہو کر گر پڑیں..... میں نے زیتون کے تیل سے دیے روشن کرنے لگی..... وہ راستوں میں آنے والا مہینوں بعد سامنے تھا..... ہم دونوں نظریں نہیں جھکا سکے تھے۔
 ”کیسی ہولالے.....؟“

”انتظار میں ہوں سالار.....“ دیوں کی لو پھڑکنے لگی تھی..... شعلے رنگ بدلنے لگے، سے صنوبر کے جنگل میں ٹھہر سا گیا..... کیا اب بھی اس کا قبوہ زہر ہوتا تھا.....؟
 ”میں بھی انتظار میں ہوں.....“ میری آنکھوں پر پچکوں کا زور بڑھنے لگا تھا۔
 ”کیسا انتظار.....؟“

”تمہاری واپسی کا..... مجھے یقین ہے تم واپس آؤ گی.....“ اتنے دنوں، مہنتوں، مہینوں، سالوں کا ضبط میرے سامنے کھڑے شخص نے ریت کا ڈھیر کر دیا تھا۔
 جبر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہو نے خواب پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے ہیں پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے ہیر پاقل دے ہوؤں جیسی باتیں کرتے ہیں رنگ سے خوشبوؤں کا نانا ٹوٹا جاتا ہے پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں میں نے زرگل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

”گل، خدا کے واسطے..... چند لمحے کو مجھے سنو..... تم تو وادی کی سب سے ذہین لڑکی ہو ناں..... بتاؤ میں کیا کروں؟“ گل نے میرے ہاتھ جھٹک کر رکھ دیے تھے۔
 ”صنوبر کے خوشبودار جنگل میں آگ بھڑک اٹھی

طرح کے شور بے پناہوں نے پھر سے ہمیں بلاوے بھیجے تھے اور ہم دوڑے چلے آئے۔
پہاڑ ہمارے دوست ہیں۔ رباب نے شور بے کا پیلا کوئی تین مرتبہ پیا تھا۔

”زندگی اتنی بری شے بھی نہیں اگر شور بہ پینے کو مل رہا ہو تو۔۔۔“

”شور کا گھر مضبوط ہوتا ہے اگر بنیاد اولاد رکھے تو۔۔۔“ زری کھمبیاں تل رہی تھی۔ اس کا بیٹا ذرافا صلے پر بیٹھا کنکر وادی میں پھینک رہا تھا۔

”ہمارے غم ہجرت کر گئے ہیں۔“ گل نے قہوہ سڑک، سڑک پیتے ہوئے ایک لمبا قہقہہ لگایا۔

رباب نے دف اٹھا کر بجانا شروع کر دی۔ پہاڑ باز گشت ہو گئے۔ ہم نے قہتہوں کو دیودار کی چوٹیوں سے بھی اوپر اور اوپر جانے دیا۔

میں نے شمال کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سالار تھا جو ادھر ہی آ رہا تھا اور اس کا رنگ بہار کی طرح کھلا ہوا تھا۔

”لالے۔۔۔ لالے۔۔۔ صنوبر کا جنگل پھر سے اگنا شروع ہو گیا ہے۔“

اور ہم دو تھے۔ سالار اور میں۔ تیسرا صنوبر کا خوشبودار جنگل تھا۔

خنگ پتوں کا چٹکتا۔ منکتا ہوا شور اور ہم۔ شریہ بندر شاخوں سے ادھر، ادھر لٹک رہے تھے۔

”مجھے وہ ملا تھا۔“ سالار نے مجھے بتایا تھا۔

”کون۔۔۔؟“

”شاہ زین۔“

”میں کسی شاہ زین کو نہیں جانتی۔“ پہاڑ مسکرائے اور جنگل کھل اٹھا تھا۔

”میں بھی نہیں جانتا۔“

ہم دونوں بس صرف اور صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

کیسے خوشی سے روتی ہیں۔۔۔ لالے۔۔۔ تیرا شوہر تجھ سے راضی ہے اسی واسطے تیرا سالن ڈاکتہ دیتا ہے اور کھانے والا سیر ہو کر کھاتا ہے۔“

☆☆☆

اس شام زرگل کے کہنے پر مدت بعد میں نے اپنی پائل کا ٹھکر و پہاڑ کی چوٹی سے نیچے وادی میں گم کیا تھا۔
”جاؤ سالار۔۔۔ اگر آج ٹھکر و ڈھونڈ کر لائے تو میں اپنی محبت گم کر دوں گی۔“

وہ شام سب نارنجی شاموں پر بار تھی۔ دیودار اور صنوبر کی چوٹیاں ڈھکے گئیں۔ اندھیرا روشنی ننگے کوآن کھڑا ہوا اور بھی وہ آگیا۔ وادی کا سب سے شریف اور آنکھوں

میں حیار رکھنے والا مرد۔ اس نے لائین ہم دونوں کے درمیان کھڑی کی تھی۔ آنکھیں پھیل کر چار ہو گئیں۔

میں نے ہتھیلی سامنے پھیلا دی۔ وہ ہنسا اور ہتھیلی پر احتیاط سے ننھا چاندی کا ٹھکر و رکھ دیا۔ اور۔۔۔ ہمیں شاہ زین کو مات ہو گئی۔

میں نے آنکھوں کو بہہ جانے دیا۔

”جاؤ، خال کو بھیج دینا۔ اس بار انکار نہیں ہوگا۔“ میں نے آخری بار اپنے سامنے کھڑے شخص کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔

”چلے جاؤ شاہ زین۔۔۔ ہمارے پہاڑ فریب اور دھوکے کی محبت پر پھٹ پڑتے ہیں لاوے اگلنے

ہیں۔“ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ بت اور بتوں میں جان نہیں ہوتی۔ میں اپنے دل اور گھر کے دروازے

بمیشہ، ہمیشہ کے لیے اس پر بند کر چکی تھی۔ وہ اپالو دیوتا اسی لائق تھا۔۔۔ اب کہیں بھی ”محبت“ نہیں تھی۔

☆☆☆

”میں نے سالار کے لیے شاہ زین کو چھوڑ دیا۔“ گل نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔

”وادی کے سارے پھول تم پر قربان ہوں۔“ رباب بکری کے گوشت کا شور بہ بنا کر لائی تھی۔

”میں شور بہ بہت اچھا بنانے لگ گئی ہوں کیونکہ انہیں بہت پسند ہے۔“ زری نے سالوں بعد ہماری پھر سے پہاڑوں پر دعوت کی تھی۔ کھمبیاں، بیٹھا قہوہ اور



محراب

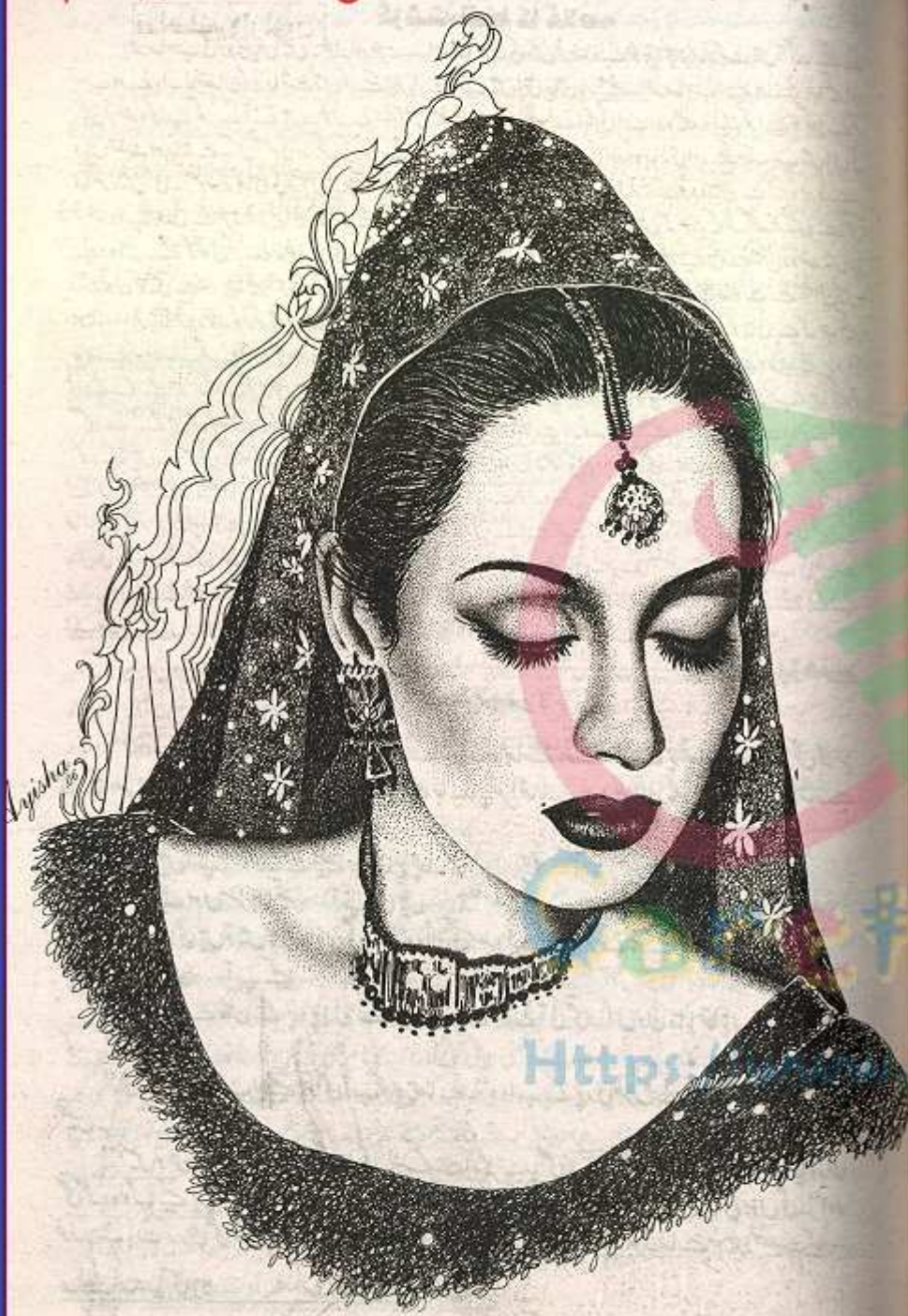
نار کہانی ہے محبت کی مگر اس میں آپ کو محبت ہوتی نظر نہ آئے گی... سمجھ نہ آئے گی گر سمجھ آگئی تو سلجھ نہ پائے گی...
نار کہانی ہے اک راز کی... اور راز اک چنگاری سے کم نہیں ایسی چنگاری جو سلگی تو بھڑکے گی گر بھڑکی تو... شاید دل بچیں گے نہ وجود...

نار کہانی ہے دو ناآسودہ لوگوں کی جو مردہ دلوں کو زندگی کی زور سے باندھے گھسیٹتے ہیں اور پھر خود ہی گھسیٹتے چلے جاتے ہیں... زندگی کا تنفس برقرار رکھنے کی بدترین کوشش میں...
نار اک پہیلی ہے یا کسی کی سہیلی ہے مگر نار تو نار ہے... سہیلی کیسی؟

ایک چپ رہنے کے سب الزام مجھ پر ہی نہ تھے
خاموشی پر بھی تو تہمت لب کشا ہونے کی تھی
میں خود اپنی آگ ہی میں جل بھا تو یہ کھلا
شرط جلنے کی نہیں تھی کیا ہونے کی تھی

نار پڑھیے، لکھیے اور پھر سلجھائیے.....





احمد صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ خولہ اور مزنہ۔ احمد صاحب کی بہن فرخندہ کے شوہر اجمانہ، مارکیٹ میں آگ لگنے کے سبب ہونے والے نقصان کو برداشت نہیں کر سکے اور ہارٹ ایک میں اپنی جان ہار بیٹھے۔ احمد صاحب اپنے بھانجے جہانگیر اور بہن فرخندہ کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔ خولہ نے ایم ایس مکمل کیا اور جہانگیر نے ایم ای، وہ علیحدہ ایک گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ مس تبسم کی سالگرہ کی تقریب ان کے بھائی نے بعد اصرار کی اور وہ ساڑی اور ہینکے میک اپ میں اس کی سالگرہ میں آئی۔ تبسم کے بھائی کی یہ اس سے تیسری ملاقات تھی جس میں وہ اسے پروپوز کرتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ میرٹھ ہے۔ فرخندہ اپنے بھائی سے مزنہ اور جہانگیر کے رشتے کی بات کرتی ہیں تو وہ خولہ کو بھجور کرتے ہیں کہ مزنہ کیونکہ بھعدا نہیں ہے اس لیے وہ اس رشتے کو قبول کر لے۔ خولہ سوچتی ہے کہ جو رشتہ مزنہ کے لیے صحیح نہیں وہ اس کے لیے کیسے صحیح ہے لیکن وہ ضد میں یہ رشتہ قبول کر لیتی ہے اور جہانگیر جس کا خواب جرمی جاکر آگے پڑھنا تھا وہ شادی کر تو لیتا ہے لیکن اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اور بالآخر وہ خولہ کو نوکری کرنے کا کہتا ہے۔ جس پر وہ حیران اور پریشان رہ جاتی ہے۔ خولہ، مزنہ کو بتاتی ہے کہ جہانگیر چاہتا ہے کہ وہ جاب کرے تو وہ بھی بہت حیران ہوتی ہے، فرخندہ بھی نہیں چاہتیں کہ خولہ جاب کرے اس لیے وہ جہانگیر پر دباؤ ڈالنے کے لیے احمد صاحب کو بتاتی ہیں جس پر خولہ پریشان ہوتی ہے کہ انہیں انوکھوں کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ احمد صاحب، جہانگیر کو سمجھانے آتے ہیں تو وہ خولہ کو ان کے ساتھ ہی بھیج دیتا ہے، مزنہ کا رشتہ آتا ہے اور خولہ کے کیچے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ وہ ہوٹل کے ایک پڑھنے والے کمرے میں تھی، اس کا لباس سرخ نہ تھا لیکن وہ وہن تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس نے کیا کیا، کہ اتنے میں ماہیوں کمرے میں آ جاتا ہے۔ مزنہ کی وجہ سے خولہ واپس سرسرا چلی جاتی ہے۔ جہاں گھر اور چھپو کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ جہانگیر، خولہ سے کہتا ہے کہ اس نے اسے بہت مس کیا لیکن وہ جھکتا نہیں چاہتا، جہانگیر کے پاس کی وجہ سے خولہ کو اسکول میں جاب مل جاتی ہے لیکن خولہ ایٹجسٹ نہیں ہو پاتی۔ مزنہ کی ٹینشن میں احمد صاحب کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے خولہ بہت مشکل سے اسکول میں اپنی کارکردگی بہتر کرتی ہے۔ خولہ اور احمد صاحب، مزنہ کے رشتے کے لیے ایک جگہ جاتے ہیں تو وہ مزنہ کی کلاس فیلو نکلتی ہے وہیں باہر خولہ کی ملاقات اپنی پریسل مس مفتی سے ہوتی ہے۔

اب آگے بڑھیے

قسط نمبر 3

"may I come in?" دروازے میں سے جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ میڈم فوکل گلاسز لگائے، سر جھکائے کچھ لکھنے میں مشغول تھیں۔ پوچھے جانے پر سر اٹھایا۔ اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" خولہ نے پٹختے ہوئے پوچھا۔
 "میں ٹھیک ہوں سبز جہانگیر۔۔۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟" مصروف سے انداز میں جواب آیا تھا۔
 "آپ بڑی ہیں تو میں پھر آ جاؤں گی۔۔۔۔۔" وہ اُن کی مصروفیت محسوس کرتے ہوئے بولی۔
 "ارے نہیں۔۔۔۔۔ آپ کیسے۔۔۔۔۔"

"میں آپ سے بہن کے پروپوزل کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔ اس دن بتایا تھا ناں میں نے آپ کو۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔۔ بالکل آپ پوچھیے جو بھی آپ کو پوچھنا ہے۔" وہ اب کے پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"ہمیں تو ان کی فیملی پسند آئی ہے۔ ابو کی لڑکے سے اسکا بپ۔ یہ بھی بات ہو گئی ہے۔ میں بس تسلی کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ لوگ کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ خاندانی، اچھی شریف فیملی ہے؟ آپ تو زیادہ بہتر جانتی ہوں گی۔" اور خولہ جب بات کر رہی تھی تو اس کے لہجے میں اک انچکاہٹ تھی۔ یوں جیسے معلوم نہ ہو کہ سامنے موجود شخصیت کیا۔۔۔

مذہب ظاہر کرے گی۔ اس کی بات سن کر مس مفتی نے فوکل گلاسز اتار کر ٹیبل پر رکھے اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر کہنیاں بچہ پر رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مسز جہانگیر فیکل تو واقعی ہی میں اچھی ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے جہیں کے بھائی کی بابت استفسار کریں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ کافی سالوں سے جرمنی میں سیٹل ہے۔ اس لیے میں اس بات سے لاعلم ہوں کہ لڑکا کیسا ہے یا کیسا ثابت ہوگا۔ باقی فیکل بظاہر تو اچھی ہی ہے۔“ سنجیدہ سے انداز میں انہوں نے بات مکمل کی تھی۔ غولہ کے چہرے پر یک دم اطمینان سا پھیلا تھا۔

”بہت شکریہ..... مس مفتی.....“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”my pleasure!“ انہوں نے بھی مسکرا کر ہی جواب دیا تھا۔



چراغ دین کے لیے دین..... کسی کتاب، کسی سنت کا نام نہیں تھا۔ چراغ دین کے لیے دین، صرف اور صرف مولوی اللہ رکھے کا نام تھا۔ خود تو وہ فقط کلمہ پڑھنا جانتا تھا، وہ بھی غلط تلفظ کے ساتھ۔ قصور تو شاید چراغ دین کا بھی نہیں تھا کہ ساری بات شعور کی تھی اور مصیبت یہ کہ یہاں پھر ”شعور“ کا نام بھی مولوی اللہ رکھا ہی تھا۔ چراغ دین کے گھر میں کوئی چیز بعد میں آتی تھی مولوی اللہ رکھے کے ہاتھ کا لکھا تعویذ پہلے۔ بھینس مرگئی..... خشک ہوگئی، بنی بھینس لی۔ فصل کو کیڑا لگ گیا۔ یا پھر چراغ دین کو زکام..... ہر کام کا ایک ہی جادوئی حل تھا اور وہ تھا کیا..... جی ہاں..... مولوی اللہ رکھا۔ چراغ دین اپنی عقل تو نہ رکھتا تھا۔ وہ مولوی اللہ رکھے کی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اس کے کانوں سے سنتا تھا اور جوندہ میں گوشت کا ایک ٹکڑا تھا وہ بھی وہ ہی کہتا تھا جو مولوی اللہ رکھا چاہتا تھا۔ فصل کا ایک حصہ مولوی صاحب کو جاتا تھا۔ ہر جمعرات کا کھانا دلیسی مرغ، دلیسی گھی میں ہی بھنا ہوا۔ بشمول زردے کی پلیٹ کے مولوی صاحب کے گھر چراغ دین بہ نفس نفیس خود پہنچا کر آتا۔ مہینے میں ایک بار مولوی صاحب چراغ دین کے گھر پھیرنا ضرور لگاتے تھے..... بد اثرات دور کرنے کے لیے اور اپنے لعاب دہن والا پانی گھر کے کونوں میں چھڑکنے کے واسطے، یوں سمجھیے کہ چراغ دین کی آدمی کمائی اس کا گھرانا کھانا اور باقی آدمی مولوی صاحب اور ابھی ختم درود کی داستان تو میں نے کہی ہی نہیں..... چراغ دین کا بس چلتا تو وہ مولوی اللہ رکھے کو سر پر اٹھا کر پھرتا اور قدم اٹھانے سے پہلے پوچھتا.....

”اعلیٰ حضرت! میرا صاحب، میرے کنبے رکھنا ہے یا تجھے.....“ شعور چننا تاثر ہو چکا تھا اور عقل گروی رکھ چھوڑی تھی اس نے..... اس کے گھر کی برکتیں..... رونقیں سب (نعوذ باللہ) مولوی جی کے دم سے تھیں..... وہ نہ ہوتے تو چراغ کا بننا کیا..... ایک مولوی صاحب کی ذات تھی کہ جنہوں نے (نعوذ باللہ) اس کے گھر سے ہر قسم کی بلاؤں کو دور کر رکھا تھا۔ ابھی سال بھر پہلے کی تو بات تھی کہ اس کا بیہ ہوا تھا اور آج..... آج وہ صاحب اولاد ہو چکا تھا۔ جب کھیتوں پہ کام کرتے چراغ دین کو یہ خبر ملی تو وہ دوڑا، دوڑا بھاگا، بھاگا گیا تھا۔ بھلا کہاں؟ گھر؟ ارے نہیں..... مولوی اللہ رکھے کے پاس..... بچے کو کھٹی دینی تھی اور اس کا نام بھی تو جو بڑ کرنا تھا۔ مولوی صاحب نے قال نکال کر۔ اور مولوی صاحب ان کے لیے وہ دن بڑا بھاگوان ثابت ہوتا تھا کہ جب بھی گاؤں میں کسی بھی گھر میں ولادت ہوتی تھی۔ وارے نیارے ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے میں جب چراغ دین انہیں بلائے آیا تو وہ کچے دھاگے سے ہی تو بندھے..... پشیم پشیم چراغ دین کے ساتھ دوڑے آئے۔ گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے بچہ مولوی صاحب کی گود میں ڈالا گیا۔ مولوی صاحب نہ جانے کتنی دیر زیر لب ورد کرتے رہے اور پھر بچے کے چاروں جانب پھونکیں مارتے رہے۔ اتنی دیر میں بچہ بھوک سے بلکتا رہا مگر جب تک مولوی صاحب کا دم پورا نہیں

ہونا تھا۔ سو اس نے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بچے کو پھلایا جائے۔ مولوی صاحب نے ہندو پورا کیا۔ ایک آخری پھونک مار کر بچے کو آئندہ زندگی کی تمام تر بلاؤں سے محفوظ کیا اور پھر جلالی آواز میں کہا۔
 ”شہد لاؤ۔۔۔۔۔“ شہد لایا گیا۔ مولوی صاحب نے بچے کو شہد چٹایا۔ پھر کان میں اذان دی اور چراغ دین کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

”بہن مبارک ہو چراغ دین۔“ اور چراغ دین فرط مسرت اور فرط احترام سے جھک، جھک جاتا تھا۔
 ”پیر و مرشد۔۔۔۔۔ نام بھی بتا دیجیے کہ کون سا نام میری اولاد کے لیے ٹھیک رہے گا۔ بھاری نہیں پڑے گا۔“
 ”چراغ دین۔۔۔۔۔“ مولوی صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔
 ”مسجد آنا۔۔۔۔۔؟“ وہاں تمہیں بتائیں گے کہ کون سا نام صحیح رہے گا۔ حساب کتاب بھی تو لگانا ہے ناں ابھی۔۔۔۔۔“ وہ اب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے۔

”جی مولوی صاحب۔۔۔۔۔ جو عظم۔۔۔۔۔ جیسا آپ کہیں۔۔۔۔۔“ اور چراغ دین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وہاں اپنا جسم رکھے کہ جہاں مولوی صاحب اپنا پیر رکھتے تھے۔ وہ مسجد تک گیا تھا، مولوی صاحب کو چھوڑنے اور خالی ہاتھ کیے جاسکتا تھا۔ نذر و نیاز کا ایک ڈھیر تھا جو چراغ دین کے ساتھ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان کے حجرے کے اندر تک چھوڑ کر آیا تھا۔ مع اس ساز و سامان کے اور کل جب وہ نام کا پوچھتے آتا تو تب بھی کون سا خالی ہاتھ آتا تھا تو جب کل آئی اور چراغ دین چیزوں اور نیاز کے ایک اور ڈھیر کے ساتھ مولوی صاحب کے حجرے میں پہنچا تو۔۔۔۔۔ مولوی صاحب نے کہا تھا۔

”تمہارے بیٹے پہ ”اح“ سے شروع ہونے والا نام موزوں رہے گا۔ دوسرا کوئی نام رکھو گے تو بیٹا یا تو بیمار رہے گا یا پھر ساری عمر پریشانیوں میں گھرا رہے گا۔“ اور اب چراغ دین نے کیا مجال کہ وہ کوئی اور نام رکھتا۔۔۔۔۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام ”احمد نجفی“ رکھا تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد ابو کے چہرے پر اتنا سارا اطمینان دیکھا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے نظر آئے تھے اور بے فکری کا رنگ ہنسی پر غالب تھا۔۔۔۔۔ اور معلوم نہیں کیوں اس نے خود بھی خود کو اتنے عرصے بعد اتنا پرسکون محسوس کیا تھا۔ چند لمبے وہ ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھتی رہی اور خود کے لیے سکون کشید کرتی رہی۔

”ابو آج مجھے سمجھ آیا کہ محبت ہمیشہ بے توازن ہی ہوتی ہے۔ جیسے آپ کی مزہ کے لیے اور میری آپ کے لیے۔۔۔۔۔ توازن کا بھلا کیا کام محبت سے۔“ سر جھٹک کر اس نے سوچا اور مزگی۔ مزہ کی منگنی تھی جو ابویں اسنے پرسکون نظر آئے تھے۔ جہانگیر کے ساتھ بھی ان کے تعلقات میں بہتری آئی تھی۔ اور یہ تب سے ہوا تھا کہ جب وہ بیمار پڑے تھے۔ خولہ مصروف سے انداز میں بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بچن کی طرف گئی تھی کہ جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

اس نے کا مادر و پنا مزہ کے سر پر ٹھیک کیا اور پھر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مزہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، خولہ مسکرا دی۔ اس نے ابو کی طرح مزہ کو بھی اسنے ہی عرصے بعد یوں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ قریب تھا کہ وہ ڈیپ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی۔

”خوش ہو؟“ اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر خولہ نے پوچھا۔
 ”خوشی کا معلوم نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مطمئن ضرور ہوں۔“ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے مزہ نے جواب دیا تھا۔

خولہ ایک بار پھر سے مسکرا دی گئی۔
 ”مہ جیوں کے بھائی کا تو معلوم نہیں..... لیکن مہ جیوں ضرور تمہاری آنکھوں پر فدا ہے۔“ خولہ نے بیڑ کرادیا
 سے ٹپک لگاتے ہوئے اسے چھوڑا تھا۔

”لو بھلا..... اس کا کیا فائدہ ہوا؟“ مزمنہ نے منہ ہناتے ہوئے کہا۔ اور پھر ان دونوں کا قہقہہ گونجا تھا۔
 ”بندہ معقول لگتا ہے مزمنہ.....!“ خولہ نے اب کے بنجیدگی سے ہی کہا تھا۔
 ”مجھے کیا پتا؟ میں نے کون سا اس سے بات کی ہے؟“ مزمنہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔ خولہ نے اب
 کے ہنسی دبا لی۔

”آج بڑی ہری، ہری سو جھ رہی ہیں تمہیں؟“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے ایک دھب اس کے کندھے پر لگا لی۔
 ”اب بھی نہ سو مجھے آئی.....“ چند لمحوں بعد مزمنہ نے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ جس نے خولہ کے دل کو
 جکڑا تھا۔

”اللہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔“ خولہ نے بے ساختہ اس کا ہاتھ چوم کر دعا دی۔

☆☆☆☆

مستثنیٰ کا فریضہ انجام ہو جانے کے بعد گھر میں ایک بے ترتیبی سی پھیلی ہوئی تھی۔ جاہ جاہیروں کے نیچے آکر مسلی
 جانے والی پھولوں کی چٹان ڈرائنگ روم میں موجود صوفوں کے کشن اپنی جگہ سے ہلے ہوئے..... ہال کرسیوں سے
 اٹا پڑا تھا اور ان کرسیوں اور گول میزوں کی حالت صاف بتاتی تھی کہ وہاں کھانا، کھایا گیا تھا۔ فرش کی چمک کو
 جوتوں کی مٹی نے دھندلا رکھا تھا۔ کچن میں برتنوں کا ایک جم غفیر تھا اور کام والی صبح آکر دھوئے کا کہہ کر غائب ہو چکی
 تھی۔ ایسے میں..... اس لئے پڑے، بے ترتیب گھر میں..... ایک جانب سے پارہ، پارہ تہوں اور ہنسی کی آوازیں آتی
 تھیں۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا..... مزمنہ نے جیوری اتار دی تھی لیکن ابھی تک وہ اسی جوڑے میں تھی۔ خولہ نے بھی
 پہنچ نہیں کیا تھا۔ جہاں گیارہ کاوٹ صوفے پر اٹا پڑا تھا اور اس نے ڈریس شرٹ کے بازو فولڈ کر رکھے تھے۔ ٹائی ڈھیلی
 اور گریبان کا اوپر ہی بٹن بھی کھول رکھا تھا۔ احمد صاحب نے بھی شلوار سوٹ کے اوپر پہنی واسٹ اٹار کر کرسی کے
 بازو پر ڈال رکھی تھی۔ اور اب آرام وہ حالت میں بیٹھے تھے، فرخندہ بھی دونوں پاؤں اوپر کر کے صوفے پر براجمان
 تھیں۔ ان کے پہلو سے چھلی مزمنہ بیٹھی تھی اور خولہ..... وہ ابھی ابھی چائے کی ٹرے لے کر آئی تھی۔ سب کو باری،
 باری کب پکڑانے کے بعد وہ مزمنہ کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہنس رہے تھے، خوش گپوں میں مصروف تھے۔ آج کی
 تقریب کو ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ سبھی کی رائے مزمنہ کی سسرال والوں کے بارے میں اچھی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ یہ
 اطمینان ایک عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔

”احمد بھائی..... مزمنہ کی شادی کے بعد تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔“ فرخندہ نے اچانک پوچھا۔ اس سوال
 پر ایک محسوس کی جانے والی اداسی وہاں سرعت سے پھیلی تھی۔ ماحول پر یک دم خاموشی حاوی ہو گئی۔
 ”بہنوں کو تو بیاہنا ہی ہوتا ہے ناں فرخندہ.....“ چند لمحوں بعد وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولے تھے۔
 ”نہیں، احمد بھائی..... میں آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔“ فرخندہ جذباتی
 ہو رہی تھیں۔ احمد صاحب ہنس دیے۔

”اچھا جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ ابھی سے کیوں ہلکان ہو رہی ہو تم.....“ بہن کا سر شفقت سے تھپکتے
 ہوئے وہ بولے۔ مزمنہ کا دل بھر آیا تھا۔ اسے یوں رونے کے لیے آمادہ دیکھتے ہوئے خولہ نے اس کی پٹلی میں کہنی
 ماری۔ ”سی“ کر کے اس نے گھور کر بہن کو دیکھا۔ خولہ نے مسکرا کر اسے نہ رونے کا اشارہ کیا تھا۔

ہا معلوم سے احساس نے جکڑ لیا تھا۔ عجب طرح کے وہم تک کرتے تھے اور وہ ہم، ہم جانتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں یہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہتے، ہتے یک دم اس کے ہونٹوں کی ہنسی غائب ہو جاتی اور دل پر خوف اپنے پنجے پھیلا کر اسے جکڑ لیتا تھا۔ خوف.....؟ کیا خوف؟ یہ ہی تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا وہ مزہ کی شادی کے باعث پیشین میں تھی یا پھر اسے ابو کی پریشانی تھی۔ ان کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے ایسا تھا؟ لیکن یہ دونوں معاملات ایسے تو نہ تھے کہ جن کا حل نہیں نکالا جاسکتا، مزہ تو کبھی سب لڑکیوں کی طرح ایک نہ ایک دن اپنا ہنسی ہوتا تھا تو پھر خوف کیسا..... رہ گیا احمد صاحب کا معاملہ تو اس کا کوئی حل بھی نکالا جاسکتا تھا بعد کی بعد میں دیکھی جاتی تو پھر..... پھر ایسی حالت کیوں.....؟ اور یہ ”کیوں“ کا جو سوال تھا اس کا جواب کہیں پر بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہر وقت یہ ہی ”کیوں، کیوں“ ہوتی رہتی تھی اور وہ ہم، ہم جانتی، دل میں جو اک خوشی کا جذبہ تھا وہ جیسے اچانک مر گیا تھا۔ وہاں بس اب راک انجانا، ان دیکھا سمجھ میں نہ آنے والا خوف براجمان تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا اس کے سامنے سلوموشن میں چلنے والی پکچر تھی یا پھر وہ ہی کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ کیا یہ اسٹرپس تھا؟ اس تھا کہ دینے والی روٹین کی وجہ سے..... جسے وہ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اختیار کیے ہوئے تھی۔ اسٹرپس تھا..... یا پھر کوئی ذہنی حالت وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ خولہ یہ حالت کسی سے ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ خوشی کا موقع تھا اور وہ کسی کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، چاہے خود پریشانی اس کے وجود پر ضرر نہیں لگا، لگا کر اسے ادھ موا کرتی رہے، وہ کسی سے بھی یہ بات ڈسکس کرنے والی نہیں تھی۔ وہ مزہ سے ڈسکس کرنے لگتی تھی تو مزہ کا ہنستا چہرہ اس کے ہونٹوں کو ”ش، ش“ کرتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اور پھر..... پھر اس کا دل چاہتا کہ وہ دہائیں مار، مار کر روئے۔ اتار روئے، اتار روئے کہ دل پر چھایا یا غبار، آنسوؤں کے ساتھ دھل، دھل کر پھٹ جائے..... وہ بھی بے فکری سے اک، اک لہجہ انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اونچے، اونچے بے مقصد قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ خوش ہونا چاہتی تھی کہ خوشی کا ہی موقع تھا۔ لطف اٹھانا چاہتی تھی لیکن..... لیکن اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ اس کے قہقہے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ ہنسی پیٹھ پھیر کر کہیں بھاگ گئی تھی۔ خوشی اسے جیسے گڈ بائے فار ایور کہہ چکی تھی۔ تو کیا زندگی کبھی بھی..... اسے کبھی بے فکری کا معنی اوڑھ کر نہیں ملے گی؟ کیا ابھی بھی نہیں.....؟ اس کا دم اور گھٹنے لگتا..... اتنا کہ آنکھوں سے آنسو بھی خفا ہونے لگتے۔

”تو کیا وہ کسی قسم کے ذہنی مرض کا شکار ہو رہی تھی؟“ اور اگلی ذہنی روا سے نئے سرے سے خوف میں مبتلا کر کے رکھ دیتی تھی۔ یوں جیسے وہ دو نقطوں کے درمیان کھینچا گیا ایک خط تھی۔ پہلے نقطے کا نام بھی خوف اور دوسرے کا بھی..... وہ بس انہی دو نقطوں کے درمیان کسی گیند کی طرح لڑھکتی رہتی..... اور جیسے، جیسے مزہ کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا اتنا کہ اب دوسروں پہ بھی عیاں ہونے لگا تھا۔

”تم تھک گئی ہو ناں خولہ.....! آرام کر لو چند دن..... مت کرو اتنا کام.....“

”مزہ! تم نے میری بیٹی کو خوار کر کے رکھ دیا۔ دیکھو تو کیسے رنگت ہی بدل کر رہ گئی ہے اس کی تو.....“ ابو کہتے..... پیچو اسے دودھ، بادام کھلانے کے چکروں میں رہتی اور وہ..... وہ ان سب کو سمجھانے میں ناکام تھی کہ آخر..... آخر اس کا اصل مسئلہ کیا تھا۔

☆☆☆

شائینگ کا کام ختم ہوا تو..... ایک دو دن کے وقفے سے گھر میں ڈھولک رکھی گئی تھی۔ خولہ نے ابھی تک اسکول سے چھٹیاں نہیں لی تھیں۔ سواس کی مصروفیت کا وہ ہی عالم تھا۔ اور اب تو اس نے اس کا آسان حل بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ پچھو کو لے کر ابو کے گھر میں ہی آ گئی تھی۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ مزہ کے معیتر کو بھی ایک دو دن

اس وقت بھی وہ سب کو چائے سرو کر رہی تھی اور بے طرح مصروف دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ سنجیدہ، رنگت زرد، آنکھوں کے نیچے واضح محسوس کیے جانے والے حلقے، ہونٹ خشک.....

”تو کیا اسے پانی پینے کا بھی ہوش نہیں تھا؟“ یہ سب جہانگیر اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اور وہ جب کسی کام کی غرض سے دوبارہ بچن کی طرف مڑی تو جہانگیر بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ وہ بچن میں ملازمہ کو کچھ کہنے میں مشغول تھی اور اس کا آنا نوٹس نہیں کر سکی تھی۔ جہانگیر نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑا۔ ہاتھ میں موجود پلیٹ کو ٹیبلٹ پر رکھا اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لایا۔

”جہانگیر، جہانگیر افوہ..... ہوا کیا ہے؟ اُف..... کچھ بتاؤ تو سہی..... جہانگیر کیا کر رہے ہو، یا خدا یا.....؟“ وہ اس کی سنے بغیر کھینچتا ہوا اسے چھت پر لے آیا تھا اور پھر اپنی پشت پر موجود اس کے وجود کو کھینچ کر اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب کی بار وہ کچھ یوں بولی نہ تھی بلکہ خشکی بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے سوال کرتی ہو۔

”آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”تمہیں کیا ہوا ہے خولہ.....؟“ وہ دو قدم نزدیک ہوا۔ خولہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ اور پھر الٹا سوال پوچھا۔

”حالت دیکھی ہے اپنی؟ کیسی ہوتی جا رہی ہو؟ شادی میں تم دلہن کی بہن کم اور ماسی زیادہ نظر آؤ گی۔“ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔

”آں..... اور تم کب چاہو گے کہ تمہاری بیوی ماسی لگے، ہے ناں.....؟“ وہ ہلکی سی شگفتگی سے بولی تھی۔

”شٹ اپ خولہ! یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اسکول سے چھٹیاں کیوں نہیں لے لیتیں تم.....؟ کیوں خود کو اتنا تھکا رہی ہو؟ نہیں ہوتا تم سے توقع کرو اسکول کو.....“ وہ ناراضی اور جھنجھلاہٹ سے بول رہا تھا۔ اور خولہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ دیکھو تو بھلا..... کہہ کون رہا تھا؟

”مجھے تم عزیز ہو خولہ.....“ وہ اب اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے مدھم لہجے میں بولا۔ اور خولہ..... اس کی آنکھوں میں یک دم ہی ایک بے نام سی جلن اتر آئی۔ اس نے ایک سسکتی سی نظر سے جہانگیر کو دیکھا۔

”آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت ہے تمہیں یا یہ کام بھی میں ہی کر دوں؟ تاکہ تم کم از کم اپنی حالت تو ملاحظہ کر سکو!“

وہ اب دو انگلیوں میں اس کے بالوں کی لٹ کو پکڑے، اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ خشکی اس کے لہجے سے چھلک، چھلک پڑتی تھی۔ آنکھوں کے جلن نے سرطان کے مانند پورے جسم کا احاطہ کیا تھا۔ دھیرے، دھیرے آہستہ، آہستہ جوں، جوں وہ اس کی خاطر، اس کی فکر میں ایک، ایک جملہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ ویسے، ویسے وہ سسکتی جا رہی تھی۔

”جواب چھوڑ دو خولہ.....! میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یوں دیکھوں؟“ اور وہ بے اختیار، بے ساختہ ایک مڑپش مسکراہٹ مسکرائی۔

”نہیں جہانگیر.....! اب تو جواب میرے لیے مسئلہ ہی نہیں رہی، میں عادی ہو چکی ہوں، یہ اب میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے زندگی کا کوئی دوسرا معمول..... جیسے..... جیسے تین وقت کا کھانا..... مجھے اب فرق نہیں پڑتا اور رہ گئی چھٹیاں لینے کی بات..... تو لے لوں گی آف..... آخر لیٹا ہی ہے ناں اور اس تھکاوٹ کا کیا ہے..... چاروں کی بات ہے، دن گزر جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسی تپتی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے براہ راست پلکیں جھپکے بنا۔

”شیور.....؟“ جہانگیر نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”شیور.....!“ اس کے چہرے پر طنز سے تاثرات ابھرے اور انہی تاثرات کے ساتھ اس نے جہانگیر کا

ہاتھ چپتہ پٹا تھا۔

”اچھا! ابھی تم نیچے نہیں جاؤ گی..... میں تمہارے لیے اچھی سی چائے کا کھہہ کراتا ہوں اور میرے آنے تک تم یہاں سے ہلکی تک بھی نہیں..... چاہے کوئی جتنی بھی آوازیں دیتا رہے، اوکے؟“ وہ پیار سے کہہ رہا تھا اور اک اور ان دیکھا، نظر میں نہ آنے والا پھولا خولہ کے جسم پر نمودار ہوا تھا۔ اک اور تکلیف کی لہر..... اس نے مسکرانے کا تکلف کیا اور اثبات میں سر ہلایا۔

”بلتا نہیں.....“ اسے ایک بار پھر سے وارن کیا گیا تھا۔ اور خولہ بتتے وجود اور اسی پرتپش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پشت کو دبھکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو..... تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ایک دم نمودار ہوئے تھے۔

”ہونہ.....!“ وہ خود پر ہنسی۔

”تو جہانگیر اعجاز، تو جب تمہاری مرضی ہوگی جیسے تم چاہو گے۔ جب تمہیں اچھا لگے اور جب تمہیں برا..... تو تم دیئے ویسے ہی مجھ سے محبت کرو گے میری پروا کرو گے..... ٹھیک! تو پھر میری مرضی.....؟ میری منشا؟ میری زندگی اور اس کی خواہشات؟ وہ کیا ہوئیں.....؟ سارے اختیار تمہارے..... اور خواہشات بھی کیا تمہاری؟ اچھا! تو محبت اسے کہتے ہیں اور پھر اس کا نام ہے، پہلی دفعہ ذائقہ چمکا ہے اور زبان کہتی ہے کہ اللہ نہ کرے کہ دوبارہ یہ ذائقہ نصیب ہو..... ٹھیک ہے، جب تمہارا دل چاہا، تم نے اپنی زندگی میں مجھ کو جگہ دی اور اب جب میرا دل راضی ہوگا تو تب میں اپنے دل میں تم کو جگہ دوں گی..... یوں ہے تو یوں ہی سہی..... تمہاری محبت اور پروا دونوں ہی بے اہم ہیں اب میرے لیے، وہ یوں کہ مجھے نہ صرف پیروں پر کھڑا ہونا آگیا ہے بلکہ میں نے تو دوڑنا بھی سیکھ لیا ہے جہانگیر.....! اور تم..... تم تو کہیں پیچھے ہی رہ گئے ہو..... بہت پیچھے..... میری زندگی میں تو بس اک خواہش بچی ہے، بخش اک ہی خواہش..... میری اولاد اور اسی خواہش کے واسطے میں نے اپنا آپ وقت کے پیروں تلے رکھ چھوڑا..... کہ آؤ اور لمحہ لمحہ مجھے روندتے چلے جاؤ..... پتا نہیں محبت کہتے کسے ہیں..... اگر اسے تو بڑی ہی کڑوی شے ہے یہ.....“

”چائے.....“ اس کے بدن کو گرم، گرم لہروں کی صورت ڈھانپتی سوچوں کا تانا اس آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے چونکے بنا بے تاثر نظروں سے جہانگیر کو دیکھا اور چائے کی پیالی بکڑی تھی۔ جہانگیر کچھ کہہ رہا تھا..... کیا؟ وہ بھلا کیوں سنتی..... ہاں..... کیوں؟

”عورت بڑی سخت چیز ہوتی ہے، پتھر ہے پتھر..... دل کا دروازہ نہیں کھولتی، چاہتی ہے کہ اسے دیے جا یا جائے جیسے کہ وہ چاہے جانا پسند کرتی ہے، جس مرضی سے اور گریوں نہ ہو تو سارے دروازے بند، قفل ڈال کر چھوڑتی ہے یہ، لاکھ سر جتنے رہو، نہیں کھولنا تو بس نہیں کھولنا..... موم ہونا کہاں آتا ہے اسے..... اس کے برعکس مرد کے دل میں گنجائش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ جیسے تیسے ہی سہی محبت ہونہ، ہوسا تھ رہنے والی عورت کے لیے گنجائش نکال ہی لیتا ہے، گنجائش یوں اس کے دل میں موجود رہتی ہے جیسے کہ دھڑکن..... اور عورت..... سمجھوتے کے نام پر ساری زندگی گزار دے گی، خالی رہنا پسند کر لے گی مگر محبت..... من مرضی سے ہی کرے گی۔

☆☆☆

”ابو.....“ وہ یک دم بوکھلائی سی آئی تھی۔

”یا اللہ خیر کیا ہوا خولہ!“ ابوس سے زیادہ حواس باختہ ہوئے۔

”نہیں، نہیں سب ٹھیک ہے ابو، وہ میں آپ کو یاد کروانے آئی تھی کہ آج عزتہ کے.....“ اسے یک دم یاد آ رہا

تھا اور وہ بھگائی، بھگائی ابو کے پاس آئی تھی۔

”ہاں، ہاں..... ایسا ہے مجھے، آج فلائٹ تھی ناں اس کی۔“

”تو.....! تو ملنے نہیں جانا کیا؟“

”کمال کرتی ہو خولہ.....! ابھی تو پچ آیا ہوگا.....! اسے تھوڑا آرام تو کرنے دو..... کل چلیں گے ہم لوگ.....“

”تو پھر فون پہ ہی مہ جبیں سے پوچھ لوں؟“

”کیا پوچھو گی؟“

”خیریت ہی پوچھنی ہے ابو.....! وہ لوگ یہ نہ سوچیں کہ ہم نے پوچھا تھا نہیں.....“

”ہاں، ٹھیک ہے، فون کر لو مناسب رہے گا۔“ ان کے جواب دیتے ہی وہ مزہ کے کمرے کی طرف مڑی

تھی۔ اپنا سیل فون اس نے مزہ کے پاس ہی رکھ چھوڑا تھا۔ ورنہ اتنی مصروفیات میں وہ تو کب کا سیل گم کر چکی

ہوتی..... مزہ سے سیل فون لے کر اس نے کال ملائی تھی۔ مہ جبیں کے نمبر پر..... دوسری طرف تیل جا رہی تھی مگر کوئی

اٹھا نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک ٹرائی کرنے کے بعد اس نے کوشش یہ سوچ کر ترک کر دی کہ مہ جبیں مصروف ہوگی

اور پھر ایک ٹیکسٹ میسج بھیج دیا تھا۔

”بھائی خیریت سے پہنچ گئے ناں؟“ اور مزہ کو بتا کر، سیل فون اسی کے حوالے کرتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔

بعد میں مزہ نے اسے بتایا تھا کہ کافی دیر بعد مہ جبیں کا ایک لفظی جواب آیا تھا۔ ”ہاں.....“

☆☆☆

چائے کاگ پکڑے وہ کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں تھی کہ جہاں بیٹھ کر وہ سکون سے چائے پی سکے..... پینے تو

وہ چائے ہی آئی تھی لیکن..... سوچوں کے سفر پہ چل نکلی تھی۔ دور سے دیکھو تو یوں لگتا تھا کہ چائے کاگ دونوں ہاتھ

میں پکڑے وہ عہد رفتہ کا کوئی لنگی جسم ہو۔

”آپی.....!“ اور وہ بری طرح ڈری تھی۔ رنگت یک دم اتنی پیلی پڑی کہ مزہ حیران ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ اب اس کے ہاتھ سے چائے کاگ پکڑ کر مائڈ بڑھاتے ہوئے بولی اور اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ

پر چھلک جانے والی چائے صاف کرنے لگی۔ خولہ کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے گئے تھے۔

”آپی.....؟“ مزہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوئی تھی۔ اور خولہ نہ چاہتے ہوئے بھی..... قابو نہ رکھ

سکی تھی۔ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ روئے جا رہی تھی اور مزہ ہنق دق پریشان کہ محض

چائے چھلک جانے سے بھی کوئی یوں روتا ہے، وہ پکی تو نہ تھی۔

”آپی کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....؟“

”تو پھر یوں روتی کیوں ہیں؟“

”بس دل گھبرا رہا تھا۔“

”اور دل گھبرانے کی وجہ.....؟“ مزہ چڑی تھی۔

”کچھ نہیں.....“ اب وہ مزہ کو اپنی کیفیت کیا سمجھاتی۔

”تم کیوں آئی تھیں؟“ خود پہ اب وہ قابو پا چکی تھی۔

”ابو بار ہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ میری سسرال جانا ہے۔“ اور مزہ بولتے ہوئے ابھی تک حیرت بھری

نظروں کے ساتھ اسے دیکھتی جاتی کہ اسے آخر ہوا کیا تھا؟

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 162

<https://reading.caretofun.net>

”اچھا آتی ہوں.....“ اس نے اتنا ہی کہا۔

☆☆☆

دل گھبرائے تو گھبرانے کی وجہ بھی تو ہو..... جو یہ بے وجہ ہی گھبرانے، رونے یہ آمادہ ہو تو کوئی کیا کرے؟ کیا ہے یہ..... وہ تیار تو ہو گئی مگر ابھی تک دل گھبرا رہا تھا۔ جب تیار ہو کر آئی تو ابو اور جہانگیر بھی تیار ہی کھڑے تھے۔

”اطلاع دی تھی مہ جیس کو؟“ احمد صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں..... یاد نہیں رہا ابو.....“ وہ شرمندہ سی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی پرس سے سیل فون نکال کر.....

”جیس کا نمبر ملانے لگی۔ جہانگیر اور احمد صاحب دونوں ہی اب اس کے منتظر تھے۔ اس نے دو تین بار ٹرائے کیا مگر فون نہیں اٹھا یا چار ہاتھا۔

”فون ریسیو نہیں کر رہی ہے مہ جیس.....“ اس نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔

”اچھا چلو کوئی بات نہیں..... مصروف ہوگی اپنے ہی گھر والی بات ہے اب تو..... چلو جہانگیر آگے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

احمد صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے تھے اور خولہ نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔

☆☆☆

گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اتنی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ چند دن بعد ہی مہندی کا فنکشن تھا۔ مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا ہوگا۔ وہ آرام سے اندر آئے، گاڑی باہر پارک کی تھی لیکن لاؤنچ کا داخلی دروازہ داخل ہونے سے پہلے ناک کیا گیا تھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار..... اور چوتھی بار ان کے درمیان حیران نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ وہ سب راک لے کے لیے وہاں ساکت کھڑے رہے کہ اب کریں تو کریں کیا؟

”خولہ تم جاؤ اندر.....“ جہانگیر نے اس سے کہا تھا۔

”میں.....!“ اور اس کا بے وجہ گھبرانے والا دل اک بار پھر گھبرا یا۔

”ہاں تم! اب ہم دونوں مردیوں بنا اطلاع کے اندر جاتے اچھے تو نہیں لگتے ناں..... تم جاؤ۔“ اور وہ جہانگیر کے کہنے پر تذبذب کے سے انداز میں آگے بڑھی تھی، لاؤنچ خالی تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ خولہ کو حیرت ہوئی، وہ ہنگامہ، رونق بھی عقلاً نظر آتی تھی..... جو شادی والے گھر کا خاصہ ہوتی ہے، عجیب سائیں، سائیں کرتا ماحول تھا۔

”مہ جیس..... آنٹی.....!“ وہ آواز دیتی آگے بڑھ رہی تھی اور جواب..... خاموشی..... وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی تو یک دم اسے اک جانب سے مہ جیس آتی دکھائی دی۔

”مہ جیس.....!“ خولہ نے ترنت آواز دی تھی۔ یوں جیسے یہ کوئی بھوت بنگا تھا اور مہ جیس کا ظہور بھی چند سیکنڈز کا تھا۔ ورنہ وہ پھر کہیں حلول کرنے والی تھی۔

”آپ؟“ مہ جیس کو اس کی موجودگی پیٹ میں پڑے گھونے جیسی لگی تھی۔ وہ بھی اچانک اور لاعلمی میں پڑنے والا گھونسا اس کے اس طرح کے رد عمل پر خولہ عجب سی خجالت کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کا دل اک بار پھر سے بے وجہ ہی گھبرا یا تھا۔

”آپ کب آئیں؟“ مہ جیس کو جیسے ہوش آیا تھا۔

”ابھی..... ذرا سی دیر پہلے ابو اور جہانگیر بھی ہیں ساتھ۔“ خولہ نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی ایسے جیسے اس کے بعد بولنے پر پابندی لگنے والی تھی اور یہ سن کر بوکھلائی ہوئی مہ جیس مزید بوکھلائی تھی۔

”آئی ایم سوری..... میں نے فون کیا تھا مگر آپ نے ریسیو نہیں کیا تو ہم بنا اطلاع کے ہی آ گئے۔“

”ہم کوئی بات نہیں۔ آپ جیتے ہیں۔“ انکل اور جہانگیر بھائی کو بھی بلائیں۔۔۔۔۔ بلکہ میں بلاتی ہوں۔“ وہ بولی نہیں، بوکھلائی تھی۔ اسی حواس باختگی کے عالم میں وہ ان دونوں کو بلانے لگی اور ان کو اندر بٹھا کر وہ امی کو بلانے چلی گئی تھی۔ اس کے انداز اتنے عجیب تھے کہ وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت بھری سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر خود کو روک نہیں پائے تھے۔ اور جب مہ جبین کی امی آئیں تو وہ بھی بوکھلائی ہوئی تھیں لیکن مہ جبین سے ذرا کم۔۔۔۔۔

”ہم بھائی سے ملنے آئے تھے۔ ان کو بلا دیں پلیز۔۔۔۔۔!“ جب چائے کے بعد بھی بھائی کے آثار نظر نہ آئے تو خولہ کو کہنا ہی پڑا۔

”ہاں، میں بلاتی ہوں۔“ مہ جبین انھی ہی تھی کہ ایک طرف سے آواز ابھری۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ اور سب یک دم اس آواز کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔ وہ دروازے کے پتوں بچ کھڑا تھا۔ اس کے سلام کا جواب ان لوگوں کے حلق سے برآمد نہ ہو سکا تھا۔ وہ اندر ہی کہیں گھٹ سا گیا تھا۔ اور وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کھڑا انہی لوگوں کی طرف متوجہ تھا۔ شاک وہاں موجود تین لوگوں کے چہرے پر جیسے درج ہو کر رہ گیا تھا۔ بے یقینی رقم تھی ان کی آنکھوں میں اور خولہ۔۔۔۔۔ وہ اک لمحے کے لیے حیران ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس کا دل اتنے دنوں کی تکلیف اور بے سکونی کے بعد۔۔۔۔۔ عین اسی لمحے میں حالت سکون میں آیا تھا۔

”اچھا۔۔۔۔۔“ تو یہ تھی وہ ”وجہ“ جو الہام بن، بن کر مجھ پر ٹوٹی رہی۔“ اس پر جیسے انکشاف ہوا تھا اور اس نے بے اختیار تھک کر اک گہری سانس بھری تھی۔

اور وہ۔۔۔۔۔ وہ اب اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔

”خوشی کو اگر حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی وہ بس مزہ نہ احمد ہوتی۔“

اور یہی۔۔۔۔۔ خوشی گر ہوا ہوتی تو ایسی ہوا ہوتی کہ جہاں، جہاں سے گزرتی وجود پتھر کر چھوڑتی۔ کسی کام کا نہ رہنے دیتی اور وہاں صرف خوشی تو نہ تھی وہاں ویرانی بھی تھی۔۔۔۔۔ موت کی سی ویرانی۔۔۔۔۔ سزاوند کی صورت چھپتی ہوئی۔۔۔۔۔ یہ شدید تھا۔۔۔۔۔ بدتر دھچکا تھا۔

عزیز، مزہ نہ مانگتیر۔۔۔۔۔ وہ اک عدد بچے کے ہمراہ واپس آیا تھا۔ ”قانونی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کی گئی پیپر میرج کا تحفہ۔۔۔۔۔“ اس بچے کے بارے میں اس نے اپنے گھر والوں کو بھی لاعلم رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کا خون تھا۔ وہ کیسے اسے چھوڑ سکتا تھا اور اب جبکہ وہ یہاں، پاکستان میں شادی کر رہا تھا تو اس کی بیوی کو بھی یہ پچھنا لانا تھا۔ یہ طے تھا۔

”تم نے ہمیں لاعلم کیوں رکھا؟“ احمد صاحب نے بے حد بے بسی سے سوال کیا۔

”میں بتانا چاہتا تھا لیکن جرات نہیں کر پایا۔“ عزیز کا سر اٹھا ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور وہ جھکا ہوا ہی تھا۔

”اور اب جو جرات کی ہے وہ؟ یہ قلم ہے۔۔۔۔۔“ احمد صاحب کو تاؤ آیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“

”تمہاری معذرت کا اب میں کیا کروں عزیز؟ اب کیا؟“ لہجہ مزید سخت ہوا۔

”تمہیں شرم آنی چاہیے، تم جانتے بھی ہو تم نے کیا کیا ہے؟“ وہ جہانگیر تھا جو کہ بھڑک کر بولا تھا۔ احمد صاحب نے یک دم اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے روکا تھا۔ مہ جبین اور اس کی امی رو رہی تھیں۔ اور ان کا رونا بتاتا تھا کہ وہ بھی لاعلم تھیں۔ جہانگیر نے اک غضب سے مڑنگہ عزیز پر ڈالی اور پھر وہ وہاں رکا نہ تھا، وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ خولہ نے اک گہری سانس بھر کر عزیز کو دیکھا اور اک مزید تھکا دینے والی تھکن اس کے وجود میں اتری تھی۔ مزہ نہ تو مر جائے گی۔۔۔۔۔ اور اس کے ذہن میں یہ جملہ ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتا تھا۔

اور مزہ..... وہ واقعی مر رہی گئی تھی..... لمحوں میں دفن ہوئی تھی۔

”اور اگر نموشی کو حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھلانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی..... وہ بس مزہ احمد ہوتی۔“

وہ جب وہاں سے واپس لوٹے تو کوئی بھی وہاں ان تینوں میں سے کوئی بھی کم از کم گھر تو جانا نہیں چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ فی الوقت گھر کے راستے کے علاوہ اور کوئی رستہ بھی تو نہیں تھا۔ احمد صاحب گھر آ کر خود پر قابو نہ رکھ سکے تھے اور وہ مزہ کو نگلے سے لگا کر آواز کے ساتھ رونے لگے۔ مزہ حواس باختہ ہوئی۔ فرخندہ کے بھی چھلکے چھوٹے تھے کہ اچھے بھلے تو گئے تھے..... اب کیا ہوا اور جب معلوم ہوا کہ کیا ہوا تو..... تو اک موت کا سا سناٹا..... اک دھماکے کے ساتھ اس گھر میں پھیل گیا تھا۔ مزہ اتنی چپ ہو گئی اتنی ساکت کہ لگتا تھا چھوٹے تو دھڑام سے گرے گی، زمیں یوں ہو جائے گی، اسے یک دم، کھڑے، کھڑے سیکنڈز میں دیمک چاٹ گئی تھی۔

”مزہ.....!“ خولہ نے ڈرتے، ڈرتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میکا کی انداز میں کندھے پہ دھرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اسی انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ خولہ کا ہاتھ پہلو میں جا گرا..... پھو پھو اور آواز رو رہی تھیں اور وہ سر پکڑے، پکڑے صوفے پر ڈھسے سی گئی تھی۔

جو تکلیف ہوتی ہے ناں..... چاہے کوئی کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو..... کتنا ہی جان سے بڑھ کر عزیز کیوں نہ ہو..... پھر بھی..... پھر بھی آپ اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ اس کے جسم سے تکلیف کشید کے خود کو اس تکلیف کے سامنے پیش کریں۔ نہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتے..... یہ جس کی تکلیف، جس کا دکھ ہوتا ہے ناں یہ اسی کو سہنا پڑتا ہے۔ اپنے دکھ خود ہی سہارنے پڑتے ہیں۔ وہ مزہ کی تکلیف کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ تسلی کے دو بول بھی اسے جرم محسوس ہوتے تھے اور وہ سب اپنی، اپنی جگہ مر چکے تھے، وہ خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتے تھے کہ ایک دوسرے کا کندھا بھی تھپتھپا سکیں وہ سب اپنی، اپنی جگہ غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور باوجود اس سب کے وہ مزہ کو اس دکھ، اس تکلیف سے بچانہ سکے تھے۔

وہ مزہ کے کمرے کے باہر کھڑی رہی، بیڑ چوکھٹ پار کرنے کی جسارت نہ کرتے تھے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھی، اسے تسلی دینا چاہتی تھی، ہر زخم پر شفا والا ہاتھ رکھنا چاہتی تھی مگر..... اپنی ہمت کو ختم پانی تھی، وہ تھک چکی تھی۔ ہاں..... وہ تھک چکی تھی..... مزہ سے بھی زیادہ..... اپنی زندگی کی پریشانیوں، مزہ کی پریشانی، ابو کی پریشانی اور نہ جانے کون، کون سی پریشانی..... اور وہ اک گہری سانس بھر کر پلٹ آئی۔ پورا گھر سکوت میں ڈوبا تھا، اندھیرے کا مسکن بنا ہوا تھا، آج تو کسی کو محن کی جتنی جلانی بھی یاد نہ رہی تھی۔ کیسی نحوست پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل گہرا پایا اور اس نے سوچ بورد نہ یہ ہاتھ مار، مار کر سارے گھر کی بتیاں جلادیں، سارا گھر روشنی میں نہا گیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا..... اس نے صحن لاؤنج کے وسط میں کھڑے ہو کر اس چمکتی سفید روشنی کو دیکھا اور بس دیکھنے کی دیر تھی، روشنی اسے جیسے لگی۔ وہ بھی بری طرح سے..... وہ صحن سے نکل کر آئی اور ساری بتیاں پھر سے بجھا دیں، اندھیرا منہوس لگتا تھا تو روشنی جسم کھسکتی تھی..... کیسی حالت تھی یہ.....

اس نے آسمان کی طرف اک شکوہ بھری نگاہ کی اور پھر جھکالی۔ مرے، مرے قدموں کے ساتھ وہ جھولے پر جا بیٹھی..... اس کے بیٹھنے سے جھولے کی حالت سکون میں ارتعاش آیا تھا اور وہ عجیب بے بسی کے عالم میں سر پر ہاتھ رکھنے بیٹھی رہی۔ باہر صحن میں وہ بے بسی کی تنہی بنی بیٹھی تھی اندر ایک کمرے میں جہانگیر، ماں کو ہائی بلڈ پریشر کی دوا کھلا رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں احمد صاحب نیند کی گولیوں کی تلاش میں تھے اور ان کے ہاتھ میں نیند کی گولیوں کا بنا موجود تھا مگر پھر بھی وہ اسے تلاشتے تھے اور مزہ..... اپنے کمرے میں دروازے کے بند پٹ کے ساتھ ٹپک

لکے اس حالت میں کسی کی جانب سے بیان کرنے کے واسطے لفظ نہ تھے۔ اس کی ٹانگیں سیدھی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے، اپنے ہاتھوں پر نقش مہندی کی سرخی کو کھرچتی تھی۔ وہ روتی نہ تھی..... ہائے تنگ نہ کرتی تھی واویلا نہ مچاتی تھی۔ بھلا وہ کیسے روئے..... کیسے ہائے کرے، کیسے چائے واویلا..... وہ تو مجسم غموشی تھی..... مجسم غموشی..... یوں جیسے ہر اک گزرتے لمحے کے ساتھ وہ غموشی کی اک نئی دیزیز میں لپٹتی جا رہی تھی۔ دفن ہوئی جا رہی تھی۔ یوں جیسے اب کے بعد کبھی نہ اٹھے گی، کبھی نہ بولے گی، کبھی نہیں..... اور اس کا ہاتھ سرخ، سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتا چلا جاتا تھا۔ کھرچتا ہی چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سورج نے تو چڑھنا ہی تھا کہ حکم تھا دن اور رات کے بدلنے کا۔ اور سورج حکم کیسے ٹالے..... کہ وہ پابند ہے، زمین والوں پہ جتنی بھی بڑی آفت ٹوٹے کیسی بھی مصیبت آئے، دن کو رات اور رات کو دن میں بدلنا ہی ہے اور اسی تغیر میں ابن آدم کے لیے شفا ہے..... جان لو کہ اسی میں شفا ہے، مہم کا بھید چھپا ہے۔ مؤذن کی آواز نے خولہ کے دل پر چوٹ لگائی تھی۔ اس کا دل بھرا آیا۔ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر ابھی اور جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں اتنا سکوت، اتنی غموشی، اتنی ویرانی تھی کہ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے چلائے..... ایسے کہ یہ سکوت، یہ غموشی، یہ ویرانی مچ جائے۔

”ابو، پچھو.....“ اس نے بے اختیار آوازیں دیں۔ کمروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ نماز کے بہانے سب کو اٹھاتی رہی اور وہاں سویا ہی کون تھا، سوائے احمد صاحب کے کہ جن کو بالآخر معلوم ہوئی گیا تھا کہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہی مطلوبہ تھا..... اور جب اس کا ہاتھ مزنہ کے کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا تو پھر سے ساکت ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کے گلے سے کچھ نیچے اترتا محسوس ہوا، کسی ہمت چاہیے تھی یاں لکڑی کے اس بے جان سے پٹ کو دھکیلنے کے واسطے..... کیسی؟ خولہ کی آنکھ نم ہوئی تھیں اور بالآخر اس نے آہستگی سے پٹ کو دھکیلا۔ قدم اندر رکھا اور لا شعوری طور پر سامنے بیڈ پر دیکھا..... اور جیسے ہی دیکھا تو شعور نے اطلاع پہنچائی کہ اس کی بائیں طرف قدموں کے پاس کچھ تھا۔

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو..... تو..... مزنہ ابھی تک سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتی تھی۔

”مزنہ.....“ اس کے لب بے آواز رہے اور دل دھک کر کے رہ گیا۔

”مزنہ.....“ اب کہ وہ بولتی ہوئی نیچے بیٹھی تھی۔ بے اختیار آپے سے باہر ہو کر اس نے مزنہ کا ہاتھ ہٹایا تو اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھنا پڑا۔ مزنہ کی انگلی کے تارخن تلے..... زخم بن چکا تھا اور خون ایک خراش کی صورت میں نظر آتا تھا۔ واضح نہ ہوتا تھا کہ مہندی کا رنگ کون سا تھا اور..... وہ چند لمحے ضبط کی بہترین کوشش کرتی رہی اور پھر اس نے یک دم مزنہ کو سینے سے لگایا تھا۔ اور وہ..... اب رو رہی تھی..... وہ مزنہ کو سختی سے سینے میں جھپٹے ہوئے تھی اور مزنہ کے دونوں بازو دائیں بائیں ڈھلکے ہوئے تھے یوں جیسے اسے اب فرق نہ پڑتا ہو۔ فرق محسوس نہ ہوتا..... اور خولہ کو اختیار نہ رہا..... وہ اپنی آواز کو ادھمکاتا ہونے سے روک نہ سکی۔ اس کی ہچکچاہٹ بندھ گئیں پر مزنہ بے اثر دکھتی تھی۔

”خولہ، خولہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ جہانگیر تھا جس نے سب سے پہلے آواز کی سمت کا تعین کیا تھا، پر خولہ کو ضبط کہاں.....

”خولہ.....“ اس نے ذہنی ذرا سے غصے کے ساتھ خولہ کو مزنہ سے الگ کیا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....“ جہانگیر برہم ہوا، خولہ کی آواز زور و عمل کے طور پر ذرا آہستہ ہوئی تھی۔

”کیا چاہتی ہو کہ ماموں اسپتال جا پڑیں۔ ابھی تو انہیں تمہارا سہارا ہے اور اگر تم یوں ری ایکٹ کرو گی تو ان

کا کیا ہوگا۔“ جہانگیر کے کہنے کی دیر بھی اس کی آواز خود بخود بتی چلی گئی۔ وہ اب منہ پر ہاتھ رکھے، اکڑوں بیٹھی، ہم آنکھوں سے مزہ نہ دیکھ رہی تھی۔

”خولہ!“ جہانگیر نے اس کا کندھا ہلایا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ..... میں آتی ہوں جہانگیر۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”شیور؟“ اور خولہ نے جواباً گردن ہلائی۔

جہانگیر کے جاتے ہی اس نے مزہ کو اٹھایا۔ بیڈ پر بٹھایا اس کے لیے دودھ کا گلاس لائی اور اس ایک گلاس... مزہ کو پلانے کے لیے اسے کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ مزہ نے بڑے آرام سے دودھ پی لیا تھا۔ اس سے اگلا کام خولہ نے وہی کیا تھا، جو ایسی کسی بھی صورت حال میں کیا جانا چاہیے..... اس نے مزہ کو نیند کی دوا کھلائی تھی۔ خولہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی..... ہنا پلکیں جھپکے..... ساکت یوں جیسے آنکھ جھپکے گی تو کچھ ہو جائے گا، یہاں تک کہ مزہ کی پلکیں بھاری ہونے لگیں اور ایک دوسرے سے جڑنے لگیں۔ اور پھر وہ سوئی تھی، خولہ کے گال پر اک آنسو لڑھک آیا تھا۔

”اب..... اب کیا ہوگا؟ کیا.....؟ مزہ کی شادی ہوگی یا.....“ اور اس یا کے بعد اس کے دل پر ہاتھ پڑتا تھا۔ اور جان جیسے نکل، نکل جاتی تھی۔ یہ سوچ بھی تکلیف دیتی تھی اور اگر ایسا ہو گیا تو.....؟ تو.....؟ تکلیف کا کوئی انت نہ ہوگا، کوئی انت نہ ہوگا۔

☆☆☆

وہ محبت تھی اور اس کو گھر سے گھر سے لڑکر، بھڑک کر سب کی مخالفت مول لے کر وہ شادی کرنا پڑتی تو وہ کرتا۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ کارگر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ کوئی چننا بانی دھمکی کام نہ دکھا سکی تھی..... باپ کے عاق کر دینے کے باوجود وہ اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہ ہلاتھا۔ محبت بھی کوئی مذاق تھوڑی تھا اور گھر والے جس وجہ کو بنیاد بنا کر اس شادی کے مخالف ہوئے تھے وہ اس وجہ، اس بنیاد کو زنی جہالت گردانتا..... ایک بکو اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا، باشعور آدمی تھا اور اوپر سے فطرت کی ایک آمل کپنی میں ملازم تھا۔ وہ ایسی باتوں کی پروا کرتا تو کرتا ہی کیوں..... وہ وجہ، وہ بات اس کے لیے قابل گرفت نہ تھی..... باپ عاق کرتا ہے تو کرتا رہے..... وہ کوئی باپ کا دیا کھاتا تھا؟ اچھی خاصی خوفناک تھی اس کی اور اسی کے بل پر وہ اکڑتا تھا۔ پر اس کے ماں، باپ..... ہاں ان کے لیے وجہ بہت بڑی ہی تھی جو اس کے لیے معمولی سی اہمیت بھی نہ رکھتی تھی۔ ذہنیت بدلنے کے لیے اک جزیریشن چاہیے تھی۔

”اک اس کے علاوہ جس لڑکی کے لیے..... جس لڑکی کے لیے تو کہے گا، میں بیاہ لاؤ گی لیکن اس رزیل کا خیال دل سے نکال دے۔“

”ماں جی! رزیل ہے اسی لیے تو دل سے نکلتی نہیں.....“ وہ ہنس کر کہتا اور ماں جی کے پیر و ہانے میں شدت آئی تھی۔ ماں جی وہ ہی پیر اس کے ہاتھوں سے نکال کر زور کی ایک لات رسید کرتیں..... مگر وہ جوان تو اتنا خون..... ایک ذرا سا جھجکا کھاتا اور پھر وہ ماں کے پیر کو مضبوطی سے پکڑ لیتا اتنی مضبوطی سے کہ ماں جی چاہنے کے باوجود اسے لات رسید نہ کر سکتی تھیں۔ وہ اور ہنستا..... ماں کو تپ چڑھتی تو وہ بجائے اسے ڈانٹنے کے اس کی محبوبہ کے دائیں کندھے والے فرشتے کو ایک ٹوکرو دیتی تھیں۔ وہ ان کو سنوں، طعنوں اور بددعاؤں پہنسا دیتا۔

”ان میں سے ایک بھی..... ماں جی ایک بھی طعنہ، کو سننا یا بددعا اسے لگنے والی نہیں ہے، مظلوم ہستی ہے ماں جی وہ..... کچھ تو خیال کریں۔“ اس کی سانس لیتا وہ یقین سے کہتا تو ماں کو اور غصہ چڑھتا..... اس کے ہاتھ زور، زور سے بھردہ ہاتے رہتے اور ماں کی زبان تیز، تیز چلتی ہوئی بددعائیں فائر کرنے والی ایک مشین بن جاتی۔

اس کی بہن بیخ پاہو کر باہر نکلتی اور ناک کے نچھنے پھیلا کر بے حد ربرہم ہو کر کہتی۔
 وہ سنتا اور ہنس دیتا۔ اور اس کی تو عادت تھی ہنستا۔ ہنسنے والی بات پہ ہنستا۔ اور رونے والی بات پر بھی ہنستا۔ وہ اکثر سوچتا کہ یہ ماں، باپ بھی کیا ہوتے ہیں۔ اپنے منہ کا نوالہ کھلا دیتے ہیں، اپنی ہڈیوں کو گھسا دیتے ہیں، جان مار دیتے ہیں اور گر ضرورت پڑے تو وار بھی دیتے ہیں۔ قدم، قدم انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے ہیں، بچوں کو سنانے کے لیے اپنی نیندیں حرام کر لیتے ہیں، ایک بار بلاؤں دفعہ ”جی“ کرتے ہیں۔ لیکن اولاد کو اپنی مرضی سے ایک فیصلہ نہیں کرنے دیتے۔ پسند کی گیم، پسند کی آٹس کریم فلیور، پسند کے کپڑے، پسند کے جوتے، پسند کا اسکول بیک، پسند کی ٹائی، شرٹ، جینز، سب کچھ مگر پسند کی ”زندگی“ نہیں، کیوں؟ کیوں؟ ٹھیک ہے ان کا تجربہ ہے، ان کا مشاہدہ ہے مگر ضروری تو نہیں کہ ہر اولاد غلط فیصلہ ہی کرے اور بالفرض کر بھی لے تو کیا؟ کیا انہوں نے زندگی میں اپنی جوانی میں سارے فیصلے ٹھیک کیے تھے؟ کیا انہوں نے بھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ یہ تو پھر محبت نہ ہوئی۔ حکمرانی ہو گئی ناں، ہاں بھی ہم نے تمہیں پالا، جوان کیا، اک عمر کھپائی تم پر۔ چلو اب احسان اتارو، بدلہ چکاؤ، تاوان بھرو۔ وہ سر جھٹک دیتا اور اس کا ارادہ کچھ اور مضبوط ہو جاتا۔

”شادی کروں گا تو اسی سے اور وہ بھی آپ دونوں کی مرضی سے، رضامندی سے۔۔۔۔۔ بھگا کر لے جانے والا میں نہیں۔۔۔۔۔ میں مرد ہوں کوئی نام کی تو نہیں جو رات کے اندھیرے میں نقب لگاؤں۔“ تو یہ طے تھی۔۔۔۔۔ اسے اپنی پسند سے ہی شادی کرنا تھی اور وہ بھی ماں اور باپ کی رضامندی سے۔ فی زمانہ ایسا کبھی ہوا تو نہیں تو دیکھیے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے بھلا کیا۔۔۔۔۔؟

☆☆☆

وہ قدیم طرز پہ بنا ایک جدید گھر تھا، جس کا لاؤنج گولائی میں تھا، وہاں بہت سی، قطاری صورت دیوار کی گولائی میں نصب آنسو کھڑکیاں تھیں۔ سورج کب کا چڑھ چکا تھا اور روشنی ان آنسو کھڑکیوں سے چھن، چھن کر اندر آ رہی تھی اور اس گول کرے کو روشن کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ جاتی سردی کے دن تھے اور اب وہ ایک چمکیلا گرم دن ثابت ہونے جا رہا تھا۔ سورج کی روشنی تو یہی اعلان کرتی تھی۔ لاؤنج دو حصوں میں منقسم نظر آتا تھا ایک حصہ سنگ ایڑیا تھا جبکہ دوسروں میں تقسیم کرتے نیٹ کے پردوں کے پار ڈانگنگ ٹیبل رکھی تھی۔ کھڑکیوں کے قریب۔۔۔۔۔ سورج کی تمازت سے ہلکی سی خشکی اب رخصت ہونے کے واسطے بالکل تیار تھی۔ وہ ڈانگنگ ٹیبل کی کرسی چھیننے اس کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی ایک گرم سا احساس چھوڑ رہی تھی جو کہ فی الوقت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ تمازت آنکھوں کو اک راحت کا احساس بخشتی تھی۔ اس گھر کا کچن آج روز ہفتہ کے صبح کے معمول سے عاری تھا۔ پرائیوٹ کی انٹھی مہیک، برتنوں کے کھٹکنے کی آواز، کچن کی آواز ابنتی جائے کی خوشبو اور نہ ہی ایسی کوئی آواز۔۔۔۔۔

”ابو جی ناشتا کر لیں۔۔۔۔۔ پچھو آپ کے لیے دلیا بنا دوں یا پھر جہانگیر تم کیا لو گے؟ پراٹھایا تو س۔۔۔۔۔؟“
 چولہا ٹھنڈا تھا اور ویرانی کو سورج کی روشنی بھی کم نہ کر پائی تھی۔

”خولہ۔۔۔۔۔!“ اس نے اپنے کندھے پر اک ہاتھ کی گرمی محسوس کی اور نرم سے لہجے میں اسے پکارا گیا تھا۔ اس نے چونکے بنائے۔ آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد نرمی تھی۔ اتنی کہ آج سے پہلے بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ اس کے دیکھنے پر۔۔۔۔۔ اس کے کندھے کو ٹپکی سے چھپتا تھا، اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ خولہ اب اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہانگیر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اور

پھر اک گہری سانس بھر کر اس نے زاویہ نگاہ بدلا اور باہر پھیلتی روشنی کو دیکھنے لگا۔

”اب کیا ہوگا جہانگیر.....؟“ اس کی آواز اتنی شکستہ، اتنی دکھ سے پر تھی کہ جہانگیر کو نظر پھیر کر اسے دیکھنا پڑا تھا۔

”ہم مزہ کی شادی وہاں نہیں کریں گے۔“ وہ توقف کے بعد مضبوط لہجہ میں بولا تھا۔

”جہانگیر.....!“ اور خولہ کا ہاتھ دل پر جا پڑا اور وہ وحشت زدہ دکھتی تھی۔ بے ساختہ اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔

”مگر جہانگیر یوں..... اچانک شادی سے چند روز قبل، اس طرح سے رشتہ ختم کرنا.....“ وہ بات نہیں کرتی تھی ہلکاتی تھی۔

”آف.....“ اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں..... جہانگیر خوش رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ خولہ بات مکمل کر لے۔

”زیادہ تر زہرا گئیں گی جہانگیر..... کتنی ذلت، کتنی ہنسی ہوگی اور ابو، وہ..... وہ کیا کریں گے۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور صبح کو کچھ کاٹا تھا۔

”خولہ.....!“ جہانگیر نے ذرا سا جھک کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور جب وہ خولہ، کہتا تھا تو پکار میں مضبوطی ٹھانیں مارتی تھی۔

”ہاں، میں مانتا ہوں، یہ ہوگا، یہ سب ہوگا شاید اس سے بھی بدتر ہو جتنا تم سوچ رہی ہو، مزہ کو ہو سکتا ہے اک لمبے عرصے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس سب کے باوجود میں دُہرا رہا ہوں، ہاں اس سب کے باوجود..... مزہ کی زندگی اتنی غیر اہم نہیں کہ اسے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جس میں جرأت نہ ہو اور اس شخص کے ساتھ زندگی اک آزمائش سے زیادہ اور کچھ نہ ہو۔ مزہ کا مزاج میں جانتا ہوں، وہ یہ نہیں کر سکے گی، اسے کپور و ماہر نہیں کرنا آتا خولہ..... وہ نباہ نہیں کر سکے گی تو کیوں اس کی زندگی کو داغدار کیا جائے..... یہ چند روز کی پریشانی ہے اور شادی کی صورت ساری عمر کا بھگتان..... تھوڑا سا حوصلہ..... زندگی کبھی اک نقطے پر نہیں رکتی خولہ، وقت جب بدلتا ہے تو مرہم ہو ہی جاتا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے، اتنی نرمی، اتنے خلوص سے کہہ رہا تھا کہ وہ جہانگیر نہ لگتا تھا، وہ کوئی اور دکھتا تھا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔

”جہانگیر ٹھیک کہہ رہا ہے خولہ.....“ اپنی پشت پر اس آواز کو سن کر وہ چونکی..... چونکا تو جہانگیر بھی تھا۔ اس نے بے اختیار خولہ کے ہاتھ چھوڑے تھے اور خولہ بے اختیار ہو کر اٹھی تھی۔

”ابو.....“ اس کے لب بے آواز بولے اور وہ فوراً انہیں سہارا دینے کے واسطے اٹھی تھی۔ اس صبح کو وہ اتنے بوڑھے دکھتے تھے جیسے عمر کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوں۔ خولہ نے آہستگی سے ان کا ہاتھ تھاما اور ڈانگنگ نیبل کی کرسی گھسیٹ کر انہیں بنھایا تھا۔ چند لمحوں بعد فرخندہ بھی وہیں آچکی تھیں اور ان چاروں نفوس کے چہروں پر خوشی اپنا رقص پیش کر رہی تھی۔ وہ چاروں چہرے جیسے خوشی کے بیروں تلے تھے۔ ان کے چہرے جیسے خوشی کے لیے ایک اسٹج بن گئے تھے۔

”میں مزہ کی شادی کبھی ایسے شخص سے نہیں کروں گا۔“ احمد صاحب اک لمبے وقفے کے بعد بولے تھے۔

”مگر بھائی صاحب.....!“ فرخندہ اپنے تحفظات بیان کرنے لگیں اور ان کے تحفظات بھی کم و بیش وہ ہی تھے جنہیں خولہ پہلے ہی دُہرا چکی تھی۔

وہ عورتیں تھیں سمجھوتا انہیں آسمانوں سے دے کر اتارا جاتا ہے اور وہ مرد..... مضبوطی اور خطرناک فیصلے کرنا ان کی پہچان اور شان بھی۔

ہوئے تھے اور وہ اپنی عمر سے چاہے جتنے بھی زیادہ بوڑھے اور شکستہ نظر آتے مگر لہجہ ان کا ایک تو نامرد کا ہی تھا۔
 ”مزنہ کی شادی نہیں ہوئی..... میں انکار کر رہا ہوں۔“

”اور میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی ابو.....“

اور وہ سب بری طرح سے چوٹے اور چوکے، مڑکر استعجاب سے پرنظروں کے ساتھ اس آواز کی سمت دیکھا تھا۔ وہ مزنہ تھی جو کہ سرخ چہرہ لیے، کسی مرد کے سے ہی مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

☆☆☆

اس نے کھلے دروازے پر انگلی کی پشت سے ٹک، ٹک کیا۔ مس مفتی نے چوٹک کر سر اٹھایا۔

”مزنہ جہانگیر.....! آئیں ناں اندر آئیں.....“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔ خولہ ست روی سے چلتی ہوئی اندر آئی تھی اور جب تک وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی مس مفتی کو کچھ غلط ہونے کا احساس ستا رہا۔ اس کا چہرہ.....؟ پرسوں تک تو وہ خاصی خوش نظر آ رہی تھی مگر اب..... چند لمحے اسی خموشی کی نذر ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے مغموم دھمتی تھی اور مس مفتی کی نظریں اس آرزوگی کا سر اڑھوٹتی تھیں۔

”ایوری تھنک از فائن مزنہ جہانگیر؟“ کسی خدشے کی بنا پر انہوں نے پوچھا۔

”مجھے کچھ دنوں کے لیے آف چاہیے مس مفتی.....“ ایک گہری سانس بھر کر سر اٹھاتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”آپ کی بہن کی شادی ہے..... اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... آف لینا آپ کا حق ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور خولہ کا دل کسی انجانے، ان دیکھے پتھنچے میں جکڑتا جا رہا تھا۔ ”شادی کے لیے اب میں آپ کو منع تو نہیں کر سکتی ناں.....“

”مس مفتی.....!“ اور اس نے اچانک انہیں ٹوکا تھا۔

”میری بہن کی شادی..... کیمنسل ہوگئی ہے.....“ اس نے بوجھل لہجے میں کہا تھا۔

”اوہ.....“ وہ یک دم سناٹے میں رہ گئیں۔

”کیوں.....؟“ اگلا سوال فطری رد عمل کی غمازی تھا۔

وہ انہیں بتانے لگی۔

”میرے خدا..... آئی ایم سوسوری مزنہ جہانگیر..... سوسوری..... مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو میں.....“

”ارے نہیں مس مفتی..... آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں..... اس کے تو گھر والے بھی لاعلم تھے۔“ اس نے نرمی سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا۔ وہ کتنی دیر منہ پر ہاتھ رکھے افسردہ سی بیٹھی رہیں۔

”اللہ بہتر کرے گا۔ وہ مصیب الاسباب ہے۔ اسی میں کوئی بہتری ہوگی۔“ خولہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ انہوں نے پھر اس سے دوبارہ پوچھا نہیں تھا کہ جب شادی نہیں ہو رہی تھی تو وہ آف کس بات کا لے رہی ہے..... وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں کہ وہ کس وجہ سے آف لے رہی تھی، خولہ گھر کے فیشن ماحول سے بھاگی تھی۔ وہ مزید سہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا گھر سے نکلے گی تو ذہن کچھ ریلیکس ہوگا مگر اسکول آکر ہوا کیا..... ساتھی ٹیچرز نے فنکشنز، عروسیلبوسات اور اسی طرح کے دوسرے سوال پوچھ، پوچھ کر اسے زچ کر دیا تھا۔ وہ بے طرح سے گھبرائی تھی اس سے بہتر تھا وہ آف ہی لے لیتی، وہ ابھی سب کو کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہی تھی اور وجہ بھی مزنہ..... وہ عزیز سے شادی کرنے پر بعد تھی۔

☆☆☆

”مزنہ..... اللہ کا واسطہ ہے تمہیں..... خدا کے لیے ہم یہ رحم کھاؤ۔“ وہ اتنی تک آئی تھی کہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑی۔ مزنہ ایک دم گھبرائی تھی۔
 ”آپنی پلیز!“ لہجہ التجا یہ تھا۔ ”آپ کیوں نہیں سمجھتیں..... مجھ سے نہیں ہوگی پھر سے وہ پریز اور شادی سے چند روز قبل۔ شادی ٹوٹنے کا مطلب جانتی ہیں ناں آپ.....؟ میری مشکلات میں اضافہ نہ کریں، میں پال لوں گی اس کی اولاد کو۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تم نہیں پال سکوگی مزنہ.....“ خولہ نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی تھی۔ نری جذباتیت ہے یہ..... آج جذبات میں آکر پھندا اپنے گلے ڈال لوگی اور کل کو جب دم گھٹنے لگے گا پھر ہمیں الزام دوگی میں تو نا سمجھ تھی۔ آپ لوگ تو سمجھ والے تھے..... کس کرو مزنہ، عزیز اس دنیا کا آخری مرد نہیں ہے۔ جو تم اتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہی ہو۔“ خولہ کی سانس ہموار نہ رہی تھی۔ اسے بے حد غصہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کا ہی کیوں سوچتی تھی۔ کیا ابو کی حالت اسے نظر نہیں آتی تھی۔ گر اتنا ہی آسان ہوتا جتنا وہ کہہ رہی تھی تو اب سب سے پہلے اس آسان حل کو سمجھنے والے ہوتے..... جب وہ خود انکار کر رہے تھے تو وہ کیوں مری جا رہی تھی۔ مزنہ چند لمحے غموش رہی اور خولہ کو دیکھتی رہی۔

”یہ میری زندگی ہے آپنی.....! اور اس میں فیصلے کرنے کا اختیار صرف مجھ کو ہے..... آپ لوگ اپنی، اپنی مرضیاں اور اپنی مانیں مجھ پر مت تھوپیں..... مجھے عزیز سے ہی شادی کرنی ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سن سکتی ہوں اور نہ برداشت کر سکتی ہوں۔ میرے لیے اس شادی کے بعد کی مشکلات سہنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود کو، اپنے وجود کو لوگوں کی اٹھتی انگلیوں اور زہریلی زبانوں کے لیے چھوڑ دوں..... سوری آگین آپنی..... آپ، ابو کو بتا دیجیے گا۔“ وہ اتنے غموس اور بے حس انداز میں کہہ رہی تھی کہ خولہ کو سانس روک کر اسے سننا

مارچ 2019ء کا دلکش شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سیرہ ناکسٹ ماہنامہ

مزید



عشورہ کی محفل، محفل شعر و سخن اور

مرزا اجدید نیک کا دلچسپ انداز

شکست پا

زندگی کے شیب و فراز میں انسان جانے کتنے محاذوں سے لڑتا ہے..... وہ بھی اپنوں کے درمیان منافقتوں اور مصلحتوں میں الجھا لڑتا رہا۔

آخری صفحات پر اسما قادری کے خیالات کی پرواز

ہنگامہ زن

ماضی کے پوشیدہ گوشوں..... اور بند درپچوں میں پنہاں راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر الیا میں سیٹا پوری کے قلم سے

رنگ آسمان

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم..... اے آراجپوت! سحر انگیز انداز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کرہاں ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ حسام بٹ کے قلم کا جادو

اسی کے علاوہ

تنویر ریاض، ماہ رخ، باب، شاہ زین رضوان، اعتزاز سلیم وصلی، فہمی فردوس، منظر امام اور آصفہ ضیا احمد کی خوبصورت کہانیاں

مڑا تھا۔ وہ سناک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک دم اس کی پشت پر کھٹکا ہوا تھا..... وہ دونوں ہی چونک کر متوجہ ہو گئیں۔ کسی نے دروازہ کھولا تھا۔

”خولہ.....!“ وہ جھانگیر تھا اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھتا تھا۔

”عزیز کے گھر والے آئے ہیں۔“ جھانگیر کے منہ سے نکلا ہوا جملہ..... محض جملہ ثابت نہ ہوا تھا۔ وہ اُک دھکا کا ثابت ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار مزہ کو دیکھا اور مزہ کی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی باؤں لٹیکوٹ، یہی کتنی تھی کہ ”انہیں انکار نہیں، ہرگز، ہرگز بھی نہیں.....“

☆☆☆

عزیز کے گھر والوں کا آنا..... یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب اگر کیا جائے تو آخر کیا، کیا جائے۔ وہ اب کیا کرنے، کیا کہنے آئے تھے۔ جب سب کچھ واضح تھا، طے نظر آتا تھا تو اب..... اب کیوں..... آئے تھے وہ لوگ..... کیا وہ سمجھوتے کی بات کرنے آئے تھے تو ہرگز نہیں..... احمد صاحب کسی بھی قسم کا کوئی بھی سمجھوتا کرنے پر تیار نہ تھے۔ کوئی ایک دو دن کی بات ہو تو برداشت کو آواز دے لے انسان..... ساری عمر، ساری عمر کا معاملہ تھا اور سمجھوتا کوئی بہترین حل نہ نظر آتا تھا، نہیں ایسا تو وہ کرنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ہی جھانگیر کو کہہ کر خولہ کو بلانے کا کہا تھا اور خولہ..... جھانگیر کی بات سن کر اس کی تو جیسے ساری سمجھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔

”خولہ..... چلو..... ماموں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ جھانگیر نے اسے اپنے پیچھے آتے نہ دیکھ کر کہا۔

”آ رہی ہوں.....“ اس نے قدم بڑھائے مگر ایک دم ٹھک کر رک گئی تھی۔ اور رکنے کی وجہ..... مزہ بنی تھی۔ اس نے خولہ کا ہاتھ پیچھے سے تھام کر اسے روکا تھا۔

”شٹ اپ مزہ جسٹ شٹ اپ.....“ اس نے بری طرح سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”اور خبردار..... خبردار جو تم اس کمرے سے باہر نکلیں..... تمہاری بات میں نے سن لی ہے اور اب تک بھی پہنچا دوں گی، بار، بار مت دہراؤ.....“ مشتعل ہو کر کہتے ہوئے، وہ بل کھا کر پٹی اور مزہ کے تقریباً منہ پر ہی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ مزہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی ابھری، بلند ہوئی اور اب وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

جیسے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو تباہی ناگوار بدی کی طرح ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی اور دیکھ بھی سکتی تھی۔ ابو کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ دکھتا تھا۔ جھانگیر کی پیشانی پر کئی بل تھے اور وہ ناک تک بھرا بیٹھا تھا اور پچھو..... وہ عورت تھیں، مروت دکھلانے کی ایسی کوئی ضرورت انہیں نہ تھی ان کا چہرہ شدید ناگواری کا نینوں سا بننا ہوا تھا۔ جیسے ابھی کہ ابھی وہ ان آنے والے مہمانوں کی تواضع، بے عزتی سے کرنے والی تھیں..... خولہ نے پست آواز میں سلام کیا اور خوشی سے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی تھی۔ اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر..... وہ اب انہیں مشروب سرو کر رہی تھی۔

”شکریہ بیٹے.....!“ عزیز کی ای نے دھیمے لہجے میں کہا جب اس نے انہیں گلاس پکڑا دیا تھا۔ سرو کرنے کے بعد وہ بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ ماحول پر اب ایک بھاری، بو جھل خاموشی تھی کہ جس کا بوجھ کندھوں پر پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ ان سب کے لیے یہ بات شروع کرنا ایک عذاب کی طرح تھا۔

”بھائی صاحب! آپ کو یقین آئے نہ آئے مگر ہم بھی آپ کی طرح ہی لاعلم تھے۔“

”ٹھیک ہے مان لیا کہ آپ لاعلم تھے بچے کے وجود سے مگر پیپر میرج سے تو آپ لاعلم نہیں تھے ناں، وہ کیوں چھپائی ہم سے.....؟“ وہ جھانگیر تھا۔ جس نے اتنے ترش لہجے میں عزیز کی ای کی بات کاٹی تھی کہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے

تھے۔ اور عزیز کی ماں..... ان کا رنگ فق ہوا تھا۔ مہجیں نے بے اختیار ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں دیکھا۔
 ”اس کے قصور وار ہیں ہم، مگر.....“ وہ مدھم لہجے میں بولیں لیکن بات عمل نہ کر سکیں۔

”ہم آپ سے مزید کوئی بد مزگی نہیں چاہتے تھے اور.....“
 ”آئی پلیز..... ابھی آپ لوگ چلے جائیں۔ ہمیں کچھ وقت دیں..... تھوڑا سا وقت ایک بہترین فیصلہ کرنے کے لیے.....“ وہ خولہ تھی جس نے احمد صاحب کو کوئی اور بات کہنے سے روکا تھا۔ احمد صاحب، جہانگیر اور فرخندہ..... وہ سب اتنی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو وہ ٹھیک ہو جیسے.....
 ”بہت شکریہ بیٹے..... امید ہے کہ آپ لوگ اچھا ہی فیصلہ کر س گے۔“ مہجیں کی امی اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ مہجیں نے بھی ان کی پیروی کی اور چند لمحوں بعد وہ دونوں چلی گئی تھیں۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیوں انہیں آس دلا کر بھیجا ہے جب طے ہے کہ انکار ہی کرنا ہے تو؟“
 جہانگیر ان لوگوں کے اٹھنے ہی خولہ سے مخاطب ہوا تھا۔ لہجہ برہم، انداز خفا، خفا.....

”دماغ میرا نہیں..... مزہ کا خراب ہوا ہے جہانگیر..... وہ اس..... وہ شادی پر بھند ہے ابو۔“ جہانگیر کو جواب دے کر رخ موڑ کر اس نے احمد صاحب سے کہا..... فرخندہ کا منہ کھلا اور امجد صاحب نے اچھٹے سے اسے دیکھا۔ وہ اتنی حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے جیسے دنیا کی سب سے انہونی بات ہو گئی تھی۔ خولہ تھک کر ڈھے پڑنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھی تھی کہ ان نظروں کی حیرت کا علاج اور جواب..... دونوں ہی اس کے پاس نہیں تھا۔

مزہ ایک بار پھر سے مسئلہ بن کر سامنے آئی تھی۔ اور اب کی بار یہ سنگین صورت حال تھی۔

☆☆☆

اس نے بے حد حیران ہو کر وہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑا تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا تھا کہ چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ سامنے کھڑی لڑکی اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اور جب بانو نے اسے بت بنا کھڑا دیکھا تو گھبرائے سے انداز میں ادھر، ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا..... اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمایا تھا۔ اسے کسی کے آجانے کا خدشہ تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹی اور تیز قدموں کے ساتھ ہی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کی زمین چادر کے پلو کو پھڑ پھڑاتا ہوا دیکھتا رہا جو کہ اس کی تیز چال کی وجہ سے اڑا جا رہا تھا۔ اس کے دور جاتے ہی اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے اس کاغذ کو دیکھا اور ایک بار پھر سے وہ خود کو حیران ہونے سے روک نہ پایا تھا۔ ”یہ..... یہ اس نے بھجوا تھا۔ اپنی کسی کزن کے ہاتھ.....“ یہ اس کے لیے کسی بدترین دھچکے سے کم نہ تھا۔ وہ ایسی کسی کوشش کی تو قیاس کم از کم اس سے نہیں کر رہا تھا۔

”آ.....“ اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے..... ”ہو“ کر کے سانس باہر بھیکی۔

”یہ..... یہ کیا تھا؟“ اسے اپنے ماتھے پہ پسینہ آتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ایسا تو نہ تھا۔ اس نے اسے پسند کیا تھا۔ رشتہ کرنے کی بات کی تھی جو بھی تھا ایک طرف..... ایسا کوئی خط، پتر جیسا تعلق تو کبھی نہ تھا۔ وہ بد دل ہوا تھا، لاک لہجے کے لیے۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ شاک پہنچا تھا اسے یقین نہیں آتا تھا مگر ہاتھ میں پکڑا وہ کاغذ..... یقین کے تھپڑ اسے دے مارتا تھا۔ بالآخر اس نے کاغذ کو کھول ہی لیا تھا۔ اس کی نظریں سطروں پر دوڑنے لگیں..... اس کا دل دھڑک اٹھا تھا، کیا یہ اقرار نامہ تھا..... اظہار نامہ تھا یا کیا.....؟ اور جو وہ تھا اس نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا..... وہ ایسی کسی بات، ایسے الفاظ کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ دنیا کی پہلی بات نہیں تھی۔ تو یہ آخری بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنی ہی دیر منہ کھولے اس ”نا“ کو دیکھتا رہا۔

”ہیں..... یہ کیا تھا؟“ اس خط میں اسے منع کیا گیا تھا کہ ”وہ اس کے رشتے کے لیے اپنی کوششیں ترک کر دے مزید یہ کہ وہ اس کے لیے موزوں نہیں تھی اس کی ”محبت“ اس کے لیے محض مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔“ کتنی ہی دیر وہ اس کاغذ کا کونا ہونٹوں میں دبا کر حیران پریشان کھڑا رہا۔ اتنے عرصے سے یہ بات چل رہی تھی۔ پسندیدگی کی بات اس کے خاندان میں بھی پھیل گئی تھی اور سب کو معلوم تھا کہ اس کی اماں مان کے نہیں دے رہی تھیں۔ ایسا پہلے تو نہیں ہوا تھا۔ کیا ہوا تھا ایسا..... کیا؟ کہ اسے یوں..... اس سے رابطہ کرنے اور اسے پیچھے ہٹنے کی تلقین کرنا پڑا تھی۔ وہ الجھا اور بری طرح سے الجھا۔ ایسا کیا ہوا تھا، کیا ہو گیا تھا۔ اسی الجھن کے ساتھ وہ گھر آیا اور جیسے ہی گھر آیا تو اس کی بہن اس کا بازو پکڑ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک طرف لے گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
 ”ماں جی آج اس کے گھر گئی تھیں.....“ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہن نے آنکھ اور بھوؤں سے اشارہ کیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ کس کے گھر گئی تھیں۔
 ”کیوں؟“ حیرت سے پر مگر دھیما لہجہ.....

”اتنی بے عزتی کی ہے، اتنی بے عزتی کہ بس..... اتنی باتیں سنائیں ہیں کہ کیا بتاؤں.....؟“ بہن اسے بتا رہی تھی اور اس کی جیب کے اندر، والٹ میں رکھے کاغذ کے الفاظ جیسے بولنے لگے، پھڑپھڑانے لگے تھے۔ ساری الجھن رفع ہو گئی تھی اور خط بھیجنے کی حرکت بھی جیسے بہترین طریقے سے justified ہوئی تھی۔
 ”ماں جی..... نے ایسا کیا؟“ وہ یوں بولا جیسے ماں سے اس انتہائی قدم کی توقع وہ مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔
 ”کیوں کیا ایسا.....؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیوں سے کیا مطلب ہے بھائی، ضد کرو گے تو..... یہ تو ہو گا ہی۔“ بہن اس کے پچگانہ سوال پر مسکرا کر بولی تھی۔
 ”یہ ٹھیک نہیں ہوا، بے حد غلط بات ہے یہ..... انتہائی نامعقول حرکت ہے یہ..... ماں جی کو جو کہنا ہے مجھے کہیں اس کی اور اس کے گھر والوں کی یوں بے عزتی کرنا.....“ اور اس نے تف کے سے انداز میں سر جھٹکا تھا۔
 ”تم ہی ضد چھوڑ دو بھائی.....“ بہن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بھی لہجے میں کہا تھا۔
 ”ضد ہوتی تو چھوڑ دیتا، میں کیا کروں..... کیا کروں کہ یہ ضد نہیں ہے۔ بے غیرت دل کا مسئلہ ہے۔“
 آخری جملہ اس نے منہ ہی منہ میں کہا تھا۔ اسے جیسے خود بے طرح سے غصہ آیا تھا۔

”وہ اس گھر میں آگئی تو تم سوچ سکتے ہونا کیا ہوگا؟ کیا کبھی سوچا تم نے کہ تم کیسی زندگی اسے دو گے.....؟ خود تو تم قطر چلے جاؤ گے اور وہ پیچھے سے ماں جی کے ہاتھوں اور زبان پر ہوگی۔ زندگی اتنی پیچیدہ ہو جائے گی کہ.....“

”اسے یہاں چھوڑ کر جائے گا کون.....؟“ اس نے بہن کی بات کا ٹی تھی۔ اور بہن ایک دم نہ سمجھ سکی اور جب سمجھی تو ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”یعنی کہ ایک اور رولا..... ایک اور مسئلہ.....“ وہ حیرت سے بولی۔
 ”بھائی ماں جی تمہیں کھا جائیں گی۔“ اور وہ ہنس دیا..... کھل کر..... زور سے..... اک بھر پور مردانہ قبضہ لگا کر۔
 ”فکر نہ کرو..... میں ماں جی سے اس دفعہ کھل کر اور بالکل صاف، صاف بات کروں گا، وہ نہیں..... تو اور کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں.....“ اس نے اتنے متمم ارادے اور اتنے مضبوط لہجے میں کہا تھا کہ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔
 یہ اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے گا۔ آخر کس کروٹ.....؟

وہ جیسے ہی فون کر ڈیل پر رکھ کر پلٹے۔ سناکت رہ گئے تھے۔ وہاں مزہ لڑائی کی اور وہ آجی جیرائی سے انہیں
 کچھ رہی تھی کہ احمد صاحب کو عجیب محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ لبریز تھیں۔
 ”ایسا کیوں کیا آپ نے ابو؟ کیوں؟“ اور پانی جھلک گیا۔ بہہ گیا۔ احمد صاحب دو قدم آگے
 بڑھے، ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کا سر شفقت سے تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے اور مزہ۔ وہ وہیں ہونٹوں پہ ہاتھ
 رکھ کر نیچے ٹٹھکتی چلی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے رونے کی آواز سے گھر کی دیواریں بل گئی تھیں۔ خولہ ننگے پیر، بنا
 دوپٹے کے دوڑی۔

”یا اللہ خیر.....!“ فرخندہ بھی حواس باختہ ہوئیں۔ اور جہاگیر اس وقت گھر پر نہ تھا۔ اور مزہ۔ وہ اسی
 طرح سے روئی تھی جیسے کوئی مر گیا تھا۔

”مزہ..... مزہ کیا ہوا ہے..... کیا؟“ خولہ نے اسے دونوں بازوؤں میں بھرتے ہوئے سیدھا کیا لیکن وہ
 روئے جا رہی تھی۔

”بتاؤ تو سہی..... آخر ہوا کیا ہے؟“ خولہ نے اس کا چہرہ سیدھا کیا، تھپتھپایا اور پوچھا۔
 ”ابو..... ابو نے..... انکار کر دیا..... آپ.....“ وہ ہچکچوں میں اس نے بات مکمل کی اور خولہ کے اندر اٹھتے
 وہموں کے تھپڑوں پہ ایک دم برف گری تھی۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ باوجود اس کے وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوتا تھا۔
 باوجود اس کے کہ یہ ہی طے تھا پھر بھی یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دل نکال لیا تھا۔ اس نے کچھ اور مضبوطی سے
 اسے بازوؤں میں جکڑا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا مزہ..... سب ٹھیک.....“ اس کا سر چومتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”کیا ہوا؟“ فرخندہ حواس باختہ، گھبراہٹی ہوئی آتی تھیں۔ خولہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں واپس جانے
 کا کہا۔ وہ خشکیں..... رک کر ان دونوں کو دیکھا۔ خولہ نے پھر سے انہیں واپس جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بادل
 خواستہ مزگئی تھیں اور اب وہاں بے قابو ہوتی، تڑپتی، بجلی کی مزہ تھی اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑے..... اس کے
 سر پر ہونٹ رکھے اسے سنبھالے ہوئے خولہ تھی، جس کے اپنے آنسو کہیں اندر بہت اندر کسی گھپاہ میں ٹپ، ٹپ
 گرتے تھے، نظر نہ آتے تھے۔ بالکل بھی نظر نہیں آتے تھے۔

☆☆☆☆

تین ماہ بعد

چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی اس نے بچوں کی قطار بنوائی اور انہیں لے کر گیٹ کی طرف جانے لگی۔ ارد گرد بچوں کا شور
 پیلا ہوا تھا۔ گاڑیوں کی پاپ، پاپ..... چونکیدار مختلف ناموں کو پکار رہا تھا۔ بچوں کی مستیاں عروج پر تھیں۔ اس نے
 اپنی کلاس کو گیٹ تک چھوڑا..... اور پھر واپس اسٹاف روم میں آگئی۔ اسٹاف کی چھٹی، بچوں کے آف ہونے کے پندرہ
 منٹ بعد ہوتی تھی..... پندرہ منٹ بعد ہی اسے جانا تھا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کچھ کاپیاں تھیں، کچھ ورک شیٹس اور
 اسی طرح کی دوسری چیزیں..... جنہیں اس نے اسٹاف روم کی الماری میں رکھ کر الماری لاک کی تھی۔ گلے میں پڑا
 دوپٹا اتار کر اس نے چادر اوڑھی اور اب وہ ہٹا دو پٹا نہ کر رہی تھی کہ اچانک اس کا فون بج اٹھا تھا۔
 ”اس وقت..... خیرت ہو؟“ اس نے ذرا سا حیران ہوتے ہوئے فون دیکھا تو ”جہاگیر کا لنگ“ کے الفاظ
 اسے مزید حیران کر گئے۔

”خیریت جہاگیر؟“ اس نے ریسیو کرتے ہی سوال داغا۔
 ”ہاں خیریت ہی ہے، میں آج فری تھا تو سوچا تمہیں پک کر لوں۔ تم دین والے کو منع کر دو.....“ جہاگیر نے
 ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء 175

اتنا کہہ کر فون آف کر دیا تھا اور وہ اچنبھے سے فون کی بجھتی اسکرین کو دیکھتی رہی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ شادی کے دو سالوں میں بھی نہیں..... اسے اعتراف تھا کہ جہانگیر کی فطرت پہلے کی نسبت ذرا سی بدل گئی تھی مگر پھر بھی اس کا یہ کہنا خولہ کو حیران کرتا تھا اور بے طرح سے کرتا تھا۔ اسی حیرت کے زیر اثر اس نے دوپٹا نہ کر کے بیک میں رکھا اور جہانگیر کا انتظار کرنے لگی۔ قریب بیس منٹس کے بعد اسے جہانگیر کی مس کال آئی تو وہ گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

”مسز جہانگیر..... آج آپ دیر سے جا رہی ہیں۔“ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ وہ مڑی اور مسکرائی۔

”جہانگیر نے آتا تھا لینے..... بس اسی کا انتظار کرتے دیر ہو گئی۔“ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

”آپ بھی تو دیر سے جا رہی ہیں.....“ اس نے سوال کیا۔ مس مفتی مسکرا دیں۔

”میرا تو کام ہی ایسا ہے۔“ اسی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے جواب دیا تھا۔ وہ اب گیٹ کے پار پہنچ چکی تھیں جہاں پہ جہانگیر، خولہ کا اور مس مفتی کی گاڑی ان کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر نکلیں۔ گاڑی ان کے قریب آ کر رک گئی تھی۔ وہ ان کو خدا حافظ کہتی جہانگیر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”پچھو کہاں ہیں؟“ جہانگیر کو گیٹ کا لاک کھولتے دیکھ کر اس نے از حد حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ ماموں کی طرف گئی ہیں..... فون آیا تھا ان کا مجھے.....“ جہانگیر بایک کو اندر لاتے ہوئے بولا۔ اور وہ رک گئی، ٹھہر گئی۔ اس نے آنکھیں سکیز کر جہانگیر کو دیکھا، کچھ غلط تھا، کچھ غلط تھا۔ غیر معمولی کچھ تھا جو وہ چھپا رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار گھبرایا۔ پچھو اسے بتاتے بنا تو نہیں جانتی۔

”جہانگیر، کیا ہوا ہے؟“ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خولہ نے پوچھا اور اس طرح پوچھتے ہوئے وہ بے حد پریشان دھنکی تھی۔ جہانگیر نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یک دم اسے بتائے..... پریشان کرے صبح سے وہ اسکول میں تھی۔ لچ عموماً گھر آ کر ہی کرتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ کھالے، تھوڑا آرام کر لے تو وہ اسے طریقے سے، سجاؤ سے بتا دے گا مگر خولہ کی حیات تیز تھیں اتنی کہ..... اس کی ہر کوشش پہ پانی پھیر کر رکھ دیا تھا۔ جہانگیر نے اک نظر اسے دیکھا۔ بایک کو کھڑا کیا۔ اس کی طرف مڑا..... اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے..... اور خولہ کا دل تھا کہ آج پسلیاں توڑ کر رکھ باہر آنے کو تھا۔ جہانگیر کے ہاتھوں کا لمس بھی تسلی نہ دیتا تھا اور اس کے ہاتھ لرزتے سے تھے۔

”جہانگیر.....“ خولہ نے سرا سمہ ہو کر پکارا اور درمغل کے طور پر جہانگیر کے ہاتھوں کو کچھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

”مزنہ اسپتال میں ہے خولہ..... anxiety attack“ اور خولہ کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا چہرہ لمحوں میں سفید ہوا تھا۔

☆☆☆

خیال یہ ہی تھا کہ وہ چند دن اسی کیفیت کے زیر اثر رہے گی۔ اور پھر نارمل ہو جائے گی۔ آہستہ، آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ مگر مزنہ، مزنہ احمد نہ رہی تھی۔ وہ ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ ان تین ماہ میں وہ کتنی ٹھیک ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس طرح سے لگایا جا سکتا تھا کہ تین ماہ میں یہ دوسرا anxiety ایک تھا۔ یہ ایک بڑا اور سنگین مسئلہ تھا۔ خولہ اب اسے ادویات کے زیر اثر سوتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت حیرت انگیز طور پر پیلی اور گہری ہو چکی تھی۔ ہونٹ خشک اور سیاہ پڑ چکے تھے۔ آنکھیں اندر کو کھنس رہی تھیں، اس کے چہرے کی ساری رعنائی جیسے نچوڑ لی گئی تھی۔ خولہ یک تک اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا۔ ان کے سفید بالوں اور جھریوں زدہ چہرے اور جھکے کندھوں کو دیکھا۔ اک تکلیف کی لہری اٹھی اور کسی کوڑے کی طرح اس کے جسم پر ضرب لگا گئی تھی۔ وہ بے اختیار انہی

اور اٹھ کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ کب تک..... کہاں تک..... آخر کہاں تک..... وہ تھک چکی تھی..... خدا کی قسم وہ تھک چکی تھی۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اسپتال کے لان میں نکل آئی اور بیٹا اکیلے گوشے میں جا بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ تکلیف کی اس حالت میں تھی کہ جہاں آنسو ساتھ نبھاتے نہیں..... ساتھ جھوڑ جاتے ہیں۔ فرخندہ اسے یوں باہر نکلتا دیکھ کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل کتنا تھا۔

”خولہ..... بچہ.....“ شفقت سے کہتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اس نے کسی بچے کی طرح منہ ان کے سینے میں چھپایا تھا۔ وہ اس کا سر ہلاتی رہیں، تسلی بھرے انداز میں۔

”پچھو! خوشی کیا ہوتی ہے..... کہاں ہوتی ہے..... کیسی ہوتی ہے یہ.....؟ کہاں سے ملتی ہے پچھو.....؟“ وہ یونہی ان کے سینے میں منہ چھپائے بولی تھی۔ پچھو نے اک لمبی سانس بھچی تھی۔

”بتائیں ناں پچھو.....!“ اب کی بار اس نے منہ اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا اور پچھو کی آنکھ نم ہوئی تھی۔ وہ اسے بتاتی تو آخر بتاتیں کیا؟

”معلوم نہیں میری زندگی کب سیدھی ہوگی..... کب؟ مجھے اس سے کچھ نہیں چاہیے..... ماسوائے ذرا اسے سکون کے.....“ وہ دوبارہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر ہلکا سا بڑبڑائی تھی ایسے کے فرخندہ کو اب کی بار کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہتی ہے، کیا بولتی ہے۔

☆☆☆

سنگ کے کناروں پر میل اک واضح لکیری صورت موجود تھی۔ مسالاجات کے ڈبوں یہ گرد کی اک تہ جم چکی تھی۔ kitchen cabinets اتاری کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ کوکنگ ریج کی حالت بھی چیخ، چیخ کر کہتی تھی کہ اسے صفائی کے لیے کسی کے بھی ہاتھ دستیاب نہ رہے تھے اور وہ حیرانی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

”مزنہ اتنی بے پروا تو کبھی نہیں تھی۔“ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ ابو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ان کی وارڈروپ..... چپک کی تو نتیجہ حسب توقع تھا۔ ایک جوڑا بھی پریس کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔ کپڑے گول مول کر کے الماری میں ٹھنڈا دیے گئے تھے، تیر کر کے نہ رکھے گئے تھے۔ اور اس طرح سے ٹھنڈائے گئے کہ الماری کا پٹ کھولتے ہی ایک ذخیرہ خولہ کے پیروں پر آن گرا تھا۔ خولہ نے جس تیسری چیز کا جائزہ لیا تھا وہ گھر کی اندرونی چھت تھی جا بجا ٹپکتے جالے، فرنچیز پر ڈسٹ، بے ترتیبی اک کمال ترتیب سے پورے گھر میں بکھری نظر آتی تھی۔

”یہ..... یہ اس کے پیچھے کیا ہوتا جا رہا تھا..... کیا؟“ وہ ابو سے پوچھتی تو وہ ادھر، ادھر کی بات کر کے ٹال دیتے۔ اس نے محسوس کیا کہ ابواب اس سے باتیں شیر نہیں کرتے تھے..... چھپاتے تھے، وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے مگر..... یہ سب..... یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اس نے نسیم باجی کو پکڑا تھا، جو گھر کی ملازمہ تھیں۔

”خولہ بیٹانہ ہی پوچھو تمہارے جانے کے بعد ہوا کیا ہے اس گھر میں..... مزنہ بیٹا سارا، سارا دن کمرے میں بیڑی روتی رہتی تھیں۔ کھانے کا ہوش اور نہ باپ کا خیال..... پھر جو رونا تھا تو عجیب بد مزاج اور چڑچڑی ہو گیا۔ صاحب جی سے جھگڑا کر لیتی ہیں کسی چیز پہ توجہ نہیں دیتیں۔ صاحب جی اپنے کپڑے بھی خود ہی استری کرتے ہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی صاحب جی کو کہہ دیا۔“

اور اس کے آگے جو نسیم نے کہا اس نے خولہ کے جسم اور ذہن دونوں کو اک زبردست الیکٹرک شاک سے....

”مزنہ نے ایسا کہا؟“ وہ بے یقینی سے پوچھتی تھی۔

”جی..... کئی دفعہ تو ان کی طبیعت اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ سانس اکڑے لگتی ہے۔ سوتی بھی

خولہ بیٹا۔“ نسیم بتا رہی تھی اور خولہ کے ہاتھوں، پیروں سے جیسے جان لٹکتی جا رہی تھی۔

اتنا کچھ ہوتا رہا اور ایسا کیلئے بہتے رہے۔ اسے دکھ اس بات کا تھا۔ نسیم اب بھی اسے بہت کچھ بتا رہی تھی اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی سنتی رہی۔ چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ نسیم باجی کی باتوں کے لیے آج کا دن تو کم تھا۔ انہیں تو کئی دن درکار تھے، سر جھٹک کر اس نے جیسے خود کو حالت توازن میں لانا چاہا۔

”نسیم باجی! میں اب یہیں ہوں، سارے گھر کو صبح کر کے ہی جاؤں گی، آپ ذرا چن تو دیکھ لیں۔“ اس نے نسیم باجی کی زبان کے آگے جیسے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ وہ اک لمحے کو چپ ہوئیں اور پھر براسمانہ بتاتے ہوئے اٹھ گئی تھیں اور خولہ۔۔۔۔۔ وہ کسی لمحے وہاں بیٹھی اپنی کپڑی کو مسلتی رہی۔ درد محض کسپٹی میں ہی نہیں اٹھا تھا وہ تو جیسے ہر بن ہر مو میں ابل پڑا تھا۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔ کہاں سے لاؤں اتنی ہمت۔۔۔۔۔“ وہ کسی بڑھیا کی طرح ہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ابھی تھی۔ اس نے ہمت کو جمع کیا اور ارادے کو مضبوط کیا۔۔۔۔۔ وہ مزہ سے دو ٹوک بات کرنے جا رہی تھی۔ اسے سمجھانے جا رہی تھی۔ اک آخری بار، آخری کوشش اور پھر جیسے ہی اس نے مزہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو۔۔۔۔۔ وہ جھٹکے کیا تھے جو نسیم باجی کے انکشافات نے دیے تھے۔ یہ جو دھچکا تھا ناں جو کہ اس کا منظر تھا۔ یہ اسے سرے سے ختم کر کے رکھ دینے والا تھا۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو مزہ کے ہاتھ میں اک رومال تھا اور رومال میں۔۔۔۔۔

☆☆☆

”ماں جی اب وہ شادی شدہ نہیں رہی اور دوسرا عقد کرنے کے قابل ہے۔ ہر لحاظ سے قانونی، معاشرتی اور مذہبی، ہر لحاظ سے آپ کا اعتراض بلا جواز ہے۔“ اس نے ماں ہی کے ایک سواکھتر دفعہ کے دہرائے گئے اعتراض کے جواب میں ایک سواکھتر دفعہ وہی بات دہرائی تھی جو اس نے پہلے دن کہی تھی۔

”دنیا کی ساری کنواری لڑکیاں مرگتی ہیں کیا۔۔۔۔۔ تمہارے لیے بس وہ طلاق یافتہ ہی بچی ہے اور تم کتنی شادیاں نبھا چکے ہو؟ کنواریے ہو تو بیاہ بھی کنواری سے ہی کروں گی۔ تمہاری ضد ہے تو میری بھی ضد کسی۔۔۔۔۔“ اور وہ ہنس دیا۔ ”چلیں ٹھیک ہے ماں جی۔۔۔۔۔ ضد، ضد کھیلتے ہیں۔ اسی میں عمر بیت جائے گی۔ وہ نہیں تو نہ کسی پر کوئی اور بھی نہیں۔۔۔۔۔ اب آپ کی نافرمانی نہیں کر سکتا تو کیا ہوا۔ خود ہی اپنی مرضی تو چلا سکتا ہوں ناں۔۔۔۔۔ بس طے ہو گیا۔“ وہ اٹھ کر ان کے پیچھے آیا اور اب وہ زور، زور سے ان کے کندھے دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماں جی کے دل کو ہاتھ پڑا۔۔۔۔۔ مگر وہ پکامنہ بنائے بیٹھی رہیں۔ چار دن کی ضد بھی، ساری عمر تو نہ چلتی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ اب ساری عمر ہی چلتی تھی۔ وہ اس دفعہ کی چھٹیاں گزار کر واپس چلا گیا اور جاتے ہی کہہ دیا۔ اب نہیں آئے گا پاکستان۔ اب تب ہی آئے گا جب ماں جی مانیں گی۔ ماں جی نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کبھی ہارٹ ایک کے بہانے تو کبھی شوگر ہائی کبھی سانس اکھڑنے لگی تو کبھی مرنے کے ٹانگ لیکن اس نے بھی موکل چھوڑے ہوئے تھے۔ اس کی بہن تھی ناں۔۔۔۔۔ مکمل اور درست، بچی پر پور ننگ کرنے کے واسطے۔ سو ماں جی کے داؤ چلے ہوئے کار تو اس ہی ثابت ہونے لگے اور بالآخر۔۔۔۔۔ بالآخر۔۔۔۔۔ انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ اس نے فون پر ہی نکاح کیا تھا اور بہانہ۔۔۔۔۔ چھٹیاں نہیں مل سکتیں۔ نکاح کے بعد اس نے بیوی سے ڈاکو میٹس منگائے۔ ویزا اپلائے کیا اور پورے سال بعد وہ اسے رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔

☆☆☆

”ماں جی کہتی ہیں تم بہت چالاک ہو لیکن مجھے کیوں تم اتنی معصوم دکھتی ہو۔“ اور شوہر کے منہ سے پہلی بات سن

کر اس کا جھکا ہوا سر مزید جھکا تھا۔ وہ اس نے انداز پر سرایا۔
 ”اب ماں جی کو کیا پتا کہ مجھے معصومیت نے مارا۔۔۔۔۔ نہ ہی تمہارے حسن نے لوٹا، میں تو تمہاری آنکھوں سے
 پٹ گیا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ کہہ رہا تھا اور اس کا سر جھکتا ہی چلا جا رہا تھا۔ تو ایک جنگ، ایک لڑائی اپنے انجام کو پہنچی۔ اس
 نے کہا تھا کہ ماں، باپ کی رضا مندی سے ہی شادی کروں گا۔ اور اس نے کر دکھایا کہ وہ نام کا مرد نہیں تھا۔ وہ چھ ماہ
 کی چھٹی پر آیا تھا اور یہ چھ ماہ گزرنے تک سارا پیپر ورک بھی مکمل ہو جاتا تھا۔ ماں جی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا اس
 کا رروائی کا۔۔۔۔۔ وہ تو بیٹے کی روائگی کی منتظر تھیں۔ ادھر وہ جہاز پر بیٹھا۔ ادھر انہوں نے آستین چڑھائی تھیں۔ پھر
 جو وہن کا حال ہوتا۔۔۔۔۔ وہ حال اک زمانے نے دیکھنا تھا۔ لیکن وہ۔۔۔۔۔ وہ کچے کام کرنے والا نہیں تھا اور وہ اپنی ماں
 کو بھی جانتا تھا۔ مرضی کی شادی۔۔۔۔۔ لو میرج کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بھی ہم نے تمہیں پسند کیا۔۔۔۔۔ زمانے سے بھر کر
 شادی کی، لبو اب تم تاوان بھرو۔ ماں، باپ کی خدمت، ماں، باپ کی فرمانبرداری اس پر فرض تھی۔ اس کی بیوی کیوں
 تاوان بھرتی۔۔۔۔۔ کہا ناں وہ نام کا مرد نہیں تھا۔ عورت کا تحفظ، اس کی زندگی کا سکون جتنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا
 ہے اس سے کہیں زیادہ یہ مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر مرد یہ بات سمجھ لے اور تاوان کا کام لینے کے بجائے عقل کو
 استعمال کر لے تو love marriages کے ٹوٹنے کی شرح بھی زیادہ نہ ہو۔

☆☆☆

بارشوں کا موسم تھا۔۔۔۔۔ سیلا سا۔۔۔۔۔ ہر طرف نمی جیسے پھوٹی پڑتی تھی۔ دور کہیں رات کی سیاہی میں جھینگر بولتے تھے۔
 آسمان آج صاف تھا اور ستاروں کی چمک شاندار تھی۔ رات ٹھنڈی تھی۔ تاریکی میں لان میں لگے دیو قامت
 درخت پراسراریت کا مطلب سمجھاتے تھے۔

”خولہ۔۔۔۔۔ خولہ۔۔۔۔۔“ اسے اپنے نام کی پکار پڑتی سنائی دی مگر وہ شمس۔۔۔۔۔ بہری بی بی تھی۔ وہ چھت کے
 فرش پہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ ذہن سن ہو رہا تھا۔ سوچ مفلوج ہوئے چلی جا رہی تھی اور یوں لگتا
 تھا کہ ساون کا سارا سیلا پن اس کے اندر آن سلا تھا۔ وہ قطرہ، قطرہ بہہ رہی تھی۔ ٹپ، ٹپ کہیں دور سے آواز آتی
 تھی مگر معلوم نہ پڑتا تھا کہ کہاں پر بادل برسے۔

”خولہ۔۔۔۔۔ خولہ۔۔۔۔۔“ آواز اک دفعہ پھر سے آئی۔ وہ ابو تھے مگر وہ تو بہری تھی۔ سنتی تو آخر سنتی کیسے۔۔۔۔۔ جو
 اب ہوا تھا۔۔۔۔۔ ایسا تو وہ مگر کبھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ گمان کی گرد بھی اسے نہیں پاسکتی تھی جو کہ اب ہوا۔ ٹھیک ہے مرنہ
 کے ساتھ برا ہوا۔۔۔۔۔ حادثہ تھا جو کہڑے پڑا۔ وہ آیا، اس نے روندنا۔۔۔۔۔ اور گزر گیا۔ چند دن۔۔۔۔۔ چند روز۔۔۔۔۔ چلو
 مہینہ دو مہینہ۔۔۔۔۔ لوگوں کی باتیں اور ان باتوں کا زہر۔ سنا اور برداشت کر لیا لیکن جیسا بھی کڑا وقت تھا۔ جیسا بھی
 سخت حادثہ تھا۔ کتنا ہی دردناک البتہ تھا۔ وہ گزر چکا تھا۔ اسے گزر رہی جانا تھا لیکن نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو مرنہ احمد کے اندر
 جیسے ٹھہر چکا تھا۔ اس نے مرنہ احمد کو پکڑے رکھا تھا۔ وہ ابھی تک اس فیز، اس حادثے کے اثر سے باہر نہیں نکل سکی تھی
 اور حادثے نے اسے کیسے روندنا۔۔۔۔۔ کیسے اس کے دل کے وجود پر اپنے بھاری بوٹوں کے نشان چھوڑے تھے، یہ تب
 معلوم ہوا کہ جب اس دن خولہ نے مرنہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا اور رومال میں
 کوئی شے جسے وہ ناک کے پاس کیے ہوئے رکھ رہی تھی قطعاً اس بات۔۔۔۔۔ سے بے خبر تھی، غافل تھی کہ دروازہ کھول کر کوئی
 کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ خولہ چند لمحے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی یوں جیسے وہ سمجھ نہ پائی ہو اور
 پھر۔۔۔۔۔ پھر جیسے ہی سمجھ آئی کوئی چیز، اک تیز جھپٹی ہوئی لہری صورت اس کے ناک کے کھنوں سے ہوتی پورے جسم
 میں پھیلی تھی۔ یوں جیسے اس کی سانس کھینچ لی گئی ہو۔ اگلا قدم بین فطری تھا، اس نے جھپٹا مار مرنہ کے ہاتھ سے وہ
 رومال چھینا اور رومال میں موجود چیز لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری اور اب۔۔۔۔۔ اب وہ دونوں ہی شاک کی بدترین حالت

"glue sniffing" خولہ کے لب بے آواز طے اور اس نے بے حد، بے حد بے یقین ہو کر اس کا دیکھا تھا۔ پھر اس کی نظروں کا زاویہ بدلا اور اس نے مزہ کو دیکھا اور جب وہ مزہ کو دیکھتی تھی تو یوں محسوس ہوتا کہ حیرت اک لاوا تھا جو کہ اس کی آنکھوں سے ابلتا تھا اور مزہ کے وجود پر جا گرا تھا تھا۔ خولہ چند لمحے بدترین انکشاف کے زیر اثر ساکت، بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر..... اس کے بعد اس نے دوسرا کام وہ ہی کیا تھا جو ابھی بھی حالت میں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ڈرینگ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی اور اب وہ ایک، ایک کر کے ساری دراز کھول کھول کر کھنگالتی جا رہی تھی۔ اسی طرح اس نے سائڈ ٹیبل کی دراز بھی کھول کر نیچے الٹ دی تھی۔ الماری کو کھول سارے کپڑے نکال کر باہر پھینکے، سیف لاک کو کھنگالا وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی اب اور اس کے ہاتھ میں مطلوبہ تھی۔ وہ اس موڈی چیز کا شابر تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس شابر کو پکڑے یقین کر لینے کی پوری کوشش کرتی رہی اور پھر..... پھر اس نے غصے سے پیش سے پُرو کر پوری قوت سے شابر مزہ پر دے مارا تھا۔ اور بس اسی پر بس نہ کیا تھا آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑتے ہوئے اس نے کھینچ کر زور سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ بھی اسے دے مارا تھا۔ پھر جیسے کے ساتھ اسے پرے گرایا۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ رو رہی تھی۔ مزہ نکال پر ہاتھ رکھے، بیڈ پہلو کے بل گری بے یقینی سے اسے دیکھتی تھی اور وہ..... وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھاے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا تھا کیا؟ تو کیا..... کیا مزہ addict ہو چکی تھی؟“

☆☆☆

مزہ دراصل clinical depression کا شکار ہوئی تھی۔ پہلے اس کا رشتہ طے ہو کے نہیں دے رہا تھا پھر جب یہ مسئلہ حل ہوا تو عین شادی سے چند روز قبل شادی ٹوٹ گئی..... وہ بھی اس کی مرضی کے بنا اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ جتنی لاڈلی تھی اتنی ہی حساس بھی..... حادثہ اس پر پورے معنی و مفہوم کے ساتھ اثر انداز ہوا اور اسے نفسیاتی طور پر بری طرح سے مجروح کر کے رکھ گیا تھا۔ وہ ریکور نہیں کر سکی تھی..... مواءن نہیں کر سکی تھی۔ وہ اس لیے کے خانے میں پھنسی رہ گئی تھی۔ شروع میں وہ روئی رہتی تھی پھر اس کی نیند اور بھوک اڑ گئی۔ اس کا وزن دنوں میں گرا تھا۔ ایسے ہی دنوں میں اتفاقاً اس کے ہاتھ یہ چیز لگ گئی جو کسی چیز کو جوڑنے کے واسطے اس نے استعمال کی اور پھر اس کے ہاتھوں یہ لگی رہ گئی تھی۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو اک خوشبو نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے، کسی خیال کے تحت اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا اور حیرت انگیز طور پر اسے وہ خوشبو، جو کسی بھی نارمل انسان کو خوشوار محسوس نہ ہوتی۔ اسے وہ خوشوار اور بے حد بھلی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بار بار ہاتھوں کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھتی رہی اور پھر اس رات..... اس رات ہنا کسی کوشش، ہنا کسی دوا کے وہ اک پر سکون نیند سوئی تھی۔ پھر تو سمجھو روز کا معمول ٹھہرا۔ وہ اس خوشبو کو سونگھتی اور سارا درد، ساری تکلیف، ساری اذیت اور ساری جلن پتا نہیں کہاں چلی جاتی تھی۔ اس کے اعصاب ریلیکس ہو جاتے تھے اور وہ سکون کی اک چرلطف کیفیت سے دوچار ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ سیریس ہے مگر علاج سے، توجہ سے حل کیا جاسکتا تھا اور یہ کہ ابھی وہ پوری طرح سے ایڈکٹ بھی نہیں ہوئی تھی سو امید پوری طرح سے موجود تھی۔ اور اس ٹھنڈے، میلے چھت کے فرش پر بیٹھتے ہوئے خولہ نے اک فیصلہ کیا تھا۔ تنہا، اکیلے اور شکستہ تر ہونے کے باوجود..... اس نے ریزہ، ریزہ بکھری ہمت کو جمع کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی..... وہ اب مزید ایک ٹھہریلو، عام سی شادی شدہ عورت نہ رہی تھی۔ وہ فیلڈ میں کام کرنا جانتی تھی۔ وہ اب پریکٹیکل وومن تھی۔ اسے جیسے اکیلے فیصلے کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ 6 آپ اس کی بات کو سنا اور دوس کے طور پر اس کی بات کو دہراتے ہوئے ایک دم انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

”مسز جہانگیر..... یہ ناممکن ہے..... آپ کے پیریڈز، وہ کس طرح سے میچ ہوں گے۔ ایک دو پیریڈز کی بات ہو تو substitute لگایا جاسکتا ہے مگر 5، 6 پیریڈز..... مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ایسی درخواست کی۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کو کیا جواب دوں گی اس فوراً۔“

”مس مفتی میری بہن بہت بیمار ہے اور اس کو کئی کئی ضرورت ہے۔ میرے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی کئی کر سکے..... میرا آدھا دن تو دھر اسکول میں ہی گزر جاتا ہے۔ رہا باقی آدھا دن تو اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کو بھرپور توجہ کی ضرورت ہے ورنہ وہ ریکور نہیں کر پائے گی۔“ اس نے اپنی مجبوری بیان کی اور وہ دونوں ہی اب خاموش تھیں۔

”اگر میں کوئی بیماری کا.....“

”نہیں مسز جہانگیر..... میں دوسرا کام کرتی ہوں اور نہ ہی ایسا کسی دوسرے کو کرنے دے سکتی ہوں۔ آپ کے مسئلے کا یہ حل ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی کلاسز میں اور چلی جایا کریں۔ گو کہ مجھے اس کے لیے بھی پورے ٹائم نہیں مل سکتا۔ پڑے گا اور دیگر اسٹاف کا بھی خیال کرنا ہوگا۔ مگر میں یہ کر لوں گی، آپ کے سارے پیریڈز اکٹھے کر دوں گی تاکہ آپ کو آسانی رہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔“ ان کا انداز لفظی تھا۔ خولہ چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی۔ جب وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کل، پرسوں..... کسی ایک دن جہانگیر کو جرمی جانا ہی تھا تو تب..... تب اسے اپنا اور پچھو کا خرچا اٹھانا تھا۔ سو وہ چاہ کر بھی یہ جاب نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

”جھینک یوس مفتی..... جھینک یوسوچ.....“ اس نے محنت سے کہا اور ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔ یہ پہلا کام تھا جو اس نے کیا۔ دوسرا کام..... اسے ابو کے گھر شفٹ ہونا تھا، جس کے لیے اسے جہانگیر اور پچھو سے بات کرنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پچھو اتنا مسئلہ نہیں کریں گی مگر جہانگیر..... اور جہانگیر کو وہ کبھی یہ بتانے والی نہیں تھی کہ مزہ glue sniffing کا شکار ہو رہی ہے اور جہانگیر..... وہ اس کی بات سن کر اس کی شکل دیکھتا رہا۔

”مزہ بچی تو نہیں ہے خولہ.....“

”ہاں، وہ بچی نہیں مگر وہ بیمار ہے جہانگیر.....“

”تو تمہارے وہاں جانے سے کیا ہوگا؟“ اس نے تکلیف سے جہانگیر کو دیکھا۔

”اب اب اس عمر میں اسے لے کر ڈاکٹر کے ہاں چکر پہ چکر لگائیں۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہے جہانگیر، اسے مسلسل چیک اپس اور توجہ کی ضرورت ہے اور.....“ اس نے ذرا سے توقف کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے وہاں جانا ہے۔ چاہے تم رضامند ہو یا نہیں.....“ پھر اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ جہانگیر کے ماتھے پر لکیریں ابھریں مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر پیکنگ کرنے لگی تھی۔ اسے عادت ہو گئی تھی اپنے فیصلے خود کرنے کی.....

☆☆☆

”آپ لوگ اپنا وقت اور پیسہ دونوں برباد کر رہے ہیں..... جب یہ ہونا ہی نہیں تو اس کے لیے کوشش ہی کیوں کی جائے۔“ وہ بی بی لاؤنچ میں بیٹھی تھی۔ سامنے اسکرین پر کوئی ڈراما چل رہا تھا اور وہ سیب کے بڑے بڑے ہائس لیتے ہوئے انتہائی بے حسی اور بے پروائی سے بولی تھی۔ احمد صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا..... خولہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے چند لمحے رک کر ان

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ہم وقت اور پیسہ دونوں برباد کر رہے ہیں اور یہ کس نے بتا دیا تمہیں کہ ایسا ہونا ہی نہیں..... کیا الہام ہوتے ہیں تمہیں؟“ وہ نرمی سے کہتے ہوئے اس کے پاس صوفے پر بیٹھی اور جھک کر اسٹریپ کھولتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کو جوتوں سے آزاد کیا تھا۔

”مجھے جیسی لڑکی سے کون شادی کرے گا بھلا؟“

”ہاں، یہ تو سوچنے کی بات ہے کہ تم جیسی لڑکی سے بھلا کون شادی کرے گا؟ تم تو لٹلڈی ہو، اندھی ہو، بھری بھی ہو اور بد صورت مچی..... اور اوپر سے کاٹی بھی تو ہو۔“ خولہ اب بھی نرمی سے کہہ رہی تھی اور مزہ نہ رہا بدل کر خشکیں لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ احمد صاحب اور خولہ..... دونوں آج بھی نہیں سے ہو کر آئے تھے مزہ کے سلسلے میں اور جب وہ دونوں اسی پروپوزل کو ڈسکس کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو تب مزہ نے انتہائی بد مزاجی سے کہا تھا۔ خولہ نے اک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے جوتے اٹھا کر وہ کمرے کی طرف چل گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ٹھیک ہے وہ بہتر ہو رہی تھی مگر ایک چیز جیسے اس کے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، نہیں ہو سکتی تھی۔ بھلا ایک ایسی لڑکی جس کی شادی عین شادی ہونے سے چند روز قبل ٹوٹ جائے اس سے کون کرتا ہے شادی..... پاگل ہی ہوگا کوئی..... خولہ جانتی تھی اس خوف، اس وہم سے باہر آنے کے لیے بھی اسے وقت چاہیے تھا اور ڈاکٹرز کہتے تھے کہ اس کا ”فوری حل“ یہی ہے کہ اس کی کہیں شادی کر دی جائے اور یہ جو ”فوری حل“ تھا ناں یہ اتنا فوری و فوری نہیں ہو سکتا تھا۔ خولہ کو وہاں آئے کافی دن ہو چکے تھے اور وہ ایک بار پھر اسکول اور سسرال کے مابین سینڈ وچ بنی ہوئی تھی۔ ویک اینڈ پر وہ سسرال چایا کرتی تھی اور یہ چیز ایک بار پھر سے نئے سرے سے اس کی طاقت کو ختم کرنے لگی تھی۔ مسئلہ اب کی بار پھر وہی درپیش تھا۔ کوئی مناسب، ڈھنگ کا پروپوزل نہیں مل رہا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق اگر ایسا جلدی نہ ہوا تو مزہ ڈریشن کے ایک لمبے فیئر میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ اس حد تک ناامید اور مایوس ہو سکتی ہے کہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ اب تک کی سب سے پریشان کن بات تھی۔ علاج ہو سکتا ہے، زخم مندمل ہو سکتا ہے، مگر ہم رکھا جاسکتا ہے مگر جو انسان خود ہی ٹھیک نہ ہونا چاہے اس کا کیا..... کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

”ابو وہ بہت بری طرح سے ری ایکٹ کرے گی۔ میں جانتی ہوں ناں.....“

”اس میں ری ایکٹ کرنے والی کون سی بات ہے خولہ..... لڑکا اس سے عمر میں ذرا سا چھوٹا ہی تو ہے..... باقی تو یہ ایک بہترین پروپوزل ہے.....“ احمد صاحب حیران ہوئے۔

”ابو، ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی سوچ ابھی اتنی ریٹیکل نہیں ہوئی۔ مرد کو عورت سے بڑا ہی تصور کیا جاتا ہے اور مزہ..... میں کہہ رہی ہوں ناں وہ ری ایکٹ کرے گی۔“

”تم بات کرو۔ دیکھو تو سہی بھلا وہ کیا کہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں بات کروں گی اور اگر اس نے انکار کر دیا تو؟“ خولہ کی بات سن کر احمد صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”تو میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ یہ ہو تو فی ہے۔“ ذرا سے توقف کے بعد جواب آیا تھا اور خولہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

(جاری ہے)



فاصلوں کا فیصلہ

شایاعسیم

”ایمن کیا تم سنجیدہ ہو؟“ اس نے ایمن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا جو اپنے خوب صورت ناخنوں پر سے بے پروائی سے نیل پالش کھرچ رہی تھی۔
 ”ہاؤ ناں.....“ وہ پریشانی سے پھر گویا ہوئی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ایمن نے ترچھی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھئی سب حالات و واقعات تمہارے سامنے ہیں.....“
 ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ سیر بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“
 ”ہونہہ.....“ ایمن نے اپنی ناک چڑھائی۔
 ”اگر وہ مجھے چاہتا ہوتا ناں تو میں آج یہاں نہ ہوتی..... وہ تو خوش ہوگا کہ میں اتنی آسانی سے اس کی زندگی سے نکل گئی..... ہوگا اپنے دوستوں کے ساتھ سیر سائوں میں مصروف۔“
 ”اور وہ تمہاری ساس؟“ رابعہ بولی۔ ”وہ تو تمہاری سگی خالہ ہیں..... اور وہ گھر تمہاری سرال ہی نہیں،

مہارانی کی حالت کا مہاراجہ نے، مہاراجے اس جیسے سے پورے خاندان پر اثر پڑے گا۔

”بس! بس! رہنے دو راجہ، سگی خالہ ہونہ۔۔۔۔۔!“
شادی کے بعد کوئی سگی خالہ والہ نہیں ہوتیں اور نہ وہ خالہ کا گھر ہوتا ہے بلکہ وہ صرف ساس ہوتی ہیں اور وہ گھر صرف سرسرا ہوتا ہے، جہاں بہو سے کوئی خوش نہیں ہوتا ہے۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے راجہ، میں یہ سب نہیں سمجھتی، میں جانتی ہوں کہ امی اور خالہ امی، سگی بہنیں ہیں۔۔۔۔۔ اور اس فیصلے سے ان کے آپس کے رشتوں میں دراڑ آجائے گی۔۔۔۔۔ لیکن میں اب میرے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اور تمہیں پتا ہے خالہ بنو کیا کہہ رہی تھیں؟ یہی کہ میرے چہرے سے بالکل نہیں لگتا کہ وہ تمہارے جانے سے دکھی ہے یا پریشان۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تو دعویٰ جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اور کافی خوش لگ رہا تھا۔“

”خالہ بنو؟“ راجہ نے سوالیہ نظروں سے ایمین کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ ”یہ وہی تو نہیں جو تمہاری امی کی کزن ہیں۔“

”ہاں، ہاں وہی لیکن امی ان سے بالکل سگی بہنوں کی طرح ملتی ہیں۔ وہ بچاری خود اتنی دکھی ہیں ابھی ان کی بیٹی آمنہ کو ڈائیورس ہوتی ہے اور ان کے شوہر کی جاب بھی چھٹ گئی۔ بچاری خود کافی پریشان ہیں۔ لیکن راجہ مجھے وہ اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی ہیں، ایمان سے۔“ ایمین نے راجہ کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھتے ہوئے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ تو تمہیں ضرور چاہتی ہوں گی۔۔۔۔۔ لیکن یہ معاملہ تمہاری اپنی زندگی کا ہے اور ایمین تم جذباتیت سے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔“ راجہ اس کی بیٹ فریڈنڈی اور سچے دل سے اس کی خیر خواہ تھی۔ وہ دونوں بچپن کی دوست تھیں اور راجہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایمین کے فیصلوں میں جذباتیت زیادہ ہوتی ہے۔

”اچھا راجہ۔۔۔۔۔ میں چلتی ہوں، بس تم جلد از جلد کسی جاب کے بارے میں بتانا۔ آج موسم بھی ابرا آلود ہو رہا ہے ایسا نہ ہو کہ برس پڑے۔“ وہ راجہ کے روکنے پر

لہرانی کی۔ بس تم میرا کام یاد رکھنا۔
راستے میں ہی ہلکی، ہلکی بوند باندی شروع ہوئی تھی۔۔۔۔۔ وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف آ رہی تھی۔ دونوں کے گھر نزدیک ہی تھے۔ جبھی اس نے اپنے گھر کے دروازے کے پاس خالہ بنو کو اسکوٹر سے اترتے دیکھا۔

”ارے ایمین تم کہاں پھر رہی ہو؟“
”خالہ میں راجہ کی طرف گئی تھی۔“
”اس موسم میں؟“ انہوں نے آسان کی طرف دیکھتے ہوئے ایمین کو مٹھوک نظروں سے دیکھا۔

”ہاں وہ خالہ بنو اصل میں، اس سے جاب کی بات کرنی تھی۔“

”اچھا! تو کیا اب تم جاب کرو گی؟“ انہوں نے گھر میں داخل ہو کر چادر اتارتے ہوئے پوچھا۔
”جی خالہ بنو اب ایسے تو نہیں بیٹھ سکتی کچھ تو کرنا ہوگا نا۔۔۔۔۔“

”باجی، میں نے تو بہت سمجھایا اسے مگر اس کی ضد ہے کہ جاب کرے گی۔“ ذکیہ بیگم نے خالہ بنو کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

”ارے ہاں بہن۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔۔۔۔۔ ”میری اتنی حسین بھانجی ناقدریوں کے ہاتھوں ٹل گئی۔۔۔۔۔ سچی جب بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں اور ساتھ ہی آنکھوں سے نادیہ آنسو صاف کرنے لگیں۔

”میں نے تو صبر (ایمین کی ساس) سے صاف کہہ دیا کہ تم نے قدر نہ کی، میری پھول سی بچی کی۔“ انہوں نے ایمین کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اور اسے دیکھو لانا مجھے کہہ رہی ہے کہ ایمین کو گھر بسانا نہیں آتا۔۔۔۔۔ نہ اٹنے بیٹنے کا ڈھنگ ہے نہ ہی ہنسنے بولنے کی تمیز۔۔۔۔۔ منہ پھاڑ کر تو ہنستی ہے۔“

”میرے بارے میں خالہ امی نے یہ کہا؟“ ایمین بیٹھے سے کھڑی ہو گئی۔

”ہاں تو اور کیا۔۔۔۔۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس خالی کیا۔

”اور کیا، کیا کہا انہوں نے؟“ ایمن نے غصے سے پوچھنے لگی۔

”ارے بیٹا جانے دو..... خواہ مخواہ کی چغلی ہو جائے گی اور میری عادت تو ہے نہیں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے بات کروں..... میں تو صاف بات کرتی ہوں کسی کو بھلی لگے چاہے بری..... لگی لپٹی تو ہم سے ہوتی نہیں ہے بھیا! میں نے صاف بول دیا کیا ایمن تو اتنی حسین ہے اور اس کے لیے تو بہت رشتے تھے، تمہیں اپنا کچھ کراچی چاندی بچی دی تھی..... اور اب تمہیں اس میں کیڑے نظر آنے لگے..... پتا ہے وہ کیا کہنے لگیں کہ صرف صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی..... سلیقہ، تمیز بھی ہونا چاہیے جو ایمن میں نہیں ہے، شوہر کی پسند ناپسند، اس کا خیال رکھنا اچھی بیوی کے اوصاف ہیں..... جو ایمن میں ناپید ہیں..... صرف اسے حسن پر ناز کرنا، من مانی کرنا اور ایسی لڑکیاں گھر نہیں بناسکتیں۔“ ایمن حیرت سے منہ کھولے انہیں سن رہی تھی۔

”میں نے تو صاف کہہ دیا کہ اگر اتنی بری ہے ہماری بچی تو بھیا فارغ کر دو اور ہماری جان بخشو.....“

”کیا؟ باجی آپ نے ایسا کہہ دیا۔“ ذکیہ بیگم نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”ایسا کیوں کہہ دیا آپ نے..... میاں، بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے ہو ہی جاتے ہیں پھر صلح صفائی بھی ہو جاتی ہے۔“

”دیکھو ذکیہ..... ایمن کو میں نے ہمیشہ اپنی بچی کی طرح سمجھا ہے..... اور یہ کوئی اتنی گری بڑی نہیں ہے کہ کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ بھی بول دے اور میں چپکی بیٹھی سنتی رہوں.....“ غصے سے خالہ بنو کے نتھنے پھول رہے تھے۔

”اور تم بھی کسی خوش فہمی میں مت رہنا کہ سبیرا ایمن کو لینے آئے گا..... اس نے کہا ہے تم ناک بھی رگڑ لو تو بھی وہ خود ایمن کو لینے نہیں آئے گا..... اسے خود آنا ہو تو آئے..... اور ہماری شرطوں کے ساتھ۔“

”کیسی شرطیں باجی؟“ ذکیہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”ارے یہی کہ ایمن ان کی مرضی کے بغیر کہیں نہیں

جاسکتی کہ میکی بھی نہیں..... اور موبائل فون بھی استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ہر وقت موبائل میں ہی مصروف رہتی تھی..... اور گھر کے سارے کام کاج بھی کرے گی..... ارے تو تم کیا ایمن کو وہاں غلامی کرنے بھیجو گی..... بتاؤ.....؟“

”نہیں امی.....! میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ایمن نے خالہ کی باتیں سن کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ذکیہ بیگم سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔

”مجھے اب وہاں سب لوگوں سے نفرت ہو رہی ہے، کوئی اتنا کیسے بدل سکتا ہے۔“ ایمن روتے ہوئے بول رہی تھی۔

”اور ایمن تم کان کھول کر سن لو..... سمیر کا فون آئے تو اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، تم کوئی فالتو نہیں ہو کہ جب جا ہاڑکا دیا اور جب چاہا منہ لگا لا۔ یہ سلسلہ بس اب ختم ہی سمجھو.....“ انہوں نے ہاتھ جھاڑنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

”ایمن تم جاب کا کہہ رہی تھیں ناں، میرے ایک جاننے والے ہیں، ایسا کرتے ہیں ان سے مل لیتے ہیں..... ہو سکتا ہے کہ تمہارا کام بن جائے.....“

”ہیلو.....“ دوسری طرف سے ایمن کی مسلسل خاموشی پر رابعہ کو تشویش ہوئی۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں.....“ ایمن کی بیٹکی، بیٹکی آواز سنائی دی جیسے وہ رو رہی ہو۔

”ایمن سب خیریت ہے؟“ رابعہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

”رابعی، سمیر سمجھتا ہے میں اس کی دولت پر مرتی تھی اسی لیے میں نے اس سے شادی کی ورنہ اس کے لیے تو بہت اعلیٰ دولت مند گھرانوں کے رشتے موجود تھے اور یہ کہ اس نے اپنی غریب کزن پرتس کھا کر شادی کی تھی اور خالہ امی کہتی ہیں کہ میں بانجھ ہوں اسی لیے ان کو اب تک اولاد کی خوشی بھی نہیں دے سکی۔“

وہ اب سسک رہی تھی، ایمن کی بات سن کر رابعہ بھی

دنگ رہ گئی۔

”کیا؟ یہ سب میری بھائی نے ہی کہا ہے؟“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں..... رابعہ اس نے ایسا کیوں کہا.....“ وہ باقاعدہ روپڑی تھی۔ ”میں اسے بھی معاف نہیں کروں گی۔“

”ایمن پلیز سنبھالو خود کو..... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے جیسے بعض اوقات ہم غلط فہمی کی دیوار اتنی اونچی کر لیتے ہیں کہ جو نہ بھی کہا گیا ہو وہ بھی سنا لی دینے لگتا ہے۔ کیا پتا کچھ ایسا ہی ہوا ہو..... اور تم آنکھ بند کر کے اس سنی سنا پی اعتبار کر رہی ہو۔“

”کیا مطلب رابعہ.....؟“

”اچھا اس پر پھر بات کریں گے۔ بس تم میرے ساتھ کل آفس چل رہی ہو اور میں تمہیں پک کروں گی..... سمجھیں۔“

اگلے دن وہ صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی تھی۔ امی کو معلوم تھا وہ کہاں جا رہی ہے، بولیں کچھ نہیں بس اسے دیکھتی رہیں..... کچھ دیر میں رابعہ رکشے میں اسے لینے آگئی تھی اور اب وہ دونوں ایک شاندار آفس میں بیٹھی تھیں..... اور اس شخص کے انتظار میں تھیں۔ جس سے رابعہ کو ایمن کو ملنا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور کوئی بہت عجالت میں آفس میں داخل ہوا..... اور آتے ہی رابعہ سے لیٹ ہونے کی معذرت کرنے لگا۔ ایمن کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس نے جیسے ہی آنے والے کو مڑ کر دیکھا..... وہ اچانک کھڑی ہو گئی پھر اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا مذاق ہے رابعہ..... تم میرے ساتھ اس طرح کرو گئی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”ایمن پلیز ایجوونی مت کرو، تم میری بھائی کی بات تو سن لو۔“

”مجھے ان کی کوئی بات نہیں سننی..... چون لی ہے وہی کافی ہے، اب مجھے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں۔“ اس نے نیمل پر سے اپنا ٹیک اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تو مت کرو اعتبار.....“ میرا اس کے قریب آیا۔

”پلیز میری بھائی..... اور تم ایمن پلیز تم دونوں بیٹھ

جاؤ۔ میں تمہاری دوست ہوں صرف میری خاطر۔“ رابعہ کی آنکھوں میں التجا تھی..... ایمن کرسی پر ٹٹنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

”تم لوگ آپس میں بات کرو، میں تم لوگوں کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔“ رابعہ تیزی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی..... اور ایمن پیچ و تاب کھا کر کھڑی رہ گئی۔

”کیوں بات کروں میں! میں ایک غریب کزن، جس سے انہوں نے ترس کھا کر شادی کی تھی۔“ وہ..... بڑبڑا رہی تھی، میرا جو انگلیوں سے عادتاً اپنے بال سنوار رہا تھا۔ ایک دم رکا..... اور بغور ایمن کی طرف دیکھا..... اور

ایمن جو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس سے مسلسل اپنی طرف دیکھنے سے نروس ہو گئی۔ وہ دل کشی سے مسکرا دیا۔

”کیوں بھی، تم میں کیا کمی تھی جو میں تم پر ترس کھاتا بلکہ جہاں تک میں نے سنا ہے کہ تمہارے لیے کافی مالدار گھرانوں کے لڑکے چھوٹی پھیلائے کھڑے تھے بلکہ غالباً اب بھی تمہارے خواہش مند ہیں۔“

”ہاں تو اس میں کیا جھوٹ ہے۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ویسے بھی آپ کے گھر والوں کی نظر میں مجھ میں کوئی خوبی تو ہے نہیں..... ہنسنے کی تیز نہ بولنے کی، بیٹھنے کی نہ اٹھنے کی۔“

”ہاں اور میری تو بہت سی لڑکیوں سے دوستی ہے، جن سے میں رات، رات بھر موبائل پر باتیں کرتا رہتا ہوں۔“

”تو کیا نہیں ہے تمہاری لڑکیوں سے دوستی؟“ وہ نیکی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوہ کم آن ایمن.....“ وہ نرمی سے گویا ہوا۔ ”ان سب کو تم بھی اچھے سے جانتی ہو اور ان فیکٹ تمہاری بھی

ان سے دوستی ہے۔ لیکن میں نے کب ان سے رات بھر باتیں کی ہیں۔“ ایمن اس کی بات پر گڑبڑا گئی۔

”اس پر مجھے اعتراض ہے، کیا تم بتاؤ گی..... یہ سب کس نے اڑائی ہے۔“ وہ بغور سے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، آں..... رات بھر نہیں کیس لیکن.....“ وہ پھلائی۔

”لیکن کیا..... ایمن تم نے مجھ پر الزام لگایا..... اور

کچھ بھی نہ سوچا۔“ وہ رکا۔

کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ، شرمندہ ہی سکرادی۔

”بس، مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔“

”اور ہمارے اسی غصے کی وجہ سے سچ والے لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے، ہمارے درمیان مزید غلط فہمیاں ڈال کر۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں پتا ہے کہ خالہ بنو نے اپنی آمنہ کے لیے ای کو کہا ہے۔“

”کیا کہا ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہی کہ وہ آمنہ کا رشتہ میرے ساتھ۔“

”کیا؟“ وہ اس کی آدھی بات سن کر حیران۔

”تم ایسا سوچ بھی کیسے ہو سیر۔“

”میں نہیں سوچ رہا، بیوقوف لڑکی۔۔۔۔۔ بلکہ وہ ایسا

چاہتی ہیں۔“ سیر نے ایمن کے چہرے پر سے بالوں کی لٹ کو نرمی سے ہٹایا۔ وہ جیسے سکتے میں تھی۔

”میرے خدایا! میں انہیں کیا سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ اور

وہ۔۔۔۔۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”اور میں اپنی

بیوقوفی میں اپنا گھر برباد کرنے لگی تھی۔“

اور سیر سوچ رہا تھا کہ اگر اس روز رابعہ اسے نہ ملتی تو

شاید وہ بھی۔۔۔۔۔ یہ رابعہ ہی تھی، جس نے سیر سے بہت سی

باتوں کے بارے میں باز پرس کی۔۔۔۔۔ اور یوں بہت سے

حقائق سے پردہ اٹھا تھا۔ ورنہ دونوں اپنی اس جنگ میں سب

کچھ بار جاتے، بعض لوگ اپنے مفاد کے کیسے طرح آپ

سے کھیل جاتے ہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ ان پر اندھا اعتماد کر کے

ثابت کرتے ہیں کہ آپ واقعی اندھے ہیں۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔۔۔۔۔ رابعہ جوں لے کر داخل

ہوئی اور دونوں کے چہروں کو بغور دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے اکیلے ہی واپس جانا پڑے

گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ایمن سنجیدہ انداز میں بولی۔ جس پر سیر

اور رابعہ نے چونک کر ایمن کو دیکھا۔۔۔۔۔ ایمن نے باری،

باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ”بلکہ ہم دونوں تمہیں گھر ڈراپ

کر دیں گے۔“ ایمن نے ہنسنے ہوئے سیر کا ہاتھ تھاما۔۔۔۔۔ اور

اس کی ہنسی میں رابعہ اور سیر نے بھی ساتھ دیا۔

”اور ایمن کیا واقعی میں اتنا برا تھا کہ تم نے ایک

دفعہ بھی مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کی۔“ اس کے لہجے

میں دکھ بول رہا تھا۔ ”تمہیں جو بھی گلہ شکوہ تھا تم مجھ سے

کہتیں، مجھ سے لڑتیں، اس طرح گھر چھوڑ کر تو تم نے مجھے

ہی رسوا کر دیا۔“

”میں نے کوئی تمہیں رسوا نہیں کیا۔۔۔۔۔ بلکہ خالہ امی

نے ہی مجھے بانجھ قرار دے دیا۔ کہ میں ان کو اولاد کی خوشی

تک نہیں دے سکی۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے غصے سے ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”تمہیں بانجھ بنا دیا امی نے؟ یا تم نے جو مجھ پر

الزام۔۔۔۔۔ وہ رکا۔

”یہ الزام تو تم نے مجھ پر لگایا ہے ایمن لیکن میری

بے غیرتی کہہ لو یا میری اعلیٰ ظرفی کہ میں پھر بھی تمہارے

سامنے بیٹھا ہوں۔“ وہ تاسف سے مسکرایا۔ ”صرف اس

محبت کی وجہ سے جو مجھے تم سے ہے اور واقعی اس محبت نے

مجھے بہت خوار کیا ہے۔“ وہ دکھ سے ہنسا اور اس کی ہنسی میں

جیسے گرجیاں ہی سچیں تھیں۔

”میں؟“ ایمن نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ

کیا۔۔۔۔۔ ”میں تم پر اتنا گھٹیا الزام لگاؤں گی۔۔۔۔۔ تم ایسا سوچ

بھی کیسے سکتے ہو۔“ وہ حیرت زدہ تھی۔ ”کس نے کہا ہے

یہ سب۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ۔“ وہ غصے میں اپنی منھیاں سمجھتی

رہی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے، تم کیا کر لو گی؟“ وہ سوالیہ انداز

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔“

”تم ایسا کیوں کر لو گی ایمن؟ تمہیں تو اب میرے

ساتھ رہنا ہی نہیں ہے، تم تو کورٹ میں خلع کا کیس دائر

کرنے والی ہو۔“ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، میں نے ایسا کہا ضرور تھا لیکن میرا ایسا کرنے

کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”ایسے ہی ایمن میں نے بھی تمہیں غصے میں الٹا

سیدھا بول دیا تھا۔ میں تمہیں جھٹ نہیں کرنا چاہتا

تھا۔۔۔۔۔ لیکن تم تو اپنے گھر کا بیٹھ ہی گئیں۔ میرا نوٹ تک

دریو نہیں کیا۔“ اب وہ دوستانہ انداز میں اس سے شکوہ

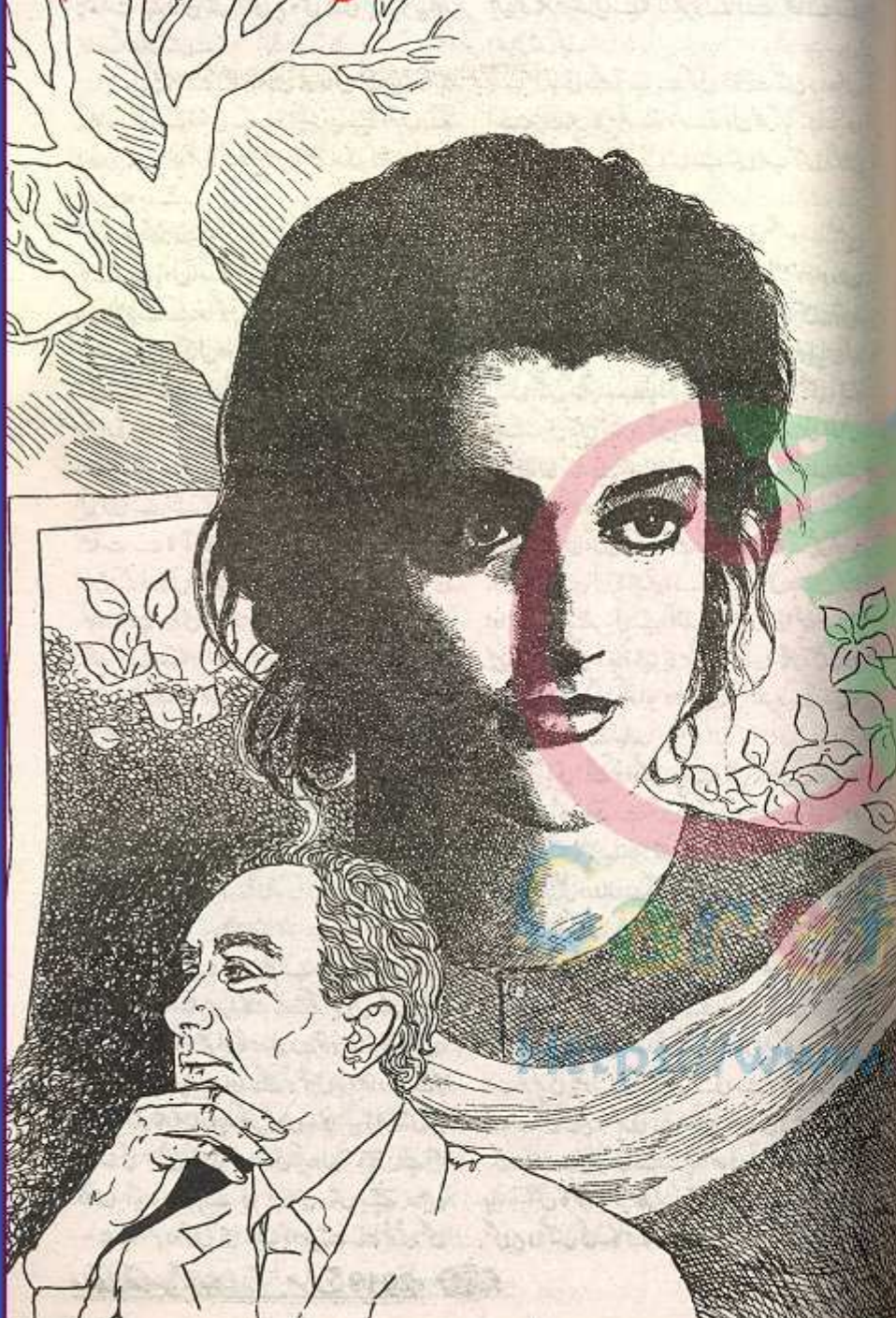


ناولٹ

بیگم جانجی

رفاقت حباوید

”اُف زندگی بھر اسٹرگل کی اور آخر میں پایا کیا؟
 سسکیاں، حسرتیں، آہیں اور آنکھوں میں ساون
 بھادوں کی جھڑی..... جو طویل سے طویل ہوتی جا رہی
 ہے، رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ کیا تروں.....؟“
 وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے بھٹکے ہوئے چہرے کو
 دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔ شام کا دھندلکا نہ جانے
 کب سے تاریکی کا پیراہن پہن چکا تھا۔ انہیں اس کی
 خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کے گھر کے



انداز میں کہا۔

”باجی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں..... بس اب میرا یہاں کام کرتے، کرتے دل بھر گیا ہے۔“ وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”اس لیے میں اب نہیں رکوں گی، میری اپنی زندگی ہے جی.....“

”ہاں تمہاری یہی تو مشہوری ہے جھمو..... لیکن میں نے یقین اس لیے نہیں کیا تھا کہ تمہیں معصوم اور ان بیگمات کو تیز سمجھ کر کسی کی ایک نہ مانی..... آخر تمہیں شرط پر رکھ لیا، آج تو تم نے وہی کر دکھایا جو میری سہیلیاں کہا کرتی تھیں کہ تمہارے پاؤں میں پتھر ہے، تم کسی ایک جگہ تک ہی نہیں سکتیں، آج میں شرط ہار گئی۔ فی الحال فوراً یہاں سے کچن میں جاؤ اور میری بارہ سہیلیوں کے لیے سچ تیار کرو تا کہ میں ہاری ہوئی شرط کا ہر جانہ آج ہی ادا کر دوں، اس کے بعد تم مجھے یہاں نظر آئیں تو یہ جو تمہارا تین سال کا بچہ تمہارے پیچھے روں، روں کرتا ہوا میرا بلڈ پریشر ہائی کیے رکھتا ہے ناں اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گی، جاؤ اپنا کام ختم کرو..... پھر تمہیں دو ہفتے کے کام کی تنخواہ دوں گی۔“ ثمرہ نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا۔

”باجی! مجھے تنخواہ نہیں چاہیے، میں سمجھوں گی میرے بیٹے کے سر کا صدقہ ہے، جس کی آپ کو ضرورت تھی۔“ وہ دھیمے لہجے میں طنزیہ انداز میں بولی..... اور تیزی سے بچے کو اٹھا کر داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”اس کا دماغ ہی خراب ہے، نہ جانے گھر، گھر کیا تلاشی پھرتی ہے؟ آج تک کوئی بھی یہ معاملہ نہیں کر سکا۔ حالانکہ فطرتاً عورت لا جواب ہے، خوش خلقی، خدمت گاری اور رکھ رکھاؤ تو اس پر ختم ہے لیکن جب نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر کسی کے غصے اور خفگی کی پروا کرتی ہے نہ ہی دوسروں کی ضرورت و مجبوری اسے نظر آتی ہے۔ بچہ اٹھاتی ہے اور یہ جاوہ جا..... اس کا رخہ تو ملاحظہ فرمائیں کہ دو ہفتے کی تنخواہ کی بھی پروا نہیں کی۔ کام چھوڑنے کی وجہ بتانے کی بھی

”کتنے اچھے تھے وہ دن جو بلال کے ساتھ گزر گئے۔“ اُن کے ذہن کے پردے پر جیکٹر پر بیٹے دنوں کے چیدہ، چیدہ مناظر آتے لیکن اضطراری کیفیت میں مندل ہو جاتے۔

ان کا مقدر بچپن سے ہی ایسا تھا جیسے آکاش پر کالے سیاہ بادل اور برستی ہوئی گاڑھی سیاہی..... جسے رب العزت کے سوا کوئی بھی مٹا نہیں سکا۔ تین سال کی عمر میں ماں کا انتقال ہوا تو باپ نے کسی بیچ خاندان کی لڑکی سے شادی رچالی۔ ان کا خیال تھا کہ اس... شکرگزاری اور احسان مندی کے صلے میں وہ ان کی بیٹی کو ماتا کے بھرپور پیار سے نوازیں رہے گی..... اور لاڈلی بیٹی اسی کے سنگ ایک مکمل عورت بنے گی۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ جب کسی ملازمہ سے بھی نکاح کے دو بول رشتہ استوار کرتے ہیں تو پھر وہ مالکن کہلاتی ہے، بیوی کی تمام ذمہ داریاں اس نکاح نامے پر دستخط کرنے کے ہمراہ ہی اس میں بیکرا لیتی ہیں، کچھ ایسا ہی حال تھا ان کا۔ بیٹی کا بچپن مار پھونکار میں گزرا..... جو نبی انہوں نے جوانی میں قدم رکھا، ان کی شادی خالہ کے بیٹے سے ہو گئی۔ اور وہ ہنسی خوشی کیے بعد دیگرے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن گئیں اور ان کی زندگی اپنے شریف انٹنس شوہر کے سنگ تناسب سے رواں دواں رہی۔

☆☆☆

”جھمو میرے پاس تم بے حد خوش بھی ہو اور مطمئن بھی..... پھر میرا کام چھوڑ کر پڑوس میں کیوں جانا چاہتی ہو؟ اگر تنخواہ کا مسئلہ ہے تو بڑھا دیتی ہوں، دیکھو تمہیں کام چاہیے اور مجھے تم جیسی با اعتماد عورت کا ساتھ..... تو پھر تم بارہ بار گھر کیوں بدلو.....؟ اور میں نئی ملازمہ کی تلاش میں مغر ماری کروں؟ بہتر ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں چلتے رہیں..... جب ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے خوش بھی

وہ نفرت آگئیں لہجے میں بولی۔ ”جس کی بیوی بیڑ روڈن ہے اور بڑھا کھوسٹ باتونی اور لاغر..... ان کی نوکری پکڑی ہے بھمنوں نے.....“
 ”مطلب کہ شمرہ شرط ہار گئی، فوری طور پر لنچ ہو جائے۔“

”انہوں نے چار میسے زیادہ آفر کیے ہوں گے، یہ تو ہوتا ہی تھا۔“ وہ تھہرے لگا کر مسخرا نہ انداز میں بولیں۔
 ”لنچ ونچ بھول جاؤ، نئی ملازمہ تو آنے دو۔ ویسے بھی ابھی تو میں شکا کڈ ہوں، ذرا سنبھل تو جانے دو۔“ وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر منمنائی اور گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

”فی الحال اس سردی میں گرما گرم چائے یا کافی کی ایک پیالی تو مل سکتی ہے نا کہ وہ بھی کل پرسوں پر ٹال دو گئی۔“ دونوں بھی کبھی کرنے لگیں۔
 ”نوکر کے بغیر جینا مشکل ہے لیکن ان کم بختوں کے ساتھ رہنا موت کے مترادف ہے، منہ پر پٹی باندھ لو اور پرس کی زپ کھول دو..... پھر بھی وفادارینے سے باز نہیں آتے، اس بار سوچا تھا کہ اپنی ہم جنس کو ہی خرابی کر لوں..... کچھ تو دید لحاظ رکھے گی۔ اس نے تو بھگو کر میرے منہ پر دے ماری ہے، یہ قوم ہے ہی نمک حرام جو مالک انہیں جوتی کی نوک پر رکھتا ہے، اس کے آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ بہت عجیب منیٹلٹی ہے اس کلاس کی۔“
 وہ صوفے پر بیٹھتے ہی بوتلی چلی گئی۔

”یار حوصلہ کرو.....! اور اب ڈنڈا رکھو ہاتھ میں..... آدھے مینے کی تنخواہ رکھو اپنے ضبط میں حفظ ماتقدم کے طور پر اور کھانے کے لیے اگلی ہوئی دال اور باسی چپاتی سے ان کا بخرو پیٹ، شرطیہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ ایک نے ہاتھ نچا کر تلقین کی۔

”بھئی یہ ظلم تو میں کرنے سے قاصر ہوں، جو خود کھاؤ وہی ملازم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ..... جب تک میرے ہاں لڑکے ملازم رہے میں ساتھ بٹھانے والا اصول بھانے میں نا کام رہی لیکن ان ملازمین کو

کے سر سے سینگ۔“ شمرہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ سے باہر رک کر شان بے نیازی سے چلتی ہوئی بھمنو کو حیرت اور تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ تین بنگلے چھوڑ کر چوتھے محل نما بنگلے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

”اچھا تو یہ ان کے گھر میں ملازمت کرنا چاہتی ہے، مزہ کچھ لو بھمنو..... کیسا زامنا آگیا ہے کہ پڑوسیوں کے دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ کیسے بے باکی اور دیدہ دلیری سے میری میڈ کو پٹالیا۔ ماما کا دور پہلو ہی میں تو کھڑا ہے، کیا مجال ہے کہ ایک گھر کے نکالے ہوئے ملازم کو کوئی پڑوسی، سبکی یا جان پہچان والا اسے ملازمت دے دے، اب تو تا بعد اور ہنرمند ملازم کی یوں حفاظت کرنی پڑتی ہے جیسے اپنی جین دھنیل جو ان بچی کی کہ کہیں کسی کی نظروں میں ہی نہیں آجائے۔ چلو صبر کا گھونٹ بھر کر انتظار کرتی ہوں اس کی واپسی کا..... اس شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی وہ میرے جیسی باجی ڈھونڈ نہیں پائے گی۔“ وہ خود کلامی کرتی ہوئی گیٹ کی اندرونی جانب مڑی ہی تھی کہ دائیں، بائیں کی رہائشی دوسیلیاں واک کرتے ہوئے اس سے اوپچی آواز میں بولیں۔

”شمرہ جلدی سے جا کر زپہن کر آؤ، مل کر واک کرتے ہیں۔“ شمرہ نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا..... آدھے منٹ میں ہی دونوں اس کے دو بدو کھڑی تھیں۔
 ”شمرہ کیا بات ہے..... کچھ پریشان نظر آ رہی ہو..... یہ اڑتی ہوئی چہرے پر ہوائیاں کیا پیغام دے رہی ہیں؟“ دونوں بیک زبان بولیں۔

”ہائے کیا بتاؤں؟ نظر لگ گئی کسی کی۔“ وہ پریشانی بولی۔

”کس کو کس کی نظر لگ گئی بھئی، گھر میں تو خیریت ہے؟“ وہ اس کے قریب ہو کر زار دارانہ لہجے میں بولیں۔
 ”اس کم بخت دو ٹکے کی بھمنو کو..... آنا فانا دفغان ہو گئی۔ تنخواہ کا مطالبہ کیا نہ ہی میری ایک سنی.....

میں نے مکمل آزادی دے رکھی تھی کہ جو ہم کھاتے ہیں وہی تم لوگ بھی کھاؤ۔ پھر بھی وہ چند مہینوں کے بعد تنخواہ لینے ہی غائب ہو جایا کرتے تھے، میں نے اس کا بھی خود کو مورد الزام ٹھہرایا کہ ہمارے درمیان اک حد ہونی ضروری ہے۔“ وہ پڑھ دنگی سے بولی۔

”ارے تم نے تو میاں کی موجودگی میں بھی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا شروع کر دیا تھا ناں، یہ اسی کا نتیجہ ہے شہرہ۔“

”بے شک انہیں تمام حقوق دینا ہمارا فرض ہے لیکن یاد رکھو کہ ہر رشتے، ہر تعلق کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہوئی ہے۔“ بھی ملازم اور مالک کا بھی ایک تعلق ہی تو ہوتا ہو۔ ملازم سے تعلق ہے ہی وقتی، عارضی اور غیر پائدار۔ وہ کبھی گھر کا فرد نہیں بن سکتا۔ یہ ان کی بد قسمتی ہے ہماری نہیں۔“

”ہاں سمجھ گئی۔۔۔۔۔ اب نصیحت کرنا بند کرو چلو اٹھو میرے ساتھ چائے دم دو۔۔۔۔۔“ تیوں مل کر چھموکی دھوکے بازی پر فاتحہ خوانی کرتی رہیں۔

☆☆☆

بھیمو لکھتی مقلتی سیکرٹری بلال خان کے گھر داخل ہوئی تو آمنہ بلال نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہیں صاف ستھری اجلی قبول صورت آیا مل گئی۔ آمنہ نے اسے اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ معمولی سا ہچکچائی اور پھر دم سے بیٹھ کر آمنہ کی ٹانگیں دبائے لگی، بچہ سہم کر اس کی ٹانگوں پر اوندھے منہ گر گیا۔ آمنہ نے اپنی نئی آیا کو آہستہ، آہستہ اپنے کام اور روٹین سمجھانا شروع کی۔ فجر کی نماز کے بعد سے جو چھوٹے کاموں کی شروعات ہوتی اور رات سونے تک بڑے کاموں کے ہمراہ اک ڈھیر لگ گیا۔ وہ تعجب اور خوف سے مالکن کے کام دل ہی دل میں گفتی چلی گئی۔

”آخری کام ذرا سا مشکل ہے۔“ آمنہ نے طویل سانس لے کر کہا۔

”بیگم صاحبہ آپ حکم تو کریں، میں کسی کام سے

میں اس کا لونگی کا ہر گھر چھان مارا۔۔۔۔۔ مگر عزت نصیب نہ ہوئی۔ ان بڑے گھروں میں جس کو بھی دیکھا وہ بہت چھوٹا ہی نکلا۔ تو بس پھر میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکی۔ ہم لوگوں کے لیے عزت پہلے اور پیسہ بعد کی ضرورت ہے، میں نے خان صاحب کی بہت تعریف سنی ہے۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔ ”کہ وہ بے حد خدا ترس اور عبادت گزار انسان ہیں۔“

”عزت دینا اور لینا تو ہر انسان کا حق ہے، تم فکر مت کرو۔۔۔۔۔ میری پہلوئگی کی بیٹی تو شادی کے فوراً بعد بیرون ملک چلی گئی۔ دو بیٹے بھی شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی اپنے روزگار کے حصول کی خاطر اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ دو بیٹے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے قریب ہیں ایک کراچی اور دوسرا لاہور میں زیر تعلیم ہے، صاحب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں، ایک بیمار بیوی کے ساتھ۔۔۔۔۔ ہم میاں، بیوی کے لیے اس وقت کچن میں خانہ ماں اور بیٹہ بھی ہے۔ صفائی ستھرائی، دھلائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے ایک عمر رسیدہ عورت بھی ہے، ان کے ساتھ تمہاری کمپنی بھی رہے گی۔ جونہی اماں کے کام ختم ہوتے ہیں، وہ اپنے گھر چلی جاتی ہے اگر وہ میرے کاموں کی ذمہ داری اٹھالیتی تو مجھے دوسری عورت کی ضرورت ہرگز محسوس نہ ہوتی۔“ وہ نرمابٹ سے بولیں۔ ”لیکن اب اس کی ہڈیوں میں جان ہی کہاں ہے؟“

”جی بیگم جی۔۔۔۔۔ آپ بے فکر رہیں، آپ کی خدمت کرنا میرے لیے نیکی بھی ہے اور فرض بھی۔۔۔۔۔ آپ میری ماں جیسی ہیں، آپ کو مجھ سے کبھی شکوہ شکایت نہیں ہوگی، مجھے تو آپ کی کمپنی ہی کافی ہے۔“ وہ عاجزانہ لہجہ میں بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی تم نے آخری اور ضروری کام کے بارے میں سن کر فیصلہ کرنا ہے کہ میری خدمت گاری منظور بھی ہے کہ نہیں۔“ آمنہ بنجیدگی سے بولیں۔

”بیگم صاحبہ بتا دیں، میں اپنا چڑکا بھلا کام چھوڑ

پھر اس کے پاس آئی ہوں، آپ کا خانا میں بھی
یہاں نہیں کر کے لایا ہے، منہ مانگی تنخواہ پر۔ مجھے مجبوراً
یہ نوکری قبول کرنی پڑی۔۔۔۔۔ ورنہ اس سنے کے ساتھ
نہیں بھی نوکری نہ کرتی۔۔۔۔۔ اس پر توجہ دیجی، آخر درس
جماعتیں پڑھی ہوئی ہوں۔“ وہ دھکی لپٹے میں بولی۔

☆☆☆

جنوری کے اوائل دن اور راتیں بے حد بخبت تھیں،
ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس بخبتی میں زمین اور آسمان یکجا
ہو گئے ہوں اور ان کے درمیان چرند، پرند، انسان اور حیوان
غرضیکہ ندی نالے، درخت اور پہاڑ زیدہ ہوں۔ آخری
شرط کے مطابق آمنہ کے کمرے میں بیڈ کی پاکٹی کی جانب
چھو گئے پر لیٹی گہری مٹھی نیند کی وادیوں میں تھی۔ آج کی
رات اس کے بچے نے بھی جو معمولی سی جنبش کی ہو۔ آمنہ
نے ہاتھ روم جانے کے لیے بلال کو آہستہ سے بلایا تو وہ
ایک دم سے چوٹے۔

”خان صاحب مجھے ہاتھ روم جانا ہے۔“

بلال توقف کے بعد پورے ہوش و حواس
میں آ چکے تھے۔ انہوں نے بیوی کو جواب دینے کے
بجائے چھو کو آواز دی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”بیگم جوانی کی نیند بڑے ہی ظالم طریقے سے
انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اس سے پہلے عمر
رسیدہ آیا تھا ہمارے ساتھ چلتی رہیں، اب تم نے اس جوان
لڑکی کو اپنے گرم کمرے میں سلا لیا ہے، اس کے کان کے
پاس ڈھول بھی بجا دوں گا تو یہ کم بخت نہیں جاگے گی۔ قصور
کس کا ہوا۔۔۔۔۔ میرا کہ تمہارا؟“ بلال نے وا کر ان کے
قریب کی اینٹیں سہارا دے کر بیڈ سے نیچے اتارا۔ وا کر ان
کے ہاتھ میں تھا کر ان کے ساتھ زیرو میٹر کی رفتار سے کمر
پر ہاتھ رکھ کر۔۔۔۔۔ چلنے لگے۔ اینٹیں ہاتھ روم میں بٹھا کر وہ
غصے میں کھولتے ہوئے کمرے میں آئے اور گدے کے
قریب بیٹھ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

”بیگم صاحبہ اٹھ جائیں، یہ ڈیوٹی تمہیں بیگم نے
پہلے ہی سے بتادی تھی۔“

چھو نے ان کے ہاتھ کو جھٹکے سے پرے ہٹایا اور
کروٹ بدل کر غنڈوگی کے عالم میں بوڑھائی۔

”میں جانتی ہوں تمہاری مجبور یوں کو۔۔۔۔۔ مجھے یہ
سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگوں کے والدین بیٹی کا رشتہ دیتے
وقت اندھے اور بہرے کیوں ہو جاتے ہیں؟ چرسی اور
اچھی شوہر تو بیوی کے کندھوں کا ایسا بوجھ بن جاتا ہے
کہ اسے پھینک سکتی ہے نہ اٹھانے کی ہمت رہتی ہے
بیچاری۔۔۔۔۔ اور پھر بچے پر بچہ۔۔۔۔۔“ آمنہ نے ترس و قہر
سے اس کی طرف دیکھا۔ لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔
بچہ سکسکایا بھرنے لگا تو چھو نے آمنہ کی ٹانگیں دبانی
چھوڑ دیں۔ اور بچے کو اٹھا کر لاؤنج میں ہی ادھر، ادھر
چکر لگا کر اسے بھلانے لگی کچھ دیر بعد دوبارہ ان کے
قریب ہی بیٹھ گئی۔

”چھو تم مجھے بہت غلطند دکتی ہو، یہ بتاؤ کہ اس
بچے کے ساتھ میرا کام کیسے کرو گی؟“ وہ فکر مند اندھے لپٹے
میں بولیں۔

”اس کی فکر مجھے کرنی چاہیے بیگم جی۔۔۔۔۔ آپ
مطمئن و پرسکون رہیں۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔
”ہم بوقت ضرورت اپنے بچوں کو معمولی سی انیم چٹا دیتے
ہیں، یہ سوئے رہتے ہیں، آخر کئی تو کرنی ہے۔“
”اوہ یہ تو بہت ظلم ہے ان معصوم جانوں پر۔“
آمنہ رپ کر سیدھی بیٹھیں۔ ”چھو میرے گھر میں یہ
ظلم نہیں چلے گا۔ کان کھول کر سن لو۔۔۔۔۔“

”میں نے بوقت ضرورت کہا ہے بیگم جی۔۔۔۔۔“ وہ
سجیدگی سے بولی۔ ”ہر وقت کا نشہ تو اسے بیکار اور ست
کر دے گا، میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے ایک مہینے کے لیے
لڑائی تو کریں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، میری بھی مجبوری ہے، مجھے غلیظ
لڑکیوں سے بہت شہن آتی ہے، خانا ماں نے تمہاری
جتنی بھی تعریف کی تھی تم تو اس سے کئی گنا بڑھ کر نکلیں۔۔۔۔۔

جنگی کتنی ٹھنڈی، بے آرام اور تاریک ہوتی ہوگی، آج اسے زندگی میں شاید پہلی بار گرم کمرے میں نرم بستر پر سونے کا موقع ملا ہے، اس پر خفا مت ہونا، دو چار راتوں کی پرسکون نیند کے بعد اس کی آنکھ پہلی آواز پر ہی کھل جائے گی۔ ”وہ انہیں نرمی سے سمجھاتے ہوئے کمرے میں لے گئے اور سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا اور پیار سے ان کے گل چھوتے ہوئے کہا۔ ”میری جان تھوڑا سا صبر کرلو۔“

”بلال! بلال! ایک دم سے اچھلے اور اسے پھر سے بلایا لیکن اس بار وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔ اسی کیفیت میں وقت گزرتا گیا جب آمنہ نے آواز دی تو وہ ایک دم سے ہوش و حواس میں اُدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگے، جھومو گہری نیند میں تھی۔ اور وہ خود نیم غنودگی میں اس کے پہلو میں لیٹے ہوئے تھے، یہ کس وقت ہوا وہ حیران و پریشان لگے۔ یہ بٹھ گئے، شاید نیند نے غلبہ پایا تھا کہ وہ وہیں لیٹ گئے تھے۔

”ادمانی گاڈ..... مجھے معاف فرمانا میرے رب.....“ یہ مشکل وہ سیدھے کھڑے ہوئے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ ہولے، ہولے ہاتھ روم کی جانب چل دیے۔ جب دروازے سے باہر آئی بیوی پر نظر پڑی تو ستر سالہ بلال نے ٹھنڈی طویل سانس بھر کر کہا۔

”آمنہ تمہاری چوٹس کا جواب نہیں، خانسا ماں تو انعام کا مستحق ہے۔“

”خان صاحب وہ آپ کی آوازوں سے بھی نہیں جاگی۔ تو میری بیمار اور لاغر آواز اسے کیسے بیدار کرے گی۔ میرا دل تو گزر رہی جاتا تھا۔ بچاری اماں گھر کا کام کرتی ہوئی مجھے سہارا دے ہی دیتی تھی۔ کیا کروں خان صاحب مجبوری میں ہی اسے قبول کیا ہوا تھا۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے ہی بہتر ہے مگر اس سے بڑی عجیب سی بو آتی ہے، سردیوں میں تو اس کا کھانا ہی محال ہے بلکہ جو بھی آیا آئی وہ اک مخصوص تعفن میں نہاتی ہوئی ہی ملی، یہ پہلی لڑکی میں نے ایسی دیکھی ہے کہ کسی جنگی کی رہائشی نہیں لگتی، ورنہ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر جوان لڑکی کو اپنے گھر کی طرف جھانکنے بھی نہ دیتی۔ مگر میں اس میں ٹپل ہو گئی۔“ وہ وا کر کو پکڑتے ہوئے بولیں۔ ”میں اسے کل ہی چلتا کروں گی ایک تو جوان دوسرے بے حد حاضر جواب۔

میں نے اسے اپنے کمرے میں سونے کے لیے نہیں رکھا کہ آپ اس حالت میں رات بھر ڈھنگ سے سو سکیں۔“

”خان صاحب آج آپ کو میری بے بسی اور محتاجی پر ترس بھی آیا اور پیار بھی، یہ معجزہ جھوٹوں کے ایک سہانا خواب.....“ وہ حیران کن لہجے میں بولیں۔

”بیگم، خواب نہیں، ایک حقیقت سمجھو.....“ بلال ان کے گرے لہجے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

”ہرگز نہیں مانوں گی، ایک وقتی ابال ہے ہمدردی و رحم کا.....“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر نرم ناک لہجے میں بولیں۔

”شوہر کی محبت کا امتحان بیوی کی بیماری میں ہوتا ہے اور بیوی کے پیار کو شوہر کی بے روزگاری میں آزمایا جاتا ہے، میں تو ہوئی کامیاب کہ آپ کو مشکل وقت میں بھی نہ چھوڑ پائی تھی۔ یاد ہے ناں وہ وقت جب میں نے اپنا تمام زور آپ پر قربان کر دیا تھا۔ آج آپ کے پاس وافر دولت نہ سہی..... بسر اوقات سے زیادہ بینک بینکس ہے، میں نے پھر بھی کبھی سونے کی واپسی کا تصور نہیں کیا۔ آج آپ کی پارینہ ہمدردی دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا ہے کہ میں بہت ہی عجیب اور نرالی فطرت کی بیوی کیوں ہوں۔“

”بیگم تم ٹھیک ہو جاؤ، تمہیں جیولر شاپ پر لے جاؤں گا، تم اپنی پسند کا زیور خرید لیتا۔ اگر تم نے اس کا اظہار پہلے کر دیا ہوتا تو خدا کی قسم تمہیں اسی وقت اس سے ڈبل سونا دلا دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ سونا عورت کی سیکڑیوں میں رہتا ہے، اسے خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ میں نے سمجھا کہ تمہیں اس میں دلچسپی نہیں جو تم نے اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔“ وہ ان کے جھریوں زدہ

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پیشہ کاری

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

اجمل زیدی کے لیے پاکستانی مسکن پروگرام ایوارڈز ہولڈر



ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

کان نمبر 162 سڑک نمبر 20 بکسر G-8/1
سرکاری لکھنؤ (ک) اسلام آباد
فون (051) 32331725
موبائل 0300-8566188

سینٹر

9- اپریل 30ء مئی
9- اگست 30ء ستمبر
9- دسمبر 30ء جنوری



AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

گلف سینٹر

آفس نمبر 16

فیروز پور روڈ سرگرم چوکی
نزدیک انڈین بینک لاہور

موبائل نمبر 0300-8566188

14- فروری تا 27 فروری

14- جون تا 27 جون

14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

قیام

پشاور

پیشہ کاری

کیم فروری 11ء فروری

قنی روڈ نزد بھٹو چوک پشاور
موبائل 0300-8566188

قیام

کیم جون 11ء جون

کیم اکتوبر 11ء اکتوبر

ملتان

پیشہ کاری

12 مارچ تا 6 اپریل

ریٹس سڈ روڈ نزد چوک مزاج ہاؤس ملتان
فون (061) 4518061-62

4582803 (0300-8566188)

قیام

28 جولائی تا 6 اگست

28 نومبر تا 7 دسمبر

کراچی

پیشہ کاری

13 مارچ تا 27 مارچ

آفس 706 گورنمنٹ ہاؤس
سرکاری اسٹاپ بینک
اخلاق اور ایم سی ٹی
موبائل 0300-8566188

قیام

13 جولائی تا 27 جولائی

13 نومبر تا 27 نومبر

”یہ کھریہ سب کچھ اور میں سب تمہارا ہی تو ہے۔“

”کہنے کو تو عورت کا ہی ہوتا ہے گھر کا کاٹھ، بچے اور شوہر پر بھی عورت کا ہی حق ہوتا ہے لیکن خان صاحب یہ سب زبانی کلامی باتیں ہیں، دل سے نہیں نکلتیں نہ ہی سوچ میں ان کی ہلکی سی رمت ہوتی ہے، حالات بدلنے کی دیر ہے، عورت ان سے محروم کردی جاتی ہے، عورت تو عمر کے ہر حصے میں تہی دست ہے۔ میں نے تو اپنی جوانی آرٹیفشل جیولری پہننے بتادی، اب تو زندگی کی شام ہونے کو ہے۔“ وہ روہاکی ہو گئیں۔

”اب گھر نہ پیسے میں اور نہ ہی آپ میں دلچسپی رہی ہے، جذبات پر اس بیماری نے ہی غلبہ پالیا ہے۔“

”ایسے مت کہو آمنہ..... تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی، دیکھو جب تمہیں اسٹروک ہوا تھا تو تم پلنے جلنے سے قاصر ہو گئی تھیں، اب تو ماشاء اللہ اپنے قدموں سے چل کر ہاتھ روم تک جاتی ہو اور ماشاء اللہ مکمل طور پر الٹ بھی ہو، کیا محال ہے کہ کوئی نوکر اپنے کام میں ڈنڈی تو مارے۔ میری دعا ہے اور پُر امید ہوں کہ ایک دن اس واکر کا سہارا بھی تمہاری جان چھوڑ دے گا۔“ وہ محبت سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولے۔

”جانتی ہوں اولڈ اڈ گولڈ..... آئی لو پو جاتی.....“

”خان صاحب میں بے ہوش ہو جاؤں گی، مجھ سے اتنا بڑا مذاق مت کریں۔ لگتا ہے یہ عورت ہمارے لیے مبارک ثابت ہو گئی ہے۔“ وہ کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر ترپیں۔

”خان صاحب اس بیماری میں آپ کے کس، کس روپ سے مقابلہ نہ کیا لیکن کسی سے اپنا دکھڑا نہ رو دیا کہ کہیں آپ کی نیک نامی پر حرف نہ آ جائے۔“

”آئی ایم سوری آمنہ..... دراصل وہ بھی میری محبت کی انتہا تھی کیونکہ جب میں تمہاری تکلیف کو دیکھنے کی ہمت مکمل طور پر کھودیا کرتا تھا تو بے بسی کے احساسات میں تم پر برس پڑتا تھا۔ تمہیں ایک مثال دیتا ہوں، جب بچہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے خود کو چوٹ لگا

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

”کیا ہوتا ہے بھلا..... وہ اسے جھٹوڑ کر دو چار تھپڑ کس کر لگاتے ہیں اور ایک دم برا بھلا کہنے لگتے ہیں پھر دوسرا ری ایکشن یہ کہ اسے سینے سے چمکا کر رونا شروع کر دیتے ہیں ہائے میرا بچہ میں تجھ پر صدقے، قربان جاؤں، چلو بازار سے کھلونا خریدنے چلتے ہیں۔“ وہ محل سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”میری باتوں کو اتنا سیریس مت لیا کرو ڈیر.....“

”لیکن آپ کے اس دوسرے ری ایکشن سے میں ہمیشہ ہی محروم رہی، سوچی سمجھی ترکیب کے مطابق یا نا سمجھی میں بھی اپنے سینے سے بچھنے کر تلی و تفتنی کے دو بول تک تو کہہ نہ سکے، میری تکلیف پر آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کا اٹھنا تو مردانگی اور غیرت کے خلاف ہے ناں.....“ وہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

”پنگی بعض لوگ اپنے پیار کا اظہار کرنے میں بالکل ہی پیدل ہوتے ہیں، ذرا دیکھو اس بیچاری غریب کو، بیکیس لڑکی ایسے مری ہوئی ہے جیسے ہمت سے زیادہ نشہ چڑھا لیا ہو۔“ بلال نے موضوع بدلنے کے لیے چھمو کی طرف دیکھ کر مزاحیہ لہجے میں کہا۔

”بد بخت، گھوڑے بیچ کر سو گئی ہے، صبح اس کی خبر لیتی ہوں، تیس ہزار کم تنخواہ نہیں ہے میاں۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولیں۔ ”اور بوجی رزق حلال.....“

”آمنہ تم اسے ایک لفظ بھی غصے میں بولو گی تو یہ اسی وقت اپنا بچہ اٹھائے چلتی بنے گی، رات کو نیند قربان کرنا آسان نہیں ہے۔ میں اس سے بات کر لوں گا۔ یہ تو میری اولاد سے بھی کم عمر کی ہے، بے فکر ہو سمجھانے بھانے کا کام تو مجھ پر ہی چھوڑ دو ویسے نیگم، عجیب زمانہ ہے کہ پیسے ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں پھر بھی ملازمہ ڈھنگ کی نہیں ملتی۔“

”ٹھیک ہے خان صاحب..... میں اسے ایک ہفتے بعد ہی رخصت کر دوں گی۔“ اگر اس کے یہی کچھن رہے تو۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولیں۔

”نیگم اپنے اس شوہر کا ہی خیال کر لو، ایک بار جو بستر سے نکل جاتا ہوں تو پھر نیند واپس نہیں آتی،

چڑھے گا۔ اس کی تعلیم موسیٰ سوری سے شروع ہوئی اور یہ ہمارے بچوں کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی جائے گا ان شاء اللہ.....! میرے رب نے مجھے ننگی کا اِک سہری موقع دیا ہے، میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔“

”صاحب جی، ہر ایک ایسے ہی لارے لگاتا آیا ہے، مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی آپ کی بات سن کر..... جب مطلب پورا ہو جاتا ہے ناں تو، تو کون میں کون..... لیکن میری ایک ہی شرط ہے کہ بچہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”شیم، یہ دیکھو میرا ہاتھ، اس کی انگلیاں پانچ ہیں ناں.....“ وہ نرمابھت سے بولے۔

”جی صاحب جی.....! وہ تو سب کی ہوتی ہیں۔“ وہ سر اثبات میں ہلا کر بولی۔ ”پانچ انگلیاں ہیں دونوں ہاتھوں کی ملاؤ تو دس..... وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔

”پھر آگے بولو کہ میں تمہیں کیا سمجھانا چاہتا ہوں، تم ہو تو ذہن، تمہارے لب و لہجے سے لگتا ہے کہ مدل تک تو پڑھا ہی ہوگا۔“ وہ اپنا نیت بھرے لہجے میں بولے۔

”صاحب جی اب آپ مجھے اتنا بھی نالائق نہ سمجھیں، اس پڑھے لکھے لوگوں کی کالونی میں کام کرتے ہوئے مجھے پندرہ سال ہو گئے، اپنی ماں کے ساتھ ہاتھ بٹایا کرتی تھی، اور بچوں سے تو میں نے وہ کچھ سیکھا جو بڑے سکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“ وہ دوپٹے کا کونہ اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

”میں نے دسویں پاس کی ہے جی، استانی بننے کے خواب دیکھتی رہی مگر نوکری نہیں ملی تو ماں کی طرح گھر، گھر کام کرنے لگی۔“

”واہ..... تو میرے سوال کا جواب دو جلدی سے، تم تو میری سوچ سے زیادہ ہوشیار نکلیں۔ شاہپاش، اپنے بچے پر توجہ دو گی تو ایک دن یہ کسی دفتر کا افسر ہوگا۔“ وہ پُر امید لہجے میں بولے۔

”سر جی..... پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں، کوئی بڑی تو کوئی چھوٹی، کوئی موٹی تو کوئی دلی، انسان بھی ایسے ہی ہیں، صاحب جی میں آپ کی خدا

آنکھیں پھرا جاتی ہیں۔ اس لیے ہم دونوں کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہی لڑکی ہمارے گھر کا فرد بن کر رہے۔“ وہ سرگوشی میں بولے۔

”آپ نے درست کہا، میں جانتی ہوں کہ ہماری مجبوری بہت بھاری ہے ورنہ اسے اس گھر کی چوکت نہ ٹاپنے دیتی۔ کل کو ہمارے جوان بیٹے بھی تو اسی گھر میں رہیں گے، ایسی کھڑی، اجلی خروں والی لڑکی گھر میں رکھنا اپنے پاؤں پر کلباڑی مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔“ وہ متذبذب لہجے میں بولیں۔

”آف کہاں پہنچ گئی تمہاری سوچ، ہمارے بیٹے ایسے گھٹیا اور شرمناک کردار کے نہیں ہیں کہ ایک ملازمہ سے..... تو بہ استغفار.....“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔

”خان صاحب! یہ ڈراما میں دیکھ چکی ہوں اپنے گھر میں۔ عشق اندھا ہوتا ہے، جوانی میں شیطان کا وار ہونا بہ حد آسان اور سہل ہو جاتا ہے، آپ خود ہی تو کہا کرتے تھے آج کیسے بھول گئے؟“ وہ دھمے لہجے میں بولیں تو بلال نے سر اٹھا کر زیر و پاؤں کے بلب کی مدھم اور ملجی روشنی میں جھمو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں کس قدر معصوم، پُرسکون اور پاکیزہ لگ رہی تھی کہ بلال دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

”میرے مالک میں نے تیرے سامنے سر تسلیم خم کر لیا کہ تو فرماتا ہے کہ میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔“ بلال نے سجدے میں گڑ گڑاتے ہوئے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ جھمو نے اس لمحے لاؤنچ میں داخل ہوتے ہوئے قدرے جھک محسوس کی۔ لیکن مجبوراً ان کے قریب سر اور آنکھیں جھکائے کھڑی ہو گئی۔ اس کا بیٹا ماں کی ناگوں سے لپٹ کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ تو بلال نے جانماز پر بیٹھے، بیٹھے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور شیریں لہجے میں کہا۔

”شیم آج میرے ساتھ مارکیٹ چلو تاکہ اس معصوم بچے کے اچھے سے کپڑے خرید لیے جائیں، ہمارے گھر میں یہ بچہ ہمارے اصولوں پر وان

اور آزمائش زدہ حالات کے درو اور تکلیف سے گزرے جو نہیں، جب بچہ دوا کے بغیر مر جاتا ہے اور بھوک کی وجہ سے وہ بڑھتا نہیں تو اس دکھ اور بے بسی کو آپ کیا جانتیں.....؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم نے نہ جانے پیدائش سے پہلے ہی کون سا گناہ کر دیا تھا کہ جھکیوں میں پیدا ہو گئے وہ بھی ترسے اور سکنے کے لیے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”گھر میں بیماری کی پریشانی اور بے بسی ہو تو ہنسنا کس کا فر کا من چاہے گا۔ تمہاری بیگم کے ساتھ زندگی کے پینتالیس سال بہت شاندار گزرے..... مگر چھ مہینوں کی محتاجی نے ان جیتے ہوئے حسین و دلنشین سالوں پر پانی ہی پھیر ڈالا۔ ایک وقت تھا کہ ہم دنیا گھومتے پھرتے، بچوں کے پاس وزٹ کرتے پوٹے نو اسوں کو گود میں لیے پھرتے ان سے کھیلتے مگر سب خواب ہی چکنا چور ہو گئے۔ دعا کرو کہ بیگم صاحبہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں۔“

”صاحب جی..... اب میں آگئی ہوں ناں..... میرا منا آپ کے ہمراہ اور میں آپ کی بیگم کے ساتھ۔ آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ سے جب آپ اپنی بیگم کے ساتھ دنیا گھومنے جائیں گے تو میں اس گھر کی ایسی چوکیداری کروں گی جیسے گھر کی مالکن کرتی ہے۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”ارے یہ تو وقتی باتیں ہیں، تمہیں ایک ہزار زیادہ پر یہاں سے لوگ خرید سکتے ہیں، اس میں تمہارا قصور نہیں کیونکہ یہ لوگوں کی مجبوریاں ہیں، آخر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خود غرض تو ہونا ہی پڑتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”ہائے صاحب جی..... میری قیمت آپ نے صرف ایک ہزار لگا کر میرا دل ہی توڑ دیا ہے۔ میں اپنی بستی میں کوئی عام سی لڑکی نہیں ہوں، میرے چری شوہر پر ہر جوان، ادھیڑ اور بوڑھا رشک کرتا ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”میرا شوہر تو نکلا قسمت کا دھنی اور میں..... بد نصیب، نصیب بھلی۔“ وہ بھی خوب دل کھول کر بولی۔

”اوہو تم نے تو برا منالیا۔ وہ تو ایسے ہی میں نے

مری پر یقین رکھتی ہوں کیونکہ آپ نے زبان میں سچائی ہے، نہ تو دھوکا ہے نہ ہی لالچ کیا ہے یہ جو بیگمیں ہوتی ہیں ناں جی سارا مسئلہ ان کا ہے، یوں سمجھیں کہ ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلیاں کام کی نہ کار کی۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔

”شاہا با! انٹیلیجنٹ.....“ وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

”یہ بچہ ہمیشہ بیگمات کے کام میں رکاوٹ بنتا ہوگا۔ لیکن فکر کی قطعاً ضرورت نہیں، میں اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھوں گا، بچے بیمار کو پہچانتے بھی ہیں اور اس کا جواب دینا بھی خوب جانتے ہیں، تم اپنی بیگم کو خوش رکھو، ان کا دل جیت لیا تو مجھ کو کہ تم نے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”جی صاحب جی! میں تو سوچ رہی تھی کہ اسے اس کی دادی کے پاس ہی چھوڑ دوں، بستی کے اسکول میں داخل کرادوں لیکن ہے ابھی چھوٹا۔ دو سال اوکھے سوکھے گزر جائیں، مینے کا دو ہزار دادی کے ہاتھ پر رکھتی جاؤں گی وہ بھی خوش..... اور منا..... خوش تو نہیں ہوگا بس مجھے بہت یاد کرے گا۔ اس لیے اس کا مسئلہ سر نہیں اٹھائے گا۔“ وہ گہری سوچ بچار کے بعد بولی۔

”غریب کی کٹھنی میں مجبوری ڈال دی جاتی ہے جی، یہ دکھ تو سہنا ہی پڑے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”لیکن یاد رکھو کہ بچہ ماں کے زیر سایہ رہ کر ہی خود اعتمادی سیکھتا ہے، خود اعتمادی کا شخصیت، کردار اور اس کی زندگی پر کیا مثبت اثر پڑتا ہے، یہ پھر بتاؤں گا۔ اس وقت تو تم اپنی بیگم صاحبہ کی دن اور شب بھر کی روٹین اپنے ذہن میں محفوظ کرلو، بس انہیں خوش و خرم رکھنے کا یہی طریقہ ہے، اسے پلے سے باندھ لویا ذہن نشین کرلو..... فائدے میں رہو گی۔“

”صاحب جی، فکر نہ کریں..... دل پر لکھ لوں گی، دماغ تو ہر وقت ہی کن، کن انجیوروں کو سلجھاتا رہتا ہے، آپ کو کیا خبر.....؟ آپ بڑے لوگ بھی ان برے

”صاحب نے ٹائی دی ہے ماما.....“
 ”ماما.....؟“ آمنہ نے حیران کُن لہجے میں کہا تو
 وہ تیزی سے بولی۔

☆☆☆
”خان صاحب! ایک معما تو حل کر دیجئے.....“

”ہاں بیگم ہے تو سہی، ملازموں کی کچھ خامیوں کو
ہضم نہ کریں تو گھر جھگڑے کا اکھاڑا بن جاتا ہے،

دینا؟ تمہاری جان مار کر خدمت کر رہی ہے، ہمیں اور کیا چاہیے؟ اس لیے ایسی سیدھی باتیں سوچ کر خود

خان صاحب..... آپ کی یہ پرانی عادت ہے کہ آفس میں اپنے ماتحتوں کو اور گھر میں تمام ملازموں کو

ناں تو قسم سے پھر آیا نہیں رکھوں گی، آپ ہی میرے

ہے، خدا کے لیے اپنے دل و دماغ کو شکوک و شبہات سے پاک رکھنا کہ تمہاری ریکوری جلدی ہو سکے۔ آخر

ابھی تم نے دو بیٹوں کے لیے لڑکیاں تلاش کرنی ہیں،
 مارچ 2019ء تا 1999ء

”صاحب جی وہ آپ کے ساتھ منے کی شاپنگ کے لیے کب جاؤں گی؟ آپ دیکھنا کہ کسی صاحب کے

جب فرصت ملی چلے چلیں گے..... لیکن اپنی بیلیم کو بھٹک بھی نہ پڑنے دینا۔ خواہ مخواہ اپ سیٹ ہو کر نئی مصیبت کھڑی

یہ ہر، ہر پھرے والیاں میں انہیں نہ جانے کس بات کا
خطرہ چھین نہیں لینے دیتا۔ آمنہ بیواری سے پہلے ایسی ہرگز
نہیں تھی۔ ”

نہیں، اُن یہ عمری حواس باخشی کی ہے۔ خواہ مخواہ منہ
سے اپنا پھسلتا جا کر رہا ہے۔

بات یاد رکھیں، عورت چھوٹے گھر کی ہو یا بڑے گھر کی، ہوتی وہ عورت ہی ہے۔ مجھے بتائیں کہ ان بیگمات کے

کوئی بنی مہارانی اور کوئی بنی نوکرانی..... کوئی بنی بیگم جان
تو کوئی بنی وبال جان.....“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

صاحب.....“ وہ ان کی بات اچک کر بولی۔ اور نیلی کی آواز سننے پر فوراً آمنہ بیگم کے کمرے کی جانب بھاگی۔

3

جائے گا۔ آپ مارے ہیں کہ ہم دونوں سمندر ہو جائیں گے۔ یاد رکھیں کہ ہم دونوں ہی بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اب ہماری عمر نیشن لینے کی نہیں، میں تو بیمار ہوں آپ کو بھی سوتے میں اسٹروک ہو جائے گا۔“ وہ آنسو بہانے لگیں۔

”تو پھر مجھ پر شک کرنا چھوڑ دو، جانتی ہو شک شادی کے رشتے کو کٹن کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے، اسے ہرا بھرا رہنے دو یاں..... اور رونا دھونا بند کرو.....“ وہ انہیں چمکی دے کر بولے۔

”خان صاحب یہ آنسو خوشی کے ہیں نہ ہی شوقیہ گرتے ہیں۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ عورت مرد کی ہر بات و حرکت کو شک کی نظر سے کب اور کیوں دیکھنے لگتی ہے۔“ وہ اک طویل آنکھ بھر کر بولیں۔ اور خاموش ہو کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ایک تو تمہارے یہ مگر مجھ کے آنسو مجھے بہت ہزار کر دیتے ہیں ساٹھ سال کی عمر میں بھی یہ بچوں والی حرکت..... تم سوچو کہ میں ایک نادان جذباتی اور جھگڑاؤ..... بچی کے اعتراضات کو کیونکر اہمیت دوں گا۔“ وہ زنج ہوتے ہوئے بولے۔ ”خدا را اب تو بڑی ہو جاؤ.....“ اسی سے جھمو بیٹے کی انگلی تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ دوسرے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں دس بجے کی چائے اور دو پیالے فروٹ چاٹ کے تھے۔ اس نے بیگم صاحبہ کے پہلو میں تو لیا بچھا کر ٹرے اس پر رکھ دی اور کمرے کے ماحول کی کشیدگی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہارنگل گئی۔

”میاں یہ جو ملازمین ہوتے ہیں ناں اگر یہ اپنے پہناؤنے سے مالک دیکھ لگیں تو سمجھیں کہ ڈیزاسٹر کا آغاز ہو چکا ہے، اس کے پڑے دیکھے ہیں آپ نے..... اور بیٹے کو کوئینسڈی میں افسران کے بچوں کے ساتھ داخلہ دلوانے کی کیا ضرورت تھی؟ پانچ سال کا ہو جاتا تو اپنی بستی کے اسکول میں اپنے جیسے بچوں میں آرام و سکون اور خوشی سے پڑھائی شروع کر دیتا۔ لیکن آپ نے نہ تو مجھ سے مشورہ لیا اور نہ ہی آپ نے عقل و

سمجھنے کے پیچس دن اسی انکیوینی میں گزرتے تھے۔“ وہ سگار سگاتے ہوئے بولے۔

”ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ملازم کے ساتھ ایسا سلوک رکھو جو تم اپنے برابر کے لوگوں سے رکھتے ہو۔ بس تو ان کے وژن تک پہنچ گیا۔ وہ ہوا جنتی اور مجھے جنت کی جتو ہے ورنہ میری تہجد کی نمازوں کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب..... اس چھو کری کو کہیں میرے برابر کا درجہ مت دے دیجیے گا۔ ان عورتوں کی نہ اپنی کوئی عزت ہوتی ہے نہ دوسروں کی عزت کا خیال رکھ سکتی ہیں، ان پر خدا کی لعنت نہ ہو تو یوں در، در نہ بھلتی پھریں۔ میں تو آپ سے بہت خوفزدہ رہنے لگی ہوں کیونکہ یہ عورت بہت شاطر اور باتونی ہے اور آپ کو باتونی لوگوں سے عشق ہو جاتا ہے پھر میری بھی پروا نہیں رہتی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

”پھر وہی مشکوک باتیں، دن بھر وہ تمہارے ساتھ جڑ کر بیٹھی رہتی ہے، کب کرتی ہے مجھ سے باتیں، خدا کے لیے اب نیا مقدمہ درج نہ کر دینا۔ سونے سے پہلے تم اس کے انگوٹھے کوری سے باندھ کر اسے قید کر لیتی ہو، ہاتھ روم جانے، دوا کھانے اور پانی پینے کے لیے تم اس کی رسی کو کھینچتی ہو، میں نے تو اسے قابو نہیں رکھا ہوا، نہ ہی مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بیگم ہماری زندگی کا پرائم ٹائم ایک ساتھ بہت خوب گزرا۔ اس وقت جب میں جوان تھا تب تم نے مجھے ڈھیل دی، بے لگام چھوڑے رکھا۔ اب میں اپنی عمر کے ستر سال کر اس کر چکا تو تم مجھ پر اس قدر شک کرنے لگی ہو کہ میرا دل چاہتا ہے، تمہارے شک کو یقین میں بدل ہی دوں تاکہ ہم دونوں ہی مطمئن ہو سکیں..... اور یہ روز، روز کی چیقلش ختم ہو۔“ وہ بھویں چڑھا کر قدرے غصے سے بولے۔

”بہت انوکھی سوچ ہے آپ کی، اگر آپ نے ایسی بیہودہ حرکت کی تو گھر لڑائی جھگڑوں کا اکھاڑا بن

شور سے اس کے اثرات کو گہرائی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ جانے آپ بھی کب بڑے ہوں گے، بالکل ہی بچوں والی حرکتیں آپ کو قطعاً زیب نہیں دیتیں۔“ وہ بدلہ لینے کے انداز میں بولیں تو بلال نے بھرپور تہقہہ لگایا۔

”بھئی میں نے اپنی غلطی مان لی ہے، اب میں نے اپنا رویہ بدلاتو یہ لڑکی کسی دوسرے گھر میں لو کر لی چک سکتی ہے، ایسی صاف ستھری، سچی ہوئی لڑکیوں کے لیے لو کر لی کی کمی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو عیسیم کے آنے سے گھر میں رونق اور گہما گہمی نے ہمیں زندہ ہونے کا احساس دلادیا ہے۔ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر یہ تو آج ہی دوسری لو کر لی حاصل کر سکتی ہے۔“

”یہ آپ کی سوچ ہے، بے ٹکی اور فضول۔۔۔۔۔ ایسی لڑکیوں کو بیگمات اپنے گھر میں جھانکنے تک نہیں دیتیں، گھر میں جوان بیٹے اور ادھیڑ عمر الو کا۔۔۔۔۔ شوہر ہوتا ہے خان صاحب ایک بات کہوں۔۔۔۔۔ برا تو نہیں مائیں گے، نہ ہی مجھ سے ٹپل و قال کریں گے نہ ہی کرا چھوڑ لاؤنج میں جاسوئیں گے؟“ وہ آہستہ سے بولیں۔

”یار تمہاری کس، کس بات کا برا مناؤں، تمہاری ہر بات ہی میرے دل میں نشتر بن کر چھ جاتی ہے۔ پھر خود کو سمجھا بھجا کر درگزر کر جاتا ہوں کہ پیار بیوی سے بحث و مباحثہ کرنے کا فائدہ تو ہوگا نہیں۔۔۔۔۔ الٹا وہ میرے گلے پڑ جائے گی۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟ جہاں سیکڑوں کینڑے مجھ میں نکالے جاتے ہیں، وہاں ایک اور اڑدھا سہی۔۔۔۔۔ سینے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے ڈاک براؤن ویل ویٹ کے پردے مکمل طور پر ادھر، ادھر ہٹا کر بولے۔ لان میں جھمو ایٹھو نیا کے ٹخنے درخت کے سائے میں بیٹھی بیٹے کے بیک سے کلر ز پینٹیلیس اور ڈرائنگ بکس دیکھتے ہوئے اسے سینے سے لگائے خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ایک دم سے نرم پڑ گئے، ترحم آمیز لہجے میں بولے۔

”آمنہ، کاش تم اٹھ سکتیں اور باہر کا نظارہ دیکھ سکتیں تو تمہیں اسد کو نیو نیسوری میں داخلہ دلانے پر اعتراض نہ ہوتا۔ کیسے خوشی میں نہائی ہوئی ہے شمیم۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ

کی رضا کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے، تکلیفیں اور بیماریاں رونو چکر ہو جاتی ہیں بیگم۔“ خان صاحب خدا کے لیے عیسیم کے نام کا ورد کرنا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ وہ ہنسمو ہے اور اس کا بیٹا سرو ہے اسد نہیں، انہیں اتنا اونچا مقام دے کر بہت چچھتا میں گئے، چھوٹے برتن میں اتنا ہی دودھ ڈالیں جتنا اس کے اندر ساسکے، مجھے یہ بتائیں کہ ہر وقت کبھی ہاتھ میں لیے پھرنے اور صبح شام واک اور یہ انداز کس کے لیے ہیں۔ ایسے رحم دل اور نرم مزاج تو آپ کبھی نہیں تھے۔ جتنی عنایتیں اور نوازشیں جھمو پر کی جارہی ہیں، معاملہ کچھ گڑ بگڑ رہا ہے۔“ وہ معترض لہجے میں بولیں۔

”پار سمجھا کرو ناں۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یہ لڑکی چھوڑ کر یہ جاوہ جا ہونے کے لیے پرتولنے لگے۔ ہم اسے روک نہیں سکیں گے، اسے اس گھر میں سہولیات و آسائشات دیں گے تو یہ یہاں کی محتاج ہو جائے۔ اس کے علاوہ میرا اور کوئی مقصد نہیں۔۔۔۔۔ واک تو ایک یورکتی ہے، بلڈ شوگر کو کنٹرول رکھتی ہے۔“

”خان صاحب میں آپ کو یہی تو کہنا چاہ رہی تھی کہ ہم خود ہی کیوں نہ اسے چٹا کر دیں۔ جس دن سے اس منحوس نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے گھر میں محسوس اور تقنع پھیل گیا ہے۔“ آمنہ نے چائے کی چٹکی لیے ہوئے کہا۔

”میری چٹھی جس مجھے مطمئن نہیں ہونے دیتی۔“ اس بات کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور دونوں گہری سوچوں میں گم گھومت، گھومت چائے پیتے رہے۔

”تمہاری خوشی کی خاطر سوچنا پڑے گا۔ ملازمہ بدلنا کون سا مشکل ہے آمنہ لیکن ہم مشکل میں پڑ جائیں گے کیونکہ اس کم بخت نے ہمیں آرام بہت دیا ہے۔ میں سات گھنٹے کی نیند پوری لینے لگا ہوں، اتنی گہری اور میٹھی نیند سوتا ہوں کہ مجھے اس کے اٹھنے اور تمہیں ہاتھ روم لے جانے کی خبر تک نہیں ہوتی، اپنی حالت دیکھو۔۔۔۔۔ ہر وقت نکھری، اجلی نظر آتی ہو، تمہارا کرا، الماریاں اور ہاتھ روم قرینے سے سیٹ ہیں۔“

میرے احساسات کو پچھاننے کی کوشش کریں کہ میں ایک ہائراکشیو خاتون تھی کیا اب سوشل ورکر اور میرے آس پاس سیلیاں کھینوں کی طرح منڈ لایا کرتی تھیں سب کچھ لیکھت چھوٹ گیا۔ یہ دنیا بھی صحت مند لوگوں کی ہمراہی میں چلتی ہے، ورنہ زندگی کی ہر خوشی بے وفاقی اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر لیتی ہے، میں چوبیس گھنٹے اسی کمرے میں بی دی کے سامنے خود کو کیسے خوش رکھ سکتی ہوں، اب تو میرا دل اس قدر مردہ ہو گیا ہے کہ لان تک جانا بھی مجھے عذاب لگنے لگا ہے۔ یور کچھے جیسے مجھ پر قیامت طاری ہو چکی ہے۔ لے دے کے آپ ہی مجھے ایسا ہمارا نظر آتے ہیں جب میں آپ کو چھمکے سے گھس لگاتے اور چھینچھینا کرتے دیکھتی ہوں ناں تو میرا دل کٹ جاتا ہے کہ کیا میں کب شب اور ہنس مذاق کے بھی قابل نہیں رہی۔ ”وہ آٹو گرائے اور ہاتھ مسلتے ہوئے بولیں۔ وہ مزید بھی کچھ کہیں کہ بلال صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”خدا کے لیے آمنہ اپنی زندگی خراب کرو۔۔۔ نہ مجھے رسوا کرو، خبردار جو ایسی فضول قیاس آرائیاں تم نے کسی سہیلی سے کیں۔“ وہ عجب خوفزدہی سے بولے۔

”آپ اسے فارغ کیوں نہیں کر دیتے؟ بس مجھے میلی کچلی بند بودار آہا ہی منظور ہے۔ کم از کم میرے بیڈ پر بیٹھنے کی جرات تو نہیں کرے گی۔ اس کی کتنی بار بے عزتی بھی کی۔ پیار سے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ مگر خاموشی سے حق دیکھے چلی جاتی ہے، آپ مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ میں شک کیسے نہ کروں.....؟ میری برابری کرنے کی جرات اسے کس نے دی ہے؟ آپ کو میرے اعتراض کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی، صرف منکا لا کر تاہی برائی نہیں، آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“

”میرے ہمدردانہ سلوک اور روتے نے ہی اسے تمہارے ساتھ بیٹھنے کی جرات دی ہے آمنہ، اسے گھر کے فرد کی حیثیت سے دیکھو۔ اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ صاف سقری ہے، تمہاری خدمت گاری

سہلانے لگے۔“ ہمیں اس سے جیسے کام چاہیے، وہ بخوبی سرانجام دے رہی ہے پھر گلہ کیوں ہے اس سے۔“ وہ خاموشی سے انہیں تنہا رہیں، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کے سترے شیمپو کیے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

”آمنہ اب انہیں شیم سے ڈائے بھی کرالیا کرو..... یقین جانو کہ تم پہلے جیسی آمنہ جو کبھی خود کو نظر انداز نہیں کرتی تھیں ویسی ہی لگنے لگو گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت بیمار لگنے لگی ہو۔ مجھ پر ہی ترس کھاؤ۔ بے چاشنک کے علاوہ تمہیں اور کوئی دہنی و جسمانی مسئلہ نہیں اور اب میری عمر دیکھو، غلط بات سوچتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ جب تم مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتی ہو تو میں خود اپنی نظروں سے ہی گر جاتا ہوں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بلال، مجھے اس تکلیف دہ بیماری میں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ آپ ہر آن مجھے کمزور دینے کا ہی سوچتے ہیں۔ میں ہی یلگی ہوں، سوری خان صاحب.....“ وہ کھسپائی سی ہنسی کے ساتھ آنکھیں جھکا کر بولیں۔

”سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے آمنہ، تم جوانی میں تو شکی نہیں تھیں اب نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ وہ حیرت و حیرت سے بولے۔

”اس وقت میں بھی تو جوان اور توانا تھی۔ یہ ذہن ہی کم بخت مجھ میں موجود کی پر نالاں رہنے لگا ہے، آپ تو ہیلدی ہیں۔“

”آمنہ خیر سے اب پہلے والے دن آنے والے ہیں، بادل چھٹ جانے والے ہیں۔ بشرطیکہ تم خود کو قلبی اور دہنی طور پر مطمئن و خوش و خرم رکھو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری طرف سے بے فکر رہو۔“ وہ.....

بڑا امید نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں چھمکو کو بیگم جان کا رتبہ بخش دوں گا؟ ایسا تو مرکز بھی نہیں ہوگا۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، نیپال، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیردن ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مئی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری دیک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: مرزا اشرف عباس فون نمبر: 0301-2454188

سرکولیشن منیجر: سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

63 قیر III سسپنشن ایف ایس ایس آر ایف اتھارٹی بین کوریڈر لاہور
35804200-35804300 فون:

میں دن دیکھتی ہے نہ رات..... ایک پاؤں پر کھڑی
رہتی ہے، اگر اپنائیت میں تمہارے بیڈ کی پستی پر بیٹھ
جاتی ہے تو کہاں سے یرابری ہوگی۔ اللہ سے ڈرو اور
ہر وقت استغفار کا ورد جاری رکھو تا کہ تم پر اللہ تعالیٰ اپنا
فضل و کرم فرمائے۔“ وہ ہنسنے پھلا کر بولے۔

”خبردار جو آئندہ ایسی بیہودہ بکواس کی۔“

”خان صاحب کبھی، کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے
آپ کا دل بیمار ہوئی سے اکتا گیا ہو۔ یہ سوچ مجھے لمبے
ہاتھوں سے نوچنے لگتی ہے۔“ وہ بھرائی آواز میں بے بسی
سے بولیں۔

”بیگم ایسی فضول اور جان لیوا سوچوں کو ہمیشہ کے
لیے الوداع کہہ دو۔ تم میری اور میں تمہاری ہوں آخری
سانس تک۔ خود کو اذیت اور مجھے ندامت دینے سے
تھمیں کیا حاصل ہوگا۔ فقط دکھ، درد اور غم.....“ وہ اس
کے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولے۔
”چلو چھوڑو یہ باتیں، خود کو ریلیکس کرو.....“

تمہاری ٹرانکولانٹرز کا وقت ہو گیا ہے شیم کہاں ہو، بیگم
صاحبہ کو دوا دو۔“ انہوں نے بلند آواز میں کہا تو وہ جھٹ
سے کمرے میں آ گئی۔

”دیکھو انہیں دوا کھلا دو تا کہ سکون سے سو سکیں۔
تم نے وقت نہیں دیکھا افسوس کی بات ہے، پلیر ایسی
کو تا ہیاں چھوڑ دو۔“

”جی صاحب جی..... پانی اور گولی سائڈ ٹیبل پر
رکھی ہوئی ہے، ابھی کھلائے دیجی ہوں۔“ وہ پھرتی سے
سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھ کر آنکھیں منکا کر بولی تو بلال
بیز سے اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

چھوٹے آمنہ کو گولی کھلا کر ناگوں کا مساج کرنا شروع
کیا۔ تو چندہ منٹوں میں ہی وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

”بیگم جی کم از کم تین چار گھنٹے تو سوئی رہیں گی۔
میں موبائل پر ان کی دوا کے لیے الارم لگا کر سو جاتی
ہوں۔“ وہ اپنے گدے پر سوتے ہوئے بیٹے کی طرف
رحمہ لاندہ نگاہوں سے دیکھ کر بڑبڑائی۔

”کاش میں تمہارا مقدور سنوار سکتی۔ صاحب

اللہ کرے آمنہ صحت یاب ہو کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے۔ بیچاری پر آزمائش کے لہراتے سائے چھٹے ہی نہیں رہے۔“ وہ سوئی ہوئی بیوی کی طرف ہمدردانہ ترس بھری نظروں سے دیکھ کر بڑبڑائے۔

”صاحب جی! اللہ مایاں خدمت کا بدلہ ضرور دے گا۔ بندے کے پاس تو چند نونوں کے سوا اور بے ہی کیا ہے۔ بے لوث خدمت، خاطر اور محبت کو بندہ خرید کر سمجھتا ہے کہ حق ادا ہو گیا۔“ وہ فحش سے بولی۔ ”آپ نے مجھے اس گھر کا فرو تو بتا لیا لیکن اس درجے سے محروم ہی رکھا۔“

”ایسی بات ہرگز نہیں شیم..... اگر تم نہ ہوتیں تو میرا تو ابھی تک جنازہ نکل چکا ہوتا۔ یہ برادری، دوست، احباب وغیرہ تو تماشا بین ہیں، بس برے وقت کے انتظار میں ہماری طرف نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دو بیٹے اپنی زندگی میں خوش و خرم ہیں، ہم مریں یا جھیں ان کی بلا سے۔ دو بیٹے بھی امریکا جانے کے لیے پرتول رہے ہیں، اس گھر میں پہاڑی کی نحوست، مایوسیت اور پریشانی کے ساتھ کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا۔ رہ گئے تم اور میں.....“ اسی اثنا آمنہ نے کروٹ بدلی تو بلال نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور ٹھیل لیمپ آف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”صاحب جی مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ مھمو نے کمرے کی اس دھندلی روشنی میں ان کے قریب ہو کر کہا۔

”شیم یہاں بیگم ڈسٹرب ہو جائیں گی، ساتھ والے کمرے میں چلتے ہیں، کچھ تم اپنی سناؤ، کچھ میری سنو.....“

”صاحب جی اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہو جائے گا۔“ وہ ان کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولی۔ ”کل ہی یہ خبر جھکیوں میں پھیل جائے گی، شوہر تو مجھے کچھ نہیں کہے گا البتہ سری میری چٹیا کاٹ کر گھر سے باہر نکال دے گی۔“ وہ ہم کر بولی۔

”آپ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا کیوں نہیں بنا لیتے، مجھ میں کوئی کمی ہے کیا؟ عورت کی جوانی ہر خاکی پر چھا جاتی ہے۔ نوکری کرتی ہوں آپ کی، ویسے بھی

میں کا کیا جھروسا؟ بس دن بیوی کی بات مان لی۔ تم واپس جھگی میں وادی کے پاس اور میں دن بھر چار گھروں کی صفائی ستھرائی کر کے جب اپنے گھر پہنچوں گی تو تیرا باب، میرا خون چوستے کو میرے پرس کے ہر خانے کی تلاشی لے گا۔ اور آخر کار وہ میرے محنت کے پیسے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر چل پڑے گا اپنے چری یاروں کی جانب..... کیا میری زندگی اسی گھن چکر میں ہی بیت جائے گی۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس زندگی پر..... اسے جینا نہیں کہتے..... بے شک بیگم مجھ سے خوب صورت اور بڑے گھر کی ہے لیکن اس حقیقت سے میں انکار کیوں کروں۔ کہ وہ اپنی جوانی کی عمر گزار چکی ہے۔ ایک بیمار اور محتاج عورت شوہر کے لیے بھوسا ہے، جسے جب چاہے آگ لگا کر راکھ کر دے اور نئی نوہلی دہن لے آئے۔ اپنی زندگی کے بقیہ دن عیش و عشرت میں گزارنے کا اس کا بھی حق ہے اور میرا بھی۔ تو کیوں نہ میں ہی پہل کر دوں۔ بیگم جی اب میں اس گھر سے جانے والی نہیں بلکہ تم یہاں سے نکلو گی۔“ وہ ٹھٹھکی لگے سوسے جا رہی تھی۔

”مھمو تم بھی سو جاؤ، کوئی بیہیلی بوجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ وہ ہاتھ روم سے نکل کر بولے۔

”صاحب جی کیا بتاؤ؟ بس آپ پر بڑا ہی ترس آنے لگا ہے۔“ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی چٹیا کو گھماتے ہوئے ترحم آمیز نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ترس اپنی بیگم پر آ رہا ہے یا مجھ پر..... کچھ لفظوں کا ہیر پھیر کر دیا ہے تم نے۔“ وہ حیرت سے بولے۔

”جی آپ پر.....“ وہ نظریں جھکا کر ذرا سا شرم کر بولی۔ ”مجھ پر کیوں؟ خود پر ترس کھاؤ کہ ایک رات میں چار مرتبہ جانے کا مطلب ہے کہ نیند تو رخصت ہوئی ناں اور میں بھی تان کر سو جاتا ہوں۔“ وہ اس کا شرمنا دیکھ کر مضطرب ہو گئے..... دل نے سرگوشی کی۔ ”آخر تمہاری محنت رنگ لے ہی آئی ہے۔ اب یہ لڑکی ہمارے گھر کی لونڈی ہو گئی۔ اتنی سستی لیکن لا جواب.....“

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 204

ان حالات میں آپ پر جائز ہوں۔“ وہ کیسٹ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ مصحوبیت سے بولے۔

”صاحب جی لونڈی مطلب ملازمہ، نوکرانی، مالک پر اپنا حق رکھتی ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھے، بیٹھے انگڑائی لے کر بولی۔

”کیا تمہارے حقوق میں ہم سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ وہ غیر ارادی طور پر بیڈ پر بیٹھ کر تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”جی صاحب جی.....!“ وہ بڑھ کر ان کے سینے سے سر ٹکا کر بولی تو ایک دم سے وہ ٹھٹکے۔

”شیم تم ہوش میں رہو..... ہٹو یہاں سے اور بیگم کے کمرے میں جاؤ، میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے، دراصل تصور وار میں ہی ہوں۔“

”تم اس قدر حسین ہو، نمکین اور غزالی آنکھوں والی، ہر نی کے مانند قلائیں بھرتی ہوئی.....“ وہ ان کے گرد بازوؤں کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کے ہی الفاظ ہیں ناں..... اور پھر آپ نے مجھے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں تمہارا صرف صاحب جی نہیں ہوں، تمہارا خیر خواہ بھی ہوں، ہمدرد بھی، تمہیں ایک دن ایسی شاندار جگہ پر لے جاؤں گا کہ تم زندگی سے خوش ہو جاؤ گی۔“

”ہاں میں نے کہا تھا، مجھے یاد ہے..... پر تم غلط سمجھیں، تمہاری تعریف کرنا، گپ شپ لگانا تو یوں سمجھو کہ اپنی بیٹی جیسی سمجھتا تھا اور شاندار جگہ کا مطلب کہ تمہارا بیٹا جب پڑھ لکھ کر میری طرح کا افسر بنے گا تو تم اپنی زندگی کو حسرت و تاسف سے نہیں دیکھو گی۔ تم نے تو میری ہر بات کا مطلب غلط نکالا۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”صاحب جی، میں آپ کی ان ہمدردیوں اور عنایتوں کا احسان چکانا چاہتی ہوں، جو نبی بیگم جی سندرست ہوئیں میرا آپ سے ناتا ختم ہو جائے گا۔ فی الحال میں آپ کی ضرورت پوری کر سکتی ہوں۔“ وہ بے باکی سے بولی۔

”کیونکہ مجھے آپ سے پیار ہو گیا ہے، میں آپ

کی خدمت کار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں۔ میں اپنی حیثیت پہچانتی ہوں صاحب جی، تاحیات آپ دونوں کی ساتھ بندگی غلام رہوں گی۔ صاحب جی میری مجبوری ہے نوکری..... جو منے کے جوان ہونے تک برقرار رہے گی اور آپ کی ضرورت بھی اسی کے ساتھ پوری ہوگی، جب تک منا اسی کالونی میں گھر نہیں خرید لیتا۔ یہی آپ کی خواہش ہے ناں.....“

”شیم تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ.....“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے اتارتے ہوئے بولے۔ ”میں نے گھر، گھر میں ایسے حرام کام ہوتے دیکھا ہے تو کیا اب اسی کو اپنے گھر کی محنت اور ندامت بنادوں۔“

”سوچ لیں صاحب جی، آپ کا جب دل مانے آپ کی غلام حاضر ہے۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر پکن کی طرف بڑھ گئی۔ بلال وہیں ہی دق بیٹھے کچھ..... سوچتے ہوئے شیطان کی ہمراہی میں چلتے ہوئے دور دراز سرسبز و شاداب علاقوں میں گھومتے ہوئے مکمل طور پر اس کی گرفت میں چلے گئے۔

☆☆☆

”آخر میں جان تو صاحب جی کی بن ہی گئی ہوں۔“ وہ اپنے گدے پر لیٹی فخر و مسرت سے کروٹیں لے رہی تھی۔ ”زندگی نے میرے ساتھ جو انصاف برتا ہے، یہ میرے صبر و شکر کا صلہ ہے، اب سمجھ پائی ہوں کہ جتنی کی ہر عورت پاک و امن کیوں نہیں؟ وہ مجھ سے پہلے اپنی حیثیت کو پہچان کر صاحبوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان بن گئی لیکن میں اس سے بڑھ کر ایک خواب دیکھ رہی ہوں، وہ پورا ضرور ہوگا ان شاء اللہ۔“

وہ عجب انداز سے سوچ رہی تھی۔

”بیگم مر کیوں نہیں جاتی، اس کے جینے کا مقصد ہے کیا؟ خاوند کے لیے عذاب اور میرے لیے آزمائش..... کتابی اچھا ہو، منائش میں سوتا رہے اور میں اپنی خود ساختہ جنت کا چکر لگا آؤں۔ کاش ایسا ہو جائے۔“ وہ حسرت و یاس سے سر اٹھا کر آمدنی کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی اثنا بلال کمرے میں دبے

ماہنامہ پاکیزہ

مارچ 2019ء

205

سے دیکھا وہ جو نبی گدے سے اٹھی، منے نے فل والیوم میں روٹا شروع کر دیا۔

”چل پتر میں تجھے تو تیرے ابا کے پاس چھوڑتی ہوں، تمہاری مسنڈی دادی تمہیں مجھ سے اچھا ہی پال لے گی۔ اس گھر میں میرے پاس سر کھانے کا وقت نہیں اور یہ کم بخت چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ چلی رہوں۔“ وہ بڑبڑاتی تو بیگم نے اسے آواز دی۔

”مہموا سے تھوڑی دیر کے لیے باہر لے جاؤ، میری نیند خراب کر دی ہے اس نے۔“ وہ غصے سے بولیں۔ اسے ساتھ والے کمرے میں سلا کر میرے پاس آ جایا کرو۔“

”نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے؟ بے وسائی ہو گئی ہے اسے۔ جو نبی آپ کے لیے اٹھنے لگتی ہوں، مجھے بالوں سے پکڑ لیتا ہے، اکیلا دوسرے کمرے میں کیسے سوئے گا؟ اسے تو عادت ہی نہیں۔“ وہ اسے پھکی دیتے ہوئے بولی تو بلال نے اک طویل آہ بھری اور آمنہ کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

”صاحب جی، اگر آپ نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟ کیسے چلتا میرا چولہا اور کیسے پلتا میرا بچہ.....؟“ اس کی پیشانی پسینے میں بھگ گئی۔ ”صاحب جی جب یہ جج کر روتا ہے ناں تو بیگم جی اسے بہت موٹی، موٹی، گندی گالیاں دیتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دوں..... اور پھر بھی اس طرف منہ نہ کروں..... بس آپ کی محبت اور چاہت پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں، آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس گھر سے نکال دی گئی تو پھر کسی کے گھر کام نہیں کروں گی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”بے فکر ہو، میری جان، اب تم ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رہو گی۔“ وہ اسے محبت آگئیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔

”صاحب جی، ہم جھکیوں میں رہنے والے لوگ نفی تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن بے غیرت اور بے عزت ہونا..... یہ ہمارے خاندان کو چٹا نہیں..... میرا دامخ

خراب ہو رہی کیا تھا۔ کچھ آپ ہی اپنے بڑھاپے کا مان رکھ لیتے، مجھے دوپٹھر مار کر گھر سے نکال دیتے۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”میں تو بے عزت ہو گئی اور اگر میرے شوہر کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو اس کی غیرت مجھے انارکلی کی طرح چن ڈالے گی۔“ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے صاحب جی۔“

”ہم تمہیں دنیا والوں سے چھین لیں گے جاندنی، تم نے تو ہماری تاریک راہوں میں روش کر نہیں چھیر کر نئی زندگی بخشی، جینا سکھایا، دنیا میں اکڑ کر چلنا سکھایا۔“ وہ احسان مند لہجے میں بولے۔ ”اب پچھتاوا کیسا؟ بس اپنی بیگم کو خوش رکھو جان، سب معمول سے چلتا رہے گا۔ خواہ خواہ پریشان ہو گئی ہو۔“

”صاحب جی، بس دھڑکا لگا رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ گھر کے تمام ملازم اور بیگم مجھے گھور رہے ہیں جیسے رگنے ہاتھوں پکڑ لیا ہو، صاحب جی میں تو معصوم، ناجر بہ کار لڑی تھی، آپ نے ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔“ وہ مکاری سے بولی۔

”جس دن آپ نے آنکھیں پھیر لیں تو میں اپنی نظروں سے دھڑام سے فرش پر آ گروں گی اور میرا شوہر، جلا داس اور میرے بھائی اور دوپور، جیند میرے اوپر سے دندناتے ہوئے گزر جائیں گے۔ بتائیں کہ میں اس منے کو لے کر کہاں جاؤں گی؟“ وہ بناؤنی سسکیاں بھرنے لگی۔

”شیم، ہم کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دیں گے تو ایسا ظلم ہو گا ناں، خواہ خواہ ہی پریشان رہنا چھوڑ دو، جاؤ ڈی کھولو، تمہارے لیے ایک خوب صورت جوڑا اور اسد کے لیے عید کا کرنا شلوار خرید کر لایا ہوں۔“ وہ خوشدلی سے بولے۔

”اوچھو کہاں مر گئی..... کتنی بار کہا ہے کہ میرے کمرے سے باہر قدم نکالا تو تمہاری پٹھنی کر دوں گی۔“ ان کی لاؤنج تک آئی آواز چیرتی ہوئی ان کے کانوں میں زہر گھولنے لگی۔

جانتی ہوں لیکن صاحب جی چھو کر تو نہیں ہے ناں۔۔۔۔۔
ستر سال کا بڈھا، مجھے سوائے بیٹی، چڑی باتوں کے اور
کیا دے سکتا ہے۔“ وہ بھوس چڑھا کر بولی۔

”اچھا تو ایسا کرو کہ اپنا بستر بوریا اٹھاؤ اور یہاں
سے چلتی بنو، کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو میں تمہارا سر گنجا
کر کے تمہارے گلے میں انہی جوتیوں کا بار ڈالتی، منہ کالا
کر کے گدھے پر بٹھاتی اور اس کالونی میں دس چکر لگواتی
تاکہ تم دوبارہ اس طرف منہ کرنے کی جرأت نہ کر سکو۔۔۔۔۔“
”بیگم جی۔۔۔۔۔ میرا قصور تو بتائیں، ایسی کون سی
غلطی کر دی ہے میں نے کہ آپ مجھے ذلیل و رسوا۔۔۔۔۔
کرنے پر اتر آئی ہیں۔“ وہ ایک دم ڈھیمی پڑ گئی۔

”کیا میں نے آپ کے سہاگ کو لوٹ لیا ہے۔۔۔۔۔
ایسا وہم مت کریں بیگم جی۔۔۔۔۔ کہاں آپ بیگم جان
اپنے شوہر کی اور کہاں میری حیثیت۔۔۔۔۔؟ وہ تو میرے
باپ برابر ہیں، نہ جانے آپ کو شک کیوں گزرا۔۔۔۔۔؟
میرا جینا حرام کرنے سے آپ کو کیا ملے گا۔“

”میں تمہارا جینا حرام کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں
سمجھیں تم، ذرا کان کھول کر سن لو کہ تم کل کی چھو کر
مجھے تجربے کار عورت کو چمکے کیسے دے سکتی ہو؟ میں سب
کھیل تماشے کا اور اک رکھتی ہوں، میری ناگوں سے
جان نکلی ہے، اس دماغ سے نہیں، نہ ہی قوت بصارت
زائل ہوئی ہے اور نہ ہی سماعت نے میرا ساتھ چھوڑا
ہے۔“ وہ پھر استحقاق سے چیخیں۔

”لوجی کر لو گل۔۔۔۔۔ بیگم جی آپ کو غلط فہمی ہوئی
ہے، صاحب جی تو میرے ابا سے بھی عمر میں بڑے
ہیں بلکہ میرے دادا کے لگ بھگ ہیں، میں انہیں اسی
قابل احترام نظروں سے دیکھتی ہوں اور وہ مجھے اپنی
بیٹی ہی سمجھتے ہیں۔“ وہ شیریں لہجے میں بولی۔

”اچھا تو تمہارے گھٹیا خاندان میں باپ، بیٹی کا
غلط اور نا پاک تعلق بھی جڑتا ہے۔ واہ کیا خوب ہوتم
لوگ۔۔۔۔۔ ادھر آؤ میرے قریب۔۔۔۔۔“ وہ تھکمانہ لہجے
میں بولیں تو وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھ کر ان کے
کندھے دبائے۔

”چاؤ بیٹی۔“ وہ آہستگی سے بولے اور اسٹڈی
روم کی طرف چل دیے۔ چھمو، بیگم صاحبہ کے کمرے کی
طرف گالی گلوچ سننے کی تیاری کرتے ہوئے پہنچ گئی۔
”یہ بتاؤ چھمو کہ تم صاحب سے کس قسم کی باتیں
کرتی ہو، وہ ایک تعلیم یافتہ، بائیسویں گریڈ سے ریٹائرڈ
ایک جانے پچھانے افسر اور تم دو ٹکے کی ان پڑھ اور
جاہل بچگی میں رہنے والی عورت۔۔۔۔۔ تم دونوں ایک
دوسرے سے ایسی کون سی راز دارانہ باتیں کرتے ہو۔“
ان کے لہجے میں شیم کے لیے ڈھیروں نفرت تھی۔

ادھر چھمو نظریں ان کے چہرے پر جمائے اپنا
نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے غصے پر قابو پانے کی
کوشش کرنے لگی۔

”آہ نکلیں بیٹی کرو اور مجھے جواب دو۔“ وہ
دھاڑیں۔ وہ نظریں ادھر ادھر کر کے کھڑکی سے باہر
لان میں جھانکنے لگی۔ جہاں بلال اس کے بیٹے سے
کھیل رہے تھے۔

”آج ذرا مجھے میری الماری تک لے چلو، یقیناً
تم نے میرے قیمتی کپڑے، جوتیاں اور پرس چرا لیے
ہوں گے، فقیرنی کو گھر کا فردہ بکر خان صاحب نے
اچھا نہیں کیا۔“ وہ سخت سخت بھرے لہجے میں بولیں۔

”بیگم جی میری بات ذرا غور سے سنئے گا۔“ چھمو
نے بھی ناگواری سے کہا۔ ”مجھے آپ کے ان استعمال
شدہ چیزوں سے کوئی غرض نہیں، یہ جوتیاں آپ کے
نصیب میں تو ہیں نہیں۔۔۔۔۔ صفائی والی کو ہی دے دیں۔

اور تمام پرس اپنی سہیلیوں میں بانٹ دیں کیونکہ میں
استعمال شدہ چیزوں پر تھوکتی بھی نہیں۔۔۔۔۔ آپ کی
زر خرید غلام نہیں ہوں کہ ہر وقت جوتے کھاتی
رہوں۔۔۔۔۔“ وہ بے نیازی سے کہتی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”واہ نواب زادی، میرے مرد کے بارے میں
کیا خیال ہے تمہارا۔۔۔۔۔ کیوں گھسی رہتی ہو ہر وقت
صاحب میں، یہ قوف مرد پر بھروسا کرنے والی عورت
جلد یادیر دھوکا کھاتی جاتی ہے۔“

”مرد تو ہمیشہ نواکھور گھوڑے کا سوار بیگم جی سب

خون دوڑ رہا ہے۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں اور پھر میرے دو بھائی شیر جیسے تھے تو کیا ہی نگل جائیں گے۔۔۔۔۔ اور تیرے خاندان کو خبر تک نہیں ہوگی، اگر تم اپنا اور اس بچے کا بھلا چاہتی ہو تو صاحب کے آنے سے پہلے یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔۔۔۔۔ وہ دمکی دیتے ہوئے تو نکار پراتر آئی تھیں۔

”بیگم جی، آپ مجھے سیدھے طریقے سے نکال سکتی ہیں لیکن میں اس الزام کا اقرار نہیں کروں گی کیونکہ میں بے قصور ہوں۔“ وہ زار و قطار رونے لگی۔

”کلمہ ہی تو ذرا بلال کو گھر آنے دے۔۔۔۔۔ وہ میرے ساتھ دھوکے بازی، فریب کاری اور بے وفائی تو کر سکتے ہیں لیکن جھوٹ ہرگز نہیں بولیں گے، وہ ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔“ وہ پُر تکین لہجے میں بولیں تو جھجھو بھاگنے کے سے انداز میں باہر نکل گئی۔ دھڑکتے دل اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ لان میں لٹکی تو بلال کو بچے کے ساتھ بال کھیلے ہوئے دیکھ کر ان کے قریب چلی گئی۔

”آپ تو مارکیٹ گئے تھے، اسے آئس کریم کھانے، ہائے صاحب جی میں مرنے لگی ہوں، اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے، بیگم جی کو ہمارے عشق کی خبر ہوئے دو مہینے ہو گئے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ حیرانی و خوفزدگی سے بولے۔

”ایسے نہیں ہو سکتا، وہ ناگوں سے محتاج ہم تک کیسے پہنچ سکتی ہے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جان۔“

”آپ بھی بڑے معصوم ہی نکلے اور میں تو پرلے درجے کی بیوقوف اور نامراد۔۔۔۔۔ اور وہ بہت بڑے دل گردے والی عورت نکلیں کہ اس کمزوری اور محتاجی کی حالت میں بھی چور کو پکڑ لیا۔ میں بہت حیران ہوں صاحب جی۔۔۔۔۔“ وہ تڑپ کر بولی۔

”ارے جلدی سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ وہ۔۔۔۔۔

بلے قرار ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”صاحب جی وہ بڑے وثوق سے دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم دونوں کے تعلقات میں گڑبڑ ہے اور آپ

مجھے سیدنی بات کا انشا جواب دیوں دیا ہے؟“ وہ اس کا کان مروڑ کر بولیں۔ ”اس قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر اپنی بد چلتی اور بدکاری کا اعتراف کرو۔۔۔۔۔ میں تمہیں معاف کر دوں گی لیکن اس گھر میں ایک منٹ بھی نہیں رکنے دوں گی اور نہ صاحب سے سوالات کروں گی، نہ ہی کالونی میں کسی کو تنہائی اصلیت سے آگاہ کروں گی، خدا کے لیے کسی اور گھر کا دروازہ کھٹکھاؤ۔ جہاں تمہیں جوان صاحب کی اصلی قربت نصیب ہوگی۔ چھوڑ دو خان صاحب کو۔۔۔۔۔ وہ ایسے تو ہرگز نہیں تھے۔“

”ہائے بیگم جی۔۔۔۔۔ اللہ معافی۔۔۔۔۔! قرآن مجید کو بچ میں ہم کیوں لائیں؟ میں نے کچھ کیا ہوتا تو اپنے گناہ کا اعتراف ضرور کرتی، صاحب کی رحم دلی اور ہمدردی کو آپ نے بدکاری کا نام دے دیا۔ کیسی بیوی ہیں آپ تو بہ، تو بہ۔۔۔۔۔“ وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

”اچھا یہ بات ہے تو سنو دھوکے باز اور جھوٹی عورت۔۔۔۔۔ تم کیم کیا جھپکتی ہو کہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں، تم مجھے ٹرانکولائزر کھلا کر جو ناک کھیل رہی تھیں آج اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، میں نے پچھلے دو مہینے سے گولیاں کھانی چھوڑ دی ہیں، رات بھر جاگ کر میں نے اپنے شوہر کو بھی پہچانا اور تمہاری بے باکی، بے شرمی اور بے لطفی کو بھی خوب پرکھا۔۔۔۔۔ اور بار بار پرکھا کہ کہیں میں شک کی بنیاد پر۔۔۔۔۔ تم سے زیادتی نہ کر دوں۔۔۔۔۔ اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو اپنا جرم تسلیم کر لو۔ یقین جانو کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گی لیکن بلال کو اس گھر سے نکال دوں گی، میں اس کے پانچ بچوں کی ماں ہوں، کیا بیمار ہو کر میں کمزور ہو گئی ہوں؟ ایسا مت سمجھو بلکہ میں اپنے بچوں کی نو فرنگ ہو گئی ہوں۔ میری اولاد میری ایک آواز پر میرے پاس دوڑی آئے گی اور اس بدکار باپ کو اٹھا کر کرسی اندھے کنوئیں میں پھینکنے میں ایک پل نہیں لگائے گی، تمہیں تو وہ کھڑے، کھڑے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے، ان میں خان خاندان کا

ماہنامہ پیا کیڑہ۔ مارچ 2019ء

”نکاح کے بغیر میں داشتہ ہوں، مجھے آپ کی بیوی اور بچے کس بل بوتے پر یہاں رہنے دیں گے۔ نکاح کے دو بول عورت کے تحفظ کا قلعہ ہیں صاحب جی۔“

”کی! بہت عجیب سوچ ہے تمہاری..... مجھ سے نکاح ناممکن ہے..... میں پانچ جوان بچوں کا باپ ہوں..... میری بیٹی کی سسرال والے اس کی ناک میں دم کر دیں گے۔ ہمارے معاشرے میں دوسری شادی قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہے اور وہ بھی اپنی گھر کی ملازمہ سے..... توہ استغفار..... میں تو سوچتے ہی اپنے میں بھیگ گیا ہوں..... آئندہ ایسے دل دہلا دینے والے مشوروں سے محتاط رہنا۔“ وہ قدرے سختی سے بولے۔

”صاحب جی آج تک مجھے شوہر کے علاوہ کسی مرد نے چھوا تک نہیں تھا۔ آپ نے مجھے بہلا پھسلا کر اس طرف متوجہ کیا میرے بچے پر اپنی جان، مال اور محبت لٹائی درنہ آپ کے قابو نہ آئی۔“ اور بھی جانے وہ کیا، کیا انکشافات کر رہی تھی اور بلال ہن دق اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ ہی کی باتوں میں آکر میں نے اپنے شوہر سے جھگڑا کیا، گھر خراب کیا۔“

”چلو بس بہت ہو گیا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ تمہیں پیسہ چاہیے..... تناؤ کہ تمہاری قیمت کیا ہے، اس سے کوئی قیمت ادا کروں گا۔“ وہ تڑخ کر بولے۔

”صاحب جی..... عورت کی عزت انمول ہوتی ہے صاحب جی، میں آپ کو دنیا بھر میں نشر کر دوں گی، آج کل میڈیا کا دور ہے، میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے وہاں تک جاؤں گی کیونکہ بڑا حارم دھجی جب ذلت کے گھن چکروں میں پھنس جاتا ہے تو پھر موت ہی اسے رہا کر سکتی ہے۔ سوچ لیں۔“ وہ بڑی مکاری سے کہہ رہی تھی۔

”میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا، تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں جو ذرہ، سہم کر دوب کر بیٹھ جاؤں گا۔“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکھڑاسے گئے۔ جسم تھر تھرا پھٹنے لگا اور دل کی آواز کو محسوس کرتے ہوئے انک، انک کر بولے۔

”تا نہیں گڑ بڑ میں پہل کس نے کی..... اس کا قائدہ اٹھانے میں آگے کون بڑھا۔ یہ مت بھولیے گا۔ صاحب جی انہوں نے سونے کی دوا کھانی چھوڑ دی ہے۔ اور ہماری رات بھر کی تمام کارروائیوں کی انہیں شد بد رہی۔“ اس نے گویا انکشاف کیا۔

”صاحب جی انہوں نے اتنا بڑا دھماکا کیسے برداشت کیا ہوگا کہ کہاں وہ اور کہاں آپ نے مجھے ان کے برابر لاکھڑا کیا یہی دیکھی کہ میں انہیں ہر بات پر ٹکا کر جواب دینے لگی تھی، یہ سوچ کر کہ ہم دو عورتیں ایک مرد کی حصے دار ہیں تو پھر میں انہیں مالکین کی حیثیت کیونکر دوں، میری نظروں میں ان کی وقعت ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے مانند ہے جسے بے دردی سے ایک کونے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اور میں خود کو مہارانی کا درجہ دینے لگی ہوں۔ آپ نے مجھے جان کہہ کر پکارا تو میں بیگم جان بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ آپ نے میرے ساتھ یہ ستم پر ستم کیوں ڈھائے؟ مجھے سبز باغ دکھانے کا نتیجہ کتنا بھیا تک نکلا کہ میرے شوہر نے میری ٹینس کر ڈالیں لیکن میں نے اس سے طلاق حاصل کر کے ہی دم لیا۔ کیونکہ مجھے کہا تھا کہ میرے پیچھے آپ ہیں، آپ نے اس ضمن میں میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ مجھے اس فعل سے روکنا آپ کا فرض تھا صاحب جی.....“ وہ روتے ہوئے بولی گئی۔

”اس کا حل بناؤ اور رونا دھونا چھوڑ دو.....“ وہ متذنب سے لہجے میں بولے۔

”وہ یہ کہ آپ مجھے سے نکاح کریں گے اور میں ایک بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ رہوں گی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”اس گھر کو ایک جوان اور تندرست و توانا عورت کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میں نبھانے کے لیے ہمیشہ سے تیار رہی۔ آج بھی مجھے اپنا وفا دار پائیں گے۔“

”مجھے تمہاری وفا و ایثار پر رتی بھر شک نہیں۔ نکاح کے بغیر بھی تو سب کچھ چل رہا ہے ناں.....“ وہ نرمابہٹ سے بولے۔

”میں نے..... تو..... تم سے شادی کرنے کے وعدے
وعدہ نہیں کیے تھے۔ تمہاری رضا مندی کے بغیر اس گناہ
عظیم کا آغاز ہرگز نہ ہوتا۔ اس لیے اپنے دماغ کو عرش
معلى سے ٹھوڑا نیچے لے آؤ بہت فائدہ سے میں رہوں گی۔“
وہ بظاہر گر جتے برستے لہجے میں بولنے ہوئے سوکھے
پتے کی طرح لرز رہے تھے۔

”میری بات غور سے سنو..... بیگم صاحبہ کی برابری
کرنے سے باز آجاؤ، سارا بگاڑ ہی اس برابری کی وجہ
سے ہوا ہے، میں دل و جان سے تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ
ہوں اور تم میرے وقار اور شان و شوکت کی قاتل بننا
چاہتی ہو، جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور اس بچے کو
لے کر ابھی اور اسی وقت گیٹ سے باہر نکل جاؤ، ورنہ تمہیں
چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”صاحبہ جی سوچ لیں اچھی طرح..... گھائے
میں رہیں گے آپ، میرا کچھ نہیں بڑے گا۔ میں تو پھر
بھی قابل قبول ہوں کہ نہ میری عزت نہ حیثیت اپنا
سوچیں.....“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”آپ ایک دغا باز
اور جھوٹے انسان ہیں۔“ وہ ان کی طرف انگلی
اٹھاتے ہوئے بولی۔

”اپنی بیگم کو دغا دینا آپ جیسے مرد حضرات اپنا
فرض سمجھتے ہیں۔ میں آپ کے لیے اک چیونٹی کی حیثیت
سے بھی کم تر ہوں..... یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ مجھے
روندتے ہوئے لرز جائیں گے۔ یاد رکھیں یہی نازک،
کمزور، بے ضرر چیونٹی جب وجود پر پھر جائے تو جسم
خارش زدہ ہو جاتا ہے۔ بے شک ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے
لیکن ایک بار تو وہ اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب
ہو جاتی ہے ناں.....“ وہ تنہے پھلا کر بولی۔

”چلیں بلائیں پولیس کو، میں جانے کے لیے
تیار ہوں۔“

”اپنی زبان کو لگام دو اور فوراً یہاں سے دفع
ہو جاؤ،“ وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولے۔ ”گناہ کی
ترغیب دینے والی بھی خود اور..... اور.....“ وہ کف
اڑا رہے تھے۔

”صاحبہ جی اگر مدد ہو گئی ناں تو اس کا خمیازہ
آپ کو جھگڑنا پڑے گا۔ یہ جو آپ نے شرافت، انسانیت
اور خوش خلقی کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ تار، تار ہو گئی تو
اپنی برہنگی کو کس، کس سے چھپائیں گے۔ کالونی میں یہ
کہانی جنم لے گی اور اس کے اثرات دور، دور تک
جائیں گے۔“ وہ بچے کو اپنے ساتھ چٹا کر بولی..... تو
وہ مسکایاں بھرنے لگا۔

”تمہیں میری طرف سے مکمل طور پر اجازت
ہے۔ جیسا کرنا چاہتی ہو کر دیکھو، منہ کی کھاؤ گی۔“ وہ
وٹوق سے بولے۔

”ٹھیک ہے صاحبہ جی..... یہ کام اسی گھر سے
شروع کرنی ہوں، جہاں مجھے سبز..... باغ دکھا کر لوٹا گیا
تھا۔“ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

”اگر تم نے بھی بہکانے کے جھکنڈے نہ
آزمائے ہوتے تو مجھے ہمت ہی کیونکر ہوتی۔ ذرا اپنے
گریبان میں جھانکو کہ سب سے پہلے عورت کی نیت میں
فجور آتا ہے پھر وہ اس کا جال بنتی ہے اور جس شکار پر
نظریں جمائے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس پر موقع ملتے ہی جال
پھینک دیتی ہے۔ اور اس پر غلبہ پالتی ہے۔“ وہ رعب و
دید بے کے انداز میں بولے۔ ”یہ دھمکیاں اور تریاں
کسی اور یار کو دنیا میں بلیک میل ہونے والا نہیں.....“

”آپ نے مجھ پر نئی الزام تراشی تو پب دی۔
بتائیں کہ میرا اس کالونی میں کون سا بار ہے، مجھے اپنے
شوہر اور آپ کے سوا کسی نے چھوئے کی ہمت نہیں کی۔
میں ہی نادان لنگی کہ آپ کے تیرے سامنے آئی۔“ وہ
پھر زار و قہار روئے لگی۔

”خدا کے لیے رونا بند کرو، مالی ہماری طرف
آ رہا ہے، اس کے کان میں معمولی سی بھنگ بھی پڑ گئی
ناں تو بہت برا ہو جائے گا۔ آخر میں تم سے عمر کے اس
حصے میں بھی جوانوں جیسی محبت کی۔ اور تمہاری عزت
افزائی بھی کی۔ یہ سچا عشق ہی تو تھا۔“ وہ نرم پڑتے
ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولے۔

”تو پھر نکاح کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ میں نے

غزل

کس خوشی کا میرے دل کو انتظار نہیں
مجھے کسی کی محبت پہ اعتبار نہیں
وہ کہہ رہا تھا کوئی اور راستہ جن لو
مجھے تو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں
یقین خود پہ مجھے تھا لیکن بہت زیادہ
مگر کسی پہ تجھی اب مجھ کو اعتبار نہیں
منار ہے ہیں سبھی سوگ آدمیت کا
اگرچہ لہجہ کسی کا بھی سوگوار نہیں
برس رہے ہیں یہ بادل بھی کی چھت پر کنول
کہ موسموں پہ کسی کا بھی اعتبار نہیں
کلام: یاسمین کنول، پسرور

☆☆☆

سلسلہ تو ہے شروع
سلسلہ نبھاؤ گے
کر چکے جو وعدہ تم
بھول تو نہ جاؤ گے
لے کے امتحانِ درد
یونہی آزمائے گے
تجھ سے روٹھ جاؤں تو
کیا مجھے مناد گے
انتظار میں تیرے
عمر یونہی گزرے گی
میری یاد آئے تو
پھر سے لوٹ آؤ گے
کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

کی تو اپنے شوہر سے آپ کی محبت میں ہی مدھوس ہو کر
طلاق لی تھی ناں..... آپ نے اس وقت مجھے منع کر دیا ہوتا تو
میں بچے کو یوں لاوارث اور یتیم نہ کرتی۔ میں تو اپنے بچے
کے لیے اس دلدل میں پھنس گئی۔ میں نے اپنے جھگی اسکول
کی استانیوں سے یہی درس سیکھا ہے کہ اگر زندگی کو بہتر
بنانے کا ایک بھی موقع ملتا ہے تو اسے سنہری بنا دو..... مجھے
اس وقت یہی سمجھ آئی تھی جیسے وہ تعلیم کی بات کر رہی ہوں
جس کی وجہ سے میں نے میٹرک اعلیٰ پوزیشن میں پاس
کر لیا۔ جب میں اس گھر میں آئی تو مجھے اپنی استانی کی بات
رو، رہ کر یاد آتی رہی تو میں نے سوچا کہ میں آپ جیسے خدا
برس انسان کے زیر سایہ آپ کی خدمت کرتے ہوئے عمر
نزار دوں گی۔ میرے بچے کا مستقبل روشن ہو گیا تو میں
سمجھوں گی کہ ہمارے خاندان کے وارے نیارے ہو گئے۔
میں اسی طمع و لالچ کی اشتہا میں ایسی پھنسی کہ آپ کی میٹھی
زبان نے مجھے اپنا اسیر بنالیا اور پھر گناہ سرزد ہونے میں
پہنچ گئی۔ اب میں کہاں جاؤں؟
گوئی گھر بتا دیں۔ جو مجھے سہارا دے سکے.....“

”پگلی میں نے تمہیں یہاں سے جانے کے لیے
نہیں کہا۔ تم نے ہی اٹنی سیدھی ڈیمانڈ زپیش کر دیں تو
میں کیا کرتا..... غصے اور غفلت میں آتا تو ایک فطری عمل
ہے یاد رکھو کہ محبت بے مشروط ہو تو اس کی جڑیں بھی
کنزور نہیں ہوتیں۔ وہ پھلتی پھولتی رہتی ہے۔“ وہ اسے
تسلی و تشفی دیتے ہوئے بولے۔ مالی پھولوں کی کیاری
میں گودی کرتے ہوئے بار بار انہیں دیکھ رہا تھا۔

اسی اثنا دھلائی والی بوزھی عورت سر کھجائے
ہوئے باہر آئی اور ان کے قریب پہنچ کر اپنے دوپٹے
سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ہچھمو کی طرف کھا جانے
والی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”مجموعہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ بیگم جی کو میں بڑی
اوکھی ہو کے غسل خانے میں بٹھا آئی ہوں، تمہیں
آوازیں دیتے ہوئے ان کا گلا خشک ہو گیا۔ جب میں
پگلی تو وہ دباڑیں مار رہی تھیں۔ صاحب جی! اسے
کچھائیں کہ اگر یہ لڑکی اپنی ڈیوٹی نبھانے کے قابل

کیوں نہ ہو کہ میرے جیسے بڑے آدمی کو تو نرم ہے۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

لی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے، جاتے اس خدمت لڑاری میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے۔ بھگتے آپ جاتے آتے ہیں ہرگز عورت۔ جس کا مقام یہ ہو سکتا۔ انداز کر اس رشتہ ریتی۔ دونوں کا میں روک کر آئندہ کمرے سے سوئے۔

ہو، بہت کارآمد ہوتا ہے۔ اس کا ادراک آپ کو
 ہانے کے بعد ہوگا۔“ وہ آزدگی سے بولیں۔
 سے یہ امید نہیں تھی۔ لگتا ہے جوانی میں بھی نہ
 پ نے کتنے افسیر چلائے ہوں گے۔“
 آمنہ اتم اپنے بیٹے کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو
 نہیں روکوں گا۔ یہ جبر بھی کرو کیجو، اپنا گھر ہی
 کے لیے جنت ہے اس کے دروازے تم پر کھلے
 وند چاہے کتنی ہی عورتوں کے پاس جائے جو
 ی کا ہوتا ہے، وہ ان چالو عورتوں کا نہیں
 اگر مجھ سے غلطی سرزد ہو بھی گئی ہے تو اسے نظر
 دیتیں، ہم دونوں کے درمیان لحاظ داری اور
 تے کی پاسداری کی ایک مضبوط دیوار تو قائم
 افسوس کہ تم نے اسے ہی گرا دیا۔ اب ہم
 مل کر رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ تم جانا چاہتی ہو تو
 وں گا نہیں..... واپس آنا جا ہوگی مجھے خوش
 ہتے ہوئے پاؤ گی۔“ وہ پر مردگی سے بولے اور
 سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے لیکن میں نے تو اپنا گھر
 پ دیا جو اس کی حقدار نہیں تھی۔ آج بلال نے
 ی جنت کا حقدار تسلیم کرنے پر مہر ثبت کر دی۔
 اکی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی جو شب و
 سے کپ شپ بھی لگائے، مشورے بھی کرے
 کی تنہائیوں میں ان کا ساتھ بھی دے اور ان کا
 کر زندگی میں گامزن بھی رکھے۔ قصور میرا ہے
 انہیں معاف نہیں کر سکی۔ جنہوں نے میری
 میں بھی میرا ساتھ دیا۔ بچوں کی طرح میری
 ت کی..... اک ماں بن کر عمر کے اس حصے میں
 ساتھ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیں۔ میں نے
 صلہ دیا کہ پوری کالونی میں ایک سرگزشت چھوڑ
 کے سر پر آئی تھی آج میں اک بے گھر اور.....
 اں اور ساس کے روپ میں بے وقعت ہو گئی
 بچے اور بہو بھی مجھے ایک ناکام، بزدل اور

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء (213)

اپنا پورا پورا گھر پر اٹھا کر اپنے پاؤں کی کاؤں پر لے کر آئے۔ ہر قدم بچھلے قدم سے زیادہ مضبوط اور متوازن ہوتا ہے۔ جب ہم دوسرے کے سہارے پر زندگی کو اس کا محتاج کر دیتے ہیں تو احساسِ زیاں ہمیں جیسے نہیں دیتا۔۔۔۔۔۔ پچھتاوا اور قلق ہمارا ہم ستم بن کر ہمیں ہر لحاظ سے لاغر کر دیتا ہے۔“ آمنہ نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ بلال صاحب اس کی واپسی کے منتظر ہیں۔ جبکہ جھموان کے ساتھ ڈائمنڈ جیئر پر بیٹھی خانساں کو گرما گرم روٹی لانے کا حکم صادر کر رہی ہے۔

”جھمو گھر تو میرا ہے جے دنیا بھر کے سامنے بیاہ کر سرسرا والوں نے سر پر تاج رکھ کر سجا دیا تھا میں تو مالکن ہی رہوں گی اور تم نکاح کے باوجود اک کتر ملازمہ اور بن مول لونڈی کا درجہ رکھو گی۔ کاغذ کی اک ناؤ کے سوا تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔۔۔۔۔۔“ یہ سوچتے ہوئے وہ آہستہ، آہستہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی پورچ میں آگئیں۔ ڈرائیور نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے انہیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

”میں پانی کا ایک قطرہ نہیں وسیع و عریض سمندر ہوں، جس میں بہت کچھ مایا ہوتا ہے۔ مجھے آج ہی اس کا علم ہوا ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے اپنے گھر چھوڑ دو، اب میں اپنے پاؤں پر چل سکتی ہوں۔ وہاں خان صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے لگا۔ وہ شان بے نیازی سے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ جب دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچیں تو بلال کے ہمراہ جھمو انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے پھولوں کے ہار لیے وہاں منتظر نظر آئے۔ غالباً میری آمد کی خبر پہونے ہی مسرت و طمانیت سے مغلوب ہو کر ان تک پہنچا دی ہوگی۔ وہ ان کے قریب آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ جھمو تو میری بہو سے ہزار گنا زیادہ قابلِ قبول ٹھہری کہ میرے انتظار میں دروازے پر کھڑی ہے۔۔۔۔۔۔ جب وہاں گئی تھی تو دروازہ کھلنے میں ہی آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔

”بیگم جی! آج اس گھر میں آپ کی پسند کا کھانا تیار کیا گیا ہے۔ آپ کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے اس گھر کا ہر چہا سجا یا ہے۔ آپ کے پسندیدہ رنگ کا ڈریس استری کر کے ہاتھ روم میں لٹکا دیا ہے۔ آپ فریش ہو جائیں، میں کھانا لگوائی ہوں، آپ تو بہت کمزور ہو کر واپس آئی ہیں، اب میں آپ کا ویسائی خیال رکھوں گی جیسا مجھے سکھایا گیا تھا۔ اور میں آج بھی اسی گدے پر ہی آپ کے قدموں میں سوؤں گی۔ آپ کی معمولی سی آواز پر آپ مجھے خدمت کے لیے کمر بستہ پائیں گی۔“ وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ یہ نیا رشتہ سوتن کا آمنہ پر کھل رہا تھا۔ یہ رشتہ بھی تو اسی حیثیت کا حقدار ہے جو آمنہ کا تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا جو کسی سہارے کا محتاج نہ تھا تو اسے محسوس ہوا کہ گھر کا چپا، چپا اسے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ بلال نے خوشی سے مغلوب ہو کر ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

”خان صاحب میرا نیا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات پر سب تسلیم ختم کر لیا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان اب تیسرے کی ضرورت مجبوری بن چکی تھی۔ لیکن یاد رکھیے گا وہ قانون کہ اگر تم انصاف کر سکتے ہو۔ ورنہ ایک پرہی اکتفا کرو۔“ وہ پُرسکون و اطمینان بھری سانس لے کر بولی۔

”آمنہ۔۔۔۔۔۔ اسی انصاف کو مد نظر رکھتے ہوئے تم اس گھر کی بڑی بیگم جان اور شیم۔۔۔۔۔۔“ ”میں شیم اپنی بیگم جی کی پرانی خدمت گار۔“ جھمو نے بلال کے منہ سے بات اچک لی۔

”مجھے اس مقام کی شناخت کرانے کا بہت شکریہ۔۔۔۔۔۔ نکاح سے برابری کا درجہ حاصل کرنا ایک خواب تھا میرا۔۔۔۔۔۔ خوش فہمی تھی۔۔۔۔۔۔ میری حیثیت ایک خاندانی بیوی سے کم ہی رہے گی میں خود برابری کرنے والی کون ہوتی ہوں۔“ وہ خوشدلی سے بولی تو آمنہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

ختم شد



ایک دن حوالی بیٹے کے ساتھ

عالمی یوم خواتین کے موقع پر ایک مثبت پیغام دیتی آسیہ عامر کی چشم کشا تحریر

منی کو فیڈر پلاتے ذہن تیزی سے اگلے کاموں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ منی دوبارہ سو گئی۔ تو اس نے بچن میں جا کر ایک چولے پر دودھ گرم کرنے کے لیے رکھا اور دوسرے پر انڈا فرائی کرنے کے لیے ساس پیں..... سب بچے الگ، الگ پسند کا ناشتا کرتے تھے اور اب اسکول کے لیے لُچ بھی الگ، الگ وہ اسی میں ہلکان ہو جاتی۔ انڈا فرائی کر کے روٹی پکائی کیونکہ چھوٹے بیٹے نے کہا تھا کہ رات کا قیمر روٹی کے ساتھ کھاؤں گا۔ بڑی بیٹی کے لیے فرنج فراز بنائے۔ اس نے جب سے اسکول

صبح سرخ کی بانگ کے ساتھ ہی سکیئر کی آنکھ کھل گئی۔ جلدی، جلدی اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز پڑھی۔ تسبیحات سے فارغ ہو کر قرآن پاک کے دور کوغ پڑھے اتنی دیر میں چھوٹی بیٹی ارسلارو نے گئی.... قرآن پاک کو احترام سے جزدان میں لپیٹ کر الماری کے اوپر رکھا اور جلدی سے منی کا فیڈر بنانے دوڑی کہ کہیں دوسرے بچے اور اس کا شوہر چھوٹی کے رونے کی آواز سے ڈسرب نہ ہو جائیں۔ نماز کے لیے تو حسب معمول اس نے شوہر اور ساس دونوں کو جگایا تھا لیکن انہیں نہیں اٹھنا تھا نہ اٹھے۔

جانتا تھا فریج فراز کے سوا کچھ مج میں نہیں کھا کھتی تھی۔ اتنی دیر میں سات بجے کا الارم بج گیا۔ دونوں بچ باکس ٹرے میں اوپر نیچے رکھے اور ساتھ ہی انڈے کی پلیٹ، دودھ اور چائے کے کپ..... ٹرے میں رکھے اور پھر اتنی ہی بھاری ٹرے اٹھائے جلدی، جلدی باہر آئی کہ الارم بند کر دے کہ دھڑام سے عین سانس کے کمرے کے سامنے انڈے کی پلیٹ گر گئی جو ٹرے میں ٹیڑھی رہی ہوئی تھی۔ بدحواسی میں کپ میں سے دودھ اور چائے بھی پھٹک اٹھے۔ اذان اور اس کے جگانے سے نہیں براس دھڑام کی آواز کے ساتھ ہی سانس صلیب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

”اب آئی بختی یہ کئی نوہول ہی دل میں بولی۔“
 ”ارے ننھوں، صبح سویرے کیا کھڑا کر کے سب گھر والوں کی نیند حرام کر رہی ہو۔“ وہ دروازے پر آگئی تھیں۔ ”تم ثابت کیا کرنا چاہ رہی ہو کبھی عورتیں اس وقت اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لیے ناشتا بنا رہی ہوتی ہیں، تو کیا تم بہم پر احسان کر رہی ہو۔“
 ”وہ اماں.....“ سیکینہ منمنائی۔

”بس آگے سے زبان چلو الو..... میں کہتی ہوں جب تم بے کچھ ہوتا نہیں تو بازار سے سلکٹ، پیس منگوا کر بچوں کو کچ میں دے دیا کرو۔“ سیکینہ نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور جا کر بیٹے کو جگایا تا کہ وہ جلدی سے تیار ہو سکے پھر اسے ناشتا بھی تو اپنے ہاتھ سے کروانا تھا۔ بیٹی کو آواز دی، شکر ہے اللہ نے بیٹی بھعدا دی تھی جو ایک ہی آواز پر اٹھ جاتی تھی، اتنی دیر میں جا کر بچوں کے یونیفارم استری کرنے لگی۔ اگرچہ ہمیشہ رات کو کر لیتی تھی، پانی کی بوتلوں میں پانی بھی بھر کر فریج میں رکھ دیتی تھی تا کہ صبح زیادہ افراتفری نہ پڑے لیکن رات کو منی کو سلانے کے لیے لیٹی تو بچی سے پہلے خود ہی سو گئی۔ اس لیے اس وقت کپڑے استری کرنے پڑے۔ خیر جلدی، جلدی بچوں کو یونیفارم پہنا کر ناشتا کروایا، ان کے بیگ چیک کیے، بچ باکس اور پانی کی بوتلیں بیگ میں رکھ کر بچوں کو گیٹ پر بھیجا کہ دین کا بارن مسلسل بج رہا تھا۔ اب شوہر کی تو الیاں شروع ہوئی تھیں۔

”نجر کے وقت سے انھی ہوتی ہو پر ہر روز دین

ہارن بجاری ہوئی ہے، پناہیں کرتی کیا ہو؟ اماں صبح کبھی چس دھیان تو کہیں اور ہوتا ہے۔“ شوہر کی دہائی پر دو چار گرم آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے دوپٹے میں چھپ گئے کہ ابھی روئے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کہ تیمور کے لیے کھانا بھی پکانا تھا اور ناشتا بھی اور اماں کو بھی بیڈنی دینی تھی۔ وہ تو چائے پیسے بغیر پاؤں بیڈ سے نیچے نہیں اتاریں گی۔ بچوں کے بیچے گھپے ناشتے ڈھک کے رکھ دیے کہ فارغ ہو کر کھا لے گی۔ اماں جی کو چائے دینے گئی تو ساتھ ایک فرمائش لے آئی۔

”سیکینہ آج میرا دل دیا کھانے کا چاہ رہا ہے۔“
 ”جی اماں ابھی پکا دیتی ہوں“ اب ایک چوٹے پر دلیا کپنے کے لیے رکھا دوسرے پر سالن..... ساتھ ہی آٹا گوندھ کے رکھ لیا۔ تیمور کو ناشتے میں آ پلیٹ پر اٹھا پسند تھا۔ اس کے کپڑے ہاتھ روم میں رکھ کر اسے جگایا۔
 ”گرم پانی ڈال دیا بالٹی میں؟“ تیمور نے رعب سے پوچھا۔

”آپ تو ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔“
 ”موسم بدل گیا ہے، ابھی تو عقل کا استعمال کر لیا کرو۔ خود تو رات میں اوڑھ کر سو رہی تھیں، میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی سردی لگتی ہے تمہیں تو کام نہ کرنے کا بہانہ چاہیے۔ بس اپنی ذات کی فکر ہی کرتی رہنا۔“ ایک ذرا سی بات پر اچھا خاصا لکچر سننے کو ل گیا تھا۔

”اچھا، میں پانی گرم کر کے ہانسی میں ڈال دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آگئی ورنہ وہ، وہ گڑے مردے اکھڑتے کہ اللہ کی پناہ..... اس پہلے ”پیریتا“ سے فارغ ہونے کے بعد سیکینہ کو یاد آیا کہ اسے تو پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی، نہار منہ پانی پینے کی عادت تھی، بچپن سے اب تو یہ عادت ٹھوڑی ہی باقی بچی تھی۔ کبھی یاد آیا تو پانی پی لیا، پانی پینے پر بھی سانس کے طعنے سننے پڑتے کہ فارغ بیٹھنے کے بہانے پورے پانچ منٹ لگا کر پانی پیتی ہے، تو بے، پانی پینے میں بھی نزاکت ہے، بہواری کی۔

سورج پوری آپ و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ رات کو بے شک ہلکی سی ٹھکی ہو جاتی تھی لیکن دن کے وقت وہی گرمی..... لال اینٹوں کے فرش کو جب برش سے رگڑ،

رگز کمرسرف ڈال کر دھویا تو پچنے، پینے ہو گئی۔ اس کے بعد بچن کی صفائی، کمروں کی صفائی، ہاتھ روم دھویا ان سب کاموں کے بچ ہانڈی چولہا بھی کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی کوشش ہوئی کہ نہادھو کر ظہر کی نماز بھی پڑھ لے۔ بچوں کے آنے کے بعد وہ انہی میں لگ جاتی۔ مٹی کو نہلا دھلا کر تیار کر دیتی تو ساس کچھ دیر تو سنبھال ہی لیتی تھی اگر جو ان کی مرضی ہوتی۔ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو برآمدے میں رکھے تخت پر الٹی سیدھی لیٹی اماں کسی سے فون پر چپک، چپک کر اسی کے متعلق کسی سے کچھ کہہ رہی تھیں جسے سن کر سیکینہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”ارے ہماری بہورانی کا مت پوچھو وہ تو ایک بچہ تک سوئی مری رہتی ہے۔ پتا نہیں ساری رات کیا کرتی ہے جو سارا دن سو کر گزاری ہے ہم تو جو صبح اٹھتے ہیں پھر رات کو ہی بستر پر لیٹتے ہیں۔“ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگا کر ابھری تھی۔

”چل سیکینہ اپنا کام نہلا۔“ صحیح کہتے ہیں سیانے کبھی، کبھی لاعلمی رحمت ثابت ہوتی ہے، نہ اماں کی باتیں سنتی نہ پتا چلتا ان کے دل میں اس کے لیے کیا ہے۔ بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد انہیں سلا کر پانی ابالتھا اور اب ہٹھنڈا ہو گیا تھا۔ انہیں بوتلوں میں بھر کر فرنیج میں رکھا اور رات کے کھانے کے لیے اماں نے پلاؤ کی فرمائش کی تھی تو گوشت کی بخنی چولھے پر تڑھادی۔ میٹھے میں چاکلیٹ ڈیزرٹ بنانے کی تیاری کی کیونکہ بچوں کو رات کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت تھی۔ ساتھ ہی لہسن اور نمائش کی چٹنی بنا کر بوتل میں بھر کر فرنیج میں رکھ دی۔ آدھا کام ختم کر کے میں آئی کہ تھوڑی دیر کمر سیدھی کر لے تو دیکھا مٹی جاگ رہی تھی۔

”لو اب یہ نہیں سوئے گی، نہ ہی ماں کو سونے دے گی۔“ لہذا بچی کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئی تاکہ بڑے بچے سکون سے سوتے رہیں۔ سوچا ابھی فارغ ہے تو کل کے دھلے ہوئے کپڑے تہ لگا کر رکھ دے۔ اتنے میں عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ نماز پڑھنے سے پہلے بچوں کو چگایا، وہ بھی عصر کی نماز.... ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد شام کی چائے کے ساتھ بچوں کو ان کی پسند کے سینڈویچ بنا

کر دیے۔ اب سیکینہ کو مغرب سے پہلے رات کے کھانے کی تیاری مکمل کر لینی تھی۔ کیونکہ مغرب کے بعد بچوں کو اسکول کا ہوم ورک کروانا تھا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہوئی تھی کہ تیمور آفس سے آ گیا۔

سیکینہ کی جب سے شادی ہوئی تھی اس کی شروعات سے عادت تھی کہ وہ رات کا کھانا اپنے شوہر کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ لیکن آج لگ رہا تھا کہ بھوکا سونا پڑے گا کیونکہ پلاؤ کچھ زیادہ ہی مزیدار پکا تھا سب نے شوق سے اور کچھ زیادہ ہی کھالیا۔ اس کے لیے نہیں بچا تھا۔ اس نے پتیلی سے بچے بچے چاول نکالے جو تھوڑی سی سے تھے اور اسی کو چٹنی کے ساتھ کھالیا۔ تیمور نے نوٹس بھی نہیں کیا کہ وہ کیا کھا رہی ہے۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنانے چلی گئی۔ بچے تھوڑی دیر لی وی دیکھتے یا کوئی اسٹوری بک پڑھتے اور پھر سونے لیٹ جاتے۔ ان کاموں سے فارغ ہوئی تھی کہ اماں نے آکر بتایا کہ تمہاری امی کا فون آیا ہے۔

اماں کے فون کا سن کر اسے ایسا لگا کہ جیسے دلی سکون مل گیا ہو۔ بھنڈی، بھنڈی پھوار بڑنے لگی۔ پورے دن کی تھکاوٹ اتر گئی ماں کی آواز سن کر سیکینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اس نے جلدی سے اپنے اوپر قابو پایا اور فون ہنس کر ان سے باتیں کرنے لگی۔

”ہاں امی بس کام تو خاص نہیں ہوتا، کام والی آتی ہے اور آج تو موسم بہت اچھا ہو رہا تھا تو تیمور کے ساتھ باہر گئے تھے۔ پھر شاپنگ بھی کی اور ہاں اللہ کا شکر ہے بس خیریت ہے۔ جی اماں بھی بہت خیال رکھتی ہیں۔“ وہ ماں کو جانے کیا، کیا تسلیاں دیتی رہی۔ یہی شاید ہر دوسری حوا کی بیٹی کی کہانی ہے..... مگر سیکینہ نے یہ کہانی اپنی بہو کی دفعہ ہرگز نہیں دہرائی۔ اگرچہ وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں مگر اعلیٰ اخلاق اور اقدار کی پروردہ ضرور تھی۔ اپنا وقت تو اس نے جیسے تیسے گزار لیا مگر اب وہ اپنی بہو کے لیے ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ جب وہ یعنی سیکینہ خود کی سہیلی یا پڑوسن سے باتیں کرے تو اپنی بہو کے متعلق بدگمانیوں سے بھر پور گفتگو اس نے تو اپنی بہو کو ہی اپنی سہیلی بنا لیا تھا اور دنیا پر ثابت کیا تھا کہ بنت حوا ہی بنت حوا کی ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔

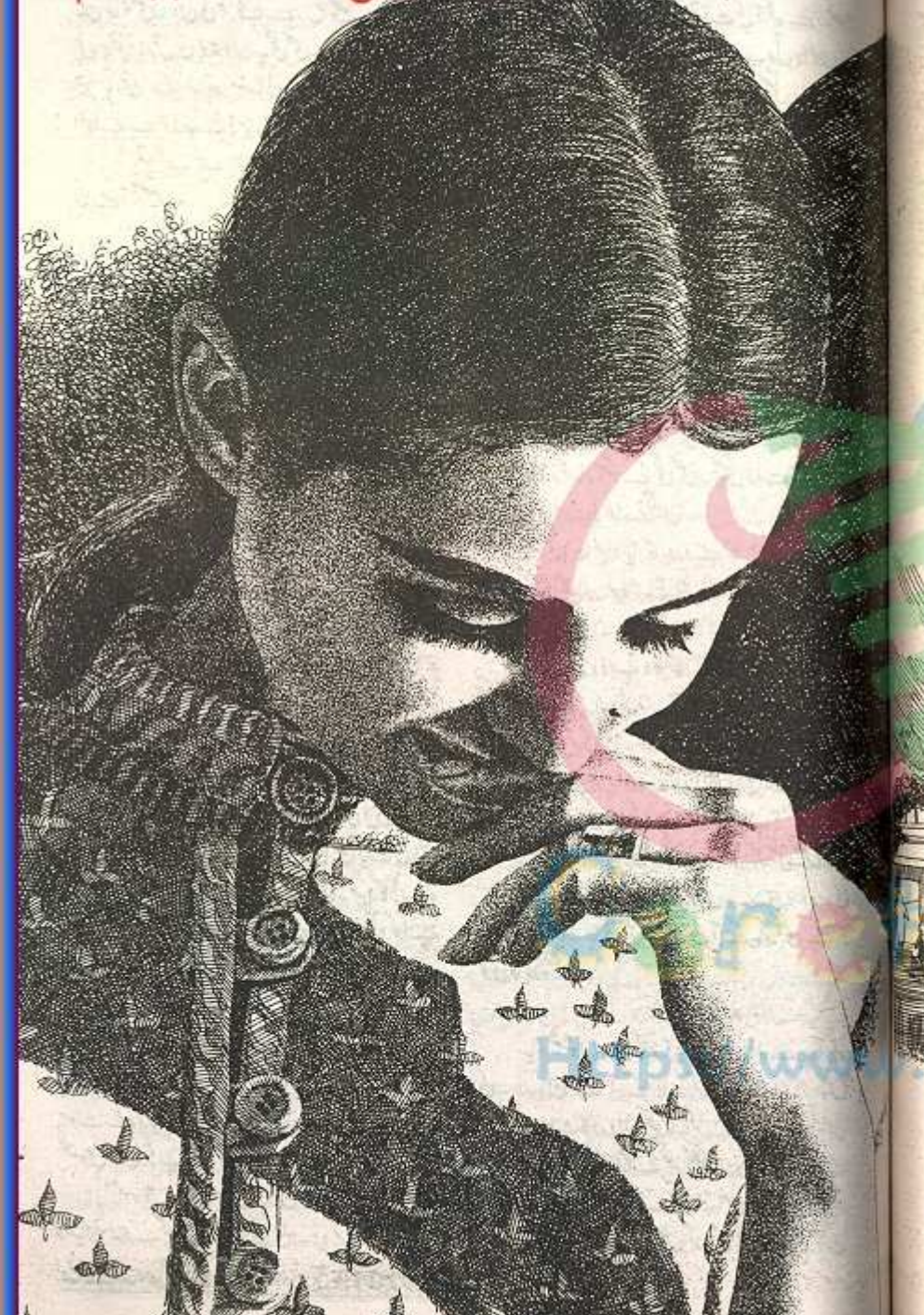


ایک لفظِ محبت کا

نادیہ احمد



”باہر کوئی نہیں ہے۔“ دروازہ کھولا اس کا ہاتھ
 تھم گیا۔
 ”پر میں نے آہٹ سنی ہے۔“ اس نے پلٹ کر
 شرمندگی سے دیکھا۔
 ”دروازہ ہوا سے بچ رہا تھا۔“ چہرے پہ سنجیدگی
 لیے وہ غیر جذباتی انداز میں بولیں تو اس کے دل کو کچھ
 ہوا۔ تھکے، تھکے قدموں سے چلتی وہ لاؤنج کی بڑی سی
 کھڑکی کے پاس رکھے صوفے پہ گرنے کے سے انداز



ہے۔ جذبات کی بینک اتار کر حقیقت کی آنکھ سے دیکھو۔
یہ دنیا اور یہاں کے لوگ بہت ظالم ہیں۔ دل والوں کو تو
بس درد ہی سہنے پڑتا ہے۔“ آج اس بیگنی رات میں
بارش کی جلتنگ کسی سازی کی طرح شامل گفتگو تھی۔

اس دن کے بعد آج ان دونوں کے درمیان اتنی
تفصیلی گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید یہ موسم کا اثر تھا یا اس کی
بے بسی اس پل حاوی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اس اذیت
میں دیکھ کر بے قرار ہو رہی تھیں اسی لیے اتنی مایوسی کی
باتیں کر رہی تھیں۔

”عقل، دل سے ہارتی جا رہی ہے۔ اب تو بس
دل ہی دل ہے اور محبت ہی محبت۔“ آنکھیں موندے
وہ بے بسی سے بولی۔ لاکھ کوشش کے باوجود پلکوں کی نمی
بوند نہ کر رہا ہلکے گئی تھی۔ بیگنی رات میں برستی
آنکھیں قیامت ڈھانے لگیں۔

”اس ظالم دنیا کا درد سہنے کا حوصلہ ہے مجھ
میں.....“ انگلیاں مروڑتے اس کا اضطراب چھپائے
نہ چھپتا تھا۔

”اور اگر وہ بے وفا نکلا؟“ اس نے خوف سے
آنکھیں کھول دیں۔ دل اس پل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔
شاید کہیں بجلی گری تھی۔ شیشے کے پار روشنی کا جھماکا ہوا،
ہو کر غائب ہو گیا تھا پر فضا میں گونجنا دیر کی رہی تھی۔
”سہہ پاؤ گی اس کی بے وفائی کا عذاب؟“ لب کا فنی
وہ خاموش رہی۔ جو اس نے کہا نہیں وہ بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔

ایک گہری سانس لیتے اس نے چہرہ دوسری
طرف موڑ لیا۔ جانتی تھی اس سے آگے کچھ بھی کہنے کا
کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆

سیاہ شیشوں والی گاڑی صدر دروازے پہ آکر
رکی۔ دربان نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ انداز میں
ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ گرے پیٹ، سیاہ قمیص،
آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے نکھر اُنکھرا وہ پوری آن بان
سے چلتا رامداری کی طرف بڑھا۔ اس کی آمد کی خبر تو
صبح سے حویلی کی فضاؤں میں گردش کر رہی تھی لیکن

یہ سب سنا کر اس نے دل سے پیرے نکالے اس
پل برستی بارش کی بوندوں پہ کئی تھی۔ سیاہ سردرات اور
تیز بارش کے ساتھ سنسنائی ہوا میں..... دل میں
انجانے سے خوف نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔
”تم کب تک اس کا انتظار کرو گی؟“ وہ بھی
سامنے آئیں۔

”شاید آخری سانس تک۔“ بوندوں کی جھلمل
جاری تھی۔ نیکی مٹی کی سوندھی خوشبو کھڑکی کے کھلے پت
سے اندر آرہی تھی۔

”اسے آتا ہوتا تو کب کا لوٹ آتا۔“ اس بار بھی
اسے دیکھنے سے اجتناب برتتے اس نے بس لان کی
سیاہی مائل بیلیوں پہ نظر ٹکائے رکھی۔

”آپ تو کہتی تھیں اس گھر کے مرد اپنے قول کی
لاج رکھتے ہیں۔ وعدہ کر کے پیچھے نہیں ہٹتے اس بات کا
تو بہت یقین تھا آپ کو۔“ وہ یک دم پلٹی۔ آنکھوں میں
امید۔ چہرے پہ آس، بیلیوں پہ سوال لیے..... ایک آس
تھی جو سانس کی ڈور سے جڑی تھی اور اتنے دنوں سے
بس یہی ڈور تھا سہ وہ اس ہر جانی کی راہ دیکھ رہی تھی جو
محبت کے ریشمی دھاگے سے اس کا دل باندھ گیا تھا۔

”تم نے کب سے میری باتیں ماننا شروع کر دیں۔ تم
نے تو زندگی بھر صرف وہ کیا جو تم نے چاہا، زندگی کو ویسے
جیا جیسے جینے کی خواہش کی۔ اتنے برس بس اپنی ہی جمع
تفریق میں گزار دیے پھر اچانک میری کہی بات کی اتنی
اہمیت؟“ ایک ہچک سی ہنسی بیلیوں پہ پھیلی۔ سیردکانی کے
آخری گھونٹ کی طرح بنا محسوس کیے اس نے گئی کو اپنے
اندرا تارنا چاہا تھا۔ کڑواہٹ روح تک پہنچ گئی تھی۔

”سالوں دماغ کی سختی رہی اسی لیے آپ کی
باتیں سمجھ نہیں پائی۔ آج دل کی سن رہی ہوں تو آپ
کے یقین“ یہ یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ اعتراف،
موت سے زیادہ اذیت دیتا ہے وہ بھی اس اذیت کو
محسوس کرتی تڑپ رہی تھی۔

”اور میں جانتی ہوں تم آج بھی دل کی باتوں پہ
دھیان نہ دے کر بس دماغ کی سنو۔ وہ کرو جو عقل کہتی

جھروکے پہ نظر رکائے رملہ نے سب سے پہلے اسے اندر داخل ہوتے دیکھا اور پھر بے اختیار دوڑتی شاملہ کے کمرے میں جا پہنچی۔

”بھابی وہ آگئے۔“ پھولی سانس، بکھری زلفیں۔ وہ بے اختیاری سے بولی تو شیشے کے سامنے کھڑی ہار سنگار کرتی شاملہ کے لبوں پہ شریری مسکراہٹ چلی۔

”اس کی آمد کا عندیہ تو تمہارے گلاب ہوتے گالوں پہ لکھا ہے بنا اب یہاں کھڑی کیا شرماری ہے۔ جا اس کے پاس۔“ کانوں میں آویزے سجاتے اس نے چھینر اتو وہ شرم سے سمٹ سی گئی۔

”ان کے پاس؟ حیا سے مرئی تو نہ جاؤں گی میں ان کا سامنا کرتے۔“ رملہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے شرماتے ہوئے کہا۔

”تیرا کچھ نہیں ہو سکتا رملہ، وہ شہری بابو ہے۔ شرم و حیا سے مر جانے والیوں سے متاثر نہیں ہوگا۔ اعتماد سے آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے والی سے دل میل کھاتے ہیں ان پڑھے لکھے لڑکوں کے۔“ سدا کی دونوک بات کرنے والی شاملہ دوپٹے کا پلوسر پہ جمائے تھکے انداز میں چلی اور اپنا نارجی بھاری لباس سنبھالتی بیڈ پہ جا بیٹھی۔

”اس کے دل میں جگہ بنائی ہے تو اس کی توجہ حاصل کر۔“ شاملہ مزید بولی۔ رملہ اس کے سامنے بیٹھتے اس وسیع و عریض کمرے میں کسی مہارانی کی طرح بیٹھی اپنی بھابی سے مرعوب ہوئی تھی۔ شاملہ کی بات اس کے دل کو ٹپتی تھی۔

”یہ سب کچھ یقیناً آپ سے سبج لالہ نے کہا ہوگا۔ وہ تو ہر رمز سے واقف ہیں ان کی۔“ اس نے کریدا۔ جب سے دل کی بات زباں پہ آئی تھی وہ یونہی شاملہ بھابی کے گرد منڈلاتی ان کی باتیں سنا کرتی تھی۔ ان دنوں دل کے سب راز و نیاز انہی سے کرتی تھی۔

”تمہارے لالہ کا مزاج بہت سلکھا ہوا ہے لیکن اس چھوٹے نواب کا دماغ مختلف ہے۔ بابا سائیں اور ان کا سر چڑھایا جو ہے۔“ شاملہ نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھٹکتے اسے گر کی بات بتائی۔ یہ آج کا نیا سبق تھا جو لاڈنی منہ کے گوش گزار کیا گیا تھا۔

گھر کے اگلو تے بیٹے کی بیوی ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ رملہ کی ماموں زاد بھی تھی۔ اس ناتے شاملہ کا حویلی میں منصب کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ اس پہ بیٹا پیدا کر کے تو مزاج پونہی ساتویں آسان پہ رہتے تھے۔ وہ زیادہ پر بھی لکھی نہیں تھی کہ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا البتہ بیٹوں کو خوب اعلیٰ تعلیم دلوائی جاتی۔ کچھ یہی حال رملہ کا بھی تھا کہ اس نے اسکول کے بعد کالج کا مت نہیں دیکھا تھا البتہ زندگی کے ساتھ، ساتھ ان دنوں محبت کا سبق وہ اپنی پیاری بھابی شاملہ سے پڑھ رہی تھی جو اس کی واحد رازدار تھی۔ ان دونوں کے درمیان روایتی منہ بھاد وچ والا تعلق تو تھا نہیں، ماں حیات تھی نہ ہی کوئی بہن تھی۔ ایسے میں شاملہ کی محبت اسے نعمت لگتی۔

”اسی لیے تو ڈر لگتا ہے۔“ رملہ کی کاجل بھری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ کہاں یہ دل تھا جو اس خالم کے نام پہ بی جلتی سناجھتے لگتا تھا۔ بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں میں بس اسی کی شبیہ سوتے جاگتے طواف کرتی تھی اور اس پر ستم کدہ مہینوں بعد آکر بھی بے نیازی دکھاتا تھا۔

”ارے میری لاڈو پریشان کیوں ہوتی ہے جب پیار کیا تو پھر ڈرنا کا ہے کو۔“ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پکڑا کرتے تسلی دی۔

”آپ نے لالہ سے بات کر لی؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ان سے بات کرنے سے کیا حاصل، سیدھا بابا سائیں سے بات کروں گی۔ اب لاکھ سر پھر اسی پر بابا سائیں کو نہ نہیں کر سکتا۔ ایک بار رشتے طے ہو گیا تو کہاں جائے گا دامن بچا کر۔“ شاملہ نے اعتماد سے کہا تو رملہ کے سینے سے سکون کی سانس نکلی اور وہ ایک بار پھر مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو گئی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی تو وہ اس کی دید سے نظروں کو سیراب کر کے آئی تھی۔

”نخرے والا ہے تو کیا اس پہ چٹا بھی تو ہے یہ نخرہ۔ پورا شہزادہ ہے شہزادہ۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

☆☆☆☆

کے لیے بے چینی ٹوٹ کر رہا تھا اور اب ان کے مسکراتے چہرے پر پھیلا سکون اسے بھی سکون دے رہا تھا۔
 ”کیوں فائز؟“ سہج نے کبھی مار کر فائز کو کبھی شامل گفتگو کیا۔ ان دونوں میں بچپن سے گہری دوستی تھی۔ حالانکہ وہ عمر میں فائز سے بڑا تھا لیکن مزاج میں ہم آہنگی بلائی تھی۔

”جی بالکل لالہ اب بڑے شہر کی مصنوعی اور ہمارے علاقے کی سادہ اور خالص زندگی کا بھلا کیا موازنہ؟“ فائز نے بھی تائید کی۔ رملہ کی موجودگی سے بے نیاز وہ تینوں اپنی خوش گپیوں میں لگے تھے۔ اس کا موڈ بری طرح خراب ہوا تھا۔

ہال کمرے میں جی محفل کھانے کی میز تک جاری و ساری رہی۔ البتہ رملہ بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے اس میں شریک... نہیں ہوئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد بھی ان کی محفل جی رہی فائز کی آمد پر تو یوں بھی بابا سائیں سارے کام بھول کر بس اسی کے ہورہے تھے اور اب جتنے دن فائز یہاں تھا حوصلی کا یہی معمول رہنے والا تھا۔ ان تینوں کے شوق بھی یکساں تھے۔ بابا سائیں کو مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا یہی وجہ تھی فائز شہر سے ان کے لیے خصوصی طور پر کتابوں کا تحفہ لانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ اور شرط کو تو گھر میں جیسے قوی کھیل کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی یہی عادات سہج اور فائز نے اپنائی تھیں۔ فائز کی آمد کے بعد دیر رات تک ایسے ہی شغل چلا کرتے تھے۔

☆☆☆

”کہاں بھاگی جا رہی ہو رملہ؟“ فائز کو حیرانی ہوئی۔ فائز اس وقت اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا جب یک دم اس کا راستہ کاٹتی رملہ اس پر توجہ دیے بغیر سیدھی، سیدھی اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ خود پہ قابو پاتی وہ اس کی آواز پر مڑی۔

”اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔“ اس نے فائز کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ حالانکہ اندر اس پل ایک طوفان پھا تھا۔ لہجے میں حد درجہ بے نیازی سیٹھی وہ ایسے ظاہر کر رہی

”پورے دو ماہ بعد دھانی ہے تم نے۔“ اقرار اس نے اسے سینے سے لگاتے تبصرے میں کہا۔

”امتحان چل رہے تھے بابا سائیں ورنہ میں تو جلد آنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔“ وہ ہولے سے اس محبت بھرے شکوے پہ مسکرایا۔

”اب بھی میں نہ بلاتا تو تم نے کہاں آتا تھا۔ شہر میں خوب دل لگ گیا ہے تمہارا۔“ فائز نے نفی میں سر ہلاتے ان کا بازو دبایا۔

”شہر میں کیا رکھا ہے بابا سائیں۔ یہاں آپ ہیں، لالہ ہیں، گھر ہے، سب گھر والے ہیں۔ تعلیم کا مقصد نہ ہوتا تو بھلا میں وہاں اکیلا کیوں رہتا۔“ راہداری سے گزرتے رملہ کے کانوں سے فائز کی آواز نکلئی۔ وہ بابا سائیں کے ساتھ چلتا اپنے اسی مخصوص اور دل کو چھو لینے والے انداز میں گفتگو کرتا اس پل رملہ کی دھڑکنیں بڑھ رہا تھا۔ ستون کے پیچھے سے اس نے جھانک کر دیکھا جہاں اقرار اس کے ساتھ فائز اور سہج لالہ اب بڑے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتے ہیں ورنہ کچی بات تو یہ ہے تمہاری عمر میں اس چھوٹے شہر میں ہمارا دل بھی نہیں لگتا تھا۔ اس وقت تمہارے نانا سائیں بھی ہم سے ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے جیسے ہم آج تم سے کرتے ہیں۔“ اقرار اس نے اپنی ہی بات سے لطف اندوز ہوتے قہقہہ لگایا۔ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں تھے۔ صبح سے انہیں فائز کا انتظار تھا اور اب اسے دیکھ کر دل میں سکون اتر گیا تھا۔ کچھ تو اس کے لیے فطری محبت تھی اور کچھ اس کی بے پناہ ذہانت اور ان سے خصوصی وابستگی تھی جس کے باعث اقرار اس کے دل میں فائز کی محبت اپنی ہی اولاد سے بھی بڑھ کر تھی۔

”آپ کا تو پتا نہیں بابا سائیں لیکن میں اپنی اور فائز کی طرف سے کنفرم کر سکتا ہوں آپ کو کہ ہم جہاں بھی ہوں اپنے گھر اور آپ کو دل میں لیے گھومتے ہیں۔“ سہج نے ہنستے ہوئے چھیڑا تو انہوں نے بھی انجوائے کرتے سر ہلایا۔ صبح سے وہ بابا سائیں کی فائز

تھی جیسے فائز کا ہونا نہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

کے سوا کوئی توجیح سمجھتی بھی کیا۔ وہ خود کون سا جانتا تھا اندر اندر کیا چھڑی پک رہی ہے۔

”ہاں واقعی ایسی کیا بات ہوگی۔“ فائز نے زیر لب بڑبڑاتے خود کو تسلی دی اور سب سے کچھ اور بات کرنے لگا۔

☆☆☆

انوار الحسن اپنے علاقے کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ بڑی زمینداری کے ساتھ شوگر مل، فلور مل اور لاتعداد پھلوں کے باغات ان کی ملکیت تھے۔ سالوں سے اس علاقے میں ان کا ہم پلہ کوئی دوسرا گھرانہ نہ تھا۔ اقرار الحسن اور یاسمین ان کے دو ہی بچے تھے۔ خاندان میں تعلیم کا رجحان نہ تھا پر اقرار الحسن کو ان کی خواہش پر اعلیٰ تعلیم کی خاطر شہر بھیجا گیا تھا لیکن یاسمین بہت منت سماجت کے بعد بس میٹرک ہی کر پائی تھی۔ انوار الحسن کا رعب و دبدبہ ایسا تھا کہ اپنی اولاد بھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھی کچا اپنی خواہشات کے لیے ضد کرنا۔ انوار الحسن نے بیٹی کو اتنا پڑھا کر بھی گویا پردہ کی روایات سے ہٹ کر کچھ کام کیا تھا۔ اقرار الحسن کی شادی ان کے والد نے اپنی بہن کی بیٹی جنت خاتون سے طے کی تو انہوں نے باپ کی خواہش اور حکم پہ سر تسلیم خم کیا پر یاسمین نے تو جیسے شان ہی لی تھی باپ سے بغاوت کرنے کی۔ چچا زادیاور کارشہد ٹھکرا کر اس نے یاسر حسین کا انتخاب کیا۔

یاسر حسین، انوار الحسن کے فشی کا بیٹا تھا۔ شہر سے نیا، نیا گریجویٹ ہو کر آیا تھا جب یاسمین اسے دل دے بیٹھی اور پھر باپ بھائی کے خلاف جا کر مرضی کی شادی کر کے شہر جا بسی۔ وہ بھائی کی لاڈلی نہ ہوتی تو باپ اسے اتنی ذلت اور شرمندگی پر جان سے ہی مار ڈالتے پر فرمانبردار بیٹے کی رحم کی درخواست قبول کرتے انہوں نے بس یاسمین سے اپنا ہر تعلق ختم کر کے اسے زمین جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ کچھ ایسی ضد اور خاندانی غرور تھا انوار الحسن کے خیر میں کہ پھر مرتے دم تک انہوں نے بیٹی کی صورت دیکھی نہ ہی بیٹی نے اپنا منہ دکھایا۔ ان کی وفات کے چند سال بعد ایک حادثے

”کمال ہے، کب سے آیا ہوں اور تم ملی بھی نہیں۔ اب بھی غیروں کی طرح نظر انداز کرتی بھاگی جا رہی ہو۔“ اس نے خود ہی احساس دلایا تو رملہ نے یوں چونک کر دیکھا جیسے واقعی وہ فائز کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھی۔ بہر حال فائز نے ہی سلام کرنے میں ہاتھ کی اور پھر خیریت دریافت کی۔ بہت لگے بندھے انداز میں فائز کو جواب دے کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ پیچھے فائز حیران، پریشان کھڑا رہ گیا۔

رملہ جو اس وقت فائز کی توجہ حاصل کرنا چاہتی تھی جانتی تھی سامنے چلی بھی گئی تو سب کے سچ نہ تو وہ اس سے ڈھنگ سے بات کر پائے گا نہ ہی وہ اس کی طرف دھیان دے گا پر اب جس انداز سے اس نے اس کی موجودگی کو سر اسر نظر انداز کر کے اینٹری دی تو فائز کی توجہ خود بخود اس کی طرف گئی تھی۔

”یہ رملہ کو کیا ہوا ہے۔ مجھ سے پردہ کرنے لگی ہے کیا؟“ ہال میں داخل ہوتے سمجھ کر فائز نے بے اختیار پوچھا۔ رملہ کا اندازہ درست تھا فائز کو واقعی اس کے رویے نے چونکا دیا تھا۔ اسی لیے رملہ کے جاتے ہی اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”ڈھنگ سے دعا سلام بھی نہیں کی۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتی تھی آج تو بہت بدلی، بدلی سی لگ رہی ہے۔“ فائز اس بدلے ہوئے رویے کو نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔ وہ سب سالوں سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ رملہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور فائز اس کا بالکل اسی طرح خیال رکھتا تھا جیسے سب لالہ رکھتے تھے۔ اپنی کسی بھی ضرورت یا خواہش کے لیے وہ اس گھر میں ان تینوں پہ یکساں حق رکھتی تھی۔ سب کی طرح رملہ، فائز کی بھی ذلتے دیاری تھی پر اب جس طرح وہ اس سے بات کیے بنا جا رہی تھی فائز کے لیے اس کا رویہ حیران کن تھا۔

”ویسے کوئی خاص بات تو نہیں ہے تم خود ہی پوچھ لیانا۔ دیر سے آتے ہونا تو شاید خفا ہے ورنہ ایسی کیا بات ہوگی۔“ سب سے خود بھی حیران تھا اور فی الفور اس

بالوں پر نکالا تھا۔ وہ اب سارہ کی طرف متوجہ بھی جو اپنے بن کباب کے آخری لقمے کھا رہی تھی۔ گھوم پھر کر وہ ایک بار پھر اسی موضوع کی طرف آگئی تھی جس کی وجہ سے وہ پچھلے کچھ عرصے سے شدید پریشان تھی اور جس کا حل اس کی سمجھ اور اختیار دونوں سے بالاتر تھا۔ اس بار لہجہ بھی تھوڑا مدہم تھا۔

”مسئلہ نہیں محترمہ آپ کے پاس مسائل ہیں اور میں ٹھہری نصیحتی سی جان اور یہ چنا منا سادل ہے میرا“ کچپ میں فراز ڈبوتے سارہ نے استہزائیہ کہا۔ سین نے باقاعدہ اسے گھورا تھا۔

”جتنا مناسادل ہے ناں تمہارا اس سے بھی چنا وماغ ہے۔ نیچ ٹائم ختم ہونے والا ہے اور تم نے اب تک کام کی بات نہیں بتائی“ گھڑی دیکھتے اس نے چڑ کر کہا مگر سارہ کے اطمینان میں دراڑ نہ ڈال پائی۔

”اے مسوئلی کی جانشین، ذرا چھری تلے دم لو۔ بتاتی ہوں تمہارے مسئلے کا حل بھی۔ حلق تو تر کر لینے دو میری ماں، ویسے بھی تمہاری اس سنگل پہلی کو کرائی جانے والی خوفناک گھوریاں دیکھ، دیکھ کر میرا گلا سوکھ رہا ہے۔“ سارہ نے باقاعدہ گلے پہ ہاتھ رکھتے انتہائی معصوم شکل بنائی۔

”لو پو مرو یہ گرم کولڈ ڈرنک اور جلدی بکو۔“ سین نے ہنسی چھپاتے پاس پڑی لوک کی بوتل پینے کے سے انداز میں اس کے آگے رکھی۔

”دیے اگر بچپن کی دوستی نہ ہوتی تو اتنی سڑی ہوئی باتوں کے بعد تمہیں گھاس بھی نہ ڈالتی۔“ سارہ ٹپسکون سے انداز میں گھونٹ بھرنے لگی۔

”تم بتا رہی ہو یا میں جاؤں؟“ سین اب اس تاخیر سے بور ہو رہی تھی۔

”اچھا، اچھا بتاتی ہوں یا رخا کیوں ہوتی ہو۔“ اس کی دھمکی پہ سارہ نے ہاتھ کے اشارے سے حوصلہ دیا اور ایک ہی سانس میں بقیہ سو فٹ ڈرنک ختم کر کے گہری طویل سانس لی۔

دراصل سارہ سے بڑھ کر سین کو شاید ہی کوئی

میں سپر مین کھوم رہا ہے۔ انسان ہی ہے ناں کھائیا جو کا۔ معاف کر دو غریب کو۔“ بس ایک سارہ ہی تھی جو غصے کی حالت میں بھی اسے چھیڑ سکتی تھی کہ تعلق بہت پرانا تھا ورنہ کسی عام انسان کے بس کی بات تو نہیں تھی سین سے غصے کی حالت میں پڑنا لیتا۔

”ذہنی بیمار لوگ ہیں یہ، انہیں لگتا ہے گھر سے باہر نکل لڑکی تو نالہ ہے۔ کوئی نہیں سوچتا ہماری زندگی میں کیا مسائل ہیں۔ ہمیں شوق نہیں سڑکوں پہ آوارہ گردی کرنے کا۔ ہم پر بھی تو ذمے داریاں ہو سکتی ہیں۔“ اپنا برگرز مار کر کرتے وہ رنجیدہ سی ہوئی۔ پہلے ہی ذہن اتنا منتشر تھا کہ چھوٹی، چھوٹی باتیں بھی اس کا دماغ کھولا رہی تھیں ورنہ پچھلے دو سال سے ملازمت کرتے وہ ایسی صورت حال سے بار بار گزری۔ اب تو ان اوجھی حرکتوں کی عادی ہو چکی تھی پر آج معاملہ مختلف تھا شاید اس کا صبر جواب دینے لگا تھا۔

زندگی آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں سے دو سال پہلے آغاز ہوا تھا۔ وہ غصے کی تیز تھی کہ یہ مزاج اسے وراثت میں ملا تھا پر زندگی میں جمود کی کیفیت نے اسے حد درجہ چڑچڑایا تھا۔

”کون سی نئی بات ہے میری جان۔ یہاں تو زندگی گزر گئی یہی معاملات دیکھتے، دیکھتے۔ اب تو تمہیں بھی عادت ہو جانی چاہیے۔“ سین کے مقابلے

میں سارہ خاصی متحمل مزاج تھی۔ بڑے سے بڑے مسئلے پر بھی وہ بے نیازی دکھاتی کہ سامنے والا دنگ رہ جاتا۔ سین کی زندگی کی طرح اس کے حالات بھی مشکل و

عجیب تھے۔ وہ سارہ جیسی نارمل زندگی نہیں گزار رہی تھی پھر ایسا کیسے ممکن تھا اس کا رویہ بھی نارمل ہوتا۔

ایسے حالات انسان کی زبان میں کڑواہٹ بھر دیتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ سین کے ساتھ بھی تھا۔ نارمل لڑکیوں والی کوئی بات تو اس میں تھی ہی نہیں۔

”چھوڑو خیر، یہ بتاؤ میرے مسئلے کا کیا حل سوچا؟“ اپنے بالوں کو سمیٹ کر انہیں پہلے سے زیادہ کس کر کچر میں جکڑتے اس نے اپنا سارا غصہ سر کے

اے جانتا تھا۔ ہاں اسوں نے وہ دونوں ایک ساتھ تھیں پھر گریجویشن کے بعد ملازمت بھی ایک ہی کمپنی میں کرنے لگیں۔ اب اتنے طویل ساتھ اور اتنی بچی دوستی میں ایک دوسرے کے مزاج سے ہم آہنگی ہونا تو فطری بات تھی۔ اسی لیے لاکھ اختلافات اور ٹکراؤ کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے پہ انحصار بھی بہت کرتی تھیں۔

”دو لفظوں میں پھونٹو.. نو فضول ناکیں، ٹائمن۔“ سین نے چٹکی بجاتے اسے وارننگ دی۔

”کرایے دار۔“ سارہ نے گردن اڑاتے اعلان کیا۔

”کرایے دار؟“ سین کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔ الجھے ہوئے لہجے میں اس نے سوال کیا پرسارہ اپنا شوذر بیگ اٹھائے کھڑی ہو گئی۔

”یہ کیسا حل ہے بھلا؟“ اپنی چیزیں سمیٹتے سین الجھی پرسارہ نے ہرگز توجہ نہ دی۔

”تم نے دو الفاظ کی مہلت دی تھی تو بتا دیا۔ اس سے آگے اب میں خاموش ہوں۔“ سین ہونٹ بھیجنے پیر پختی اس کے ساتھ چل پڑی۔

جانتی تھی اب سوئٹیں کروا کر ہی یہ لڑکی پوری بات بتائے گی۔

☆☆☆

”بابا سائیں کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ شائلہ بھالی نے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا، دروازے میں کھڑے ہو کر اجازت مانگی۔ ساس کے انتقال کے بعد گھر کا سارا انتظام شائلہ کے پاس چلا آیا تھا۔

”ارے بہو وہاں کیوں کھڑی ہو اندر آؤ۔“ گھر میں خاتون خاندن کی کمی کو شائلہ نے بڑے احسن انداز میں پورا کیا تھا یہی وجہ تھی اقرار احسن بہو کو بہت مان دیتے تھے۔ اور پھر شائلہ چونکہ اپنی ساس کی جیتی تھی تو حویلی میں اس کا مقام بہت جلد بن گیا تھا۔ رملہ عمر میں چھوٹی تھی اور اس میں لالباہی پن بھی تھا۔ اسے تو بس ضد میں منوانی آتی تھیں، فرمائشیں کرنی آتی تھیں۔ وہ

خوبی سے معاملات دیکھنے پر وادعی اسی لیے شائلہ کا یہاں پورا کنٹرول تھا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔“ دودھ کا گلاس سائڈ ٹیبل پہ رکھتے اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اقرار احسن نے سر کے اشارے سے انہیں اجازت دیتے سانسے رکھی کرسی پہ بیٹھنے کو کہا تھا۔

”بابا سائیں رملہ کی شادی کا کیا سوچا ہے آپ نے؟“ اس نے دھیمے لہجے میں کرید۔

”رملہ کی شادی کا ابھی کیا ذکر۔“ نا سمجھ بچی ہے وہ تو۔“ اکلوتی لاڈلی بیٹی کو خود سے جدا کرنا اتنا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ اس کی شادی کا سوچ کر ہی دل اداس ہو جاتا تھا برا بھی تک تو دل کو یہی تسلی تھی کہ وہ وقت دور ہے جب بیٹی کو بیاہ کر رخصت ہونا ہے۔

”دراصل میرے ملنے جلنے والوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں پیغام دیا ہے پراچھارشت جب گھر میں موجود ہو تو باہر کا کیوں سوچنا۔“ شائلہ بھالی نے بات بناتے کن انکھیں سے بابا سائیں کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟“ وہ واقعی اس کا اشارہ نہیں سمجھتے تھے۔

”میں فائز کی بات کر رہی تھی بابا سائیں، رملہ چاہتی ہے اسے..... اور جہاں تک میرا خیال ہے فائز بھی اسے پسند کرتا ہے۔“ شائلہ نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ رملہ کی حد تک تو بات درست تھی اور شائلہ یہ انہی طرح جانتی تھی لیکن فائز کا نام اس نے خود ہی لگا کر بات کو کور کیا تھا۔ اقرار احسن کے چہرے پہ بے پناہ حیرت چھپانے نہ چھپی تھی۔

چند سال پہلے تک رملہ، فائز سے کافی قریب تھی۔ عمر بڑھی تو تعلق میں ایک جھجک در آئی۔ فائز پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا۔ شائلہ کی آمد سے رملہ کا دھیان بھی بدلا اور وہ اس کی پہنی انجوا کے کرنے لگی۔ ویسے بھی ان کا خاندان بہت زیادہ روایتی تھا اور عورتوں سے مردوں کی بے تکلفی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا ایسے میں رملہ اور فائز کے درمیان لحاظ اور فاصلہ بڑھ گیا تھا پھر بھی اس کا روتیہ فائز سے نارمل ہی تھا۔ یہ تو کچھ عرصے سے شائلہ بھالی کی

پھر فائز تو ان کا سب سے چہیتا اور پیارا تھا۔ اس کی تربیت بھی اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ اس سے بڑھ کر بہترین رشتہ لاڈلی بیٹی کے لیے دوسرا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ البتہ کچھ بھی کہنے سے پہلے انہوں نے خود فائز سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

☆☆☆

طویل کاریڈور سے نکل کر وہ اب پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپنے آفس کے کنفرنٹس روم پر پیر کی کھلی سے نکل کر کھلی فضا کی گرمی کا احساس شدید تھا۔ آنکھوں کو دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے سیاہ سن گلاسز نکال کر آنکھوں پہ سیٹ کرتے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سہ پہر کے وقت حسب معمول پارکنگ گاڑیوں سے پُر تھی۔ دور کھڑی اپنی گاڑی کو اسپاٹ کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑی چابی سے گاڑی کو ان لاک کیا تھا۔ تیز قدموں سے چلتا وہ اب گاڑی تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سیل فون پہ کوئی کال ملائی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی اس کا بلیوٹوتھ آن ہو گیا تھا۔ دوسری طرف تیل جاری۔

”ہیلو عدن، کہو کیا احوال ہیں۔“ گاڑی کے اسپیکر میں سے فرقان کی آواز ابھری تھی۔

”میرا حال تو بھیک ہو گا جب تم مجھے میرے مطلب کی بات بتاؤ گے۔“ گاڑی اب مین روڈ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں ڈرائیو کرتا قدرے شجیدگی سے بولا۔

”تمہارا نفٹی پرنسٹ کام ہو چکا ہے باقی نفٹی پرنسٹ بھی شاید آج کل میں ہو جائے گا۔ ویسے تمہیں اندازہ نہیں اسے راضی کرنا کتنا مشکل ہے۔“ فرقان نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

”اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ میں تمہاری کنفرم کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب تک یہ کام مکمل نہیں ہو جاتا میں کہیں اور فوکس کر نہیں کر سکوں گا۔“ وہ گہری سوچ کے حصار میں تھا۔

”ویسے تم ڈائریکٹ کانٹیکٹ کیوں نہیں کرتے

یعنی گفتگو نے اس کے دل میں فائز کے لیے احساسات کو بڑھا دیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی مگر بھائی کی یہ چھیڑ چھاڑ اسے بھی اچھی لگنے لگی اور اب تو وہ کھل کے اقرار کرتی تھی کہ فائز اسے دل و جان سے پسند ہے۔ اسے دیکھنے کا نظریہ بدلاتا تو اس کا سامنا کرنے میں جھجک بھی ہونے لگی۔ وہ نادان تھی پر اس کے مقابلے میں

شائلہ خاصی چالاک تھی۔ رملہ کم عمر تھی اور باپ بھائی کا خوف بھی پر شائلہ یہ ایسی کوئی روک ٹوک نہ تھی دوسرے وہ عمر کے اس جذباتی حصے سے گزر چکی تھی جہاں عقل کی ڈور دل سے بندھ جاتی ہے۔ اور اب تو ویسے بھی شادی شدہ تھی اور ساس کے نہ ہونے کے گرد میں ایک خاص رتبہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔

گھر میں دو لوگوں کو پکوں پہ بٹھایا جاتا تھا جن میں ایک تو اس کی چھوٹی مندر رملہ تھی جس کی خوشی کی خاطر ساری دنیا کو چولھے میں بھی جھونکا جاسکتا تھا اور دوسرا تھا دراج بھمار۔ اور اصل میں یہ دونوں ہی شائلہ کی آنکھوں میں کانٹنے کی طرح کھٹکتے تھے۔ شائلہ نے اپنی عقل نرا کر حوبلی میں اپنا اہم مقام بنالیا تھا یہی وجہ تھی اقرار احسن اس کی بہت سنتے تھے۔ اب بھی اس نے فائز اور رملہ کے رشتے کی بات دے، دے، دے لفظوں میں ان کے کانوں میں ڈال دی تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی فائز کبھی رملہ کے لیے نہیں مانے گا اور ان حالات میں ظاہری بات ہے اقرار احسن کی نگاہوں سے ہی نہیں دل سے بھی اتر جائے گا۔ دوسری طرف رملہ تو اس کے ہاتھوں کٹ پٹی بنی ہوئی تھی۔ جیسے چاہتی نہ جاتی۔

اقرار احسن کے لیے یہ انکشاف حیرت کا باعث تھا پھر بھی اس پر اپنا رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے وہ خاموش رہے تھے۔ انہوں نے کبھی خود سے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ فائز کو وہ اپنی اولاد مانتے تھے شاید اسی لیے وہ فائز کو رملہ کے حوالے سے نہیں سوچ پائے تھے۔ لیکن اب وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ بیٹی ہمیشہ نظروں کے سامنے ہوگی اور

آخر؟“ فرقان نے اپنے تئیں مشورہ دینے کی کوشش کی۔

”that's the last option“ اس

نے یک دم اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”ویسے بھی وہ شاید اس پہ بھی راضی نہ ہوں۔“

اس نے لب بھینچتے مزید کہا۔

”چلو پھر سینڈ پلان کو ہی فالو کرتے ہیں

انشاء اللہ بازیو آنسر ہوگا۔“ فرقان کی بات سے اسے

تسل ہوئی تھی اگلے کچھ منٹ وہ دونوں اسی مسئلے پہ

ڈسکشن کرتے رہے تھے۔ جواب آنے کی صورت میں

فرقان کو آگے سے کیا کہنا ہے اور کس انداز میں بات

سنجانی ہے وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ کال بند کرتے ہوئے

اس کا چہرہ پرسکون تھا جیسے کوئی بوجھ اترنے والا ہو۔

وہ اب اسٹیرنگ وکیل پہ لگے چند بیٹنوں کو چھیڑ رہا

تھا۔ گاڑی میں اس کا پسندیدہ میوزک بجنے لگا تھا۔

اسٹیرنگ پہ جچی اس کی انگلیاں بے اختیار ٹیپ کر رہی

تھیں۔ یقیناً وہ اپنی ڈرائیو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆

وہ اس بار زیادہ وقت رک نہیں کا تھا۔ یونیورسٹی

میں داخلے شروع ہو چکے تھے اور اسے واپسی کی جلدی

تھی۔ یہاں ویسے بھی اس کی کوئی مصروفیت نہ تھی۔ روز

صبح وہ ادا سٹیج کے ساتھ فیکٹری چلا جاتا یا پھر بابا سائیں

کے ساتھ زمینوں کا چکر لگا لیتا ایسے میں رملہ کا اس سے

سامنا کم ہی ہوا لیکن جب بھی وہ سامنے آتی اسے غیر

معمولی طور پہ نظر انداز کر دیتی۔ یہ پٹی بھی شاملہ بھابی

کی پڑھائی ہوئی تھی کہ جتنا ہو سکے اس کی نظروں میں تو

رہے پر بات چیت سے گریز کرے تاکہ فائز اس کے

بدلے ہوئے رویے کو سوچے۔ اب بھی وہ اس کی آمد کی

منتظر ہال کمرے کے چکر لگا رہی تھی جب فائز اپنے

کمرے سے نکل کر بابا سائیں کے بلاوے پر ان کے

کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

”خیر تو ہے یہ تم نے نولفٹ کا سلسلہ کیوں شروع

کر دیا بھی۔ جب سے آیا ہوں ایسے انگور کر رہی ہو

جیسے میرے آنے سے تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔“

اسے دیکھتے ہی رملہ انجمن بن کر وہاں سے گزرنے لگی

کہ فائز نے راستہ روک لیا۔

”وہ تو پہلے بھی نہیں پڑتا تھا۔“ اس نے گردن

موڑے کمال بے نیازی سے کہا۔ فائز نے فہمی دہائی۔

”اچھا جی تو پھر میں وہ سارا سامان شاملہ بھابی کو

دے دوں جو شہر سے تمہاری فرمائش پر لایا تھا کیونکہ

تمہیں تو اب میرے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔“ فائز حوصلی لوٹنے سے پہلے سب سے ہی پوچھا

کہ تھا کہ اگر کسی کو کوئی چیز چاہیے تو وہ بطور تحفہ ان کے

لیے لے آئے۔ رملہ کی فرمائشی لسٹ طویل ہوتی تھی اور

فائز وہ یا سب کچھ کوئی اس کا سامان کبھی نہیں بھجوتا تھا ورنہ

آفت آ جاتی تھی۔ اسے منانے کے چکر میں ان دونوں

کے دُگنے خرچ ہو جاتے تھے۔ اس بار بھی آنے سے

پہلے اس نے سب کے لیے شاپنگ کی تھی جس میں رملہ

کی شاپنگ سرفہرست تھی۔

”خبردار میری چیزیں اگر شاملہ بھابی کو دیں تو

مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ یہ دھمکی کا اگر ثابت ہوئی

تھی وہ یک دم بچی بن کر کھٹکی کا اظہار کرنے لگی۔

”وہ تو خیر اب بھی کوئی نہیں ہے لیکن پتا تو چلے

بندے کا قصور کیا ہے؟“ اس نے اسے چڑایا۔

”شکوہ تو ایسے کر رہے ہیں جیسے میری بہت پروا

ہے آپ کو۔ شہر جا کر کبھی ایک فون کال تک تو کی نہیں

آپ نے مجھے۔“ حوصلی سے اسے اتنی بار کال کی جاتی

تھی کہ فائز کو خود کال کرنے کی ضرورت کم ہی پڑتی

تھی۔ رملہ پر بھی ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ بھی آنسر

اسے فون کرتی تھی پر اس کی انوکھی فرمائش نے فائز کو

حیران کیا تھا۔

”پڑھائی کر رہا ہوں وہاں۔ اب تمہیں کیا پتا

آگے جا کر اسٹڈیز کتنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ تم نے تو

میٹرک کے بعد کالج جانے سے صاف انکار کر دیا۔

حالانکہ میں بابا سائیں کو راضی کر سکتا تھا۔“ عام سے

لہجے میں کہتے اس نے قصداً رملہ کی بات کو نظر انداز کیا

اور پھر بات کا رخ ہی موڑ دیا۔

”مجھ سے نہیں ہوتی یہ پڑھائی وڑھائی۔ خواہ
خواہ کتابیں جاننے سے میرا تو سر درد کرتا ہے۔“ رملہ
نے سر پہ ہاتھ مارتے منہ بنایا۔
”حالانکہ پڑھائی زندگی میں سب سے اہم
ہے۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”خیر جیسے تمہاری
خوشی۔“ اور پھر بات بدل دی۔

”تمہاری چیزیں میں نے رشیدہ کے ہاتھ تمہارے
کمرے میں بھجوا دی ہیں۔ کل میری واپسی ہے سوچا بھول نہ
جاؤں۔ بغیر خطا کے موڈ دکھا رہی ہو بعد میں تو شکل بھی نہ
دیکھتیں۔“ اپنی بات کے اختتام پر وہ توجانے لگا تھا پر رملہ کی
سرکشی نے اس کے قدموں کو روک لیا۔
”یہ چہرہ نہیں دیکھوں گی تو سانس کیسے آئے گی
بھلا۔“ وہ زربلب بڑبڑائی کہ فائز کچھ سمجھ نہیں پایا۔

”کیا کہا؟“ اس نے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔ آپ کہیں جا رہے تھے؟“ اس کے
لہجے میں واضح گھبراہٹ تھی۔ اپنی احمقانہ بے ساختگی پہ
خود کو کوستے اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔
”ہاں بابا سائیں نے اپنے کمرے میں بلایا تھا
شاید کوئی اہم بات کرنی ہے۔“ فائز، رملہ کی بدلی ہوئی
رنگت پہ چونکا۔ پر اسی وقت سبج لالہ وہاں آگئے۔ ویسے
بھی وہ بابا سائیں کے خصوصی بلاوے پہ حیران تھا۔

”تم یہاں کھڑے ہو فائز وہاں بابا سائیں تمہارا
بارہ بار پوچھ چکے ہیں۔“ سبج نے آتے ہی اسے بابا
سائیں کا پیغام سنایا جبکہ رملہ ان دونوں کو جو گفتگو دیکھ کر
کھسک گئی تھی۔

”میں بس جا ہی رہا تھا رملہ سے بات کرنے رک
گیا تھا۔“ سبج کو وضاحت کرتے وہ اس کے ساتھ ہی
جلدی سے باسائیں کے کمرے کی طرف چل پڑا تھا۔

☆☆☆☆

اقرار الحسن نے بلا تمہید اس سے رملہ اور اس کی
شادی کی بات کر دی تھی۔ انہیں شائلہ بھائی کی بات
قدر سے مناسب لگتی تھی۔ فائز ان کے ہاتھوں کا پلا انہیں
ان کی اولاد سے بڑھ کر عزیز تھا اور وہ جانتے تھے ان کی

سارہ نے یہ بھی جوانی کی سی۔ کوئین کا ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ تھا لیکن اس کے گھریلو حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سارہ کے ریفرنس کی بدولت ہی اسے یہاں ملازمت آسانی سے مل گئی تھی لیکن تنخواہ بس گزرا رہے لاکھ تھی۔ سارہ خود بھی ایک مڈل کلاس گھر کی لڑکی تھی لیکن ملازمت اس کی ضرورت نہیں شوق تھا جو وہ وقت گزاری کی خاطر کر رہی تھی۔

سین کے لیے یہ ملازمت اور اس سے ملنے والے چند ہزار روپے بہت اہم تھے۔ پہلے والد کی شدید علالت اور ان کی وفات کے بعد اپنی بیوہ ماں کی ذمہ داری سے اب اسی کے سر پہ تھی۔ حالانکہ وہ خود ملازمت کرنا چاہتی تھیں لیکن سین کو ان کی بات سے اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا جب اس کے باپ نے انہیں تمام عمر ملازمت نہیں کرنے دی تو وہ بھی انہیں یہ پوچھ اٹھانے نہیں دے گی۔ اس کا خدشہ مزاج اور اپنی بات پہ اڑ جانا بہت حد تک اپنے ذیہ جیسا تھا اور ایسا اس کی ماں کا کہنا تھا۔ وہ جانتی تھیں بہت کم عمری میں سین کے سر پہ بڑی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کبھی ایام اس کی زندگی کا حسن اور جوانی کی بے پروائی چھین لے۔ وہ اسے زندگی میں بہت کچھ نہیں دے پائی تھیں۔ وہ آسودگی جس کی ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کے لیے خواہش ہوتی ہے۔ وہ فراغت جو کم عمری میں ہر انسان کا حق ہوتی ہے۔ یہ سوچ انہیں اندر ہی اندر پریشان بھی کرتی تھی کہ اس پہ اس کی ہمت سے بڑھ کر بوجھ لا دیا گیا ہے لیکن وہ بھی بے بس تھیں کہ یہی تقدیر کا لکھا تھا جسے بدلنا ممکن نہ تھا تو بس صبر سے اچھے وقت کا انتظار ہی کیا جاسکتا تھا۔

وہ تپے ہوئے لہجے میں بولی تو سارہ نے کندھے اچکائے جو خود اپنے سامنے پڑے کمپیوٹر پہ ساتھ ساتھ ڈیٹا انٹری میں مصروف تھی۔

”تھینک یو، میں جانتی تھی تم کچھ ایسا ہی کمٹ کرو گی۔ وہ کیا ہے ناں میں تمہاری طرح decadent (کامل) تو ہوں نہیں جو زمین کو خرد کر خزانہ کانٹنے

مردوں کی اپنی امیدوں کا ذکر کرتے رہے۔ فائز اس مان کو توڑ نہ پایا اور چپ چاپ ان کے کمرے سے چلا آیا لیکن اضطراب تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا اس کے دل کی سلیٹ بھلے صاف تھی لیکن یہ بھی سچ تھا وہ رملہ کو اپنی سگی بہن سمجھتا تھا۔ اسے اس تعلق سے سوچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کیونکہ اپنے جیون ساتھی کے روپ میں جو خاکہ اس کے ذہن نے بنایا تھا رملہ اس پر ہر کسی طور پوری نہیں اترتی تھی۔ اسے میچور سوچ والی تعلیم یافتہ لڑکیاں متاثر کرتی تھیں۔ پھر ابھی سے شادی..... تو کیا اسے بابا سائیں کی خوشیوں پہ خود کا کیرئیر قربان کرنا ہوگا۔ یہ اس کی تعلیم کے اہم ترین سال تھے۔ اسے خود کو ان چہروں میں نہیں ڈالنا تھا۔

تمام رات بے سکنی میں گزرا کر صبح تک اس نے خود میں یہ ہمت جمع کی تھی کہ وہ بابا سائیں کو بچ بتا دے گا مگر اس سے بھی پہلے حویلی کی فضاؤں میں فائز اور رملہ کا رشتہ طے ہونے کی بات گردش کر رہی تھی۔ منوں مٹھائی کے ٹوکے پوری برادری اور ملنے جلنے والوں میں ہانٹنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ بابا سائیں کی خوشی چھپائے نہیں چھپی تھی۔ سب نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا اور مبارک دی۔ اس بار حویلی والوں کے چہروں پہ خوشی کے جتنے گہرے رنگ تھے فائز کے اندر اتنی ہی تاریکی اتر رہی تھی۔

وہ چپ چاپ بوجھل دل کے ساتھ شہر واپس چلا آیا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری طرح انتہائی بھونٹ اور یکواں آئیڈیا ہے تمہارا۔“ موصح ملتے ہی اپنے دماغ میں ہونے والی کھد بد کو کم کرنے وہ سارہ کے پاس چلی آئی تھی جس نے دو چار منتوں کے بعد اسے تفصیل بتائی دی تھی پر سین کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آفس آکر وہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

یہ ایک پرائیویٹ کمپنی تھی جن کا اپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ دو سال پہلے گریجویٹس کے بعد

”زیادہ انزومت۔ تم سنی سیکس ہو یہ میں اپنی طرح جانتی ہوں بس میرا ہی حوصلہ ہے جو برداشت کر رہی ہوں۔“ کرسی سے اٹھتے اس نے حساب چکایا۔

”اب یہ تو اللہ جانتا ہے کون کسے برداشت کر رہا ہے میری جان۔“ سارہ کی آواز پہ سر مارتی وہ سنجیدگی سے واپس اپنی میز پہ جا بیٹھی۔ اپنی میز پہ بڑی اسپریڈ شیٹ پہ غائب دماغی سے نگاہ ڈالتے اس کا دھیان منتشر تھا۔ ذہن اب پہلے سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔

تو کیا سارہ نے جو صل بتایا تھا واقعی وہ اتنا عملی ثابت ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو سین کو بغیر وقت اور محنت کے اچھا خاصا ریلیف مل سکتا تھا۔ مگر یہ سب بظاہر جتنا سادہ اور آسان نظر آ رہا تھا کیا عملی طور پہ بھی یہ اتنا ہی آسان ہو جائے گا؟ ذہن میں اٹھتے خیالات کو جھٹکتے اس نے اپنے سامنے بڑے کمپیوٹر میں سے مائیکروسافٹ ایکسل کی فائل کھولی اور اکاؤنٹس ٹیلی کرنے لگی۔ اسے یہ فائل آج ہی کر اس چیک کے لیے اکاؤنٹس کو واپس بھجوانی تھی۔

☆☆☆

اس کی امید کے مطابق وہ اس کی منتظر تھیں۔ ان دنوں اس کا شیڈول اتنا سخت تھا کہ وہ انہیں مناسب وقت ہی نہیں دے پا رہا تھا۔ اکثر اسے گھر آتے، آتے رات ہو جاتی تھی۔ پھر آج کل شہر کا بھی چکر زیادہ ہی لگ رہا تھا جہاں وہ اپنا ہیڈ آفس منتقل کر رہا تھا۔ اب بھی وہ دو دن بعد شہر سے ہی لوٹا تھا۔

”میں پوچھتی ہوں کس بات کا روگ ہے جو یہ خانہ بدوشی کو گلے لگا رکھا ہے؟“ عدن نے محلا لب دبائے اپنی مسکراہٹ کو روکا۔ وہ فقط اس کی منتظر نہیں بلکہ اس سے خفا بھی تھیں۔

”آج یہاں تو کل وہاں، کبھی اس شہر، کبھی اس ملک..... نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی فکر۔“ وہ انہیں سلام کر کے ان کے پاس ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ بدستور اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھیں۔

”کام میں بڑی ہوتا ہوں مام۔“ اپنی جیکٹ

دریافت کر لے۔ کسی الٹو سمٹنے کے بغیر پیسے کمانے کا فوری ذریعہ تو بس یہی ہو سکتا ہے۔“ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے سارہ نے نہایت حقیقت مندانہ تجربہ کیا تھا۔ وہ عادت سے مجبور ہمیشہ آدھی بات سن کر اس سے ادھورا نتیجہ اخذ کرنے میں مہارت رکھتی تھی اور بین کی اس جلد فنی رائے قائم کر لینے والی عادت کو سارہ بخوبی سمجھتی تھی۔ بہت یادہ عقلمند لوگوں کی شخصیت کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی رائے کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دیتے یا پھر اسے آخری آپشن کے طور پر رکھتے ہیں۔

”سارہ میڈم آپ بھول رہی ہیں۔ وہ گھر نہیں بھوت بنگلا ہے۔“ سارہ کی بات پہ لب بکھینچتے وہ بے چینی سے بولی لیکن کہیں نہ کہیں خود دل کو بھی اس کا مشورہ مناسب لگا تھا۔ پھر جیسے ہی گھر کا خیال آیا تو سین کا دل پھیننے لگا۔ اب ایسے مکان میں بھلا کون کرایہ دار بنے پر راضی ہوتا۔

”ظاہر ہے آپ جیسی رائل آتما کی رہائش گاہ بھوت بنگلا ہی ہو سکتی ہے۔“ سارہ نے جھٹ جملہ مارا۔

”اچھا شٹ اپ۔“ سارہ کی بات پہ اس نے بھوئیں چڑھائیں۔

”لو ہو گئی شٹ اپ، تم بتا دو اس سے بہتر پلان؟“ منہ میں قلم کا دوسرا سرا دبا ئے وہ سوچ میں پڑ گئی کیونکہ اس کے پاس اگر مسئلے کا حل ہوتا تو سارہ سے دماغ ہی کیوں کھپاتی نہیں تھا اسی لیے تو اس کے سامنے اپنا دکھڑا دیا۔

”ممی سے بات کروں گی حالانکہ I'm not convinced“ سارہ جانتی تھی وہ فائل ہو رہی ہے مگر قبول کرتے تو محترمہ کی ناک کھتی تھی۔

”ایسے سپر لیجنڈری آئیڈیل پر دیکھنا آئی بھی داد دے بغیر نہیں رہ پائیں گی۔“ حالانکہ یہ کون سا اس کا اپنا پلان تھا۔ یہ تو جب سارہ نے اپنے بڑے بھائی سے ڈسکس کیا کہ سین ان دنوں مالی طور پر پریشان، اضافی آمدنی کے حصول کے لیے پارٹ ٹائم کچھ کرنا چاہتی ہے تو انہوں نے ہی مشورہ دیا کہ اتنے بڑے گھر کا کچھ حصہ کرایے پہ دے کر بہ آسانی اچھی آمدنی ہو سکتی ہے۔

”اچھا ہوں، سب جھجھتی ہوں میں تمہیں۔ یہ بتاؤ کتنے دنوں کے لیے آئے ہو اور کتنے دن کا بن واس باقی ہے۔“ اس کے سر پہ ہلکی سی چپت رسید کرتے وہ محبت سے بولیں۔

”ابھی تو دو چار دن ہوں لیکن پھر شاید کچھ عرصے کے لیے جانا پڑے۔ میں ٹائم ٹو ٹائم ملے آتا رہوں گا۔“ اب چونکہ ان کا موڈ کچھ بہتر تھا تو گلے ہاتھوں اگلا پروگرام بھی بتا دیا۔ انہوں نے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

”پلیز مام موڈ تو خراب نہ کریں۔ ابھی تو میں گھر آیا ہوں اور آپ نے آتے ہی شکوے شکایات کا ڈھیر لگا دیا۔ یہ نہیں بیٹے کو اپنے ہاتھ کے یکے مزیدار سے کھانے ہی کھلا دیں۔“ اب شکوہ کرنے کی باری اس کی تھی۔ بے اختیار ان کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی تھی اور ساتھ ہی بیٹے کے لیے بے تحاشا پیار۔ اسے کپڑے بدلنے کا کہہ کر وہ خود چکن میں اس کے کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی تھیں۔ اب وہ جتنے دن گھر تھا یہ تو طے تھا، اس کے لیے کھانا وہ خود ہی پکا لیں گی۔

☆☆☆

بارش کے بعد ہونے والے جس کی وجہ سے فضا میں ٹھنک کا راج تھا۔ بس کی کھلی کھڑکیوں سے بھی ہوا کا ایک جھونکا اندر نہ جھانکتا تھا۔ مسافروں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بس اسٹاپ پہ رکی تو نئے اور پرانے مسافروں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ سب ہی کو اپنی، اپنی منزل پہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ بھی خاصی مشکل سے اپنی جگہ بنائی بس سے نکل گئی۔ سفید مٹل کے کڑھائی والے بڑے سے دوپٹے کو سلیٹے سے چادر کی طرح لپیٹے اس نے وجود کو اچھی طرح ڈھاپ رکھا تھا۔ کندھے پہ ایک درمیانے سائز کا سستا سا شولڈر بیگ لٹکا ہوا تھا جبکہ ہاتھ میں فائل تھی۔ تیز، تیز قدم اٹھاتی وہ سڑک کر اس کر کے اپنے محلے میں داخل ہو گئی لیکن جیسے ہی چوراہے پہ پہنچی ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس دوہیں کے

انہار پر پاس رکھے وہ اب ریٹیس انداز میں کرسٹو کی پشت سے نکائے بیٹھا تھا۔ دونوں بازو سر کی پشت پہ باندھے اس نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔

”میںی تو کہہ رہی ہوں۔ کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو میری جان۔ تمہارے بڑوں نے یہ ڈھیر جائیدادیں اور وسیع کاروبار چھوڑا ہے تمہارے لیے پھر کیوں اپنی جان جلاتے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح ان کی ایک ہی رٹ تھی۔

”بڑوں کی دولت پہ جیرا سمیٹ بن کر پلٹا رہوں۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“ اس کے چہرے پہ ہلکی سی ہیزاری کی جھلک تھی لیکن ماں کے سامنے لہجہ و آواز دونوں دھمے تھے۔

”بڑوں نے اتنی محنت سے یہ سب بنایا، اب اپنی محنت سے اپنے اسکنزے مجھے بھی تو اس کاروبار کو کسی مقام تک پہنچانا ہے ورنہ پھر کیا فائدہ ایسی ڈگریوں کا جنہیں عملی زندگی میں استعمال ہی نہ کر پایا۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن دوسری طرف ہنوز وہی انداز تھا۔

”ایک تو مجھے اس گھر کے مردوں کی سمجھ نہیں آئی کبھی بھی سب کی اپنی ہی منطق رہی۔ اولاد ہے تو اس نے بھی اعلیٰ تعلیم کا ہتھیار نکال لیا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا، اس محل جیسے گھر میں ماں اکیلی کیسی بولانی، بولانی پھرتی ہوگی۔ نوکروں کے آسرے چھوڑ کر تم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔“ اس بار لہجہ اور انداز دونوں تیز تھے۔ وہ ان کی شکایت کو سمجھتا تھا لیکن اسے دور کرنے سے قاصر تھا پھر بھی وہ انہیں اپنے گلے شکووں میں حق بجانب مانتا تھا۔ البتہ وہ اسے سرے سے جھجھتی ہی نہیں تھیں۔

”خیر اب تم دیکھنا، میں بھی اپنی تنہائی دور کرنے کو جلد اس گھر میں بہولے آؤں گی۔ تم بڑھاتے رہنا اپنا ماما کاروبار۔“ وہ گویا دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔ ”ٹھیک ہے کر لیجیے گا اسنے دل کی۔ آپ کو بھلا روک سکتا ہوں میں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بازو پھیلائے اور پاس بیٹھی ماں سے لپٹ گیا۔ اپنا سر ان کے شانے پہ نکائے اب وہ ان سے لاڈ کر رہا تھا۔

مغرولے اڑاتے اس شخص نے ایک شان سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہر روز اسی وقت گھر پہنچتی تھی۔ یونیورسٹی سے سیدھی وہ ایک پرائیویٹ ٹیوشن سینٹر چلی جاتی تھی اور پھر وہاں سے واپسی پر گھر آتے آتے اسے پانچ بج جاتے۔ محلے کی اس سگریٹ اور پان کی دکان پر اکثر ہی مردوں کا جم غیر دکھائی دیتا تھا جس پر توجہ دیے بغیر وہ چپ چاپ تیزی سے نکل جاتی لیکن اس بد معاش کو کل پہلی بار اس نے اس دکان پر کھڑے دیکھا تھا۔ وہ جن بے حیا نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اس کی روح تک کا پٹئی تھی۔ اس کے انداز میں بے خونی تھی جیسے ابھی اس کا راستہ روک لے گا لیکن صد شکر شاید بہت سے لوگوں کی موجودگی نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھا تھا یا پھر وہ بس ایک نظر باز سادی شخص تھا۔ کل جب وہ گھر پہنچی تو اچھی خاصی گھبراہٹ ہوئی تھی لیکن صبح تک یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اب واپسی پر بھی اس کے ذہن میں یہ شاہد نہ تھا کہ وہ بد معاش وہاں موجود ہو گا لیکن اسے ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ وہ کوئی ڈرپوک اور سبکی ہوئی لڑکی نہیں تھی۔ سالہا سال سے اپنی بیوہ ماں کے ساتھ اس چھوٹے سے محلے میں زندگی گزار رہی تھی۔ کالج لائف سے ہی مشقت اس کی زندگی کا حصہ تھی۔ اسے راہ چلتے مردوں کے رویے دیکھ کر خوف نہیں آتا تھا کیونکہ وہ خود مختار رہتی تھی لیکن آج سے پہلے اس کا سامنا ایسی صورت حال سے نہیں ہوا تھا۔

سڑ پر لگا دو چادر ست کرتے اس نے اپنی فائل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر سینے سے لگا لیا اور پھر اس پر توجہ دیے بغیر اعتماد سے چلتی وہ اس دکان کے آگے سے گزری۔ سگریٹ کاپوائی دو انگلیوں میں ملے اس انگلی کی نگاہوں نے گردن گھما کر اس کا تعاقب کیا تھا۔ گلی کا موڑ مڑ کر وہ اس کی نگاہوں سے اوچھل ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کال کون کر رہا ہے لیکن وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں

تھا اس لیے سن کر بھی ان سنی کیے جا رہا تھا مگر شاید دوسری طرف بھی محل اپنے عروج پہ تھا جو کال کرنے والا باز نہیں آ رہا تھا۔

”السلام علیکم لالہ۔“ تنک آکر اس نے کال اینڈ کر ہی لی تھی۔

”جیتے رہو، جیتے رہو۔ پر یہ تو بتاؤ ہماری کال کیوں اینڈ نہیں کر رہے۔“ سمج نے اپنے ہنس مکھ انداز میں سوال کیا تھا۔

”کمرے میں نہیں تھا لالہ، فون بھول گیا تھا۔“ جھوٹ بولنے آواز خود بہ خود جھبی ہو گئی تھی۔

”تم شہر جا کر ایسے بے پروا تو کبھی نہیں ہوئے تھے جیسے اس بار محسوس ہو رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ فائز کا بھجا، بھجا انداز وہ دور بیٹھے محسوس کر رہا تھا۔

”کلاسز شروع ہو چکی ہیں تو مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے آپ کو شکایت ہوئی۔“ اس نے اپنے تئیں وضاحت دی۔ بڑا انہنی سالچہ تھا۔ سمج کا ماتھا تنک تھا۔

”میں شکایت تو نہیں کر رہا شہزادے۔ تمہاری کمی تو ہم سب کو ہر پل محسوس ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھو سب ہی مس کر رہے تھے تمہیں..... خاص طور پر بابا

سائیں۔“ اس کی اجنبیت کو نظر انداز کرتے سمج نے والہانہ پن سے جواب دیا۔

”میں کوشش کروں گا آج، کل میں بابا سائیں سے رابطہ کرنے کی۔“ اسے خود بھی احساس تھا وہ اس کی وجہ سے پریشان ہوں گے۔

”تم خوش نہیں ہو فائز؟“ سمج کے اس اچانک سوال نے اسے چونکا یا تھا۔ پر اس کا لہجہ اور انداز واضح تھا تو یہ ظاہری بات تھی کسی نہ کسی کو تو محسوس ہوتا ہی تھا۔

”اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے لالہ۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ سمج تو جیسے حیران پریشان رہ گیا۔

صرف لہجہ ہی نہیں تعلق میں بھی اجنبیت نظر آتی تھی۔

”کچھ دوست آگئے ہیں لالہ، ابھی فون رکھتا ہوں بعد میں کال کروں گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا فائز نے یک دم ہی کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء۔ (233)

سچ سچ کھانا کھانے سے باہر نکل گیا۔
لڑائی جھگڑا بحث مباحث اس کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”تو تمہیں کیا ضرورت تھی اپنے سر کے کان میں پھونک مارنے کی۔ اپنا گھر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔“
اگلے دن شام لکھنے نے دو کی سونا کر ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی تھی۔ مقصد تو اس کا ان کی ہمدردی حاصل کرنا تھا لیکن ادھر تو فضیلت کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔ سامنے بیٹھے تابش نے بھی ماں کی طرف شکوہ کناں لگا ہوں سے دیکھا۔

”آپ بھی بڑی بھولی ہو اماں۔ میں تو حویلی سے اس فائزر کا پتا کٹا اٹھا چاہ رہی تھی۔ خواہ خواہ کا حصہ دار بن رہا ہے۔ سو فیصد یقین تھا مجھے کہ صاف انکار کر دے گا۔ بھلا اس بگٹی لڑکی میں ایسا کیا ہے جو اس شہری بابو کا دل موہ لے۔“ اپنا دامن بچانے کی خاطر اس نے سچ اگل دیا تھا۔ انہیں بیٹی کی سوچ پہ حیرت ہوئی تھی بس پہلو بدل کر رہ گئیں لیکن تابش خود پہ قابو نہیں رکھ پایا تھا۔

”خیر اب ایسی بات تو مت کریں آپا۔ کس بات کی کمی ہے رملہ میں۔“ اس نے صاف صریحاً رملہ کی حمایت کی تھی۔ سچ تو یہ ہے وہ اسے شروع سے پسند کرتا تھا اور ماں کو بھی مناجا کا تھا۔ ویسے بھی فضیلت کو بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔ ایک تو دھری رشتے داری اس پہ اونچا خاندان، بہو کون سا خالی ہاتھ آتی۔ ساتھ میں بڑی جاگیر بھی تو جہیز میں آتی۔ وہ بیٹے کی خوشی پہ جھٹ پٹ مان گئی تھیں لیکن حویلی سے رملہ اور فائزر کی بات پکی ہونے کی خبر نکل تو ماں، بیٹے کی امیدوں پہ پانی پڑ گیا۔

”آئے ہائے، انہیں بڑی حمایتیں سوچ رہی ہیں۔ اماں ویسے معاملہ کیا ہے ذرا مجھے بھی تو بتا چلے۔“
شام لکھ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ بھائی کے بدلے ہوئے انداز کو محسوس کرتے اس نے فوراً چوٹ کی تھی۔
”تمہیں بتانے سے فائدہ۔ تم نے تو کر لی ناں اپنی من مانی۔ ہم نے تو ملگنی کے لڈو بھول کی طرح حلق

دھونڈ بھار رہ گیا۔ بسر پہ بچے کو ملایا۔
شام لکھ کا سارا دھیان ان دونوں کی گفتگو پر ہی تو تھا۔
اب جو سچ کے چہرے پہ ٹھکر کی لکیریں اسے ایک نئی کہانی سنار ہی تھیں۔ یوں اچانک خاموشی سے اس سے پہلے تو بھی کال بند نہیں ہوتی تھی۔

”کیا کہہ رہا تھا فائزر؟“ بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔
”ہونہہ..... کچھ نہیں۔“ اپنی ہی سوچوں کے حصار میں کھویا سچ اس کے سوال پہ چونکا تھا۔
”لگتا ہے آپ کی بہن سے رشتہ جوڑ کر خوش نہیں ہے آپ کا لاڈلا۔“ شام لکھ نے دور کی کوڑی چمکنی نمی جو لگی تو ٹھیک نشانے پہ تھی کیونکہ سچ کے ماتھے پہ واضح بل نمودار ہوئے تھے۔

”تم سے کس نے کہا؟“ وہ اپنی عادت کے خلاف خاصے تیز لہجے میں بولا تھا۔

”اندھی نہیں ہوں میں..... صاف دکھائی دے رہے ہیں اس کے تیور۔ اب میں نے تو یہ سوچا تھا چلو گھر کا لڑکا ہے۔ بابا سائیں کے کتنے احسان ہیں۔ رملہ کو خوش رکھے گا پر یہاں تو ابھی سے آنکھیں ماتھے پہ رکھ لیں۔“ شام لکھ نے سچ بتا کر اس وقت اپنے ہی پاؤں پہ کھپڑی ماری تھی۔ سچ پہلے ہی فائزر کے رویے سے شدید دُشرب تھا اس کی بات سن کر مضطرب ہوا تھا۔

”تم نے..... اوہ مائی گاڈ..... یعنی یہ سب تم نے بابا سائیں کے کان میں ڈالا اور میں تو سمجھ رہا تھا یہ ان کی اپنی خواہش ہے۔“ اصل بات تو اسے اب معلوم ہوئی تھی۔
”ہاں تو کیا غلط کیا؟ رملہ بھی تو یہی چاہتی تھی۔“
اس نے مزے سے رملہ کو بھی درمیان میں گھسیٹ لیا تھا جسے اس سچ تک لانے والی بھی وہ خود ہی تھی۔

”اب تو مجھے لگ رہا اسے بھی یہ پنی پڑھانے والی تم ہی ہو۔ اس کا ذہن تو بچکانہ ہے۔“ رملہ کا نام سن کر تو سچ کو مزید غصہ آ گیا تھا۔

”لو بھلا، بہن اپنی قابو میں نہیں، غصہ مجھ پہ ایسے اتار رہے ہیں جیسے میری ہی غلطی ہو۔“ زرب لب بڑبڑاتے اس نے پہلو بدلا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

”کوئی خاص وجہ؟“ انہوں نے ابرو سوا لیا انداز میں اٹھائے۔ وہ دونوں اب اپنے، اپنے چائے کے گم لیے لاؤنج میں آگئی تھیں۔

”تو آپ کے نزدیک یہ وجہ نہایت عام ہے کہ یہ گھر ہماری ملکیت نہیں۔“ سین نے چکران حقائق کی طرف دھیان دلایا جنہیں وہ سراسر نظر انداز کر رہی تھیں اور وہ نہیں جانتی تھی وہ ایسا جان بوجھ کر کر رہی ہیں یا بے دھیانی میں اتنا بڑا راج فراموش کر بیٹھی ہیں۔

”تم بھول رہی ہو میری جان، یہ گھر تمہاری ہی ملکیت ہے۔“ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنا گرم چائے کا گلاسے سامنے دھری میز پر رکھا۔

”آدھا!“ سین صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں ان کے پاس جا بیٹھی۔ موڈ سخت آف تھا۔ یہ بھی اس کے احتجاج کا ایک انداز ہوا کرتا تھا کہ جب موڈ خراب ہو اور کوئی اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا وہ یونہی اپنا غصہ دکھاتی۔

”آدھا ہی سہی..... ہے تو تمہارا“ چائے کا گلاسے لہو سے لگاتے وہ نہایت محل سے بولیں۔ اس کے برعکس ان کا چہرہ اور لہجہ دونوں پرسکون تھے۔

”میرا؟“ استہزاء سے ہنستے اس نے انگلی سے اپنی سمت اشارہ کیا۔ انہوں نے سر اشارت میں ہلاتے اعتراف کیا پر وہ ایک دم تھکے سے اکھڑ گئی۔

”جی بالکل..... یہ محل جیسا گھر آدھا میری ملکیت ہے لیکن میرے کسی کام کا نہیں۔ کیونکہ میں صرف یہاں رہ سکتی ہوں اسے بچ نہیں سکتی۔“ طنز یہ انداز میں کہتے اس نے انہیں وہ شرط یاد دلانی جسے جاننے کے بعد ہی سین کا اس گھر سے اور دوسرے معنوں میں زندگی سے دل اجاٹ ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں مصائب تو تھے لیکن حوصلے کی کمی نہ تھی کیونکہ وہ ان سے لڑ رہی تھی۔ یوں تو ہوش سنبھالتے ہی اس نے رشتوں کے بے حسی دیکھی تھی مگر اپنے پاپا کے ہوتے اس نے کبھی ان رشتوں سے کوئی توقع نہیں لگائی تھی لیکن اب جو روپ اس کے سامنے آیا تھا اس نے

سے اتارے۔ تابش کا بڑا دل تھا رملہ سے بیاہ کا۔“ فضیلت نے دھیمے لہجے میں شکوہ کرتے بیٹی کو بھی اس راز میں شریک کیا تھا پر اسے تو جیسے پتے ہی لگ گئے تھے۔

”حد کرتی ہیں آپ بھی۔ سالوں سے اس تک چڑی کو نند بنا کر سر پہ بٹھا رکھا ہے اب بھابی بنا کر کلیجا جلاؤں۔ یہ تو ابھی سے میری زبان پکڑ رہا ہے کل کو گھر لے آتا تو میرا اس گھر میں داخلہ بھی بند کر دیتا۔“ شامک کی باتوں پہ پیر پختا تابش کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

”خیر اب اس بات سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔“ فضیلت نے بات سنبھالتے ہوئے تسلی دی اور پاس پڑا پاندان کھول کر اپنے لیے پان بنانے لگی۔

☆☆☆

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھیں جب سین سیدھی ان کے پاس جا پہنچی اور ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی۔ ”مشورہ تو اچھا دیا ہے سارہ نے۔“ ماں نے بھی وہی دہرایا تھا جو سارہ نے کہا تھا۔

”اوہ رینکلی؟ آپ کو یہ احمقانہ تجویز ایک اچھا مشورہ معلوم ہو رہی ہے۔“ وہ کچھ جزبہ زبونی اور حسب عادت ان سے بھی بحث کا آغاز کر بیٹھی۔

سین اس وقت سے مستقل اسی مسئلے پہ سوچ رہی تھی۔ غم یہ تھا دو الگ، الگ جگہوں سے دو الگ جواب آرہے تھے۔ دل مائن رہا تھا پر دماغ نہیں۔ وہ دماغ کی سننے والوں میں سے تھی جبکہ دل کہتا تھا سارہ کی بات میں دم ہے۔ اس سے آسان اور دیر پا حل، وہ بھی کیا سکتا ہے۔

”میرا خیال ہے کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“ کچن کیبنٹ بند کرتے انہوں نے کندھے اچکائے اور ایک نظر سین کے لہجے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی کاؤنٹر ٹاپ سے کمر نکالے اپنے ناخن چبائی تھی اُن کی بات پہ پٹی اور تنک کر بولی۔

”ممی ہم یہ گھر کرایے پہ نہیں دے سکتے۔“ چائے دو گلوں میں اٹھیل کر انہوں نے اپنا گم اٹھایا دوسرا سین کی سمت کھسکا یا۔

سے کاٹ چھانٹ سے محروم ہیں اور ان کی کمی کی بدولت لاؤنج کی اندرونی دیوار بری طرح خراب اور سیلن زدہ ہو چکی تھی۔

شروع شروع میں وہ دونوں میاں، بیوی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کر لیا کرتے تھے پھر زندگی کے جھمیلوں میں یہ سلسلہ بھی کم ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ لان کی حالت اتنی بدل گئی کہ اب کسی باقاعدہ مالی کی ضرورت تھی وہ بھی مستقل بنیادوں پہ۔ رہی سہی کسر اس کے بابا کی بیماری نے پوری کر دی جب بین کی ملازمت ہی وہ واحد آسائش جس سے گھر کا ڈال دیا چل رہا تھا اس پہ دووائیوں اور ڈاکٹروں کے کمر توڑ اخراجات تو بس اس جگہ کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا گیا تھا۔

”یہ گھر بائیس سال سے مرمت نہیں ہوا می۔ بائیس سال سے کبھی ان دیواروں کو روغن نہیں کرایا گیا کیونکہ ہم انورڈ نہیں کر سکتے تھے اور آج بھی کم از کم میری سیلری میں سے یہ سب نہیں ہو سکے گا۔“ اس دو کنال کے گھر کی مرمت کروانا اتنا آسان نہیں تھا۔ روزمرہ کی چھوٹی موٹی توڑ پھوڑ بھی کئی ہزار لے جاتی جبکہ انہی چند ہزار میں وہ دونوں اپنی گزر بسر کرتی تھیں۔ کسی بڑے کام کو کھولنا ایک پینڈو وارا کس کھولنے جیسا تھا جس میں لاکھوں لگ جاتے۔ یہی سوچ کر کبھی ان سب چیزوں پہ دھیان نہ دیا اور بس صبر شکر سے وقت گزرتا رہا کہ ان کی ضرورت بھی تو محدود ہی تھی۔ لاؤنج اور ایک دو بیڈروم ان کے استعمال میں تھے۔ باقی کا سارا گھر بندی پڑا تھا۔ سوائے سارہ کے اور کوئی مہمان ان کے گھر آتے نہیں تھے کہ وہ دونوں ہی بہت زیادہ سوشل نہ تھیں۔ رشتے دار ملتے نہیں تھے تو جو جگہ انہوں نے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھی انہیں وہی بہت تھی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں بیٹا لیکن اس میں ان لوگوں کا کیا قصور؟“ انہوں نے سمجھانا چاہا۔

”سارا قصور انہی کا ہے۔ یہ جو اذیت بھرے دن کاٹے ہیں ناں ہم نے زندگی میں اور آج بھی غربت کی لکیر سے نیچے گر کر زندگی گزار رہے ہیں تو یہ سب انہی کا

”یہ بھی غنیمت ہے۔“ وہ ماں کا چہرہ دیکھ کر کہہ گئی۔ پتا نہیں یہ میرا سے کیوں نہیں آتا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہی ہیں می، آپ تو سب کچھ جانتی ہیں پھر بھی؟“ وہ شکوہ کیے بتا نہ رہ سکی۔

”کچھ بھی ہے بین، اپنی چھت ہونا بہت بڑی بات ہے۔ یہ گھر نہ ہوتا تو کرایوں میں دھکے کھانے پڑتے اور ہر ماہ کبھی چوڑی رقم کی ٹینشن الگ لگی رہتی۔“ وہ جہانم دیدہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جوان بیٹی کی ماں بھی تھیں۔ جانتی تھیں ان پہ اس گھر کی صورت ہی سہی کتنی مہربانی برتی گئی ہے حالانکہ عمل تو ایسا ہرگز نہ تھا پر شاید قدرت کو اس عمر میں ان کا بیٹی کے ساتھ دور در دور بٹھکانا منظور نہ تھا۔ اسی لیے تو سر پر یہ چھت تھنے میں مل گئی۔

”واؤ..... یعنی آپ کو بھی لگتا ہے یہ سب ہم پر قدرت کا انعام ہے۔ اپنی فیاضی دکھا کر ہم پہ باعمر چٹان سے وزنی احسان کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔“ اس کے جملے ہوئے انداز پر انہوں نے بیٹی کا کندھا سہلاتے اسے کول ڈاکن کرنا چاہا پر وہ یک دم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے ان کی توجہ وہاں دلائی جاپی جس سے وہ خود بھی غافل نہ تھیں۔

”ذرا سرائھا کر دیکھیں ان چھتوں کو۔ سیلن زدہ ہو رہی ہیں۔ اور یہ دیواریں چپک کریں۔“ انہوں نے اپنا ماتھا تھام لیا پر وہ باز نہیں آئی۔

”وہ باہر لان نما جنگل کا حال دیکھا ہے آپ نے۔ یقیناً گیدڑ بے سرا کر لیں گے وہاں چند مہینوں میں۔“

ان کا ہاتھ تھامے اس نے وہیں سے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ان کی توجہ باہر کے منظر کی طرف دلائی۔ جگہ۔ جگہ سے جلی ہوئی گھاس، بے ترتیب پودے اور ان کے بیچ آگیں بے شمار جنگلی جڑی بوٹیاں جواب اس جگہ کے حسن کو ماند کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا سالوں سے کبھی اس قطعہ اراضی کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ لاؤنج کی دیوار پہ پڑھی ٹیلیکس سالہا سال

”نصرت ہے۔“ حتیٰ کہ آپ کے لئے اس کی آواز بھرائی تھی۔

بچوں کا مستقبل

آج کے بچوں کو کل کی اہمیت سے آگاہ کریں:

ایک بچہ اقدار کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ والدین اسے ان سے آگاہ کرتے ہیں جبکہ اساتذہ ان اقدار سے بچوں کو وابستہ کرتے ہیں۔ بچہ غیر محسوس انداز سے اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے اور ان کی کئی کئی باتوں کے بجائے ان کے اقدامات کی نقل کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں بچوں کی موجودگی میں خاص طور پر اپنی باتوں، رویوں اور کاموں میں محتاط رہنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچیں کہ بچوں کو ہمارے خفیہ کاموں کا پتہ نہیں لگے گا تو ہم بہت بڑی غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے گھر کے ماحول کا انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اساتذہ کا بھی اپنے شاگردوں کے اندر مخصوص اقدار کو پیدا کرنے میں کردار اہم ہوتا ہے اور کچھ دیانت دار اور مخلص قسم کے اساتذہ نہایت ایمان و داری سے یہ فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ چونکہ معاشرہ اس شعبے کے لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا اس لیے کئی غیر دیانتدار قسم کے لوگ بھی اسی شعبے میں آچکے ہیں جن کا مقصد صرف پیسے بٹورنا ہے اور وہ اپنی اہم ترین ذمہ داری کو مکمل کرنے کے بجائے صرف آمدن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کو غیر انسانی بنانے کا عمل روک دیا جائے اور انتشار سے محفوظ کر دیا جائے تو ماحولیاتی عوامل کا پیچیدہ میٹ ورک جس میں گھر، اسکول، کمیونٹی، ذرائع ابلاغ اور معاشرے میں موجود عمومی خصوصیات شامل ہیں، فعال ہو سکتا ہے۔ تمام حلقوں کو مل کر بچوں کے اندر مثبت رویے کو پروان چڑھانا چاہیے تاکہ وہ اس جمہوری دنیا کے ذمے دار شہری بن سکیں۔

والدین اور اساتذہ کو اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا ہوں گی اور صرف اقدار کی تبلیغ نہیں کرنی ہوگی۔ انہیں اپنے بچوں کو عظیم ہستیوں کی کہانیاں سنانی چاہئیں، جن میں ان کی عدم تشدد، عالمی امن و انصاف کی بالادستی، حق و صداقت اور کمزوریوں سے محبت جیسی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔

از: نیو فہر خان، بہارہ کبوتر

”کیا چلا جاتا اس رئیس زادے کا جو اگر وہ اس گھر کو بیچنے کی صلاح مان لیتا۔ ایسی نہ جانے کتنی جائیدادیں ہیں ان کی۔ ہمارے پاس تو بس یہی ایک ٹوٹا پھوٹا آسرا تھا۔ لیکن نہیں..... صاف انکار کر دیا منجوس نے۔“ آنکھوں میں اترتی نمی کو بے دردی سے رگڑتے اس نے زچ ہو کر کہا۔

”اب اس کلیئر کو کیا پینا۔ جو ہو نہیں سکتا اس پہ واویلا مچانے اور جلتے کڑھنے سے کیا حاصل۔“ وہ ٹھیک کہتی تھیں۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے، بہت کچھ کرنا چاہتا۔ کچھ اس کے اختیار میں نہیں ہوتا کچھ قسمت میں..... اس لیے جو اللہ کی مرضی سے مل جائے اس پر شکر کرنا چاہیے جو نہ ملے اس پر صبر کرتے ہوئے بہتر کی دعا کرے۔ ایک وقت آتا ہے جب راستے خود آسان ہونے لگتے ہیں۔

”یہی تو رونا ہے کہ سب لا حاصل ہے۔ گھٹیا انسان کہتا ہے گھر نہیں کے گا..... آدھا نہ پورا۔ ذرا سوچیں می اس شہر میں اس گلی گزری حالت میں ہونے کے باوجود یہ پراپنی کروڑوں کی ہے۔ ہمیں آدھے پیمیل جائیں تو ہم اپنے حساب سے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیتے، میری ادھوری تعلیم مکمل ہو جاتی.... اور...“ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتے اسے وہ وقت یاد آیا

جب سین نے اپنی اما، اپنی خود داری پہ قدغن لگاتے خود اس رئیس زاوے کو کال کی اور تو اور اسے اپنی پریشانی کا احوال بھی مختصر انداز میں سناتے اس بات کے لیے قائل کرنا چاہا کہ وہ اس گھر کو بیچنا چاہتی ہے۔ وہ اگر گھر بیچنا نہ چاہے تو اس کے حصے کی قیمت سین کو ادا کر دے مگر اس نے تو دونوں ہی صورتوں کو ماننے سے بڑی رکھائی سے انکار کر دیا تھا۔ سین اس وقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی تعلیم چھوڑ کر اس نے ملازمت شروع کی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھے۔ ایسا ہو جاتا تو اس کے لیے بہت سے مرحلے بے حد آسان ہو جاتے مگر کہہ کر بات بھی گنواؤ

میں اس اخبار میں ایسے دولہے؟ صدمہ سرورہ
 مان گئی تھیں۔

”بسمہ اللہ کرو۔ باقی اللہ آسانی کرے گا ان شاء
 اللہ۔“ اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے انہوں
 نے انہات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

”یار سبین کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم اس
 سے مل لو۔ اگر مناسب نہ لگے تو پھر اخبار میں اشتہار
 دے دینا۔ کیوں آنٹی میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں
 ناں۔“ سارہ نے ان کے بنائے کبابوں پہ ہاتھ صاف
 کرتے تفصیلاً کہا۔

”مجھے تو خیر اس میں کوئی مضائقہ نہیں لگتا پھر
 جب تمہارا بھائی یہ گارنٹی دے رہا ہے تو یقیناً شریف
 انسان ہی ہوگا۔“ سبین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا
 ہی تھا پر اس سے پہلے ہی انہوں نے بات شروع
 کر دی۔ اس کا منہ بس کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

”شرافت کی گارنٹی، کرایے کی وقت پہ ادائیگی کی
 گارنٹی، ایندھن کی گارنٹی۔ نکاح نامے کے علاوہ جس
 کا ٹریکٹ پہ چاہیں دستخط کروا لیجئے گا۔“ سبین کو کن انکھوں
 سے دیکھتے سارہ حسب عادت اسے چھیڑنے سے باز
 نہیں آئی تھی۔

”شروع ہوگئی بس جھک مارنے۔“ سبین.....
 بے ساختہ بولی۔ ”اور یہ ادھر رکھو واپس۔ دوکھا چکی ہو۔“
 اس کے ہاتھ سے تیسرا کباب کھینچ کر پلیٹ میں پھینچتے
 اس نے بدلہ چکا تھا۔

”کیا بدگیری ہے سبین، کھانے دواے۔“ می
 کے گھورنے پہ وہ بس لب بھیجنے خاموش رہی۔ انہوں
 نے خود ہی کباب اٹھا کر سارہ کی پلیٹ میں رکھا جسے
 اس نے باقاعدہ سبین کو دکھا دکھا اور جتا، جتا کر کھانا
 شروع کر دیا تھا۔

”مجھے تو اس بندی پہ یقین نہیں کجا اس کی
 گارنٹیوں پہ ہوگا۔ یقیناً اس نے اسے چار کباب کھلا کر
 بھیجا ہوگا.....“ سبین جل کر بولی۔

اسے اس گھر سے کوئی امید باقی رہی نہ تھی جس پہ اس کا
 اتنا بھی حق نہیں تھا کہ اسے اپنی پریشانی میں استعمال
 کر پاتی۔ ماں کی زور زبردستی نہ ہوتی تو وہ اس وقت یہ
 گھر چھوڑ دینے کو ہی تیار ہوگئی تھی۔ اسے سڑک پہ رہنا
 منظور تھا مگر اس امیر زادے کی خیرات نہیں چاہیے
 تھی۔ مگر جذبات کو عقل نے قابو کر لیا تھا۔

”اور تمہاری کسی اچھی جگہ شادی بھی.....“ ہر ماں
 کی طرح اپنی جوان بیٹی کے لیے ان کے بھی خواب اور
 خواہشات تھیں جس کا برملا اظہار انہوں نے نہ کر دیا تھا۔

”مجھ سے یہ بات دوبارہ مت کیجیے گا۔“ سبین
 ماتھے پہ بل ڈالے بولی۔

”اچھا نہیں کرتی لیکن وہ کرایے دار والی بات
 کر لیں۔“ انہوں نے فوراً سے بات مان لی۔ بحث
 میں وہ اس لڑکی سے کہاں جیت سکتی تھیں اسی لیے بہتر
 موضوع پہ لوٹ آئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔
 ”سنگل فمیلی کے رہنے کی جگہ ہے یہاں۔ کوئی
 دوسری فمیلی کیسے بیچ کرے گی۔“ ایک نئی کیفیوٹن.....
 اس کا مطلب وہ ہر پہلو پہ سوچتے ہوئے کرایے دار
 رکھنے کا فیصلہ تقریباً کر چکی تھی۔

”گیسٹ روم والے دو کمرے کسی پینچلر کو دیے
 جاسکتے ہیں۔ کوئی اسٹوڈنٹ وغیرہ ہو یا پھر ملازمت
 پیشہ۔ فمیلی والا جنجال بھی نہیں ہوگا اور ایسے لوگوں کی
 زیادہ ڈیمانڈ بھی نہیں ہوتی ہیں ویسے بھی زیادہ وقت تو
 وہ گھر سے باہر ہی رہتے ہیں۔“ گو بہت بڑا تھا پر گھر
 سنگل اسٹوری تھا اور مکمل تعمیر اس انداز میں ہوئی تھی کہ
 ایک ہی فمیلی رہ سکتی تھی۔ کل پانچ بیڈ روم تھے جن میں
 سے بس دو ہی ان کے استعمال میں تھے۔ گھر میں داخل
 ہوتے ہی دائیں طرف بنے گیسٹ روم اور اس سے
 ملحقہ ایک کمر امہان کی پرائیویسی کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا
 تھا جو اتنے سالوں میں بھی استعمال ہوا تھا نہ کھولا گیا
 تھا۔ تو رہ سہہ کر بس وہی ایک آپشن بچتا تھا۔ سر ہلاتے
 اس نے ان سے اتفاق کیا تھا۔

”کہاؤں کی ریزمی نہیں لگاتا خرمہ، وہ جاگیردار ہے۔ اس شہر میں کام کی غرض سے رہنا چاہتا ہے۔ وہ تو بھائی نے ہی اسے کنوئس کیا کہ یہاں وہاں لے چوڑے کراپے بھرے گا تم لوگوں کا ہی فائدہ ہو جائے پر مجھے تو لگتا ہے آئی ہماری نیکی برباد ہونے لگی ہے۔“ سارہ سانس لیے بغیر شروع ہو گئی تھی۔

سین نے اس سے اخبار میں کراپے دار کے لیے اشتہار دینے کی بات کی تھی لیکن اس نے روک دیا اور پھر آفس سے واپسی پر اس کے ساتھ ہی گھر چلی آئی تھی۔ سین کے بجائے اس نے اس کی محمی سے تفصیلاً بات کی تھی۔ بہر حال انہیں سارہ کی تجویز پسند آئی تھی اور انہوں نے اسے اوکے کر دیا تھا۔ سین بھی ماں کے فیصلے پر خاموش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

طیبہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اور بے تحاشا دروازہ بند کر کے چنچنی چڑھا دی۔ ”کیا بات ہے فاطمہ یہ چہرے پہ ہوائیاں کیوں اڑی ہیں؟“

”امی وہ..... وہ جولفنگا چوک پہ روزانہ کھڑا ہوتا تھا تاں۔“ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس سے بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چل کر نہیں بلکہ بھاگتی دوڑتی گھر تک پہنچی ہے۔

”ہاں..... ہاں..... کیا ہوا اس نے کوئی بد تمیزی تو نہیں کی؟“ طیبہ کا دل دہل گیا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ سینے پہ رکھا۔ بیٹی کی اڑی ہوئی رنگت اور ایسی پریشان صورت تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”نہیں بد تمیزی تو کوئی نہیں کی، پر آپ تو جانتی ہیں وہ کس انداز سے دیکھتا ہے۔ بڑی ڈھٹائی ہوئی ہے اس کے چہرے پہ اور آنکھوں کی بے باکی سے تو بے حد خوف آتا ہے۔ آج جب گلی میں مڑی تو وہ بھی پیچھے پیچھے آگیا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ شکر ہے پڑوس کے بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ شاید انہی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھا۔“ کیا اچانک افتادہی کہ اس دن کے

بعد سے وہ کسی جلد فاطمہ کا شمار کرتا تھا۔ اس کے لیے جیسے شام ڈھلے گھر واپس لوٹنا مصیبت بن گیا تھا۔ آج جو حد اس نے پار کی تھی اس کے بعد تو فاطمہ کا خوف بھی بجا تھا۔ وہ مجھے بہت بہادر اور پُر اعتماد لڑکی تھی لیکن کسی غنڈے موالی کے راستہ روکنے سے ہونے والی ذلت بھلا کون عزت دار لڑکی برداشت کر سکتی ہے۔

”کبھی بے وقت کی پریشانی پڑ گئی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ تم پریشان نہ ہوکل سے میں خود بس اسٹاپ پہ آجایا کروں گی کہیں لینے۔ میں ساتھ ہوا کروں گی تو آئندہ خود ہی دفعان ہو جائے گا مردود۔“ طیبہ نے اسے تسلی دیتے حتی فیصلہ سنایا تھا۔ وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”کانی پرانی تعمیر لگ رہی ہے اس گھر کی۔“ عدن نے کمرے کا جائزہ لیتے تیسرہ کیا۔ گھر کے اس حصے کی سترائی صفائی بھی ایک مرحلہ تھی جو اس نے محمی کے ساتھ مل کر کی تھی کیونکہ یہ ساڑھ بہت وقت سے بند تھی۔ دھول مٹی ایک طرف، عمارت کی ٹھنکی ان کی صفائی سے تو چھپنے والی نہیں تھی۔ سین نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دھیمسا مسکرایا پر سین کے تاثرات ضرورت سے زیادہ بخیدہ تھے۔

”شاید قبل از صبح۔“ یہ مذاق تھا یا طنز عدن سمجھنے سے قاصر تھا۔ ویسے طنز تھا کس پر اور مذاق لگ کیوں نہیں رہا تھا۔

”اتنے پیسوں میں اس گھر کی تعمیر نو کے متعلق سوچے گا بھی مت۔ یہاں جو ہے جیسا ہے قبول کرنا پڑے گا۔“ وہ تنبیہی انداز میں کہتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ عدن بھی پیچھے پیچھے چلا آیا تھا جہاں لاؤنج میں اب اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ..... خیر عقدی انداز میں مسکرائیں۔ عدن نے بھی جواب میں مسکراتے ہوئے انہیں سلام کیا تھا۔ جس کا جواب خاصی شفقت سے دیا گیا تھا۔ سین کے سامنے والے صوفے کی نشست سنبھالتے وہ اب اس کی طرف متوجہ تھا جو اپنی والدہ کی نسبت بے حد بخیدہ نظر آ رہی تھی۔

پڑھے ہیں؟ نکالیں اس کے چہرے پہ گاڑے سوال کیا گیا تھا اور اس پل اسے اپنا آپ ایک ایسے مشتہر فرد سامحوس ہوا تھا جس کو سامنے بٹھا کر پولیس انکوائری کرتی ہے۔

”پڑھ چکا۔“ ماتھے پہ بل ڈالے ان چپیتی نگاہوں سے وہ کچھ نروس ہوا پر خود پہ قابو پاتے نظر میں جھکے مختصر بولا۔

”کتنا پڑھا ہے؟“ اس بار اس نے منہ اٹھا کر دیکھا۔ ”سب سوالات کرایہ نامہ میں لکھے ہیں آپ نے؟“ آنکھوں میں حیرت لیے اس نے پوچھا۔

”ہاں..... نہیں.....“ سین کچھ گڑبڑائی۔ ”میرا مطلب ہے اس شہر میں آمد کا مقصد؟“ پھر اپنے گلابی ہونٹوں پہ زبان پھیرتے اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ عدن نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”کاروبار کے سلسلے میں۔“ کھنکھارتے ہوئے اس نے اپنا گلا صاف کیا اور نہایت اعتماد سے بولا۔ ”ویسے میں نے ایم بی اے کیا ہے۔“ اس نے مزید تفصیل بتائی۔

”یہاں اس شہر میں کوئی واقفیت۔ میرا مطلب کوئی گارنٹی دینے والا ہو؟“ حالانکہ اس سوال کے پوچھنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ سارہ نے ہی تو منع کیا تھا

اخبار میں اشتہار دینے سے اور بتایا تھا کہ اس کے بھائی کا کوئی ملنے والا اس شہر کے کسی اچھے علاقے میں کرایے پہ جگہ دیکھ رہا ہے تو بجائے کسی اجنبی کو رکھنے

کے اسی کو رکھ لو پر سین کے اندر صرف ایک وثامن کی شدید کی تھی..... ”وثامن بھروسا۔“ گارنٹی تو سارہ کی طرف سے موجود تھی پھر بھی محترمہ اس کی زبانی تصدیق

چاہتی تھیں۔ کیا کوئی تضاد نکل آئے۔ ”آپ کی کوئیک سارہ کے بھائی جانتے ہیں مجھے۔“ وہ جتنا سا بولا۔ سین ابھی کچھ مزید انکوائری کے

موڈ میں تھی پر ساتھ ہی اپنی می کے ہاتھ کا دباؤ اپنے ہاتھ پر محسوس کرتے اس نے ایک نظر اس پہ ڈالی جن کی آنکھوں میں التجا تھی کہ بس اب اور نہیں۔ آخر کو اتنا موزوں کرایے دار ترقی جلدی انہیں کس طرح حل سکتا تھا

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

جو منہ مانگا کرایہ دینے پہ موٹی راضی ہو گیا تھا۔ ”سیکوری دے سکو گے؟“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔ ”جتنی آپ چاہیں۔“ بے فکری سے کندھے اچکاتے دیے گئے جواب پہ سین کو آگ ہی لگ گئی تھی۔ (ایسا کوئی رئیس ہے تو اپنا کل کیوں نہیں خرید لیتا۔ ہونہ) ”بجلی، پانی کا بل آدھا دینا ہوگا۔“ وہ دونوں لہجے میں بولی۔

”آدھا کیوں؟“ عدن کی حیرانی عروج پہ تھی۔ ”میٹر الگ نہیں اس لیے پہلے بتا رہی ہوں۔ بعد میں کوئی بحث یا لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے

ہاتھ اٹھائے بحث ختم کی۔ عدن بس جھجلا لب سمجھنے خاموش ہو گیا۔ چند لمبے سکوت کے گزرے جسے اس کی ماں کی نرم آواز نے توڑا تھا۔ اپنی طرف سے تناؤ کو کم کرتے اپنے نئے کرایے دار کو ویکم کرنے کی چھوٹی سی کوشش کرتے انہوں نے خوشدلی سے کہا۔

”بیٹا صبح کا ناشتا آپ ہمارے ساتھ کرنا۔“ سین نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا جو اسے قصد انظر انداز کر رہی تھیں۔

”شکریہ آئی۔“ عدن پہلی بار مسکرایا تھا۔ ”یکم میں ایک ہفتہ باقی ہے مگر آپ چاہیں تو کل

پرسوں بھی شفٹ ہو سکتے ہیں۔“ اکھڑے لہجے میں کہتے اس نے گفتگو کا اختتام کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ می کی دریا دلی اسے مہنگی پڑنے لگے اس سین کو پھین ڈراپ ہو جانا چاہیے تھا۔

”شکریہ میں پرسوں تک اپنا سامان لے آؤں گا۔“ عدن بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جالی اس کی سمت اچھالتے وہ تن فن کرتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ عدن بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے احساس ہوا تھا سین کے متعلق اس نے جتنا سنا تھا کم تھا وہ یہ کرایے داری یقیناً اسے بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔

☆☆☆ کھانے کی میز پر گھر کے سب لوگ موجود تھے۔ سربراہی کرسی پہ اقرار الحسن براجمان تھے۔ فاتر کے سوا

قائل نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو عدنان اپنا بیگ پیک کر رہا تھا۔ بیڈ پر اس کے کپڑے، کتابیں، لیپ ٹاپ اور ضروری سامان بٹھرا ہوا تھا جنہیں وہ ترتیب سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتا جا رہا تھا۔ سفید پولو شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں اپنے بے ترتیب سے بالوں کے ساتھ وہ اس وقت خاصا مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

”ہوئی تمہاری پیکنگ؟“ ان کا موڈ خاصا آف تھا پھر بھی وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

”بس وہی کر رہا ہوں۔ صبح دس گیارہ بجے تک نکلوں گا۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر مصروف سے لہجے میں ان کے پوچھے بغیر ہی اپنا پلان بھی بتا دیا تھا۔

”یہ چیزیں رکھ لوں پھر کچھ دیر دادا جان کے ساتھ بیٹھوں گا۔“ اس بار مسکراتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گئیں ساتھ، ساتھ اس کے کپڑے تیر کر کے اس کے سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔

”کبھی، کبھی میں سوچتی ہوں عدنان، کاش تمہاری زندگی میں میرا بھی وہی مقام ہوتا جو اپنے دادا کا ہے۔“ ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔ عدنان جو اپنی بک شیلف سے چند کتابیں نکال رہا تھا چونک کر رک گیا۔

”آپ تو آپ ہیں مام، آپ کا بھلا کسی دوسرے تعلق سے کیا موازنہ؟“ وہ ان کے پاس چلا آیا۔ ان کا ہاتھ تھامے بڑے پیار سے بولا تھا پر انہوں نے اس کی تردید کرتے نفی میں سر ہلایا۔

”ان کی خاطر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ آئے حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا۔ کتنے شوق سے تمہیں تمہارے پاپا نے لندن بھیج دیا تھا لیکن دادا کے لیے تم نے اپنے مستقبل کا بھی نہیں سوچا۔“ اس نے ہولے سے سر جھٹکا۔ باپ کی اچانک موت کا غم ہی کیا کم تھا کہ جان سے پیارے دادا کو دل کے عارضے نے آگھیرا۔ وہ جانتا تھا تنہا ماں کس طرح ان کی دیکھ بھال کر سکے گی۔ وہ چار سال سے وہاں تھا۔ گریجویشن کے بعد

سب ہی اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ ان کی کرسی کے برابر میں آج بھی اس کی کرسی خالی تھی۔

”فائزر کی کوئی کال آئی؟“ اپنی پلیٹ میں سالن ڈالنے انہوں نے بارعب لہجے میں سوال کیا۔ رملہ نے کن انکھوں سے باپ اور بھائی کی طرف دیکھا۔

”آخری بار آپ سے ہی بات ہوئی تھی اس کی بابا سائیں۔“ سبج کا نوالہ توڑتا ہاتھ رک گیا تھا۔ بڑے متوازن لہجے میں جواب دے کر وہ اب ان کی اگلی بات کا منتظر تھا۔

”جب سے یہ لڑکا واپس شہر گیا ہے پلٹ کر حویلی نہیں آیا۔“ سالن کا ڈونگا میز پر واپس رکھتے وہ خاصی سنجیدگی سے بولے۔ سبج کو بھی اندر ہی اندر یہ تشویش لاحق تھی کہ تین، چار ماہ سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر فائزر نے حویلی کا چکر نہیں لگایا لیکن وہ بابا سائیں کی طرح اس کا اتہار نہیں کر سکتا تھا۔

”پہلا سال ہے اس کا یونیورسٹی میں بابا سائیں، آپ تو جانتے ہیں کتنا اسٹریس رہتا ہے۔“ اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”اب ایسا بھی کیا پڑھائی کو سر پہ سوار کرنا کہ انسان پیچھے گھر والوں کو بھول جائے۔“ پاس بیٹھی شاملہ نے فوراً لقمہ دیا تھا۔ سب ہی نے اس کی طرف گردن گھما کر دیکھا تھا۔

”تم کہہ سکتی ہو..... یونیورسٹی تو دور کی بات تمہیں تو کالج کا راستہ بھی نہیں معلوم۔“ سبج کا لہجہ سخت تھے۔

”سبج“ اقرار الحسن نے ٹوکا۔

”معذرت چاہتا ہوں بابا سائیں لیکن آپ تو فائزر کی طبیعت سے واقف ہیں، وہ اسٹڈیز کے معاملے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ ویسے پچھلی بار میری بات ہوئی تھی اس سے تو کہہ رہا تھا جلد چکر لگائے گا۔“ اس نے فوری معذرت کرتے انہیں تسلی دلائی تھی۔

”یہ تو وہ مجھے پچھلے کئی ماہ سے کہہ رہا ہے۔ خیر کل صبح بات کروں گا اس سے۔ تم کھانا کھاؤ۔“ شاید وہ

پوسٹ کر لیجئے۔ اس کے لیے اپنی بات کو چمکا کر بیان حالات ہی ایسے بنے وہ پاکستان لوٹ آیا۔ پاپا کے بعد کاروبار کی دیکھ بھال دادا جان ہی تو کرتے تھے لیکن اب سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا پھر اس نے مقامی یونیورسٹی سے ہی دو سال پہلے اپنا ماسٹرز مکمل کیا تھا اور اس دوران زمینوں کے مسائل اور کاروبار کو بھی پوری توجہ دی۔

”تو کیا میرے لیے اپنا یہ سفر ملتوی نہیں کر سکتے؟“ اس نے بے اختیار لب بھینچ لیے۔

”میں جلدی واپس آ جاؤں گا مام، ویسے بھی کون سا پہلی بار جارہا ہوں۔“ ان کا ہاتھ تھا سہ اس نے وضاحت دی تھی۔

”ہاں پر اس بار جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جیسے کچھ الٹا ہونے والا ہو۔“ وہ اپنی بے چینی بیان کرنے سے قاصر تھیں۔

”کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔ خواہ خواہ مت سوچیں۔۔۔ بلکہ مجھے امید ہے آگے سب کچھ اچھا ہی ہوگا۔“ وہ اپنی ماں کی وہی طبیعت سے واقف تھا۔ جس بات میں ان کی مرضی نہیں ہوتی انہیں اس کے متعلق وہم اور خدشات ہونے لگتے۔ یہ ان کا عدل کو روکنے کا ایک بہانہ ہوتا تھا۔

”آپ پلیز میرا سوٹ کیس پیک کر دیں اور یہ کتا میں بھی۔ میں ذرا دادا جان سے مل آؤں۔ وہ پھر سو جائیں گے۔“ انہیں پکا رتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے وہ اس کا سامان سلیقے سے اس کے سوٹ کیس میں رکھنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اس بھیکے دن کے آغاز میں سستی عروج پہنچی اور اس کا یونیورسٹی جانے کا سرے سے موڈ ہی نہ تھا لیکن جانا اہم تھا۔ بادلوں کی سیاہی دوپہر میں بھی رات کا نظارہ دے رہی تھی۔ پچھلی رات مسلسل بارش کے باوجود صبح سے پاول تنا کھڑا تھا اور ہلکی بوندا باندی اب بھی جاری تھی۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر ان سب کا رخ کینے ٹیریا کی طرف تھا جب سامنے کے منظر نے اس کے

قدموں کو جلاڑ لیا تھا۔ پچھلے اچھے وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ بولتے، بولتے اپنی اگلی بات کہنا بھول گیا تھا۔ وہ چار دوستوں کا گروہ اس وقت اکٹھا کسی کسی اسائنمنٹ کے متعلق بات کر رہا تھا جو بھی کلاس میں نکلنے سے پہلے پروفیسر شجاع صدیقی نے انہیں کلاس و سکشن کے لیے دی تھی۔ price elasticity of demand

کے موضوع پہ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے فاز کی زبان کو بریک لگا تھا۔ ایک ٹک اسے دیکھتے فاز کو احساس ہوا تھا کہ خوب صورتی کا اگر کوئی پیمانہ مقرر کیا جاسکتا تو شاید وہ یہی منظر ہوتا۔ آسانی رنگ کے کرتے پہ بڑا سفید دوپٹا اوڑھے، اپنا جرتل سینے پہ بندھے ہاتھوں میں تھا سہ، بارش کی ٹھنکی بوندوں کو چہرے پہ سینتی وہ بے تحاشا مسکرا رہی تھی۔ پگنڈی پہ چلتی، اپنی سہیلی سے خوش گیوں میں محو، ہلکی بوندوں میں بھینتی وہ اس کی نظروں سے۔۔۔۔۔

بے نیاز بس چند لمحوں میں منظر سے غائب ہو چکی تھی۔ فاز کو اس منظر نے عجیب طریقے سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ نگاہیں ہٹانا بھول گیا تھا۔ اس کے دوست جو کچھ آگے بڑھ گئے تھے ان سب نے ایک ساتھ فاز کا رکنا اور خاموشی کو محسوس کرتے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ان کی نظروں سے الجھتا وہ ایک بار پھر ان کے ساتھ چل پڑا تھا لیکن اب یہ بھول چکا تھا کہ وہ کیا بات کر رہا تھا اور موضوع کیا تھا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی نے بھی فاز کی نظروں کا رخ نہیں دیکھا تھا پر ان سب نے اس کا رکنا اور خاموش ہونا ایک ساتھ محسوس کیا تھا۔ وہ بہترین مقرر تھا اور شاندار انداز میں سامنے والے کو قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کلاسز کے آغاز میں ہی وہ اساتذہ اور طلبہ کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا کیونکہ اس کی جس مشاہدہ اور سیکھنے کی صلاحیت بہت تیز تھی لیکن اس وقت روائی سے کہتا کچھ محسوس میں وہ اب خالی الذہن ان سب کے سامنے کھڑا انہیں حیران کر رہا تھا۔ ان سب نے ہی باری، باری اس سے خیریت دریافت کی تھی بہر حال جلد ہی وہ مسکراتا ان سب کی گفتگو میں ایک بار پھر شامل ہو چکا تھا مگر اس کا وہ بیان

اب بھی اسی لڑکی کی طرف تھا جسے اس نے پہلے فائز نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کی نہیں تھی۔ ویسے بھی یہ یونیورسٹی کا آغاز تھا اور اس قلیل وقت میں سب سے تعارف ممکن بھی کہاں تھا۔ چند لمحوں کی ہنگامی نگاہ میں وہ کسی گمان کی طرح اس کی زندگی میں آئی تھی اور وہ ہم بن کر لگا ہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد عدن اپنے مختصر سامان کے ساتھ وہاں شفٹ ہو گیا تھا۔ وہ اس شہر میں انجینیئر نہیں تھا کیونکہ اس نے اسی شہر کی مقامی یونیورسٹی سے اپنا ایم بی اے مکمل کیا تھا۔ اتفاق سے سارہ کا بھائی اس کا یونیورسٹی فیو تھا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی ہاسٹل میں رہتا تھا لیکن اب اسے مستقل رہائش درکار تھی۔ بغیر کسی چون و چرا اس نے سین کو ایک موٹی رقم ایڈوانس کے طور پر پکڑا دی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹی سے اپنی حیرت چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

”تمی کیا پکایا ہے بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔“ دھیمے شروں میں گفتگوائی وہ گھر میں داخل ہوئی اور اپنا ہینڈ بیگ صوفے پر پھینکتی خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سال کے آخری دنوں میں فائنل کلوژنگ کی وجہ سے اس کا ورک لوڈ زیادہ تھا اسی لیے آج بھی وہ معمول سے لیٹ ہو گئی تھی..... لیکن کل سے اپنا آپ بڑا ہلکا ہلکا لگ رہا تھا جیسے ذہن سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو اس لیے موڈ خوشگوار تھا۔

”چکن کڑا ہی، تمہاری فیورٹ۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے محبت سے کہا جسے سن کر سین کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

”واہ تو بس لے آئیں جلدی سے آج لُچ بھی نصیب نہیں ہوا اس اکاؤنٹس کلوژنگ کے چکر میں۔“ دونوں ہاتھ ملتی وہ کچن کی طرف بڑھی۔ اس وقت تو واقعی بیٹ میں چوہے ڈسکوڈانس کر رہے تھے۔ اپنے پسندیدہ کھانے کا سن کر بے اختیار منہ میں پانی آ گیا تھا۔

”ہاتھ دھو لو پہلے جا کر اور سنو! عدن کو بھی بلاؤ۔“ کچن میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچتے

”کس خوشی میں یہاں لنگر بانٹا جا رہا ہے؟ کہ عدن کو بھی بلاؤ۔“ چڑ کر کہتے اس نے آنکھیں گھما گھمائیں۔ پہلے ہی ان کی مہربانی سے صبح کا ناشتا گرما گرم سرد ہو رہا تھا اس لاٹ صاحب کو۔ لیکن اب اتنے بھی کیا ٹھٹھا کر لُچ اور ڈرنجی بیٹیں سے پکا پکا ملے گا۔ اسے ماں کی یہ بے جا عنایت ہرگز پسند نہیں آئی تھیں۔ ”حد کرتی ہو سین، بیچارہ اکیلا ہے۔ ابھی تو ٹھیک سے ایڈجسٹ بھی نہیں ہوا، اب کیا پکائے گا اس وقت۔“ کیا ہو گیا جو ایک نام ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالے گا۔“ انہوں نے تھپتھپا سنبھایا۔ سین کو ان کی طرف داری ہرگز پسند نہیں آئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کرایے دار کی موجودگی میں اپنی پرائیویسی کھونے سے خوفزدہ تھی یہ اور بات کہ حد درجہ مجبوری میں یہ فیصلہ کیا تھا اور ظاہر ہے ایڈوانس اور کرایے کی رقم ہاتھ میں آتے ہی کچھ ریلیف بھی محسوس ہوا تھا پر اس کے بدلے اس کی چوبیس گھنٹے کی مداخلت اسے تو ہرگز منظور نہ تھی۔

”کیوں خواہ مخواہ کرایے دار کو سر پہ چڑھا رہی ہیں آپ۔ ویسے بھی مجھے تو مشکوک سا لگتا ہے۔“ وہ پراسرار انداز میں بولی۔ اپنے تئیں سیدی سادی گھریلو سی ماں کو ڈرانا مقصد تھا مگر وہ بھی اپنی اولاد کے سب حروں سے بخوبی واقف تھیں۔ الٹا اسی کو سنا دیں۔ ”تمہیں اس دنیا میں کون مشکوک نہیں لگتا؟“

”تم جاری ہو یا میں بلاؤں۔“ سائن کا ڈونگا اس کے سامنے فُج کر انہوں نے دو ٹوک وارننگ دی تھی۔ سین لب بھینپے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”جاری ہوں۔ ہر وقت بلیک میل کرتی رہتی ہیں۔“ ہار ماننے والے انداز میں بڑبڑاتی وہ پیر پختی کمرے سے نکل گئی تھی۔ پیچھے سے مسز حسین نے دھیماسا مسکراتے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھیں ان کی بیٹی کی ضد اور ہٹ دھرمی کو بس ان کی بلیک میلنگ ہی

توڑ سکتی ہے۔

”میں..... وہ پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ لگ رہا
مہینوں سے پیاسے ہیں۔“ کچھ گڑبڑا کر اس نے
وضاحت دی۔

”اس ملک میں تو انسان بھی پیاسے ہیں۔“ وہ
جل کر بولتی اسے لاجواب کر گئی تھی۔

”اور اس پانی کا ٹل بھی آتا ہے مسٹر اتنا پانی
ضائع کرنا ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔“ غصے سے کہتے اس
نے ٹل بند کیا اور پلٹ کر عدن کو کھا جانے والی نظروں
سے دیکھا۔ اب کرایے دار ہے تو اپنی حد میں رہے۔

”اتنی اچھی جگہ ہے یہ لیکن لان کا حال اتنا خراب۔
میرا ایک دوست ہے اگر آپ چاہیں تو میں اسے لان کی
صاف صفائی اور دکھ بھال کے لیے بلا سکتا ہوں۔“ عدن
نے اس کے رویے کو میسر انداز کرتے کہا۔

”آپ نے مایوں سے دوستیاں رکھی ہوئی
ہیں؟“ سین نے پلٹ کر معصومانہ انداز میں پوچھا۔

”مالی نہیں اس کا لینڈ اسکیپنگ کا بزنس ہے۔
پروفیشنلی لان کو مینین کرتے ہیں۔“ اس نے بہ مشکل
خود کو بخیرہ رکھتے تفصیل بتائی۔

”اوہ، ٹھیکس بٹ نو ٹھیکس۔ ہم اتنی شاہ خرچیاں
افورڈ نہیں کر سکتے۔“ ہاتھ نہاتے اس نے تیز لہجے میں کہا
اور قدم بڑے پھانک کی طرف بڑھا دیے۔

”وہ یہ سب فری کرے گا۔“ سین کے قدم عدن
کی آواز پر تھم گئے تھے۔

”ریسکی..... کیا آپ کا دوست حاتم طائی کے
گھرانے سے ہے جو بغیر جان پہچان اس جنگل کو باغ
عدن بنا دے گا۔“ پلٹ کر دونوں بازو سینے پہ باندھے
اس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

”بتایا تو ہے وہ میرا دوست ہے۔“ وہ تجالت سے
مسکرایا اور اس وقت اسے اپنا آپ دنیا کے احق ترین
انسان سا لگا تھا جو خواہ تو اس الٹی کھوپڑی کی لڑکی سے
دامغ کھپا رہا ہے۔ پروہ بھی کیا کرتا کہ جب اوکھلی میں
سر دے دیا تھا تو پھر یہ سب تو جھیلنا ہی تھا۔ سین نے سر
ہلاتے ایسا تاثر دیا جیسے کہہ رہی ہو (خوب سمجھ رہی

☆☆☆

نئی جگہ کی اجنبیت تھی یا پھر گلٹ جو اسے تمام
رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی پھر بھی وہ حسب معمول
جاگ گیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ کا صبح خیز تھا آج بھی اپنے
معمول پہ بستر سے اٹھ بیٹھا جبکہ دوسری طرف ابھی
خاموشی کا دور دورہ تھا۔ اسی وقت ماں کا فون بھی آ گیا
تھا جو ہمیشہ کی طرح اس کی وجہ سے بے حد فکر مند تھیں۔

اپنی سستی اور بے خوابی کی اواز زاری کم کرنے کے
لیے اس نے سوچا کیوں نہ جاگنگ ہی کر لی جائے۔

فیصلہ ہوتے ہی وہ اپنا ٹریک سوٹ پہنے باہر نکل آیا۔
علاقہ تو سارا اس کا دیکھا بھالا ہی تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا
کہ صبح میں خزاں کی ٹھنڈک کی آمیزش سکون دینے لگی
تھی۔ قریبی پارک کے تین چکر لگا کر وہ جب تک گھر
کا پہنچاؤں چڑھ چکا تھا۔ ڈرائیو سے گزرتے اس نے
ایک نظر دائیں طرف لان کی خشک گھاس پہ ڈالی اور پھر
تاسف سے سر ہلاتا اپنے پورشن میں گھس گیا۔

دوسری جانب یقیناً سوریا ہو چکا تھا کیونکہ وقفے،
وقفے سے ان دونوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔
شاہور لینے کے بعد تیار ہو کر وہ واپس لان کی طرف چلا
آیا۔ سامنے گئے ٹل کے ساتھ ایک ربڑ کا پائپ لگا تھا جو
شاید فرش دھونے کے لیے رکھا گیا تھا۔ عدن نے ٹل کھول
کر پائپ سے لان کی زرد گھاس کو پانی دینا شروع کر
دیا۔ ساتھ ہی ساتھ زربل وہ ہلکا سا گلتنا بھی رہا تھا۔

کندھے پہ اپنا شولڈر بیگ سیٹ کرتی سین نے
صدر دروازے سے نکلنے یہ منظر دیکھا تو اسے حیرت کا
شدید جھٹکا لگا تھا۔ عدن جو اپنی ہی دھن میں لان میں
پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا اس کی آمد سے بے خبر اب بھی
تنگنٹار رہا تھا۔ سین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”ارے اوکا لا پانی کی سری دیوی یہ کیا لہک لہک
کے سیلاب لے آئے ہو یہاں۔“ وہ قن کرنی وہاں
پہنچی تھی اور جاتے ساتھ ایک دم حملہ کیا تھا کہ بیچارے
عدن کو پھٹنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔

سوچنے کی باتیں

☆ بعض اوقات دعا میں رب کے فیصلے نہیں بدلتیں مگر آپ کا دل بدل دیتی ہیں اور رب کے فیصلے کے مطابق کرو دیتی ہیں۔

☆ اچھے وقت کی ایک خامی ہے کہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ برے وقت کی ایک خوبی ہے کہ ہمیشہ نہیں رہتا۔

☆ کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہو تو ہمیشہ یاد رکھو پاؤں بے شک پھسل جائے لیکن زبان کو نہ پھسلے دو۔

☆ آج عمل ہے حساب نہیں، کل حساب ہوگا عمل نہیں۔

☆ جھوٹ بول کر جیت جانے سے بہتر ہے۔ سچ بول کر ہار جاؤ۔

☆ خوب صورتی ظاہر نہیں باطن میں ہوتی ہے جو بصیرت رکھنے والی آنکھ ہی دیکھ پاتی ہے۔

☆ از: نادیر، راول پنڈی

آپ ریڈی ہیں تو چلیں میں جانے سے پہلے آپ کو گروسری کروادوں۔“ ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے وہ خوشگوار لہجے میں کہتا سین کو نظر انداز کر کے اب ان کی طرف متوجہ تھا۔

”میں تو کہہ رہی تھی پہلے ناشتا کرو۔ اچھا چلو میں بس اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے پلٹیں لیکن یہ سین کی برداشت کی حد تھی۔ اسے تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

”آپ اس کے ساتھ جائیں گی؟“ وہ ناقابل یقین حیرت سے بولی۔

”ہاں تو.....؟“

”پیدل چیر گھنٹی بھی تو جاؤں گی۔ تھینکس ٹو

عدن، بیچارہ اپنا راستہ کھوٹا کر کے مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔“ سنجیدگی سے کہتیں وہ سر جھٹکتی اندر چلی گئیں۔ سین نے گردن گھما کر ایک نظر بائیں کھڑے عدن کو دیکھا جو فاتح مسکراہٹ سے اسی کو دیکھ رہا تھا اور پھر ویر

ہوں۔ عدن کا خیال تھا کہ شاید وہ اب خاموشی افس کے لیے نکل جائے گی پر شوخی قسمت ابھی استحالہ دور بھی تھی اسی لیے تو نکل رات سے لے کر اب تک سین کی زیرک نگاہ اتنی بڑی چیز کو انور کر گئی تھی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟“ ڈرائیو سے پہ کھڑی رائیڈ نیو جہازی سائز گاڑی پہ سین کی نگاہ اتفاق سے پڑی تھی۔ رات کو شاید اندھیرے کی وجہ سے یا پھر تھکاوٹ اور بھوک کا غلبہ تھا جو وہ پاس سے گزر کر بھی اسے نظر انداز کر گئی اور اب سارا دھیان اس پر تھا۔

”میری گاڑی ہے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو آفس تک لفٹ دے سکتا ہوں۔“ خوش اسلوبی سے آفر کرتے وہ دھیما سا مسکرایا۔

”اتنی بڑی گاڑی ہے تو اسی میں رہ لیتے۔“ سین کو واقعی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”سوری۔“ عدن کو اس کی سرگوشی سناٹی نہیں دی تھی۔

”شکریہ..... میں بس کے سفر کی عادی ہوں اور

اسی میں زیادہ کمفرٹئبل محسوس کرتی ہوں۔“ خود پہ قابو پاتے وہ سنجیدگی سے بولی۔ عدن نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ سین کو اب وہ پہلے سے بھی زیادہ مشکوک لگ رہا تھا۔ آخر کو اتنا ریس زیادہ ان کے ٹوٹے

پھوٹے دو کمرے کرایہ پہ لے کر کیوں رہ رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے اندر کا غبار باہر نکالتی خوش قسمتی سے می کی آمد ہو گئی تھی۔

”کیوں بحث کر رہی ہوں صبح صبح۔ روز تو دیر ہو رہی کا شور مچایا ہوتا ہے آج دیر نہیں ہو رہی تمہیں۔“ ان کی بروقت اینٹری پہ عدن نے سکون کی سانس لی جبکہ سین نے گڑبڑا کر ہاتھ پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور پھر چور

نظروں سے پاس کھڑے عدن کو، جو اب بھی اسی اطمینان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”آئیں بیٹا آپ بھی ناشتا کر لیں۔“ وہ اب عدن کی طرف متوجہ تھیں۔ اس محبت پر سین کا دل جل کر

راکھ ہی تو ہو گیا تھا۔

”شکریہ آئی لیکن ابھی مجھے بالکل بھوک نہیں۔“

اس سرسری تصادم کو فائز نے جلد ہی فراموش کر دیا تھا۔ فقط اگلی ملاقات تک جو اُن دونوں کی یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ہوئی تھی جہاں وہ سالانہ مباحثوں کے شرکاء میں سے ایک تھی جبکہ فائز دوستوں کے اصرار پر ان کے ساتھ ہال میں بیٹھے سامعین میں شامل تھا۔ ”آزادی رائے اور رواداری“ کے موضوع پر تقریر کرتی ”فاطمہ رضوی“ کا دوسرا تاثر ”فائز حسین“ کے لیے پہلے سے زیادہ متاثر کن تھا۔ بالوں کو کچر میں سمیٹے، سرخ ڈھیلے سے کرتے پر سفید دوپٹا اوڑھے اپنے سادہ سے حلیے میں بھی اس کی شخصیت غیر معمولی تھی۔ اس کا لب و لہجہ، اس کی موضوع پر گرفت، اس کا..... بے تحاشا اعتماد سامنے بیٹھے ہر شخص کو بے انتہا متاثر کر رہا تھا جو اس کی تقریر کے اختتام پر بجتی تالیوں کے شور نے ثابت کیا تھا۔ اس بار فائز نے اسے دور سے بیٹھ دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس شام کی بہترین مقررہ کی ثرائی جیتنے پر اسے مبارکباد بھی دی تھی جسے اس نے نہایت وقار کے ساتھ قبول کیا تھا۔

اس سے تیسری ملاقات تک فائز اس کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس ملاقات کے اختتام تک ان کے درمیان رسمی گفتگو سے بٹ کر غیر رسمی باتوں کا آغاز بھی فائز کی ہی کوشش سے ہوا تھا ورنہ فاطمہ بہت زیادہ لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ زیادہ سوشل نہیں تھی اور اس کا دوستوں کا سرکل بھی محدود سا تھا۔ ان کا ڈیپارٹمنٹ مختلف تھا، فائز انکس کا تھا، فاطمہ انگلش لٹریچر سے تعلق رکھتی تھی۔ فائز کی طرح اس کا تعلق کسی ایلٹ کلاس سے نہیں تھا پھر بھی ان دونوں کی دوستی ان کی متفقہ سوچ کا نتیجہ تھی۔ ان کے خیالات اور زندگی سے متعلق نقطہ نظر میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی تھی جو ان دونوں کو بڑے کم وقت میں ایک دوسرے کے قریب لائی تھی۔ شروع میں فاطمہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے فائز کے وہم و گمان

میں بھی ہیں تھا کہ کچھ عرصہ بعد ان کا تعلق محبت کا رخ اختیار کر جائے گا۔ اپنے پاؤں میں بندھی رملہ سے متعلق کی زنجیر فائز کو پہلے روز سے چھپتی تھی پر بابا سائیں کی خوشی کی خاطر وہ چپ چاپ اس رشتے کو نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اس کا خود سے کیا عہد دل میں آئے محبت کے طوفان میں کاغذ کی کشتی ثابت ہوا تھا جو پہلی ہی موج کی تاب نہ لا کر ڈوب گئی تھی۔ فاطمہ، فائز کو پسند کرنے کے باوجود اس تعلق کو محبت کا نام دینے کو تیار نہ تھی کیونکہ وہ اپنے اور فائز کے درمیان جاکل اسٹینس کی وسیع خلیج سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی دل کے رشتے معاشرے میں گھڑی دولت کی تفصیل کو پار نہیں کر پاتے لیکن فائز کی یقین دہانی اور روز بروز بڑھتی چاہت اس کے فیصلے میں دراڑ لے آئی تھی۔

”وقت بہت بدل چکا ہے فاطمہ، تمہیں کیا لگتا ہے اس انفارمیشن کے زمانے میں سوسائٹی کے پیر آج بھی دولت نے جکڑے ہیں۔“ اسے قائل کرتے فائز حسین، رملہ سے قائم تعلق میں بندھی اپنی ذات کو قصداً فراموش کر چکا تھا۔

”سوسائٹی کو دولت نے جکڑا ہے، یہ میں نہیں جانتی فائز پر محبت کی بد قسمتی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تاریخ گواہ ہے یہ معاشرہ محبت کرنے والوں کو ایک ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔“ اس دنیا کو پر کھنے کا تجربہ ان دونوں کے پاس کتابی حد تک تھا۔ عملی زندگی سے ان دونوں کا ہی دور، دور تک واسطہ نہ تھا۔ دو الگ دنیاؤں کے لوگ ہونے کے باوجود ان کے اصول ایک سے تھے پروہ نہیں جانتے تھے دنیا کا سبق کتابوں میں نہیں ہوتا۔ یہ عمل کی کسوٹی پر عقل سے پرکھے جانے کا کھیل ہے جو بنا زخم کھائے نہیں ملا کرتا۔

”یہ ہماری زندگی ہے، تمہارا لٹریچر نہیں کہ مجھے رومیو جولیٹ کی مثال دے کر قائل کر لوگی۔ میں اگر راہ محبت میں اس مقام تک پہنچا ہوں تو پھر اس رشتے کو تکمیل تک بھی پہنچاؤں گا۔ یہ فائز حسین کا وعدہ ہے تم سے۔“ اور یہ وعدہ کرتے فائز حسین نے اپنے دل

میں ایک اور عہد کیا تھا، رملہ سے شادی نہ کرنے کا عہد۔ وہ بابا سائیں کے احسانات اتارنے کی خاطر اپنی محبت کا خون نہیں کرے گا۔ (تو کیا ایسے محسن کے اعتبار کا خون کر پاؤ گے؟) ضمیر کے پتھو کوں کو نظر انداز کرتے اس نے فاطمہ کو یقین دہانی کرائی تھی۔ یقین و بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں ابھی فاطمہ کے دل نے فائز کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔

☆☆☆

”جیسے تم تو میرے حالات سے واقف ہی نہیں۔“ وہ خفیف سے لہجے میں بولی۔
 ”شادی کرو، جان چھڑاؤ۔ یا انہیں وہ سرفراز کتنا لٹو تھا تمہارے بیچھے۔ رشتہ جیجئے والا تھا لیکن تم پر ہی بھوت سوار تھا جیسی کی سپورٹ کا۔“ یہ بات سارہ اسے کئی بار سمجھا چکی تھی اور اس کے جواب سے بھی خوب واقف تھی۔
 ”تو تمہارے خیال سے شادی کر کے اپنی جان چھڑا لیتی اور می کو اکیلا چھوڑ دیتی؟“ وہ تاسف سے بولی۔
 ”اکیلا کیوں چھوڑتیں۔ وہ انہیں بھی ساتھ رکھنے پہ تیار تھا۔“ سرفراز بی ایس میں ان کا کلاس فیلو تھا۔ سین کے لیے اس نے باقاعدہ رشتہ گھر بھیجا تھا لیکن اس نے دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔
 ”نہیں چاہیے مجھے کسی کا احسان۔۔۔۔۔ اور تم بات کو سمجھا کر کہاں لے جا رہی ہو سارہ، یہاں بات میری نہیں عدن کی ہو رہی ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔ شادی کی بات پر ہر بار اس کا موڈ شدید آف ہو جاتا تھا۔

”مجھے سو فیصد یقین ہے معاملہ کچھ اور ہے۔“
 گھر سے بس اسٹاپ، بس سے دفتر تک اندر ہول اٹھ رہے تھے لہذا آفس پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنی داستان سارہ کے گوش گزار کی تھی۔ اپنا کمپیوٹر آن کرتے سارہ نے نہایت خاموشی سے تمام قصہ سنا تھا۔
 ”اچھا تو تمہارے خیال میں کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔“
 ”را“ کا ایجنٹ ہے جو تخریب کاری کرنے تمہارے گھر پناہ لینے آ گیا ہے؟“ سین کی تشویش پہ سارہ کا رد عمل بے حد مچ سکون تھا۔ یعنی جو بات اس کے لیے پہاڑ تھی سارہ کے لیے وہ رائی کا دانہ نکلی تھی۔ دل تو چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔ ایک تو اسے اس پجوشن میں پھنسانے والی بھی یہی محترمہ تھی اس پہ کیا ”کول ایکسپریشن“ تھے جبکہ خود سین کی جان پہ بئی تھی۔

”آئی ایم سیریس۔“ خود پہ مضطرب کرتے اس نے شجیدگی سے کہا۔ دوسری طرف بھی سارہ تھی۔
 ”آئی ایم ڈیم سیریس سین۔ حد کرتی ہو تم بھی۔ فرقان بھائی کا دوست ہے۔ دو سال یونیورسٹی میں پڑھا ہے ان کے ساتھ۔ بتایا ہے انہوں نے کہ اچھے وبل آف لوگ ہیں۔ زمینیں وغیرہ ہیں۔ اس شہر میں اپنا آفس سیٹ کرنا چاہتا ہے تو چلا آیا شہر۔“ سارہ نے رتی رٹائی بات ایک بار پھر دہرا دی تھی۔
 ”یار اسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ سین کی اپنی ہی نرمالی منطق تھی۔
 ”ضرورت تو تمہیں بھی نہیں۔“ سارہ نے ابرو اٹھا کر جتایا۔ وہ اپنی کرسی پہ باقاعدہ جھول رہی تھی۔

دلیل اسٹیٹ ایڈوائزر

DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI

میں خرید و فروخت کے لیے مستند نام

ریاض حسین

ایڈریس: راحت کمرشل لین 2

DHA PHASE 6 KARACHI

فون نمبر: 0300-3658964

میں کیا ہے۔ ٹال..... ڈارک..... ہینڈم؟“ سارہ اچانک یاد آنے پر بولی۔

”انتا فضول کیسے بول لیتی ہو تم سارہ۔“ سین اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانتی تھی مطلب کی بات کرنے کا اس بندی کا موڈ نہیں ہے۔ اسی لیے یہ فضول سوچ رہی ہے۔ ”میری جان اسٹیمنا..... اور کیا.....“ سارہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ سین ایک ٹک اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اوہ بابائیں وہ دے جاسوس، پچارہ شریف انسان ہے۔ ایک گاڑی کیا دیکھ لی اس کی تمہیں ہارٹ انجک ہو گیا۔“ سارہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ سین منھیاں بھیچتے مارچ پاس کرتی اپنی میز کی طرف چلی گئی۔ کام میں مصروف ہو جانے کے باوجود وہاں بار، بار عدن کی طرف جارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس اسے مطلع کر رہی تھی کہ جو دکھ رہا ہے ویسا کچھ ہے نہیں اور ایک حساب سے شاید ٹھیک ہی پیغام دے رہی تھی۔

☆☆☆

نوبے تک گھر کے سب لوگ اپنے، اپنے کمروں میں سونے چلے جاتے تھے۔ دس بجے تک تو نوکر چاکر بھی سوچکے ہوتے تھے۔ بنا آواز کے وہ اپنے کمرے سے نکل کر ہال میں داخل ہوئی۔ گھپ اندھیرے میں بس دیوڑھی میں روشن بلب کی روشنی کھڑکیوں کے پردوں سے چھن، چھن کر آ رہی تھی۔ کوئی آہٹ کیے بغیر وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی اور اس دم روشنی میں جلدی، جلدی وہ نہر ملانے لگی جو اسے زبانی یاد تھا۔ فون چند سیکنڈوں کے بعد بڑی بیزار سے ریسو گیا تھا۔

”کیوں فون کیا ہے؟“ اس کی آواز پہ وہ بے تحاشا بھڑک گیا تھا۔

”یہ کیا انداز ہیں بات کرنے کے۔ کیا میں اب آپ کو فون بھی نہیں کر سکتی؟“ وہ بے تحاشا حیرت اور پریشانی سے بولی تھی۔ اسے فائز سے اس قدر اجنبیت کی امید نہیں تھی۔

بابا سائیں جیسے ہیں م اس وقت مجھ سے بات کر رہی ہو؟“ پاس رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھتے اس نے سوال کیا تھا۔

”تو کیا انہیں سامنے بٹھا کر بات کروں۔ حد کرتے ہیں آپ بھی، ایسے جتا رہے ہیں جیسے پہلی بار آپ کو فون کیا ہے۔“ فائز نے بے اختیار لب بھیجے۔ وہ تو اس سے پہلے بھی دن کے اجالے میں بھی سب گھر والوں کے علم میں ہی اس سے بات کرتی تھی۔ اس چھپن چھپائی کے کھیل میں کہیں فائز کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ رملہ سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔

”پہلے کی بات اور تھی رملہ، میں نہیں چاہتا گھر والے میرے متعلق شہادت کا شکار ہوں۔“ وہ اس کے پیچگانہ رویے اور کم عقلی سے واقف تھا حتی المقدور اپنے کچھ کو قابو میں رکھتے اس نے اسے طریقے سے سمجھایا تھا۔ ”شہ کیسا، آخر ہمارے درمیان رشتہ قائم ہو چکا ہے۔“ یہی تو رونا تھا وہ کہاں یہ رشتہ چاہتا تھا اور کون سا اسے قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ یہی کوشش تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے اقرار بخشن کو دل کی بات بتا دے۔

”اسی لیے میں اب محتاط رہتا چاہتا ہوں۔ تم بھی احتیاط کرنا اور آئندہ مجھے کال مت کرنا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور اگر کوئی ضروری کام ہو تو؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تو بابا سائیں یا سبج لالہ کو پیغام دے دینا۔“ رملہ کا جواب سنے بغیر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔ رملہ کا داغ چٹختے لگا تھا۔ تو شام بھائی جو اسے فائز سے متعلق باتیں بتا رہی ہیں وہ سب سچائی پر مبنی ہیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے فائز کے چند ماہ پہلے اور اب کے انداز گفتگو کا موازنہ کرتے شام بھائی کی باتوں سے نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

☆☆☆

اس نے گھر میں قدم رکھا تو سامنے کا منظر دیکھ کر

منتخب نوتکے

برتنوں کو محفوظ رکھنے کے لیے: نان اسٹک برتنوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے تھوڑا سا سلاڈ کا تیل لے کر نان اسٹک برتنوں پر ملیں۔ اس سے ان کی پالش محفوظ رہے گی۔

جوتوں کی پالش کے لیے: کیلے کا جھلکا چرے کے جوتوں پر ملیں۔ اس عمل سے جوتوں کی پالش دیر تک محفوظ رہے گی۔

بلیک ہیڈز ختم کرنے کے لیے: چہرے پر بلیک ہیڈز ہو گئے ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹمائز کاٹ کر فرنیچ میں رکھ دیں۔ جب خوب صاف ہو جائیں تو انہیں چہرے پر ملیں۔ جو بلیک ہیڈز ہیں وہ نکل جائیں گے اور چہرہ صاف و شفاف ہو جائے گا۔

مرسلہ: جمیر اقبال، کوٹری

”تمہارا کرا دو پہر میں ہو گیا تھا لیکن وہاں کی صفائی کا وقت نہیں ملا تو تم میرے کمرے میں سو جانا۔“ انہوں نے اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر اسے تفصیل سنائی تھی۔ وہ خود بھی دوسرے برش سے دیوار کے نچلے بچے ہوئے جیسے پر رخن کر رہی تھیں۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آیا آخر یہ بیٹھے بٹھائے انہیں پینٹ کی کیا سوچھی۔ وہ بھی اس سے مشورہ کئے بغیر۔

”اور یقیناً آپ نے آج کھانا بھی نہیں پکایا ہوگا۔“ دھیمے لہجے میں اس نے شکوہ کیا تھا۔

”کہاں سے پکنا کھانا، صبح تمہارے جانے کے بعد سے تو ہم دونوں اس سب میں پھنسے ہیں۔ ویسے میں تو کہہ رہی تھی ایک مزدور کو بلا لیتے ہیں لیکن یہ عدن کہنے لگا چھوڑیں ہم خود ہی کریں گے۔ بس اسی نے میرے ساتھ جا کر سارا پینٹ کا سامان خریدا۔“ تو یہ سب اس فتنے کی منصوبہ بندی ہے۔ چار دن ہوئے اسے ان کے گھر کرایے دار کی حیثیت سے رہنے آئے ہوئے اور اس گھر کے فیصلے کرنے لگا۔ دل تو چاہ رہا تھا

اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ ایک پل کو تو لگا شاید کی اور گھر میں داخل ہو گئی تھی پر ماں کی موجودگی سے ثابت تھا کہ گھر تو اپنا ہی ہے پھر ایسی حالت بھلا کیسے ہو گئی۔ جب صبح چھوڑ کر گئی تھی تو ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ زمین آسمان کے بیچ اسی مقام پہ پالی جاتی تھی اور اب یہ حال تھا کہ مختصر سا سامان اٹھا کر لاؤنج کے کونے میں جمع کیا ہوا تھا جسے چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لاؤنج کے کونے میں ایک چار ٹائٹھوں والی میز بھی پڑی تھی جس پہ عدن لڑکا ہاتھ میں پینٹ برش تھا دے دیوار پہ کوچیاں لگا رہا تھا جبکہ میسر پہ کپڑا لپیٹے، پینٹ کی باٹلی سے پینٹ بھر کر اس کے ڈبے میں ڈالنے کے بعد میز کی گھبراہٹ سے اس کی مدد کر رہی تھیں۔ اس نے باقاعدہ پوری آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا تھا جس کی تقریباً تین دیواروں پر روشن ہو چکا تھا۔ آخری دیوار پر عدن اپنی مہارت لٹاتا آڈھتے تھے اسٹروک لگا رہا تھا۔ اس کی وہاں موجودگی سے بے خبر وہ دونوں اپنے کام میں مگن تھے۔

”اب یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سین کی آواز پہ ان دونوں نے گردن گھما کر سرسری سے انداز میں دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

”اللہ نے اتنی بڑی اور حسین آنکھیں دی ہیں۔ دکھائی نہیں دے رہا پینٹ ہو رہا ہے۔“ ممی نے البتہ اس کی طرف دیکھے بغیر ٹوڑا جواب دیا تھا۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ یہ پینٹ ہو رہا ہے مگر کس خوشی میں اور کس کی اجازت سے؟“ وہ حیران سی ان کی شکل دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب تک شاید میں تمہاری ماں ہوں۔“ جتنا سے انداز میں طنز کرتے انہوں نے سنجیدگی سے سین کی طرف دیکھا تھا۔ سیاہ چپک والی شارٹ شرٹ کے ساتھ اپنی پسندیدہ جینز اور گلے میں مفطر کے اشاکل میں دوپٹا لپیٹے وہ خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ بالوں کو کچھر میں جکڑ رکھا تھا جس سے چند ٹپس باہر نکل رہی تھیں۔

”ممی آپ.....“ وہ انہیں خفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی نامراد کوکانے سے پکڑ کر باہر راستہ دکھائے
لیکن اس نے تو اس کی ماں کو ہی اپنا حاتی بنا لیا تھا۔
”اچھا ہے ناں ایڈوچر ہو گیا۔ ایک دو دن لگیں
گے لیکن دیواریں صاف ہو جائیں گی۔“ وہ ہنسنے ہوئے
بولتا تھا جیسے ساری زندگی دیواروں پہ رنگ و روغن ہی
کرتا رہا ہو۔

”اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا۔“ می کے شفقت
بھرے لہجے پر اس کے اندر تک آگ لگ گئی تھی۔ کچھ
دیر اور یہاں کھڑی رہے گی تو منہ سے کچھ نہ کچھ نکل
جائے گا اس لیے کھسک لینا مناسب تھا پر ماں نے آواز
دے کر روک لیا۔

”اچھا سہن سنو، فریج میں اٹلے رکھے ہیں تم
ایسا کرو جلدی سے آلیٹ بنا لو اور ساتھ پر اٹھے۔ عدن
کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ اچھا تو ساری فکر عدن کی
تھی۔ بیٹی صبح کی بھوکی پیاسی گھر واپس آئی ہے اس کا
کوئی خیال ہی نہیں۔

”یعنی آفس سے آکر آج کوکنگ بھی نہیں کروں
گی؟“ جل جل کر اب تو وہ خاک ہو رہی تھی۔
”آلیٹ بنانا بھی کوکنگ کہلاتا ہے کیا؟“ عدن
نے لقمہ دیا۔ اس کا انداز ہلکا جھلکا تھا۔

”اسے تو کچن میں گھسنا ہی مصیبت لگتا ہے۔“
می نے اس کی تائید میں ہنسنے ہوئے سین کا راز فاش
کیا۔ وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر اسے کمرے میں چلی
آئی جہاں لاؤنج جیسا ہی نظارہ تھا۔ لیکن ایک بات تو
تھی کمرہ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ سامان بے ترتیب تھا
اور فرش کی بھی صفائی نہیں ہوئی تھی لیکن دیواریں چمک
رہی تھیں پر سین اس کی داد اس شخص کو دینے کے موڈ میں
ہرگز نہیں تھی۔ کپڑے بدل کر اور ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن
میں چلی آئی۔

”اب اس نواہزادے کے لیے آلیٹ اور
پر اٹھے بھی میں بناؤں۔“ فریج سے مطلوبہ سامان نکال
کر کاؤنٹر پر رکھتے وہ در پر اب بڑوائی۔
”مجھے نہیں آ رہا آخر یہاں ہر کوئی اس کا اتنا نفور

کیوں کر رہا ہے؟“ اسے چند دن پہلے کا سارہ کا رویہ
بھی یاد آیا تھا جو بنا جانے اس کی حمایت کر رہی تھی اور
می تو خیر اس کے لیے کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آ رہی
تھیں۔ باؤل میں بیاز کا مٹے بے اختیار اس کی آنکھوں
میں پانی آ گیا تھا۔

☆☆☆

”تم مجھ پہ اعتبار نہیں کرتی یا کرنا نہیں چاہتیں؟“
بڑی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا۔

”زندگی بڑی سفاک ہے فائز اور میں اس سے
مزید دکھ کشید کرنے کی خواہش نہیں رکھتی۔“ یونیورسٹی
کینے ٹیریا میں بیٹھے اس کی آنکھوں میں دیکھتے فائز نے
وہاں درو کی ہلکی سی رتن دیکھی تھی۔

”یار لوگ تو محبت پا کر آسمانوں میں اڑنے لگتے
ہیں اور ایک تم ہو، میں دل تمہارے قدموں میں رکھ رہا
ہوں اور تم ٹھوکر مار کر آگے نکل رہی ہو۔“ اپنی بات پہ
زور دیتے اس نے سانسے رکھی میز پر ہاتھ مارا۔

”ایسی بات نہیں فائز، میں کبھی تمہیں ہرٹ کرنا
نہیں چاہتی لیکن میں اپنی آنکھوں کی اوقات سے
واقف ہوں، اسی لیے وہ خواب دیکھنے سے گریز کرتی
ہوں جو ان کی حیثیت سے بڑھ کر ہیں۔“ وہ ضرورت
سے زیادہ حقیقت پسند تھی۔ فائز بڑا اعتبار بھی تھا کہ دل
گوای دیتا تھا پر کلاس ڈیفرنس انگور کرنے والی چیز نہیں
ہوتی۔ اسی لیے نڈل کلاس لڑکیوں کو بہت محتاط رہنے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ کیا پتا کب کوئی امیر زادہ محبت کے
نام کا فریب دے کر زندگی ویران کر جائے۔

”ان آنکھوں کو محبت کے خواب دیکھنے سے
روک کر تم خود پر ہی نہیں مجھ پر بھی ظلم کر رہی ہو
فاطمہ۔ تم کیا ہو، تمہاری حیثیت کیا ہے یہ میرے دل
سے پوچھو۔“

”فائز تمہارا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم آسمان
ہو میں زمین۔“

”یہ محبت ہے جنگ نہیں اور پلیز یہ دقیا نوی باتیں
کر کے میری چاہت کی توہین تو مت کرو۔“ فائز نے ہاتھ

اتھا کرتے سبجے میں کہہ کر اسے مزید چمکنے سے روکا۔

لوک لہجہ

خان صاحب کے رابطے اور چمکنے کی زبان پر تو خیر ناد ہندو کی چھاپ بھی لیکن بولتے اپنے ہی کھرے، کھٹکتے پشتون لہجے میں تھے جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بشارت کو اپنا لہجہ بالکل سپاٹ اور بے نمک لگا۔ پشتون اردو لہجے میں تنگ ایجاز اور تند و تازہ مہکار ہے جو کسی محکم اور ذوقی بات کی رد واد نہیں۔ یہ کوئٹہ، لکارتا لہجہ مشکوک سرگوشیوں کا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پنجابی اردو لہجے میں ایک کشادگی، گرم جوشی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں میدانی دریاؤں کا پاٹ اور دھیرج اور دل دریا پار گنگ ہے۔ اور سچ، سچ راستہ بنانے کے لیے اپنی لہری لنگر کاٹ پر پورا اعتماد۔ بلوچ لہجے میں ایک ہوک سی، ایک ہسکتی پہاڑی گونج اور دلا آویز خشکی کی کیفیت کے علاوہ ایک چوکتا پن بھی ہے جو سنگلاخ کوہ اور دشت بے آب اپنے آزدوں کو بخش دیتے ہیں۔ سندھی اردو لہجہ لہکنا، لہراتا لیریکل (lyrical) لہجہ ہے۔ ایک لکک، ایک مہراں موج جو اپنے آپ کو چوم، چوم کر آگے بڑھتی ہے۔ اردو کے علاقائی لہجوں میں وہ لوک ٹھٹھا، مٹھا اور رس ہے جس کا ہمارے گھسے پٹے نکلانی اور شہری لہجے میں دور، دور، شائبہ نہیں ملتا۔ لوک لہجے کی آمیزش سے جو نیا اردو لہجہ ابھرا ہے اس میں بڑی توانائی، تازگی، لوج اور سائی ہے۔

بھرے ہیں یہاں چارستوں سے دریا
اقتباس: ”آبِ حیم“ از مشتاق احمد یوسفی
انتخاب: ناہم شاہد، کراچی

”یہ سب کہنا بہت آسان ہوتا ہے فائز وقت آنے پر.....“ وہ کہنا چاہتی تھی وقت بدلنے نہیں لگتی، محبت کے دعویدار ضروری نہیں ہر آزمائش پر پورے بھی اتر پائیں۔
”تم سے محبت کی ہے تو مرتے دم تک نبھاؤں گا۔ نہ یقین آنے تو مر کر دکھا دوں!“ اس نے دو ٹوک کہتے فاطمہ کی بات کاٹی تھی۔

”فضول باتیں مت کرو۔“ اس نے بے اختیار ٹوکا۔
”کیا کروں تم بیار محبت کی باتیں سننا ہی نہیں چاہتیں۔“ مسکراتے ہوئے اس کے اعتراض پر فاطمہ جھینپ سی گئی تھی۔

چوٹھے کے سامنے چوکی پر بیٹھی، گھٹنوں پہ گال نکائے وہ فائز کے تصور میں ڈوبی تھی جب دروازے پر کھڑی طیبہ کی آواز پہ چونک کر اس نے سر اٹھایا۔ اپنی اور فائز کی گفتگو کو دل ہی دل میں دہراتے اس کے گال باقاعدہ بلش کر رہے تھے۔

”آپ کچھ کہہ رہی تھیں امی؟“ اپنے دھیان میں مگن اس نے ماں کی آواز پر بھی توجہ نہیں دی تھی جو اسے باورچی خانے کے باہر سے پکار رہی تھیں۔

”دب سے آوازیں دے رہی ہوں بیٹا تم ہو کہ سن ہی نہیں رہیں اور یہ کیا؟ سارا دودھ ابل گیا۔“ طیبہ نے بے اختیار ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

”اُف..... ف میرے اللہ، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ فاطمہ نے گھبرا کر چوٹھے کی طرف دیکھا جہاں پہلی سے دودھ ابل، ابل کر باہر گر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چولہا بند کر کے صافی سے گرا ہوا دودھ صاف کیا۔ وہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہیں پھر بنا کچھ کہے واپس لوٹ گئیں۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں فاطمہ، میں دیکھ رہی ہوں کچھ عرصے سے تم بہت کھوٹی، کھوٹی سی رہتی ہو۔“ کچھ دیر بعد فاطمہ کمرے میں آئی تو انہیں جاگتا پایا۔ اسے اندازہ ہوا وہ شاید اسی کی منتظر تھیں۔ فاطمہ نگاہ ملائے بغیر اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گئی جب خاموشی میں

کر اس نے اپنے بس میں کیا ہے۔ اس کا دماغ انکشاف پہ انکشاف کیے جا رہا تھا۔

سامنے بیٹھا عدن مزے لے لے کر کھانے کو ایسے انجوائے کر رہا تھا جیسے سامنے آلیٹ نہیں بریانی، کوفتے سچ ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کو یہاں وہاں کی باتیں سن رہا تھا۔ اپنے علاقے کے قصے، وہاں کی روایات، حالات حاضرہ پہ اپنا سا تبصرہ..... وہ تقریباً ہر موضوع پہ بات کر رہا تھا جسے وہ نہایت دلچسپی سے سنتیں خود بھی اپنی رائے دے رہی تھیں۔

”ارے سین تم نے اتنی جلدی ہاتھ کیوں روک لیا۔ ٹھیک سے کھاؤ ناں۔“ وہ جو اپنے ہی دھیان میں بیٹھی کڑھ رہی تھی ماں کی آواز پہ یک دم چونکی۔

”بھوک نہیں ہے مجھے۔“ عدن کی سمت دیکھتے وہ بڑی سنجیدگی سے بولی تھی۔

”بھئی ہم دونوں کو تو بہت بھوک لگی ہے۔ سارا دن بہت ہی زیادہ بڑی گزر۔ ویسے عدن سچی بات ہے یہ خیال مجھے باسین کو تو آیا ہی نہیں کہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم خود دیواروں پہ وائٹ واش کر سکتے ہیں۔

ویک اینڈ تو اکثر یونی گزر جاتے ہیں۔ اب دیکھو ناں ایسے تو خرچ محسوس بھی نہیں ہوا۔“ انہوں نے کھلے دل سے عدن کو سراہتے ہوئے کریڈٹ دیا تھا۔

”جی ہاں یہ سب تو مفت ہو گیا۔“ پانی کا گلاس منہ سے لگاتے اس نے طنز کیا۔

”ایک طرح سے مفت ہی سمجھو۔ بس میٹرل خریدا اور میٹر ہی کرایے پہ لائے۔ یہی مزدوروں کو لگا لیتے تو ڈبل پیسے لگ جاتے۔“ اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے وہ عام سے انداز میں بولیں۔

”تھینک یو سوچ بیٹا، تمہاری وجہ سے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کیسی صاف ہو گئی ہے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ انہوں نے عدن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے اسے ساتھ ہی دعاؤں کا تحفہ بھی دے ڈالا۔

”شکر یہ کیسا آئی! یہ تو بس یونی مجھے خیال آ گیا دیواریں بڑی ٹھنڈی ہو رہی ہیں چلو ایڈوچر ہی سہا۔“

غل ماں کی نظر بھری آواز گونجی۔

”دل اور دماغ میں سے کس کی بات ماننی چاہیے امی؟“ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے ان سوال کیا تھا۔

”وہ، جو صحیح ہو۔“ جواب مختصر اور جامع تھا۔

”اور یہ کیسے پتا چلے گا؟“ اس نے کروٹ بدل کر ماں کی طرف دیکھا۔

”یہ وقت بتاتا ہے میری جان۔ کیونکہ وقت آنے پر جو صحیح ہوگا اپنا آپ ثابت کر دے گا۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

جیسے بن کہے بھی بیٹی کی ولی کیفیات پڑھ رہی ہوں۔

”آپ مجھے کنفیوز کر رہی ہیں۔“ وہ ابھی تھی۔

”اور تم مجھے اس کا نام نہیں بتا رہی ہو۔“ انہوں نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔ فاطمہ نے بے اختیار لب

کاٹے۔ ہوئے ہوئے وہ انہیں فائز کے متعلق بتانے لگی تھی۔ اور یہ بھی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

رات گئے تک وہ دونوں اس موضوع پہ بات کرتی رہیں پر ماں کو سب کچھ پتا کر فاطمہ کے دل سے بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔

☆☆☆

اس کا منہ اب تک سو جا ہوا تھا جس پر حیرت انگیز طور پر ان دونوں میں سے کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔

چلو وہ تو غیر تھا پھر اسے کون سی سبین کی فکر تھی..... حیرت تو اسے ماں پہ ہو رہی تھی جو فقط چند روز پہلے آئے اجنبی کرایہ دار سے اس درجہ لگاؤ دکھانے لگی تھیں کہ اپنی ہی اولاد کو نظر انداز کیے جا رہی تھیں۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بقول سارہ کے یہ کاروبار کے چکر میں آیا ہے۔ اب پتا نہیں کاروبار کبھی رہا ہے یا بس یہیں گھر میں ڈیرے ڈال کر بیٹھا اس کی بھولی بھالی ماں کو بہکا رہا ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے ایسی چٹنی چڑی حرکتیں کر کے ان سے یہ گھر ہی ہتھیلے کے چکر میں ہو۔ اب آج کے نفسا نفسی کے دور میں بھلا کس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ کرایے دار تو یوں بھی قبضہ گروپ کے نام سے بدنام ہوتے ہیں۔ پتا نہیں انہیں کیسی، ایسی کہانیاں سنا

بس ہمارا سٹڈیٹ ہے۔ ہم پیسے کو اپنی مجبوری بنا لیتے ہیں۔ پیسے اہم ہوتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ انسان ان کے سامنے غلام بن جائے۔“ وہ بس یونہی بات برائے تبصرہ کرتا ساتھ ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

”اپنے منہ میں چاول ہوں تو دوسروں کی بھوک، بھوک نہیں لگتی ہے۔ کبھی اپنی زمینوں پہ کام کرتے غریب مزارعوں سے جا کر پوچھیے پیسے کی قدر و قیمت کیا ہے۔ جنہیں پیدا ہونے پر کانوں میں سکوں کی جھنجھاہٹ سنائی جائے وہ کیا جا میں چند ہزار کی تنخواہ کے لیے پورا مہینہ انتظار کرتے، بسوں کے دھکے کھاتے جوتی گھس جاتی ہے۔ بات کرتے ہیں پیسوں کی قدر و قیمت کی۔“ سین نے پچھلے دو گھنٹے کی بھڑاس ایک ہی وار میں ڈائریکٹ اس پہ نکالی تھی۔ وہ ایک نکل اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”سوری میں تو بس یونہی بات برائے بات کر رہا تھا۔ آپ نے اسے پرسنل لے لیا۔“ فی الفور معذرت کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑا لقمہ واپس واپس چھوڑ دیا تھا۔

”ایکسپوزی۔“ وہ اب خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ سین نے پاس بیٹھی ماں کی چھٹی نگاہیں خود پر محسوس کرتے ان کی طرف دیکھا۔ وہ شدید غصے میں اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ کندھے اچکائے سین میز پر بڑے برتن اٹھا کر سنک میں رکھنے لگی۔ وہ کچھ بھی کہے بناء مین سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

”یہ میں کیا سن رہی ہوں بھالی عدن اب شہر میں کاروبار کرے گا۔“ ان کی منہ نے بیٹھے ہی سوال داغا تھا۔

”شہر میں“ بھی“ کاروبار کرے گا۔ کہہ رہا ہے وہاں بڑا آفس کھولنا ہے۔“ مختصر لفظوں میں اسے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ وہ خود بھی تو بس اتنا ہی جانتی تھیں۔

”حد کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔ منع ہی نہیں کیا اسے۔ جانتے بھی ہیں اس شہر میں کتنے دھوکے باز لوگ رہتے ہیں۔ وہ تو جب پڑھنے گیا تھا تب بھی میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اب تو آپ کو اسے روکنا چاہیے تھا۔“

شکایت بھرے لہجے میں رازداری تھی۔

”تمہارا خون ہے۔ سرکشی تو رگوں میں دوڑتی ہے۔ تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے میری بات مانی ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو میں نے بھی کان میں ڈال دیا ہے۔ جلد ہی پاؤں میں شادی کی بیڑی ڈال دوں گی۔ بہو لے آؤں گی تو خود ہی یہاں دل لگ جائے گا صاحبزادے کا۔“ وہ بھلا خود کو ن سارا رضی تھیں۔ سب سے بڑا دھڑکا تو دل کو یہی تھا کہیں اتفاقاً ان سے ملاقات ہی نہ ہو جائے۔ درخت کٹ بھی جائیں تو جڑیں سلامت رہتی ہیں۔ کنٹی مشکل سے تو جان چھوٹی تھی۔ اپنی پریشانی میں بھی وہ عادتاً غلطی کا ملکہ سرال پہ ڈالنا نہ بھولی تھیں۔ البتہ ذومعنی سے انداز میں زیب التسا کے معصوم چہرے پہ نگاہ ڈالتے انہوں نے بڑے مان سے اپنی بات کہی تھی۔ سامنے بیٹھی زیب کے چہرے پہ کئی رنگ ایک ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ سر جھکائے اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا اور پھر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”مہما میں نانا جان سے مل کر آتی ہوں۔“ ماں نے سر ہلا کر اجازت دی تھی۔ کاسی پر عزم کرتا شلوار پہ بڑی سی چادر اوڑھے وہ ہمیشہ کی طرح سادہ پرنڈ کش لگ رہی تھی۔ اس پہ چہرے کی معصومیت اسے اور بھی حسین بناتی تھی۔

”شرما گئی۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے مسکرا کر تبصرہ کیا تھا۔ ملازم میز پہ چائے کے ساتھ لوازمات سجا رہا تھا۔

”آپ نے عدن سے زیب التسا کے حوالے سے بات کی؟“ اپنے چائے کے کپ میں شکر ملا تے اس نے بھانج کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”کہہ تو دیا۔ بھوپتی پسند کی لاؤں گی۔ اور بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا۔ پھر جب دادا کا حکم ہوگا تو چوں بھی نہیں کرے گا۔“ بڑے فخر سے انہوں نے بیٹی کی تابعداری اور اسے اختیارات کو سراہتے ہوئے اسے تفصیل بتائی تھی۔ سکون اس کے چہرے پہ بھی طواف کرنے لگا تھا۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ

ظلم..... مذمتِ الہی

اختیار ہونے کی صورت میں دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ کتاب و سنت میں اس کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔ بے شمار لوگوں کو اپنے ظلم کی بنا پر دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ بہت سے ظالموں کی بستیوں کو ان کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا۔

ظلم کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے کو بالکل پسند نہیں کرتا..... اور نہ ہی ظالموں کو نجات دے گا۔ قیامت کے روز ظالموں کا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار..... صابروں کو آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ ظالموں کو ڈھیل دے دیتا ہے۔ مگر جب کسی کا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یعنی ظلم کرنے والوں کے لیے دنیا میں بھی ہلاکت اور بربادی ہے اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

☆☆☆

ظلم کھلی گمراہی ہے اور گمراہی کا مطلب ہے اللہ کی راہ سے ہٹ جانا..... ظلم انسان کو راہِ حق سے بہت دور کر دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”کیا خوب دیکھنے، سننے والے ہوں گے اس دن جبکہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے لیکن آج تو یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (سورہ مریم) ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ

تمام حمد و ثناء اللہ رب العزت کے لیے ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ جو ہمارا خالق اور مالک ہے..... اور وہی لائقِ عبادت ہے۔

اللہ! تیرا نام ہے جو تیرے سوا کسی اور کے لیے نہیں، یہ صرف تیرے لیے ہی ہے۔ اللہ وہ ہے جسے روزِ ازل میں ہر روح نے مانا کہ تو ہمارا رب ہے۔ ہر کوئی تیرا طالب ہے اور تو اس کا مطلوب..... ہر بندے کی منزل تو ہی ہے۔ ہم تیرے ہیں اے میرے رب اور تو ہمارا ہے..... درمیان میں کچھ بھی نہیں..... تیرا نام اللہ کہنے سے دل سکون کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ جسے تو نے چاہا میرے رب اپنی معرفت سے مالا مال کر دیا۔

اے اللہ رحمت نازل فرما، اپنے پیارے حبیب سرور کو نبین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر..... درود و سلام ہو ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر..... ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر.....

ہمارا آج کا موضوع ظلم ہے..... ظلم کے لغوی معنی ہیں، ستم، بے انصافی، زبردستی، زیادتی یعنی کسی کے جائز حق کو اپنی طاقت یا اختیار کی بنا پر چھین لینا ظلم کہلاتا ہے۔ مطلب کسی چیز یا انسان کو اس کی جائز جگہ اور جائز حق سے محروم کرنا، عام لفظوں میں اس طرح کہ ٹوپی کا مقام سر ہے، اسے قدموں میں رکھنا ٹوپی کے ساتھ ظلم ہے۔ شریعت اسلامیہ میں ظلم، زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کسی کے ساتھ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کی جائے۔ اسلام میں امارت، قوت، سُلّی، برتری، حکومت، صاحب

ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (سورہ بقرہ)

ہدایت اسے ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اطاعت گزار ہو چونکہ ظالم اطاعت گزاری میں نہیں ہوتا اس لیے اسے ہدایت نہیں ملتی۔ ظلم گناہ ہے، ہدایت سراپائیکی ہے..... ظلم تاریکی ہے، ہدایت اجالا ہے، ظلم دوزخ میں لے جانے والا فعل ہے جبکہ ہدایت یافتہ لوگ اہل جنت ہیں۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے حقوق مقرر کیے ہیں۔

1۔ پہلا حق اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس خالق کائنات کی فرمانبرداری کی جائے۔

2۔ دوسرا حق۔ انسان کے جسم کا اپنا حق ہے کہ وہ اپنی جان کو اس راہ پر نہیں چلاتا بلکہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے۔

3۔ تیسرا حق دوسری مخلوق کا ہے۔ اگر انسان دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے تو وہ دوسرے کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔ دنیاوی معاملات میں عموماً تیسری قسم کا ظلم عام ہے جس سے دوسری مخلوقات کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ظلم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو آخرت میں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ حاکم وقت کی کرسی پر بیٹھ کر رعایا کے حقوق ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ انصاف کا ترازو ہاتھ میں لے کر انصاف نہ کرنا ظلم ہے۔ جانور رکھ کر ان کی خوراک کا بندوبست نہ کرنا ظلم ہے، نوکر رکھ کر ان کے ساتھ انسانی تقاضوں کے مطابق حقوق ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ ظالم کی فلاح نہ ہوگی۔ ان کو دین اور دنیا دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس گناہ کبیرہ سے بچنے کے لیے بہت تاکید فرمائی ہے اور ظلم کی مذمت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ہیں کہ ”جس نے اپنے بھائی پر ظلم کیا ہو، آبروریزی کر کے یا کسی اور طرح تو اس روز سے پہلے اس سے معاف کرا لے جبکہ اس کے پاس دینار ہوگا نہ درہم..... اگر اس کے پاس نیک اعمال ہوئے تو اس ظلم کے برابر اس سے لے لیے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ

لے کر اس پر ڈال دیے جائیں گے۔“

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ جب پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو تین باتوں کی تاکید فرمائی۔

(i) موت کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ اور باتوں کا دھیان نہ رہے۔

(ii) اللہ پاک کا خوب شکر کرو کہ اس سے نعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(iii) دعا کا خوب اہتمام کرو کیا جانے کب قبول ہو جائے..... اور تین باتوں سے منع فرمایا۔

(i) عہد مت توڑو اور نہ ہی نقص عہد میں کسی کا تعاون کرو۔

(ii) کسی پر ظلم کرنے سے بہت ہی بچو کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد فرماتے ہیں۔

(iii) مکرو فریب سے پرہیز رکھو کہ اس کا وبال اپنے اوپر ہی پڑتا ہے۔

ایک ظالم بادشاہ نے شاندار محل بنوایا۔ ایک مفلس بڑھیا آئی اس نے محل کے پہلو میں اپنی کنیا بنالی جس میں وہ سکون سے رہتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے محل کے ارد گرد چکر لگایا تو اسے بڑھیا کی کنیا نظر آئی۔ اس نے پوچھا۔ یہ کس کی ہے؟ بتایا کہ یہ ایک بڑھیا کی ہے جو اس میں رہتی ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس جھوپڑی کو گرا دو..... لہذا اس کے حکم پر غریب بڑھیا کی جھوپڑی گرا دی گئی۔ جب وہ بوڑھی عورت واپس آئی تو اس نے اپنی منہدم کنیا کو دیکھ کر پوچھا۔ اسے کس نے گرایا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اسے بادشاہ نے گرایا ہے۔ تب بڑھیا نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

اور کہا۔ ”اے اللہ! اگر میں یہاں حاضر نہیں تھی تو، تو کہاں تھا؟“ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ محل کو اس کے رہنے والوں پر الٹ دو..... اور ایسا ہی کیا گیا۔

ہوں کہ ہمیشہ خوف و امید میں رہوں۔“

☆☆☆

ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کا پیر کون ہے؟ آپؒ نے فرمایا کہ ایک بڑھیا ہے۔ پھر پوچھا وہ کیسے، کس طرح؟ آپؒ نے کہا ایک روز میں توحید اور شوق کے ایسے جوش میں تھا کہ کسی اور چیز کی گنجائش نہ رہ گئی تھی میں بہ خود ہو کر جنگل میں چلا گیا۔ وہاں ایک بڑھیا لی جو اپنے سر پر بو جھ لیے ہوئے آ رہی تھی۔ اس نے حضرت بایزیدؒ سے کہا کہ میرے وزن کو اٹھاؤ میں اس کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ میں خود کو نہیں اٹھا سکتا تھا، میں نے ایک شیر کی طرف اشارہ کیا وہ آیا میں نے وہ بو جھ شیر کی پشت پر رکھ دیا اور اس بڑھیا سے کہا جب تو شہر میں جائے تو اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھ کو نہ پہچانے۔ لیکن بڑھیا نے کہا کہ میں نے ایک ظالم اور ایک رعنا کو دیکھا۔ میں نے کہا وہ کس طرح..... بڑھیا نے کہا کہ اے بایزید.....! کیا یہ شیر مکلف ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا نہیں ہے۔ مست بڑھیا بولی کہ خدا نے تکلیف نہیں دی تو اس کو تکلیف دے رہا ہے۔ یہ ظلم نہیں ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے کہا بے شک یہ ظلم ہے۔ تب بڑھیا بولی۔ کہ باوجود اس ظلم کے چاہتا ہے کہ شہر کے لوگ جان جائیں کہ شیر بھی تیرے مطیع ہیں اور تو صاحب کرامت ہے کیا یہ رعنا نہیں ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا۔ میں تو بہ کرتا ہوں اس فعل سے اور اس بات کا حضرت بایزید بسطامیؒ پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

حضرت میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرے اور اس سے معافی نہ طلب کر سکے اس کا موقع ہاتھ سے نکل جائے تو اسے چاہیے کہ ہر نماز کے بعد مظلوم کے لیے استغفار کرے کیونکہ اس طرح سے وہ اس ظلم سے سبکدوش ہو جائے گا ان شاء اللہ.....

☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مینا ہوں کے دفتر تین قسم کے ہیں۔ ایک دفتر والوں کو وہ نہیں بخشے گا وہ

ایک دفعہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کو مینا ہی بولی گرفتار کر لیا۔ اور ان ہی میں سے کسی جابر و ظالم کو بھی نے آپؒ سے کہا کہ میرا ظلم بنا دیجیے۔ آپؒ نے فرمایا۔ میں ہرگز نہیں بنا سکتا..... اور جب ظلم نہ بنانے کی آپؒ سے وجہ پوچھی گئی تو آپؒ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ محشر میں فرشتوں سے کہا جائے گا کہ ظالموں کو ان کے معاونین کے ہمراہ اٹھاؤ، لہذا میں ایک ظالم کا معاون نہیں بن سکتا۔ کسریٰ نے اپنے بیٹے کے لیے ایک استاد مقرر کیا جو اسے تعلیم دیتا تھا اور ادب سکھاتا تھا۔ جب وہ بچہ مکمل طور پر علم و فضل سے بہرہ ور ہو گیا تو استاد نے اسے بلایا اور بغیر کسی جرم اور بغیر کسی سبب کے اسے انتہائی دردناک سزا دی۔

اس لڑکے نے استاد کے اس رویے کو بہت ہی برا سمجھا اور دل میں اس کی طرف سے عداوت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور باپ کے بعد وہ بادشاہ بن گیا..... بادشاہی سنبھالتے ہی اس نے استاد کو بلا کر پوچھا کہ آپؒ نے فلاں دن بغیر کسی جرم اور بغیر کسی سبب کے مجھے اتنی دردناک سزایوں دی تھی؟ استاد نے کہا..... اے بادشاہ.....! جب تو علم و فضل کے کمال تک پہنچ گیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ باپ کے بعد آپ ہی بادشاہ بنو گے لہذا میں نے سوچا کہ آپ کو سزا کا ذائقہ اور ظلم کی تکلیف موافق کر دوں تاکہ اس کے بعد آپ کسی پر ظلم نہ کرو..... بادشاہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے پھر اس نے اپنے استاد کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ان کے اخراجات کی ادائیگی کا حکم صادر کر دیا۔

☆☆☆

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے ظالم کی اس کے ظلم پر امداد کی یا اسے ایسی بات سکھائی جس سے وہ کسی مسلمان کا حق باطل کر سکے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا۔“

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اہل علم کا علم نہ سکھانا ظلم ہے۔ حضرت سید احمد کبیر رفاہیؒ کا ارشاد ہے کہ ”ظلم سے مراد خواہشات نفسانی کی اطاعت ہے میں تمہیں کہتا

ہو مگر ان کا حق نہیں لوٹا تا اور نہ ان سے ظلم دور کرتا ہے۔

2- قوم کا رہنما لوگ جس کی پیروی کریں وہ طاقتور اور کمزور کے درمیان فیصلہ نہیں کر سکتا اور خواہشات نفسانی کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔

3- گھر کا سربراہ جو اپنے گھر والوں اور اولاد کو اللہ کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا اور نہ ہی انہیں دینی امور کی تعلیم دیتا ہے۔

4- ایسا آدمی جو اجرت پر مزدور لا کر اس سے کام کروا کر اجرت نہیں دیتا۔

5- وہ آدمی جو اپنی بیوی کا حق مہر دیا کر اس سے زیادتی کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حقوق کو پیدا کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ باری تعالیٰ تو کس کا ساتھ دے گا..... اللہ نے فرمایا۔ میں مظلوم کے ساتھ ہوں تاکہ اسے اس کا حق دیا جائے۔

حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن ظالم آئے گا وہ پل صراط پر پہنچے گا تو مظلوم اس کے سامنے آجائے گا۔ مظلوم آکر اس سے اس کی تمام نیکیاں اس کے ظلم کے بدلے میں لے لیں گے..... اور اس کے ظلم کی بنا پر اس کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

☆☆☆

حضرت عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ایک ساحل پر رہنے والے اسرائیلی شخص نے سنا کہ ایک شخص پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ”دیکھو مجھے اور آگاہ ہو جاؤ میری حالت دیکھ کر پھر کسی پر ظلم نہ کرے۔“

اسرائیلی شخص نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا..... اے اللہ کے بندے! تیرا کیا معاملہ ہے اس شخص نے کہا..... میں ایک سہاٹی تھا ایک دن اس ساحل پر آیا تو میں نے ایک شخص کو مچھلی کا شکار کرتے دیکھا اس نے میرے سامنے ایک مچھلی پکڑی میں نے اس سے کہا کہ یہ مجھے دے، دے اس نے انکار کیا۔ میں نے کہا میرے ہاتھ فروخت کر دے اس نے اس بات سے بھی انکار کیا میں نے اس کے سر پر ایک کوڑا رسید کیا اور مچھلی

اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے۔ (اس کی ذات میں یا اس کی صفات میں جس نے بھی کسی دوسرے کو شریک کیا تو یہ سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ شرک ہے جس کی معافی نہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

دوسرے دفتر والوں کو اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا جنہوں نے بندوں پر ظلم کیا ہوگا یہاں تک کہ ایک کا دوسرے سے بدلہ لیا جائے گا، تیسرا وہ جس کی اللہ تعالیٰ کو پروا نہیں، وہ بندوں کا ظلم ہے۔ اور وہ بندوں اور اللہ کے درمیان ہے۔ بس یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ چاہے اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے درگزر کرے۔

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ظلم قیامت کے اندھیروں میں سے ایک ہے۔ جس نے ظلم سے ایک باشت بھر زمین حاصل کی اللہ تعالیٰ اس کے گلے میں ایسی سات زمینوں کا طوق بنا کر ڈالے گا۔“

حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد ہے کہ ”ظالم کے ظلم کے خوف سے کبھی سرخاب بھی گھونٹے میں مر جاتا ہے۔“

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حبشہ سے واپس آنے پر مہاجرین سے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے وہ بات بتاؤ جو تم نے وہاں دیکھی ہو..... حضرت قتیبہؓ نے کہا کہ میں عرض کرتا ہوں..... ہم

ایک روز وہاں بیٹھے تھے وہاں سے ایک بوڑھی عورت سر پر پانی کا گھڑا اٹھاے گزری اور ایک نوجوان نے اسے دھکا دیا۔ وہ گر پڑی اور اس کا گھڑا ٹوٹ گیا۔ وہ کہنے لگی کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدل کرے گا تو میرا اور تیرا وہ فیصلہ فرمائے گا..... تجھے تیرے غرور کی سزا ضرور ملے گی۔ اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیسے فلاح دے گا جو طاقتوروں سے کمزوروں کا بدلہ نہیں دلا سکتی؟“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ غضب ناک ہے، چاہے انہیں اپنے غضب کا نشانہ دنیا میں بنائے یا آخرت میں عذاب دے۔

1- قوم کا وہ حاکم جو رعایا سے اپنا حقوق حاصل کرتا

چھین لی اور اسے ہاتھ میں لٹکا لے کر لیے جا رہا تھا کہ
 اچانک اس مچھلی نے میرا انگوٹھا پکڑ لیا میں نے بہت چاہا
 کہ کسی طرح اپنا انگوٹھا چھڑا لوں مگر نہ ہوسکا..... میرے
 انگوٹھے میں مچھلی کے جتنے دانت تھے اتنے سوراخ ہو گئے
 اور میرا انگوٹھا سڑ گیا۔ میں نے طیب کو دکھایا تو اس نے کہا
 کہ یہ آکھ ہے اگر تو اپنا انگوٹھا کٹوائے گا نہیں تو ہلاک
 ہو جائے گا..... میں نے انگوٹھا کٹوا دیا..... تو پھر پھوڑا
 میری ہتھیلی میں ہو گیا..... اس طیب نے کہا ہتھیلی کٹوانی
 پڑے گی۔ میں نے ہتھیلی کٹوا دی پھر یہ پھوڑا کھائی میں
 ہو گیا۔ پھر کھائی بھی کٹوا دی تو یہ پھوڑا بازو میں ہو گیا جب
 میں نے یہ حالت دیکھی تو میں بھاگ لٹکا ایک دن میں اسی
 طرح چنچن پھر رہا تھا سانس ہی ایک درخت نظر آیا تو میں
 اس کے سائے میں جا کر بیٹھ گیا وہاں مجھ پر غنودگی سی
 طاری ہو گئی۔ خواب میں ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تو
 کب تک ایک، ایک کر کے اپنے اعضا کٹوائے گا حقدار کو
 اس کا حق پہنچا دے تب اس سے نجات پائے گا۔ مجھے فوراً
 حق والی بات سمجھ آ گئی کہ یہ ارشاد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف
 سے ہے۔ چنانچہ میں اس ساحل پر آیا تو دیکھا وہی شخص
 جال پھینکے بیٹھا ہے، جب اس نے جال کھینچا تو اس
 میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ میں اس کے قریب گیا اور
 کہا..... اے اللہ کے بندے میں تیرا غلام ہوں..... اس
 نے کہا تو کون ہے؟ تب میں نے بتایا کہ میں وہی سپاہی
 ہوں جس نے تمہارے سر پر کوڑا مارا تھا اور مچھلی تم سے
 چھین لی تھی۔ پھر میں نے اسے اپنا ہاتھ دکھایا جسے دیکھ کر
 اس نے اللہ کی بلا سے پناہ مانگی اور بولا میں نے تجھے
 معاف کیا۔ جیسے ہی اس نے یہ بات کہی میرے زخم سے
 کیڑے گرنے لگے۔ جب میں واپس آنے لگا تو اس نے
 مجھ سے کہا۔ ٹھہرو مجھ سے نا انصافی ہوئی کہ ایک مچھلی کے
 عوض میں نے تجھے بدو عادی اور وہ قول بھی ہو گئی..... پھر
 مجھے اپنے مکان پر لے گیا اور گھر جا کر اس نے دس ہزار
 درہم دیے اور کہا کہ اس سے اپنا گزارہ کرو اور پھر مزید دس
 ہزار درہم دیے کہ انہیں اپنے پڑوس کے اور قریب کے
 غریب غریبا میں تقسیم کر دو..... تب میں نے اس سے کہا کہ

خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دیں کہ آپ نے کیا کہہ کر بدو عادی
 تھی۔ اس نے کہا جب تو نے میرے سر پر کوڑا مارا اور مچھلی
 چھین لی تو میں آسمان کی طرف سر اٹھا کر رویا۔ اور
 کہا..... ”اے رب! تو نے اسے اور مجھے پیدا کیا اور اسے
 مجھ سے قوی بنایا اور مجھے کمزور بنایا۔ پھر اسے مجھ پر مسلط کیا
 نہ تو نے مجھے بیچا یا نہ مجھے اتنی طاقت دی کہ اس کے ظلم سے
 محفوظ رہتا اور اپنے آپ کو بچاتا..... میں تجھ سے سوال کرتا
 ہوں کہ تو اسے مخلوقات کے واسطے عبرت بنا دے۔“ (اللہ
 مظلوم کی بدو عا سے ہر ایک کا پانی پناہ میں رکھے، آمین)

☆☆☆

حضرت ابوسلیمان دارانی نے جب حج کا احرام
 باندھا تو تلبیہ کی ہمت نہ ہوئی حتیٰ کہ قافلہ ایک میل تک
 چلا گیا اور آپ کو کجاوے میں غشی آ گئی پھر افاقہ ہوا تو احمد
 بن ابی الجباریؒ جو آپ کے ساتھ تھے ان سے
 فرمایا..... اے احمد! اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ
 السلام کی طرف وحی فرمائی کہ نبی اسرائیل کے ظالموں
 سے کہہ دو کہ مجھے یاد نہ کیا کریں کیونکہ ان میں سے جو
 مجھے یاد کرتا ہے میں اس کو لعنت کرتا ہوں جب تک وہ
 مجھے یاد کرتا رہے..... اے احمد! افسوس ہم کیونکر مامون
 ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر لعنت نہیں کرتا حالانکہ ہم نے اپنے
 اوپر اور غیروں پر ظلم کیا ہے۔

☆☆☆

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جناب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا
 ہے کہ قسم ہے مجھ کو اپنے عزت و جلال کی میں جلد یا بدیر
 ظالم سے بدلہ ضرور لوں گا اس سے بھی بدلہ لوں گا جو باوجود
 قدرت کے مظلوم کی امداد نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب
 سے پوچھا کہ تم جانتے ہو مفسس کیا ہوتا ہے؟ صحابہ نے
 عرض کیا کہ ہم میں مفسس وہ کہلاتا ہے جس کے پاس مال و
 متاع نہ ہو..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”میری امت میں بڑا مفسس وہ ہے کہ قیامت کے دن نماز،
 روزہ، زکوٰۃ سب کو لے کر آئے لیکن اس کے ساتھ یہ ہے

☆☆☆

حرف آخر..... انتہائی نادم دل کے ساتھ اپنی تمام کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ میری ہر اس غلطی کو کوتاہی کو جو دانستہ یا نادانستہ اس مضمون کی تیاری میں ہو گئی ہو مجھے معاف کر دے..... مجھے معاف کر دے..... کہ وہ بہت معاف کرنے والا عظیم رب ہے۔

☆☆☆

ان تمام قابل احترام ہستیوں کے نام جن کی کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے..... آمین۔

- 1- مکاشفۃ القلوب..... حضرت امام محمد الغزالی
- 2- اسوۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب
- 3- کرامات اولیاء..... حضرت امام عبد اللہ یافعی
- 4- تزکیۃ القلوب..... علامہ عالم فقری
- 5- بہشتی زیور..... علامہ عالم فقری
- 6- اسلامی تربیتی نصاب..... پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب، جلد دوم

☆☆☆

کہ تو برا بھلا بھائی تو بہت لکھی۔ اس کا نام کھالیا۔ کسی کا خون کیا کسی کو مارا..... بس اس کی کچھ نیکیاں ایک کول گئیں اور کچھ دوسرے کول گئیں اور اگر ان کے حقوق کے بدلے ادا ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں تو ان حق داروں کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔“ اللہ کبر..... حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا قول ہے کہ بعض اوقات انسان زمانے کے شقیب و فراز اور اپنے برے حالات سے تنگ آکر اللہ تعالیٰ کے خلاف اظہارِ ناخوشی کرتا ہے اور اپنی مصیبت و پریشانی رنج و اضطراب میں ظلم و زیادتی کو اس عظیم رب کی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے جو کہ انتہائی غلط بات ہے۔ اس کی دعاؤں، التجاؤں اور حاجت روائی میں تاخیر ہو جائے تو یقیناً اس میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ اپنے بندوں پر رحم و کرم فرماتا ہے۔ ذرہ برابر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔“ بندوں پر جو بھی عذاب آتا ہے وہ ان کی اپنی ہی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظالم ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کے ظلم سے محفوظ رکھے ہمارے ہاتھ سے زبان سے، ہمارے تمام اعضا سے کسی کی ذات کو کوئی تکلیف یا دکھ نہ پہنچے..... اور وہ ہمارے نامہ اعمال میں ظلم کے طور پر لکھ لیا جائے اللہ ہمیں اس سے

جند باتیں بہنوں کے ساتھ

سب سے پہلے ساجدہ ظفر کمالیہ سے..... پیاری بہن آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں نے آپ کو فراموش کر دیا..... ایسا نہیں مجھے اپنی تمام باتیں ان کے تہے ان کے نام سب بہت عزیز ہیں ہاں نادانگی میں اگر کوئی نام رہ جائے تو قطعاً ایسا نہیں کہ میں بھول گئی۔ کب لوگ تو میرے دل میں رہتے ہیں اور یہ سب آپ کی دعائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ کام لے رہا ہے۔

محترمہ اسما شاہد، ثریا فرخ، فرخندہ جعفری، تسنیم کوثر، فریدہ ہاشمی اور سلسلی غزل آپ تمام بہنوں کا

بہت شکریہ..... جزاک اللہ..... آسیہ عامر آپ کی بات نوٹ کر لی گئی ہے۔ ان شاء اللہ، اللہ کے کرم سے پورا کرنے کی کوشش کروں گی..... اور وہ تمام بہنیں جو بیمار ہیں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو شفاء کا ملہ عطا فرمائے، آمین..... خصوصی طور پر دعا گو ہوں اپنی پیاری بہن یاسمین رشید کے لیے اللہ تعالیٰ ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

نزہت آپ کے لیے اور عذرا جی کے لیے ڈھیروں، ڈھیروں دعائیں اللہ آپ کو سلامت رکھے، آمین..... امی آمین۔

معاشرتی موضوعات پر کبھی شگفتگی تو کبھی سُندی قلم چلاتی
ہماری مایہ ناز قلم کار و کامیاب ڈراما نگار

شگفتہ بھٹی

سے دل خوش کُن ملاقات



سوچا اپنے باذوق قارئین کے لیے شگفتہ گفتگو و مچ لطف
خیالات کی مالک اور زندگی کے حقائق پر روانی سے قلم
چلانے والی ہستی سے خصوصی ملاقات کی جائے بلکہ ان کی
خوش بیانی سے اپنے قارئین کو بھی مستفید کیا جائے۔ جیسی

عزیز بہنو! غلوں دعاؤں کے نذرانے لیے ایک
مرتبہ پھر آپ کی بزم میں حاضر ہیں۔ چناب موسم بہاراں
کی آمد ہو چکی ہے ایسے میں ہر کوئی خوشگواریت اور شگفتہ
مزاجی کے پیرائے میں ڈھلا نظر آ رہا ہے۔ ہم نے بھی

ہم نے پاکیزہ کی دیرینہ دوست، نامور قلم کار اور ڈراما نگار شگفتہ بھٹی سے دل خوش کن اور گفتگو سے پر بات چیت کا اہتمام کر ڈالا تو انہیں بہنو! آپ کی پسندیدہ لکھاری سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

☆☆☆

پاکیزہ: شگفتہ سے لب و لہجہ کی مالک شگفتہ بھٹی آپ کو ہم اس بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کیا لگ رہا ہے یہاں آنا.....؟
شگفتہ بھٹی: پاکیزہ کی محفل میں آنا بے حد اچھا لگ رہا ہے۔

پاکیزہ: ہاں اپنوں میں آکر تو اچھا ہی لگتا ہے مگر اب کے وقفہ کچھ زیادہ ہو گیا اس کی کوئی خاص وجہ؟
شگفتہ بھٹی: آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس بار میں ایک طویل عرصے بعد پاکیزہ کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں، دراصل افسانہ اور ناول لکھنے مجھے بہت وقت ہو گیا۔ چھوٹی موٹی تحریریں تو دھر دھر لکھتی رہتی ہوں مگر ناول بہت نظر انداز ہو رہا ہے اس کی وجہ کچھ تو میری طویل بیماری رہی پھر گھر بٹو ڈنٹے داریاں اور ڈرامے لکھنے کی مصروفیت..... ان سب کی وجہ سے پرنٹ میڈیا سے دوری واقعی طویل ہو گئی۔ (جی ہاں اسی لیے تو یہ موقع فراہم کیا ہے)

پاکیزہ: شگفتہ آپ کو معلوم ہے پاکیزہ کی اس بزم میں سوالات کا سلسلہ ذرا الگ نوعیت کا ہے آپ تیار ہیں ناں.....؟

شگفتہ بھٹی: پاکیزہ کے منفرد سوالات کے جوابات کے لیے میں دل تھام کر تیار ہوں۔ (شکریہ، نوازش)

پاکیزہ: اللہ آپ کو صحت سے رکھے، اچھا یہ بتائیں ماہنامہ پاکیزہ سے آپ کی وابستگی پرانی ہے کچھ پہلی آمد کا احوال بتائیں گی کہ کب دوستی کا یہ رشتہ استوار ہوا؟

شگفتہ بھٹی: پاکیزہ پڑھنے کا سلسلہ تو لڑکپن سے شروع ہوا۔ اسکول کے زمانے میں جب نیم، دہم کا دور تھا تو سہیلیاں مل کر ایک ہی رسالے کی ایک ہی کہانی کو

یوں نظر کر جھا کر پڑھتی تھیں کہ صفحات بھی ایک ساتھ ہی پلٹے جاتے تھے تیزی سے پڑھ لینے والی سہیلیاں بے چینی سے باتوں کو گھوڑتی تھیں کہ جلدی سے صفحہ پلٹو۔ پاکیزہ کے ساتھ بہت حسین یادیں وابستہ ہیں اور میرا پہلا افسانہ جو پاکیزہ میں چھپا وہ 1988ء کا دور تھا اور تب ہر چھپنے والا افسانہ سمجھیں خود کو ایک فیشن میں لے جاتا تھا اور کئی دنوں تک دل و دماغ ایک لطف و سرور کی کیفیت میں رہتے تھے۔ (اچھا، بہت خوب)

پاکیزہ: اچھا پہلے اپنے اس شوق کے آغاز کا تھوڑا حال بتائیں کہ اس لکھنے کی صلاحیت کو کیسے دریافت کیا؟

شگفتہ بھٹی: لکھنے کا آغاز بچپن سے بچوں کی کہانیاں پڑھتے، پڑھتے ہی ہوا۔ جب نئی کلاس میں آکر نیا تعلیمی کورس ہاتھ میں آتا تو میری فیورٹ کتاب اردو کی کتاب ہوتی تھی جو میں ساری کی ساری ایک ہی دن میں پڑھ لیتی تھی۔ میری اردو بہت شاندار تھی اور اس میں میری امی جان کی محنت کا کمال تھا جو مجھے پڑھنے اور لکھنے کی مشقیں بار بار کرواتی تھیں۔ پہلی کہانی میں نے اپنے اردو



شگفتہ بھٹی اپنے شریک سفر بابر شہزاد کے ہمراہ

لکھی۔" اتفاق میں برکت" یہ وہ کہانی تھی جو میں نے کورس کی کتاب سے یاد کر کے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے سوچ کر لکھی تھی اور اس پر مجھے اپنی لپچر سے پہلے ڈانٹ اور پھر انعام ملا تھا اس کے بعد اردو کی کہانی یا مضمون سلیبس سے یاد کر کے کبھی نہیں لکھا ہمیشہ خود سوچ کر نئی طرز پر لکھا۔ بچوں کی کہانیاں جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو بچوں کے جنگ میں چھپنا شروع ہوئیں اور پھر نو نہال، بچوں کا باغ اور تعلیم و تربیت میں چھٹی رہیں۔ پھول میں تو کچھ عرصہ پہلے تک تھکتی رہی۔ ڈائجسٹ میں افسانے کا آغاز 1986ء سے ہوا۔ (ماشاء اللہ بہت خوب۔ تربیت کی سیڑھی درجہ بدرجہ طے کی)

پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ آپ کے مطالعے اور مشاہدے میں زیادہ تر کیسے موضوعات ہوتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر، دیکھ کر آپ کے اندر خود کچھ لکھنے کی تحریک زور پکڑنے لگتی ہے؟

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ میرے مطالعے میں زیادہ تر اسلامی لٹریچر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ادب میں بھی میں اصلاحی ادب کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگرچہ مجھے منلو، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، بانو قدیر، اشفاق احمد، اسرار بزم، عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور بھی بہت پسند ہیں۔ مگر میں ادب برائے زندگی اور زندگی برائے زندگی کی قائل ہوں۔۔۔۔۔ میرے موضوعات زیادہ تر چادر اور چادر دیواری سے جڑے مسائل ہیں اور میرے لکھنے کی تحریک بھی ایمان، محبت اور خاندان کی کہانیوں سے ہی زور پکڑتی ہے۔

پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ رائٹر یا شاعر پیدا کی ہوتا ہے، اس بات سے کس حد تک متفق ہیں؟

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ رائٹر یا شاعر پیدائشی ہوتا ہے۔ میں اس سے سو فیصد متفق ہوں۔۔۔۔۔ ہر بچے کو اللہ کچھ صلاحیتیں پیدائشی طور پر ودیعت کرتا ہے۔ اور لکھنے کی صلاحیت ازلی نعمت ہے بس وقت اور حالات کے ساتھ یہ پرورش پاتی اور نکھرتی جاتی ہے۔ (بالکل درست۔۔۔۔۔ صلاحیت اور رجحان کے بغیر کسی شعبے میں ترقی ممکن نہیں) پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ نامور، کامیاب، مقبول عام ادیب،

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ کوئی شاعر، ادیب یا مصنف تبھی بام عروج پر پہنچتا ہے جب وہ اپنی اس خدا داد صلاحیت کو پورے اخلاص سے ایک اہم فریضہ سمجھ کر اصلاح معاشرہ کے لیے انجام دے۔۔۔۔۔ اور وہ لکھے جو ہر ایک کے دل کو چھو کر اس کے درد پر ہم کی طرح لگے۔۔۔۔۔ ویسے مسلسل اور انتھک محنت اور مستقل مزاجی سے اور شہرت کی خواہش سے مبرا ہو کر لکھنے والا لازمی بام عروج کو پہنچتا ہے۔ مقصدیت کے بغیر محض ذہنی تفریح اور عیاشی فراہم کرنے والی تحریریں اور مصنف جلدی گناہم ہو جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ آپ نے افسانوں سے آغاز کیا پھر ڈراما نگاری کی طرف کیسے آئیں؟

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ ڈراما نگاری کی طرف مجھے میرے ناول ہی لائے۔ ایک مشہور پروڈیوسر نے میرے ایک ناول کو پڑھا اور مجھ سے رابطہ کیا۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے لگا کہ الیکٹرک میڈیا یعنی ٹی وی چینل سے بھی اپنا پیغام موثر طریقے سے معاشرے تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ آج کا دور تو لگتا ہے اسکرپٹ رائٹنگ کا ہے۔ کیا ہر ادیب، مصنف اس صلاحیت سے بھی مالا مال ہوتا ہے یا یہ زبردستی اختیار کرتا ہے؟

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ بلاشبہ یہ۔۔۔۔۔ اسکرپٹ رائٹنگ کا دور ہے لیکن اسکرپٹ لکھنا بھی ایسے ہی ہے جیسے ایک معیاری افسانہ یا ناول لکھنا۔۔۔۔۔ البتہ اسکرپٹ رائٹنگ کی ایک خاص تکنیک ہے جسے بہر حال سمجھنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے بھی یہ تکنیک سمجھنے میں تھوڑا بہت وقت لگا تھا لیکن ہاں سیکھنے سے اسکرپٹ لکھنا آ جاتا ہے۔ البتہ اسے زبردستی اختیار کرنے سے معیار تو نہیں بن سکتا۔ (جی ہاں درست کہا، ہر شعبے کے اپنے فن اے ہوتے ہیں)

پاکیزہ ✦۔۔۔۔۔ بیس چھپس سال پہلے کا ڈائجسٹ ادب اور آج کے پاپولر فکشن میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

گفتہ بھٹی ✦۔۔۔۔۔ بیس چھپس سال پہلے کے اور آج کے ڈائجسٹ ادب میں وہی فرق ہے جو خدا داد صلاحیت رکھنے والے مقصدی اور اصلاحی ادب لکھنے والوں اور



رائٹر شگفتہ بھٹی بڑے فسرز نذہد حسین کے ساتھ

راشز کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ معذرت کے ساتھ کہوں گی، آج شوق اور شہرت کی خاطر لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔۔۔۔۔ اس لیے کہانی میں حقیقت کم اور فکشن زیادہ ہے۔۔۔۔۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ اسلام اور دین کو بھی فکشن بنا کر محض اپنے نام کی انفرادیت کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ (بڑی گہری بات کہہ دی شگفتہ)

پاکیزہ ♣۔۔۔۔۔ کہتے ہیں خواتین ہی خواتین کے مسائل سمجھ سکتی ہیں، جمی آج خواتین ڈراما نگاران کی بہتات ہے اور زیادہ تر گھریلو رشتوں کے مابین تعلقات کو زیرِ قلم لایا جا رہا ہے۔ کیا یہ محدود طرزِ فکر نہیں؟

ہمارے ٹی وی چینلوں کو تو صرف اور صرف یا تو روتی چٹتی عورت پر کہانی چاہیے یا پھر رونے اور برباد کر کے گھر اجاڑ دینے والی عورت پر۔۔۔۔۔ باقی سب آئیڈیاز اور کہانیوں کو تو آج کے چینلوں کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ بھی آج کسی کو اصلاح معاشرہ کی ضرورت نہیں بلکہ ریٹنگ کے ہائی گراف کی ضرورت ہے۔ (یہی تو رونا ہے، اسی مادیت پرستی نے کیا ان کے اپنے گھروں کے ماحول اور تربیت کو متاثر نہیں کیا ہوگا)

پاکیزہ ♣۔۔۔۔۔ اچھا سنجیدہ گفتگو تو چلتی رہے گی، یہ کچھ ضروری امور تھے جن کے متعلق پوچھا گیا۔ اب یہ بتائیں کہ دورِ حاضر میں اور مستقبل میں بھی ان ڈائجسٹ رائٹرز اور پاپولریشن لکھنے والوں کو کیا مقام ہے؟

شگفتہ بھٹی ♣۔۔۔۔۔ دورِ حاضر میں جو لوگ معیاری کام کر رہے ہیں ان کا معاشرے میں اور اپنے مداحوں کے دلوں میں بہت بلند مقام ہے۔۔۔۔۔ باقی جو بحث عرصہ دراز سے ڈائجسٹ رائٹر اور ایک ادبی لکھاری

شگفتہ بھٹی ♣۔۔۔۔۔ خواتین رائٹرز کی تعداد واقعی ماشاء اللہ ڈراما نگاری میں بڑھ گئی ہے مگر افسوس کہ خواتین اب خواتین کے حقیقی مسائل کو اجاگر کرنے کے بجائے ان کے منفی کردار کو پردہ اسکرین پر زیادہ دکھا رہی ہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ طرزِ فکر محدود ہے بھی تو سانس، بہو، ظالم نند، اور جاہل مردوں کے گرد ہی ہر کہانی گھومے جا رہی ہے۔ (یہی تو افسوس ہوتا ہے، تنگ نظری اور غلط فہمی شوٹا میں گھری خواتین کو مزید جہالت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے)

پاکیزہ ♣۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جس طرح وسیع کیوس براجمد اسلام احمد، اصغر ندیم سید، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ نے اسکرپٹ رائٹنگ کی۔ اب اس ہنر کا فقدان ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

شگفتہ بھٹی ♣۔۔۔۔۔ کاش پھر سے ان نامور لکھاریوں جیسا لکھنے کی اجازت ہمیں۔۔۔۔۔ مطلب آج کے ڈراما نگار کو بھی چینلوں مالکان اور ارباب اختیار دے دیں۔ مگر افسوس

کے مقام کی پہلی آڑی ہے وہ ہونڈ وہیں ٹھری ہے
 کہ (معذرت کے ساتھ) ادبی رسالوں میں بے ادب
 اور غیر معیاری کہانیاں لکھنے والے آج بھی ڈائجسٹ کے
 بہترین لکھاریوں کو لکھاری ہی نہیں مانتے اور میرے خیال
 میں یہ محض ان کے دماغ کا فتور ہے اور کچھ نہیں..... (خود
 پرستی اور خود ستائی کے بجائے خود سازی پیدا ہو جائے تو
 آفاقی ادب تخلیق پاتا ہے)

پاکیزہ..... آج کل مختصر کہانیاں انٹرنیٹ پر دی
 جاری ہیں اور اسٹریز کی ایک بڑی کھپ جلدی، جلدی تیار
 کی جارہی ہے یہ رجحان کیسا ہے؟

گفتہ بھٹی..... مختصر کہانیاں انٹرنیٹ پر لکھنے
 والوں کی جتنی جلدی، جلدی کھپ تیار کر کے ان سے جو
 کام کروایا جا رہا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پانی کا بلبلہ
 بڑا ہو کر تیزی سے آسمان کی طرف اڑتا ہے مگر چند لمحوں کی
 اڑان کے بعد پھٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ..... کیا صرف کہانیاں لکھ کر حق ادب، حق
 تحریر ادا ہو سکتا ہے؟

گفتہ بھٹی..... بالکل کہانی کار اچھی، معیاری
 اور سبق آموز کہانیاں لکھ کر حق ادب ادا کر سکتا ہے۔ وہ
 لوگوں کے ذہن کی منفی سوچوں کو، مثبت سوچوں اور
 رویوں کو محبت میں بدل دے تو یہ ایک جہادی کام ہے۔
 (جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ..... میرا مطلب ہے جیسے گفتگو میں تاثیر
 جب ہی آتی ہے جب بولنے والا باعمل اور اعلیٰ کردار کا ہو
 اسی طرح کا معاملہ مصنف کے ساتھ بھی ہوتا ہے یا
 نہیں..... بس محض لکھ دیا جیسی تو ہر تحریر میں وہ گہرائی و
 گیرائی نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کو ایک دم سوچنے پر مجبور
 کر دے..... آپ کیا کہیں گی اس بارے میں.....؟

گفتہ بھٹی..... جی میں آپ کے مطلب سے سو
 فیصد متفق ہوں کیونکہ بنا عمل کے محض الفاظ تاثیر نہیں رکھ
 سکتے..... جی تو آج کل دن اور فلسفے پر بہت گہری کہانیوں
 کے راسخ زندگی جی محض زندگی لوگوں کے سامنے آئی ہے تو وہ
 اس کہانی اور کہانی کا رد و نوں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور
 یہ افسوس ناک صورت حال ہے۔ (جی ہے تو..... اگر سمجھ

آجائے)

پاکیزہ..... آج جب کوئی تحریر منظر عام پر آنے
 سے پہلے ہی اس کا لکھنے والا چاہے وہ نو آموز ہی ہو
 مشاہرے اور اعزازے پر بات کرنے لگتا ہے تو کچھ عجیب
 لگتا ہے، آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

گفتہ بھٹی..... مشاہرے یا اعزازے یا سال
 کے بہترین ایوارڈ کے حصول کے لیے لکھنے والوں کو وقتی
 طور پر یہ سب نصیب بھی ہو جاتا ہے مگر دائمی عزت ہمیشہ
 بے لوث اور بے غرض لوگوں کو ملتی ہے جو لکھنے کو پرورش
 سے زیادہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

پاکیزہ..... آپ کی بات کسی حد تک درست مگر وہ
 جو William Wordsworth نے کہا تھا ناں کہ
 ادیب یا شاعر کا اظہار کیا ہے؟ spontaneous
 overflow of powerful feelings
 صلاحیتیں اپنا اظہار تو چاہتی ہی ہیں اور اپنے آپ کو خود
 منواتی ہیں۔ آپ کے اندر کا ہنر خود بولتا ہے.....
 انعامات، اعزازات، بخششیں اور استاد لوگ عطا کرتے
 ہیں، آپ کے ٹیلنٹ کو دیکھ کر..... کس حد تک یہ بات
 درست ہے؟

گفتہ بھٹی..... ہمارے یہاں اعزازات مانگنے
 والے اور ایسوں کو جان بوجھ کر دوسروں کا حق مار کے دینے
 والے بہت ہیں..... اب ان معاملات میں بھی غرض اور
 ذاتی تعلقات و معاملات کا بہت عمل دخل ہے لیکن.....
 اقامت جو ایک بات حق رہے گی، وہ ہے..... اللہ جسے چاہے
 عزت دے اور عزت اسی کو دیتا ہے جو اس کا حق دار
 ہے۔ (واہ کیا بات کی ہے بہت خوب)

پاکیزہ..... اچھا کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے
 میں بھی بتائیں، کہانیاں تو آپ نے خوب لکھیں۔ لپٹی
 زندگی کی کہانی کے بارے میں بتائیں آپ کے اس کلمہ
 کاغذ کے شوق نے گھر والوں اور ارد گرد کے لوگوں سے
 کس حد تک پریرانی پائی؟

گفتہ بھٹی..... ذاتی زندگی الحمد للہ بہت اچھی
 ہے..... خوشی اور غم کے فاصلے کو اللہ نے مناسب اور
 مزے دار رکھا ہوا ہے..... کبھی تلخ کبھی شیریں..... جہاں



چھوٹا بیٹا محمد زید

افزائی اور اعتماد آپ کو کامیابی کی سبز چھٹیوں پر ڈمگائے نہیں دیتا آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

ٹکلفتہ بھٹی ❖..... جی ڈمگاتے قدموں کو گھر سے ایک سنبھالنے والا ضرور ہوتا ہے جیسے مجھے میری امی حوصلہ نہ دیتیں تو شاید میں بھی آج ٹکلفتہ بھٹی نہ ہوتی۔ (ٹکلفتہ بھٹی تو ہوتیں پر کامیاب قلم کار و نامور مصنفہ کے ساتھ نہیں لگے ہوتے)

پاکیزہ ❖..... اب تک کے ادبی کارنامے کتابی شکل میں بھی آئے؟

ٹکلفتہ بھٹی ❖..... میرے دس ناول کتابی شکل میں موجود ہیں..... مزید ان شاء اللہ جلد منظر عام پر آئیں گے۔ (مبارکال)

پاکیزہ ❖..... آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ گھریلو زندگی کو ان مصروفیات کے ساتھ کس طرح نبھاتی ہیں؟

ٹکلفتہ بھٹی ❖..... آج کل بچوں کے ادب پر کام کرنے کا ارادہ ہے جسے اللہ کرے جلدی انجام تک لے آؤں..... باقی گھر، بچوں اور خاندان کی ذمہ داریاں ہیں جنہیں نبھانے کے لیے لکھنے کو بہت قربان کرنا پڑتا ہے اکثر ہفتوں اور مہینوں پر ایثار چٹا رہتا ہے۔ (جی یہ ایثار تو اکثر چلتا ہے۔)

پاکیزہ ❖..... اپنی فیملی کا مختصر تعارف بھی ضرور کروائیں؟

ٹکلفتہ بھٹی ❖..... میرے شوہر بابر شہزاد کیمیکل

بیٹی فاطمہ

لکھاری کے طور پر گھر اور خاندان سے پزیرائی کا معاملہ ہے تو یہاں بھی گھر کی مرغی دال برابر ہے..... باقی تو کبھی کسی نے خاص حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک میری امی جان تھیں جو میری ہر تحریر پر کٹ کر سنبھال لیتیں اور میرے ہر انعام کو سچا کر رکھتی تھیں اور اب میرے بچے الحمد للہ میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ (ارے ہاں یہ تو ہوتا ہی ہے خیر..... مگر وہی لوگ چپکے، چپکے خوش بھی ہوتے ہیں بس اظہار نہیں کرتے اور جو بدخواہ ہوتے ہیں تو ان کے عمل سے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے)

پاکیزہ ❖..... ویسے آج بھی ذرا مشکل سے ہی قبول کیا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ ارے لڑکی تو افسانوں کہانیوں کی باتیں کرتی ہے، زندگی کی حقیقتوں سے دور ہوگی..... کیوں ایسا نہیں ہے کیا؟

ٹکلفتہ بھٹی ❖..... جی ایسا آج بھی ہوتا ہوگا مگر پہلے کے معاملے کی نسبت بہت کم..... کیونکہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو میری امی کو بہت طعنے سننے پڑے بہت سی ناراضیاں کو سہنا پڑا تھا لیکن انہوں نے مجھے تب بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا تو آج بھی جہاں چراغ بجھانے والی پھونکیں ہوتی ہیں وہیں ایک ہاتھ بار بار اس چراغ کو جلاتے ہیں بھی مصروف رہتا ہے۔ (یہی تو وہ حوصلہ اور مدد ہوتی ہے۔ جو کامیابی کے زینے پر چڑھنے میں مددگار ہوتی ہے، بس ہمت نہیں ہارنی چاہیے)

پاکیزہ ❖..... اصل میں گھر والوں کی ہی حوصلہ

اجتہاد میں مگر جاب کسی اور شعبے میں کر رہے ہیں۔ بچوں میں..... بڑا بیٹا فہد حسین میڈیا سائنسز میں BS نائل ایئر میں ہے۔ پھر بیٹی فاطمہ ہے فیشن ڈیزائننگ BS کے تھرڈ سمسٹر میں اور پھر بیٹا محمد زید..... ایف ایس سی سینٹر ایئر میں..... امی اللہ کو چاری ہوئیں..... ابو کو اللہ صحت و سلامتی دے..... ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں ماشاء اللہ..... (اللہ آپ دونوں کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ اکی آمین)

پاکیزہ ♦..... آپ کے بچوں میں یہ صلاحیت کس حد تک آئی؟

گفتہ بھئی ♦..... میرے دونوں بیٹوں میں لکھنے کی صلاحیت الحمد للہ موجود ہے بڑا بیٹا فہد تو ماشاء اللہ اسکرپٹ رائٹنگ کر رہا ہے۔ اس کا رجحان قلم کی طرف زیادہ ہے اور دیب سیریز لکھ رہا ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ♦..... نئی نسل کی تربیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ آج کی ماؤں کو بے حد ٹکھن مراحل کا سامنا ہے، کچھ گائڈ کریں؟

گفتہ بھئی ♦..... آج کی ماں بچوں کی تربیت کے معاملے میں غیر سنجیدہ ہے۔ درنگ و دمن ہے تب بھی اور ہاؤس وائف ہے تب بھی..... ہر کام جانفشانی سے تو کر رہی ہے، بچوں کی ضرورتوں کو اہمیت دیتی ہے لیکن تربیت کو نہیں..... اور اسی وجہ سے بچوں کے ذہنی اور معاشرتی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ میرا ماؤں کو پیغام ہے..... بچوں کی تربیت کو اولین ترجیح دیں، ان پر محنت کریں..... یہی ہماری دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہیں۔ بلاشبہ بہت ٹکھن کام ہے مگر اسے ہر حال میں ان کے پورے حقوق سے آگاہ ہونا چاہیے اور انہیں ادا کرنا چاہیے۔ (بالکل درست کہا..... دعا ہے کہ آج کی ماں ہم سمیت اپنی اس سب سے بڑی ذمہ داری کو عبادت سمجھ کر بہ احسن پورا کرے، آمین)

پاکیزہ ♦..... اچھا اپنی پسند ناپسند سے بھی ہمارے بڑھنے والوں کو آگاہ کریں؟ من پسند لباس، خوشبو، ذائقہ، تفریحی مقام کھانا، جملہ، رشتہ، وقت، شخصیت، تہوار اور ادیب یا دیہ بھی.....؟

گفتہ بھئی ♦..... من پسند لباس شلوار میس دوپٹا..... خوشبو پھولوں میں چنبیلی، موتیا اور پرنیوم چارلی..... ذائقہ نمکین، تفریحی مقام، اسلام آباد..... کھانا..... پلاؤ اور شامی کباب، سردیوں میں ساگ، ویسے کچھ بھی ناپسند نہیں..... رشتہ ماں کا..... پہلے اچی ماں اچی لگتی تھی اب خود ماں ہونا اچھا لگتا ہے۔ وقت شام کا..... تہوار، دونوں عیدیں، شخصیت پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... ادیب، ممتاز مفتی..... ادیبہ بانو قدسیہ۔

پاکیزہ ♦..... بہترین زندگی گزارنے کے تین کامیاب نسخے؟

گفتہ بھئی ♦..... ایثار، محبت اور شکر گزاری۔

پاکیزہ ♦..... کیا ہم ارد گرد کے سب لوگوں کو بیک وقت خوش رکھ سکتے ہیں، ہاں تو کیسے؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

گفتہ بھئی ♦..... سب کو بیک وقت خوش رکھنا مشکل ہے مگر کوشش کرتے رہنا چاہیے اور بہترین طریقہ درگزر اور حسد سے دل پاک رکھنا ہے اور سب سے ضروری کام ہے جو آپ سے ناراض ہے اسے منانے میں پہل کر لیں۔ (جی ہاں کہا تو درست ہے مگر انا کا بھاری بھر کم پہاڑ کیسے سر کیا جائے)

پاکیزہ ♦..... آپ نے اپنی تحریروں میں کن نکات کو، کن اصلاحی پہلو یا تفریحی پہلوؤں کو مد نظر رکھا؟

گفتہ بھئی ♦..... میری تحریروں میں عورت کو اپنے حقوق کے ساتھ فرائض کی یاد دہانی ہے اور گھر کو اجاڑنے کے بجائے بسائے رکھنے کی تلقین..... کیونکہ عورت اگر اچھی اور باعمل ہو تو گھر، خاندان اور اگلی نسلیں تک سنور جاتی ہیں۔ مگر مضبوط ہوں تو معاشرہ مستحکم ہوتا ہے، ان سب کی بنیاد عورت کے کردار اور عمل پر منحصر ہے اور میری کہانی میں تفریح طبع کے ساتھ یہی سبق ملتا ہے..... بس کوشش کرتی ہوں ویسے کوئی ناخوش نہیں ہوں خود میں ہزار کہیاں، کوتاہیاں رکھتی ہوں۔ (وہ تو ہر شخص میں ہوتی ہیں مگر گفتہ اپنا کام تو کرتے رہنا چاہیے ناں)

پاکیزہ ♦..... زیادہ لطف کس میں آیا..... افسانہ، ناول یا اب ڈراما نگاری میں؟



شگفتہ بھٹی ❖ زیادہ
لطف ہمیشہ ناول لکھنے میں آیا۔
وہاں چینل کی پالیسی اور مرضی
آڑے نہیں آتی۔ (بس جلدی
سے اب یہ لطف لے ہی لیں)
پاکیزہ ❖ قاری کا
معیار مطالعہ کیا ہوتا ہے؟ کیا
ادیب بناتا ہے، ماحول بناتا ہے یا
معاشرتی اقدار؟
شگفتہ بھٹی ❖ قاری کا

شگفتہ بھٹی اور بابر شہزاد اصفہان (ایران) کی سیر کرتے ہوئے

کوئی مشورہ، تنقید، تحریف، کوئی پیام سلام؟
شگفتہ بھٹی ❖ پاکیزہ کی یہ بزم بہت منفرد اور
پیاری لگی، یہ سلسلہ جاری رہتا چاہیے۔
پاکیزہ! بہت نوازش شگفتہ..... آپ کے ساتھ گفتگو
کرنا اور آپ کے نادر خیالات سے آگاہی بہت حسین
تجربہ رہا گویا ہم ایک لاؤنج میں بیٹھے دل کی باتیں کر رہے
ہیں۔ اللہ آپ کے زور قلم اور صلاحیتوں کو دوام
بخشے..... الٹی آئین.....

☆☆☆

جی تو بہنو! آپ کو بھی ہماری پیاری رائٹر کی کھری،
کھری اور ہر لطف باتیں یقیناً پسند آتی ہوں گی۔ بس اسی
طرح ہم آپ کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں گے۔ اس
بزم کے بارے میں اپنی قیمتی آراء ضرور نوازیے گا۔
چلتے، چلتے بس ایک چھوٹی سی کام کی بات ضرور یاد
رہیں..... خود بھی خوش رہیں۔ اپنے پیاروں کو بھی خوش
رکھیں اور دوسروں کو خوش دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھیں۔ اسی
پیغام کے ساتھ اجازت..... پھر حاضر ہوں گے۔ ان شاء اللہ

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پہنچتے ہوں جن کے وہ کب ہستکتے ہیں

معیار جو ادیب بناتا ہے وہ
میرے خیال میں معاشرتی اقدار ہونا چاہیے۔ باقی ہر ایک
کا ماحول اس کے پسندیدہ ادب پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے
یعنی اپنے ماحول کے مطابق قاری ویسا ہی ادب پسند کرتا
ہے۔

پاکیزہ ❖..... نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام،
کوئی نگرانی بات بتانا چاہیں گی؟
شگفتہ بھٹی ❖..... خدار! شہرت کی خاطر مت
لکھیں..... دولت کی خاطر مت لکھیں..... مالی ضرورت
پوری کرنے کے لیے ضرور لکھیں۔ لیکن بے مقصدیت اور
بے راہ روی پر مبنی مت لکھیں۔ اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بہوؤں
کی اصلاح کے لیے لکھیں، بگاڑ کے لیے مت لکھیں۔ (اللہ
کرے آپ کی باتیں سب کے دلوں میں بھی اتریں)
پاکیزہ ❖..... پاکیزہ قارئین کے نام کوئی خوب
صورت بات؟ کوئی یادگار جملہ، کوئی خوشگوار تجربہ.....؟

شگفتہ بھٹی ❖..... خوب صورت بات جو میری
ازدواجی زندگی کے ہر غم کا بدواہی..... میری ایک بہت
پیاری دوست صائمہ عزیز نے کہی تھی..... ”شگفتہ، ہم اپنے
نقص دو بارہ نہیں لکھوا سکتے..... مگر اپنے صبر اور شکر سے
زندگی کو خوشی سے گزارنا سیکھ سکتے ہیں..... اپنی مایوسیوں کو
اپنی خوشیوں سے امیدوں اور کامیابیوں میں بدل سکتے
ہیں.....“ یہی خوب صورت بات نسخہ کارگر ہے۔ جو مجھے
بھی نہیں بھولتی..... (واہ بہت خوب)

پاکیزہ ❖..... ہماری اس بزم میں آکر کیسا لگا.....



عالمی یوم نسوان اور حقوق نسوان

شائستہ زریں

میں نہیں، کئی خواتین بے خبر ہیں کہ ان کا بھی کوئی دن منایا جاتا ہے اور ایسی خواتین بھی موجود ہیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ برسا برس کی جہد مسلسل کا وجود.....

ندوہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں امید کے دیے بجھنے نہیں دیتیں۔ منوائے جانے والے بعض حقوق ایسے بھی ہیں جو عالمی یوم نسوان کے اولین برسوں سے آج تک ارباب اختیار و اقتدار کی ذاتی توجہ کے طالب ہیں۔

ان ہی امور کے پیش نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کر کے شرکاء سے معلوم کیا کہ..... سوال: کیا آپ عالمی یوم نسوان منانے کے حق میں ہیں؟

سوال ۲: آپ کے خیال میں خواتین کے وہ کون سے حقوق ہیں جو ایک صدی کی جدوجہد کے باوجود بھی تسلیم نہیں کیے گئے؟

ڈاکٹر شائستہ آفندی

(برن سرجن)

۱: بالکل، میں حق میں ہوں کہ کسی بھی صورت میں خواتین کا عالمی دن منایا جائے۔ خواتین کی بہتری کے لیے کچھ ضرور ہونا چاہیے۔

۲: آج تک خواتین کو وہ عزت نہیں مل سکی جس کی وہ حقدار ہیں اور اس کے لیے سب سے پہلے خواتین کو اپنی عزت خود کرنی ہوگی۔ اس کے بعد خواتین کو ایک دوسرے کی عزت کرنی ہوگی۔ اسی طرح معاشرے میں

معزز قارئین! گزشتہ صدی سے اقوام متحدہ سے پاس کردہ مل کے تحت مختلف ایام منانے کا آغاز ہوا جو رواں صدی میں پرنٹ، الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے طفیل زیادہ شدت سے زور پکڑتا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ عوام تک اس کی رسائی ہو رہی ہے۔ ورنہ تو پہلے یہ خوشی خواص اور وہ بھی محض متعلقہ افراد تک محدود تھی۔ مغربی ممالک سے جنم لینے والے ان میں سے بعض ایام محض ان کی ضرورت تھے کہ وہاں اپنوں کو ریگانہ بنا کر سال میں ایک دن ان کے نام کر کے ان کو ان کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ یہ روشی بھی محض ایک دن ان کے حصے میں آئی ہے ورنہ سال کے ۳۶۴ دن ان کے نصیب میں، تنہائی کا اندھیرا، یادوں کا ریلا اور انتظار کا بکھیرا ہوتا ہے۔ بعض دن حقوق کے نام پر بھی منائے جاتے ہیں ان ہی میں سے ایک عالمی یوم نسوان بھی ہے۔ امریکی محنت کش خواتین نے اپنے اوقات کار میں کمی، بہتر اجرت اور حق رائے دہی کے استعمال کے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کی اور جلوس نکالا جسے اس وقت تو تشدد سے ناکام بنا ڈالا لیکن جو چنگاری سگ اٹھی تھی اس کے شعلے بھڑکتے رہے۔ بالآخر اقوام متحدہ نے عالمی سطح پر سال میں ایک دن خواتین سے منسوب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں ایک صدی کا عرصہ بیت گیا خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہی ہیں اور دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی عالمی یوم خواتین منایا جاتا ہے بعض خواتین یہ دن منانے کے حق



ان کی عزت ہوئی اور
ماؤں کو اپنے بیٹوں کی
حریت میں یہ بات
لازمی شامل کرنی
چاہیے کہ وہ خواتین کی
عزت کریں اپنی ماں،
بہنوں، بیٹیوں اور
خاص طور پر اپنی
شریکہ حیات کی کہ
وہی خاندان کو آگے چلاتی ہیں۔

پروفیسر شاہدہ حسن

(ماہر تعلیم)

۱: اس دن کا مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ اور
معاشرے کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنا، ان پر ہر قسم
کے تشدد سے گریز کرنا، تعلیم، صحت اور معاشی آزادی
کی بہترین سہولیات فراہم کرنا ہے۔ مگر آپ دیکھ سکتی
ہیں کہ جس سماج میں بحیثیت مجموعی ہر سطح پر ناہمواری،
منافقت، استحصال اور انتہا پسندی کا دور دورہ ہو وہاں
مرد و عورت دونوں کی حالت کم و بیش یکساں ہی ہوتی
ہے۔ ایک مدت سے ہمارے ملک میں رسمی و روایتی
طور پر یہ دن منایا جا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی اس کے
منانے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر غور کیجیے کہ اس دن
ہوتا کیا ہے؟ بس تھوڑی سی باتیں، شور شرابہ اور
سیمینار منعقد ہو جاتے ہیں، تقریریں کی جاتی ہیں، جلسے
جلوس نکالے جاتے ہیں۔ بے شک عورتوں کے حوالے
سے کچھ نئے قوانین، کڑشتہ کچھ برسوں میں ضرور
حعارف کروائے گئے ہیں۔ مگر ذہنی رویوں میں تو آج
تک کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ خواتین کی تذلیل کے
ایسے، ایسے بھیانک واقعات روزانہ مسلسل سامنے
آتے ہیں کہ یقین نہیں آتا اور اس میں جاہل اور ان
پڑھ لوگوں کے ساتھ، ساتھ پڑھا لکھا اور معزز طبقہ بھی
ملوث ہے۔

ان کی ایدہ و سیاہی روشن کرنے
سے یا کوئی بل پاس کرانے سے ہرگز نہیں ہوتا۔ انہیں
جب تک پوری قوت سے سماج میں نافذ نہ کر دیا جائے
اور اس کے لیے سزا و جزا طے نہ کی جائے یہ مردہ و بے
اثر ہیں۔ اس حوالے سے ہم ترقی پزیر اقوام کے
معاملات تو یقیناً بہت ناگفتہ بہ ہیں۔ یہاں تو عورت کو
ابھی انسان کا درجہ دینے میں بھی بڑا تذبذب موجود
ہے۔ ان کی آواز کی اہمیت ہے، نہ احترام ہے، نہ ان
کے جذبات و احساسات اور نفسیاتی، معاشی اور فکری
ضرورتوں کا کوئی احساس۔ کچھ این جی اوز کوششیں
کرتی رہتی ہیں تو کچھ نہ کچھ قوانین بنا دیے جاتے ہیں۔



بل پاس ہو جاتے
ہیں مگر ان کے اطلاق
کی صورت حال بے
حد مایوس کن ہے۔

میں ایک
رپورٹ پڑھ رہی تھی
۲۰۰۰ء میں انٹرنیشنل
کیونٹی نے خواتین
کے لیے اپنے آٹھ

ترقیاتی منصوبوں کا اعلان کیا تھا۔ اس میں عورتوں کی
خود مختاری، صنفی مساوات، بچوں کی پیدائش کے وقت
ماؤں کی اموات پر کنٹرول، عورتوں کا معاشی
استحکام، ملکی سیاست اور فیملہ سازی میں ان کا بھرپور
حصہ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کی بلا امتیاز
شراکت، مساوی اجرت وغیرہ، وغیرہ جیسے منصوبے
شامل تھے۔ مگر اب ۲۰۱۸ء کی تفصیلات سے پتا چلا ہے
کہ اس سارے ٹارگٹ کو حاصل کرنے میں انہیں بھی
مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ جس کی توقع کی گئی
تھی۔ صرف تعلیم کے شعبے میں صنفی امتیاز کو ختم کرنے
میں کامیابی ملی ہے۔ باقی شعبوں میں کوششیں کی جا رہی
ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ وہاں (یعنی مغرب
میں) عورتیں اپنے حقوق کے لیے بہت سرگرم ہیں اور

اور اگر اس کا جواب نہیں ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا جواب یہ ہے۔
 اسی ایک خواب ہے۔

سیما مناف

(قلم کار)

۱: ہرگز نہیں میں کسی بھی دن کو مرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ سارے دن ہمارے ہیں۔ چاہے والدین کا خاص دن ہو۔ محبت کا خاص دن ہو یا خواتین کا خاص دن۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پورے سال تو ہم



غفلت میں بڑے رہیں اور ایک مخصوص دن کو مرنے کے ہر ذمے داری سے بری الذمہ ہو جائیں۔ یہ دن مرنے کا مغرب کی ایجاد ہے، ان کے پاس اپنوں کے لیے وقت ہی نہیں۔ اس لیے وہ صرف ایک دن اس شخص

کو اہمیت دے کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہی آج کی عورت؟ تو صدیوں پہلے میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے حقوق دے کر سب کو بتا دیا تھا کہ اسلام میں عورت، ماں، بہن، بیوی بیٹی کی کیا اہمیت ہے؟ (جسے ہم سب بخوبی جانتے ہیں) پھر ہمیں کیا ضرورت ہے اس دن کو مرنے کی، ہاں مغرب کو ہوگی، ہمیں نہیں ہے۔

۲: شہر کی عورت کو تو وہ سارے حقوق حاصل ہیں۔ وہ گھر میں بھی ملکہ ہے۔ باہر نکلتی ہے پڑھنے کے لیے، کمانے کے لیے، تفریح کرنے کے لیے، میل ملاپ کے لیے، درس دینے اور سننے کے لیے پھر اسے اور کون سے حقوق چاہئیں؟ ہاں گاؤں کی عورت کا اب تک احتیصال ہو رہا ہے۔ وہ گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ کھیتوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہے۔ پھر بھی شوہر اور سسرال والوں سے جوتے کھاتی

دراں اس دن کو خواتین کو اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ حکومتی سطح پر اس سلسلے میں کوئی کام ہونا چاہیے۔ جہاں تک این جی اوز کا تعلق ہے وہاں تو صرف نمائش اور دکھاوا ہے اور کچھ نہیں۔

شازیہ انوار

(جوائنٹ ایڈیٹر اور سینئر

منیجر ہم نیٹ ورک لمیٹڈ)

۱: ضرور مرنے چاہیے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ سارے دن کس کے ہوتے ہیں اور کس کے نہیں اگر ہم سال کا ایک دن صرف اور صرف خواتین کے نام سے منسوب کر دیں اس دن اس کے حوالے سے کچھ اچھی باتیں کر لی جائیں تو میں نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی مضائقہ ہے۔



۲: آپ کے جواب سے پہلے میں ایک سوال کرنا چاہوں گی کہ عورتوں کو کون سے حقوق حاصل ہوئے ہیں؟ آج ہمیں جو عورتیں معاشرے میں فعال نظر آ رہی ہیں کیا وہ کسی کی جدوجہد کا

نتیجہ ہیں؟ اگر ایسا کوئی سمجھتا ہے تو وہ بالکل غلط ہے۔ آج بالخصوص مشرقی معاشرے میں جتنی بھی خواتین آپ کو گھروں سے باہر نکل کر کام کرتی نظر آ رہی ہیں، وہ ایک تو ان ٹیچر پڑھنے لکھے مردوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، ان پر اعتماد کیا اور انہیں اپنی زندگی اپنے مطابق گزارنے کا حق دیا یا پھر ہماری عورتیں ان مردوں کی وجہ سے گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور ہیں جو اپنے گھروں کے معاشی مسائل حل کرنے سے قاصر ہیں۔ علاوہ ازیں خواتین کو ان کے کون سے حقوق حاصل ہوئے ہیں؟ کیا ہماری عورت کو معاشرہ عزت کی

ہیں اور دینی کیا شہری خواتین بھی محض اس ڈر سے اپنا یہ حق چھوڑ دیتی ہیں کہ ”لوگ کیا کہیں گے“ حالانکہ لوگ کچھ نہیں کہتے۔ یہ ہمارے ذہن کی اختراع ہے۔ ہمارے وزیرِ عظم نے خواتین کے حقوق کے لیے ایک سیل بنایا ہے اور خاص طور پر وراثت کے لیے۔ ہم کو چاہیے کہ اس آسانی سے فائدہ اٹھائیں۔

شگفتہ فرحت

(سماجی و ثقافتی شخصیت)

۱: بالکل حق میں ہوں، عورتوں کا استحصال برسوں سے جاری ہے۔ اگر یہ عالمی دن عورتوں کے نام سے منسوب ہے تو ہم خواتین اپنے حقوق کے لیے کیوں نہ اپنی آواز بلند کریں۔



۲: وراثت میں خواتین کا جائز حصہ، شوہر سے علیحدگی کی صورت میں عدالت عالیہ میں عورت کی گواہی کی صورت میں ایک آواز کا مکمل نہ ہونا (یعنی دو عورتوں پر مشتمل گواہی) کار و کاری، زنا بالجبر، تیزاب گردی پر سخت قوانین کا نفاذ نہ ہونا۔ اور اس کا نفاذ جب ہی ممکن ہے جب عورت کو با اختیار بنایا جائے۔ گھر سے لے کر صوبائی اسمبلی تک، قومی اسمبلی، سپریم کورٹ میں ان کی تعداد، آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تو یہ تمام قوانین نافذ ہو سکتے ہیں۔

انجلین ملک

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: ہمیں ابھی آگہی کی ضرورت ہے۔ جس طرح ہم اور دوسرے دن مناتے ہیں اسی طرح ہمیں خواتین کا

کی طرف سے خوش آمدید کہا جاتا ہے؟ عورت پر مبنی لکھی ہو، ان پڑھ، گھریلو ہو یا ملازمت پیشہ اسے ایک ہی طرح کے مسائل اور نظروں کا سامنا ہے، گزری ہوئی ایک صدی میں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ عورت عزت چاہتی ہے اور معاشرے کو اسے سنت نبویؐ کے مطابق عزت دینی چاہیے۔ جب آپ عورت کو خواہ وہ آپ کی بہن ہو یا کسی اور کی، آپ کی ماں ہو یا کسی اور کی عزت دیں گے تو عورت کا مقام خود بخود بلند ہوگا اس کے جملہ حقوق اسے حاصل ہو جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہوگا کیسے؟ یہ میں کروں گی اور آپ کریں گی اپنی اولاد کی تربیت کے ذریعے۔ یہ صورت دیگر اگلی ایک صدی کے بعد بھی ہم سے یہی سوال کیے جا رہے ہوں گے۔

طلعت ترین

(صحافی)

۱: جی بالکل منانا چاہیے۔ اس سے بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک احساسِ زندہ رہتا ہے کہ ہمارا یعنی خواتین کا کوئی وجود ہے۔ بعض لوگ صرف فیشن کے طور پر یہ دن مناتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس دن ان خواتین کو ڈھونڈ کر ان کی مدد کرنی چاہیے جو کسی طرح کی زندگی گزار رہی ہیں۔



۲: یوں تو ایک نہیں بیسیوں حقوق ہیں جو ایک عورت کو نہیں ملتے لیکن ایک حق ایسا ہے جو بدستوری سے آج تک نہیں ملا۔ اس کی وجہ کوئی اور نہیں عورت کا اپنا ڈر ہے اور وہ ہے وراثت کا حق جو اللہ تعالیٰ نے عورت کو دیا ہے۔ ماں باپ لڑکی کو پال پوس کر شادی کر کے

(ٹی وی آرٹسٹ)

ان میں عالمی یوم خواتین منانے کے حق میں ہوں کیونکہ عورت محض ایک عورت نہیں ہے بلکہ وہ کئی بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اسی لیے اگر ہم اس دنیا سے خاتون کا لفظ نکال دیں تو یہ دنیا نامکمل ہے کہ عورت سے جزا ہر رشتہ اس کے بغیر نامکمل ہے مثلاً شوہر، بیوی کے بغیر اولاد ماں کے بغیر وغیرہ اور ان تمام رشتوں کو بنانے اور بنانے میں عورت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔



وہ صرف اپنے لیے ہی نہیں جیتی بلکہ خود سے وابستہ ہر رشتے کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے لیے سوچتی ہے۔ ان کے لیے دن رات محنت کرتی ہے، جدوجہد کرتی ہے اور یہ صرف ایک طبقے کی

عورت کی بات نہیں ہے تمام طبقوں کی خواتین کا یہی معمول ہے۔ اور خواتین کی اہلیت اور قدر کو تسلیم کرنے کے لیے سال میں ایک دن ان کے لیے رکھ کر ان کی سٹائش کریں۔ اور خواتین کو احساس دلائیں کہ پوری دنیا آج ان کے لیے ایسا دن منا رہی ہے جس میں خواتین کی ساری جدوجہد کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔

۲: میں نے حال ہی میں نوئیں بین الاقوامی خواتین سربراہی مذاکرے میں شرکت کی۔ جہاں مجھے خصوصی اوپنکس میں بطور اعلیٰ سفارت کار کے مدعو کیا گیا کہ میں اپنے انجیل کے مخصوص پروگرام کے بارے میں بات کروں۔ اس مذاکرے میں کئی خواتین نے تقریریں کیں۔ اپنے تجربات بیان کیے۔ ان تمام خواتین نے خواہ ان کا تعلق کسی بھی پروفیشن سے تھا، اب تک خواتین کے جس حق کو تسلیم نہ کیے جانے کی سب

اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ دوسرے بندے کی ویلو کیا ہے؟ وہ لوگ جن کو خواتین کی مشکلات کا احساس ہی نہیں ہے وہ ان کی



مشکلات محسوس کریں اور جس طرح اور دوسرے دن منائے جاتے ہیں بالکل اسی طرح یہ خواتین کا حق ہے کہ ان کی ویلو کا احساس دلانے کے لیے سال میں ایک دن ان کے نام ضرور کر

کے ان کو داد دیں کہ کیسے وہ مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں اور اس دن ان کی صلاحیتوں کو سراہا جائے۔ خواتین کے وجود اور ان کی اہلیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔

۳: میں نہیں جانتی لوگ کنفیوزڈ ہوتے ہیں کہ فیمنیزم کیا ہے؟ اور وہ بین امپاورمنٹ کیا ہے؟ عورت کو اختیارات کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال سے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوال جو ہے کہ عوامی امپاورڈ یہ سوال ہی نہیں اٹھنا چاہیے۔ اور کسی بھی انسان کو یہ اختیار نہیں دینا چاہیے کہ وہ خواتین کا استحصال کرے عورت کو اس کی مرضی سے کام کرنا چاہیے۔ مختلف سطح پر خواتین کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ جب ہی تو ہم ان کے حقوق، بہتری اور باختیار بنانے کی بات کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں تمام اصول و قوانین بھی مردوں کے بنائے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے بڑا ہے۔ بحیثیت انسان مرد اور عورت میں مساوات ضروری ہے۔ صنفی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ عورتوں کو بھی باختیار ہونا چاہیے، ان کو بھی مردوں کے مساوی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ آج تک نہ ہو سکا۔

بچے آپ کا سرمایہ

اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ بچپن کا ماحول ہی بچوں کے رویے اور ان کی نشوونما کا تعین کرتا ہے۔ بچوں کی نشوونما میں گھر والوں کا سلوک ان کے آپس کے تعلق پر منحصر ہوتا ہے۔ آپس کے تعلقات کا دار و مدار بھی گھریلو ماحول اور گھر کے افراد کے اس رویے اور اسٹائل پر منحصر ہوتا ہے جو وہ بچے کے لیے ظاہر کرتے ہیں۔ والدین کا اہم کام بچوں کی ذہنی، جسمانی، معاشی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ بچے وہ خود رو پودے ہوتے ہیں جنہیں نشوونما پانے کے لیے قدرتی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں کا پیار اور محبت بچے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بچہ مختلف رویے سیکھتا ہے۔

خوشگوار خاندانی ماحول بچوں کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے جبکہ ناخوشگوار خاندانی ماحول ارتداد جذباتی ٹینشن پیدا کرتے ہیں۔ جو بچوں کی صلاحیتوں پر نہایت منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ والدین کو اس بات کو محسوس کرنا چاہیے کہ فیملی کے کمزور تعلقات بچے کو عدم تحفظ فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے بچہ بہتر طور پر پتے سیکھ نہیں سکے گا اور والدین کی توجہ اور اعتماد حاصل نہیں کر پائے گا۔

جو مائیں اپنے ازدواجی تعلق میں بہتر انداز سے زندگی گزار رہی ہوتی ہیں ان کے بچے نسبتاً زیادہ فرمانبردار اور باکردار ہوتے ہیں۔ شخصیت کے دوسرے پہلو براہ راست ازدواجی زندگی سے اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ ان کے کئی عوامل ہو سکتے ہیں۔ بچے کا فرمانبردار یا خود سر ہونے کا تعلق گھر کے ماحول سے ہوتا ہے اور اس بارے میں دو رائیں ہیں کہ بچے کی دیکھ بھال کے لیے جو طریقہ کار اپنایا جاتا ہے وہ بچے کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مرسلہ: صبا سجاد، دہلی

پیشہ ورانہ سطح پر عورت کی ناقدہری۔ عورت کو سراہا نہیں جاتا، اس کی اہمیت کم کی جاتی ہے۔ مرد سمجھتے ہیں کہ عورت کو صرف گھر اور بچن تک محدود رہنا چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے جب عورت باہر نکلتی ہے، کام کرنی ہے تو چاہے وہ تعلیمی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے مردوں کے برابر یا ان سے بہتر ہی کیوں نہ ہو اس کو وہ قبولیت نہیں ملتی جو اس کا حق ہے۔ مرد اگر عورت کا ماتحت ہے تو اس کو برا لگتا ہے کہ اس کی پاس ایک عورت ہے۔ اگر عورت اپنے بچوں اور فیملی کو دیکھنے کے لیے جلدی گھر چلی جاتی ہے تو اسے یہ بھی برا لگتا ہے ایسے مسائل ہر پیشے میں ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ مرد پیشہ ورانہ میدان میں عورت کی محنت، قابلیت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی کارکردگی کی ستائش اور حوصلہ افزائی کریں۔ میرے نزدیک مرد کے ساتھ ایک ہی پلٹ فارم پر اس کے برابر محنت کرنے والی عورت کا حق ہے کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے بھی وہ تمام سہولتیں اور عزت دی جائے جو مرد کو حاصل ہیں۔ آج تک عورت کے اس حق کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

ننا شاہد

(لیکچرار ابللاغ عامہ)

۱۔ عالمی یوم خواتین منانے سے خواتین کو ان کا مطلوبہ مقام مل سکتا تو اتنے برسوں میں مل چکا ہوتا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کو مظلومیت کی تصویر بنانے کے بجائے اسے چٹان کی طرح مضبوط بنایا جائے اور مساوات کی بنیاد پر عملی شعبہ جات میں آگے آنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔



شوش اور غلط فہمیاں تھا وہاں بھی عورت صدیوں سے اختیار نہیں۔ جبکہ اسلام نے خواتین کو بے شمار حقوق سے سرفراز کیا ہے جو انہیں میسر آجائیں تو وہ عزت، وقار اور اعتماد سے سرائھا کر جی سکتی ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں ان میں سے بعض حقوق کی پامالی عام ہے اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے باشعور اور باہمت خواتین جو اپنی قوت فکر اور جذبہ عمل سے اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہی ہیں باہم متحد ہو کر ایک دوسرے کے حقوق کو تحفظ دیں اور اپنے سے کمزور اور ایسی خواتین کو ان کا جائز مقام دلانے کی ہر ممکن کوشش کریں جو اپنے حقوق کی پامالی کی اذیت تو جھیل رہی ہیں لیکن نامساعد حالات کی بنا پر ان حقوق کے حصول کی کوشش نہیں کر پاتیں۔ جب خواتین ایک دوسرے کے حقوق کی پاسبانی کے لیے صحت مند سوچ، اعلیٰ ظرفی، وسیع انگری، کشادہ دلی سے کوشاں ہوں گی تو کامیابی یقینی ہے۔ قابل فخر ہے آہنی حوصلے والی صنف نازک جو اپنی گھریلو اور بیرونی ذمے داریاں نہایت خوش اسلوبی اور فرض شناسی سے نبھا رہی ہے۔ اس کی شانہ روز کی خدمت گزار یوں اور کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرنے اور خواتین کی عظمت کو تسلیم کرنے کے لیے سال میں ایک دن بہت ناکافی ہے۔ یہ عمل سال بھر جاری و ساری رہنا چاہیے ان کو سراہنا چاہیے کہ یہ ستائش خواتین کے لیے کسی نازک سے کم نہیں ہوتی جو ان کو ایک نئے عزم، جوش اور لگن سے بھر پور توانائی کے ساتھ زندگی کے ہر محاذ پر سرگرم عمل رکھتی ہے۔ یہ خوش رنگی خواتین کے باطن میں موجود ہوگی تو یقیناً ان کے دم سے تصویر کائنات میں رنگ ہی رنگ ہوں گے شرط یہ کہ اس رنگ کو زندگی نہ لگا جائے محض زبانی جمع خرچ تک نہیں بلکہ عملی طور پر عظمت نسواں کا اعتراف کیا جائے۔ لیکن سال میں ایک دن نہیں ہر اس دن، اس پل اور اس ساعت جب اس کا کوئی بھی فعل لائق ستائش ہو۔

بہت نسواں مدد خدا

☆☆☆

جس طرح مرد کھانا پکانے سے لے کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنے تک ہر کام میں عملی طور پر سرگرم ہے بالکل ویسے ہی عورت بھی مختلف علوم میں درجہ کمال تک پہنچ سکتی ہے۔ خواتین میں بھی وہی ذہانت، وہی علوم و افکار اور خوبیاں موجود ہیں جو کہ دنیا میں کسی بھی کامیاب مرد میں موجود ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اتنی طویل جدوجہد کے بعد بھی خواتین کو ترقی کے یکساں مواقع میسر نہیں۔ عورت کے ساتھ نا انصافی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ میں عورت کو صرف تاریخ کے حاشیے پر جگہ دی گئی ہے۔ صدیوں سے عورت یہی چاہتی ہے کہ اسے بحیثیت انسان تسلیم کیا جائے اس نا انصافی کے خلاف دنیا بھر کی خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے اپنا اصل مقام پانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ عورت کمزور نہیں ہے جب ہی فطرت نے مرد کے بجائے عورت کو تخلیق کے لیے چنا ہے۔ ضروری ہے کہ عورت کو تمام شعبہ جات میں آنے کا موقع دیا جائے پارلیمنٹ اور حکومت میں برابر کی سیٹیں دی جائیں۔ ہر ادارے، ہر پلیٹ فارم پر مرد اور عورت کی یکساں نمائندگی ہو کہ دونوں ہی نوع انسانی سے تعلق رکھتے ہیں... مختلف پلیٹ فارم پر خواتین کے حقوق کی بات کی جاتی ہے لیکن وہیں ایسا ورمنٹ کی بات نہیں کی جاتی۔ وہ کیسے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف تربیتی پروگرام منعقد ہونے چاہئیں۔ تاکہ خواتین اپنے آپ کو کمزور تصور نہ کریں۔

معزز پاکیزہ بہنو!

خواتین کے اب تک تسلیم نہ کیے جانے والے جن حقوق کی سب سے زیادہ بات ہوئی ان میں خواتین کو باعتبار بنانا۔ کام کے مقام پر ان کو مردوں کے مساوی اہمیت اور مراعات دینا اور خواتین کو عزت دینا ہیں۔ ایشیائی ممالک کو تو چھوڑیں مغربی ممالک جہاں سے آزادی

مزاح نگاری، کمال کی صنف ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانہ لگیں۔۔۔۔۔ مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ کرنل محمد خان۔۔۔۔۔ اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے۔ اس ماہ اپنے باندوق بڑھنے والوں کے لیے ہم نے اپنے نامور مزاح نگار کی تصنیف بسلامت روی سے اقتباسات منتخب کیے ہیں۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باندوق قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

کھانا کھانے کے آداب تندر سے سیکھیے

ہر دین میں ہماری آخری سرکاری مصروفیت ہر کاری اس لیے کہ اس پر ہمیں کئی اختیار نہ تھا۔۔۔۔۔ اس شب کا ڈنر تھا جس کے بہتیم اور مندر ولید تھے۔ ہماری شرطِ فطرتی تھی کہ ہمیں خالص لبنانی کھانا کھلایا جائے کیونکہ اگر بڑی کھانوں سے ہمارا منہ پیلے ہی ہے حدِ لوث اور بخروج ہو چکا تھا اور ہمارا مستقبل قریب بھی۔۔۔۔۔ جسے انگلستان میں گزارنا تھا۔ خاصا تاریک تھا چنانچہ ولید نے ایک خالص لبنانی ریستوران لیدز لارڈز انتخاب کیا۔ ریستوران میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کسی محل میں داخل ہوئے ہیں اور ماحول میں بھی وہی شرافت نظر آئی جو محلات میں ہونی چاہیے۔ چندی مہمان بیٹھے تھے مگر شکلِ صورت سے بڑے چیدہ ولید سے دیر پوچھی تو بڑی سادگی سے بولا۔

”یہ محل تو اس لیے لگتا ہے کہ لیدز لارڈز کہتے ہیں کہ وہیں اور شرافت کی نوعانہاں اس لیے آتی ہے کہ یہاں آتے ہی شرف لوگ ہیں۔“ ہم نے کہا۔ ”شراف کی تو کراچی میں بھی کی نہیں۔۔۔۔۔ لیکن کھانے کے وقت ہر طعام گاہ کے دروازے پر ایک غیر شریفانہ کیو لگ جاتی ہے۔“

بولا۔ ”یہ خالص آبادی کا مسئلہ ہے۔ سارے لبنان میں اسے لوگ نہیں جانتے کراچی سلہا کی گود میں پلتے ہیں۔“ شریفانہ ماحول کی دو گونہ وجہ سمجھ میں آگئی تو ولید کے اشارے پر کھانا آنا بلکہ برسرِ شروع ہوا۔ یہ اس قسم کا ڈنر نہ تھا جس میں چار پانچ کھانے کے بعد دیگرے مہمان کے پہلو سے اس کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ اس ڈنر میں مختلف رنگ و نسل کی چٹنیاں، مرے اور اچار چھوڑ کر پورے چالیس کھانے تھے۔ جی ہاں ہم نے ایک، ایک کر کے گئے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ شاید کوئی عقلمند آدمی ان کی تعداد پوچھ بیٹھے۔ اور چالیس کے چالیس

کھانے بیک وقت نازل ہوئے۔ یعنی کوئی دس ہیرے چار، چار پلٹیں اٹھائے شش جہات سے میز پر بیٹھے گئے اور اس موسلا دھار سروں کے بعد جب ہرے چھٹ گئے تو میز پر جل جھل کا عالم تھا۔ پلٹوں کا کھوے سے کھوا چھٹا تھا۔ پوری چالیس پلٹیں میز پر کیسے سا گئیں؟ گزارش ہے کہ یہ ہماری پاکستانی ڈنر پلٹیں نہ تھیں بلکہ چینی کی چالیس بالشتیاں کشتیاں تھیں جن میں ہم وطن میں مہمانوں کو چلغوزے پیش کرتے ہیں یا پانچ تیروں کو پتھروں میں دانہ کھلاتے ہیں۔ ہم سوچنے لگے کہ ہر دین میں تیروں کو کس چیز میں دانہ ڈالتے ہوں گے اور مہمانوں کو کس برتن میں چلغوزے پیش کرتے ہوں گے۔ بادام کے خول میں یا مونگ پھلی کے جھلکے ہیں؟ لیکن چالیس کشتیاں کتنی ہی بالشتیاں کیوں نہ ہوں، آخر چالیس ہوتی ہیں، چنانچہ ہم نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو کسی سے کشتی نہ گرائی۔ لیکن دیکھا کہ دو ہیرے اس خدمت پر مامور کر دیے گئے ہیں کہ اگر کسی کشتی کا میز کے کنارے سے پاؤں پھسلے تو اسے سہارا دے کر پھر منجھدار میں ڈال دیں۔ ان ہیروں کے تعاون کے بغیر دو ہیرو ان پلٹوں سے آرام سے کھا سکتے تھے لیکن دو انسان آرام سے نہیں کھا سکتے تھے۔ ہم نے ولید سے پوچھا۔

”آپ کوان کھانوں کے نام بھی آتے ہیں؟“

بولا۔ ”چند ایک کے تو آتے ہیں لیکن سارے ناموں کا حافظہ جامد از ہر سے ادھر نہیں ملے گا۔“ رہا ان چالیس کھانوں کا ذائقہ تو شاید تیروں اور ولیدوں کے لیے باعثِ کشش ہو مگر ہمیں بہت ملاحظہ نہ کر سکا۔ کسمو اور کاروں کے معاملے میں ہر دین بے شک بے مثال کسی لیکن کھانے کے معاملے میں بھی رسیاں شہر لاہور دیاں۔ چنانچہ ہم نے اپنے لاہور پر جاننا نہ پھر کیا اور اسے باو صبا کے ہاتھ کھلا بھیجا کہ عالم میں مجھ سے لاکھ کسی تو مگر

مادام! شے کی قاب میں جانے اور حسن سلوک سجا کر لائیں۔ اتنے میں ہماری کینو کی ہم نشین بھی الوداع کہنے آئی۔ ہمیں سوٹ کپس میں کپڑے بند کرتے دیکھ کر ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ جب ہمارے منصوبوں کی تفصیل سنی تو رشک سے چور ہو کر ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں سیر جہاں کا شوق رورور کر کہہ رہا تھا کہ

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
جج کا ثواب غز کروں گا حضور کی
لیکن اس کے لیے زرمبادلہ کا انتظام بھی ہو سکتا تو ہجرت کا انتظام کیسے ہوتا؟

سرگشتہ غبار رسوم و قیود تھا
اتنے میں عبدالرحمن کا رے لے کر آگیا اور ہمیں ہوائی اڈے کو لے اڑا۔

یہ صحرا ابھل رہا ہے

کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دیار وطن سے کوسوں نکل آئے ہیں۔ وہ خطہ خاک جس پر ہم اڑ رہے تھے، خطہ پاک نہ تھا بلکہ پانچ سیل کی بلندی سے بھی ابھنی نظر آتا تھا۔ یہ صحرا تھا اور کوئی صحرا اسحرا اچھا، پھیل اور چوٹ۔ ہم نے اپنے حافظے کے جغرافیہ واں حصے سے اس صحرا کا نام پوچھا تو حافظ نے اپنی مصومیت کا اظہار کیا۔ ہمیں ابھن یہ بھی کہ ہمارے علم نقشہ کے مطابق وہاں سمندر ہونا چاہیے یا ساحل سمندر جہاں فقری آبادیوں والی خواہیوں کشتیاں رواں ہوں اور ریکسار ان ساحل رو بھیاریت پر عمل آفتابی میں دروغ لکھ لینے ہوں تاکہ اوپر سے ہمارا طیارہ گزرے تو ان نگ پوٹوں کو کچھ چھپائے نہ بنے۔ ہمیں پورا علم ہے کہ جہاں دیکھنے والوں اور دیکھے جانے والوں کے درمیان پانچ سیل کا عمودی فاصلہ حاکم ہو وہاں کوئی قابل فہم اعضاء و اجزا نظر نہیں آتے۔ تاہم اتنا س ہے کہ ایسا سوچنے میں کیا حرج ہے؟ رعنائی پر بے شک ہمارا تصرف نہیں لیکن رعنائی خیال تو کسی کی جاگیر نہیں اور یہ ہمارا نہیں غالب دیدہ و رکھنے ہے۔

سے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
لیکن اس لقی و دق صحرا کے نظارے سے ہمارے خیال کا حسن بری طرح ریک آدو ہو گیا۔ ہاں ایک فائدہ ہوا کہ یہ ابھن ایک تقریب ملاقات کا بہانہ بن گئی اور ہم نے پاس سے نذرنی ہوش کو بھرا کر پوچھا۔ ”یہ صحرا کہاں سے آگیا؟“

بولی ”جہاں تک میرا علم ہے یہ صحرا تینک رہتا ہے۔“
بہر حال یہ ایران ہے۔

والا ایران، وہ آب رکنا باد و گلشت مصلے والا ایران؟ وہ آہوئیں اور غزاہوں والا ایران؟ وہ بلبلوں اور قمریوں والا ایران؟ وہ.....
”معاف دیکھیے گا۔“ انٹر ہوش ایک دلاؤ بڑے صبری سے بولی۔ ”ایران کے چند و پرند کی فہرست تو بہت طویل ہے اور مجھے دوسرے مہمان بھی بلا رہے ہیں۔ کیا میں کوئی فوری خدمت بجا لاسکتی ہوں؟ مثلاً اسپرو.....“

ہم اتنے بوڑھے تو تھے کہ حد درجہ اسے جانبر ہونے کے لیے ہمیں اسپرو پیش کی جاتی لیکن اتنے بچے بھی نہ تھے کہ ہمارے منہ میں نیل دے دیا جاتا۔ بہر حال اسپرو کی چٹکی کش ہم نے شکر کے ساتھ مگر نہایت وقوف سے ٹھکرا دی۔ ہمیں ناخوش دیکھ کر ہوش بولی۔

”آپ چند گھنٹے صبر کریں۔ بیروت میں آپ کو اتنی بلبلیں اور قمریاں ملیں گی کہ چک لائے میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔“
اور پھر ایک رواں دواں، مسکراتی ٹھنکتا لی لہری طرح آگے بڑھ گئی اور ساتھ ہی ہمارے جملہ شکوے اور شکایتیں بہالے گی۔ نیز کچھ روشنی بھی چرائے گی۔ روشنی ماند پڑی تو ہم نے بھی آنکھیں موند لیں کہ کچھکی رات بہت تھکے جاگے، لیٹ گئے آرام کیا۔ بیروت تک پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ کہیں بغداد کی ذوقی فضا میں جج کے لیے جاگے بلکہ جگائے گئے۔ جج کو خیر لذیذ تھا ہی لیکن ہم پر دیر پا اثر ناں و گوشت کے ذائقے کا تھا بلکہ تواضع کے مزے کا جس نے ہمیں اور ہمارے ہم نفس کو غرضی مہار جانا دیا۔ ہمیں ریاست چک لالہ کا اور انہیں ریاست میر پور حال بریڈ فورڈ کا۔

پھر دفعتاً بیروت آگیا اور ہماری تین الاقوامی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اس کی پہلی علامت یہ تھی کہ جو بھی ہم جہاز سے اترے، ہم سے زیادہ توجہ ہمارے پاسپورٹ کو دی جانے لگی۔ گویا پاکستان سے ہم پاسپورٹ لے کر نہیں آئے تھے بلکہ پاسپورٹ ہمیں لے کر آیا تھا۔ اور یہ جاننے کے لیے کہ ہمارا وجود لبنان کے لیے مفید ہے یا مضر، ہماری بخش۔ سے زیادہ ہمارے پاسپورٹ کی بخش ٹوٹی گئی۔ جب ہمارے پاسپورٹ کی صحت ٹھیک لگی تو ہماری تندرستی بھی تسلیم کر لی گئی۔ گویا ہماری حالت ان داستانہ شہزادوں سے مختلف نہ تھی جن کی جان طوطے، مینا میں ہوتی تھی۔ ہماری جان پاسپورٹ میں تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے چوما، سینے سے لگایا اور جس چیز کو کبھی روزانہ کی تہ میں پیچھک دیتے تھے، اب دل کی تہ میں جگہ دی۔ یہ ہوجا تو بسم اللہ کر کے دونوں ہاتھوں سے سامان اٹھایا اور علی پڑے۔ ہم مہاراجگی سے یونگ سے اترتے ہی معزول ہو گئے تھے۔ اور کسٹم کے راستے کچھ عربی، کچھ انگریزی، کچھ جج، کچھ جھوٹ بولنے اڑ پورٹ سے باہر نکلے۔



بہنوں کی محفل

خط کتابت کے لیے: پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612, 021.35386783, 021.35802552, Ext: 122.107

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!
تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکساں و وحدہ لا شریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدایہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو بڑی تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے عزیزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن و سکون کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہل وطن اس کی ترقی و تیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الحی آمین)

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ کے دیرینہ اور پر خلوص ساتھیوں، پچھلے کچھ عرصے سے محترمہ مدبرا رسول باقاعدگی سے آپ بہنوں سے مخاطب ہو رہی ہیں۔ آغاز محفل میں وہ جہاں اپنی رائٹرز کا ذکر کرتی ہیں وہاں اپنی قابل قدر قاری، بہنوں کی جواب طلب باتوں کا جواب بھی ضرور دیتی ہیں سو اس مرتبہ بھی ان کا پیرا گراف تیاری کے مراحل میں تھا مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا..... کہ بروز جمعہ 22 فروری عین اذان فجر کے وقت ادارے کے بانی و روح رواں جناب معراج رسول طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون..... اس عظیم سانحے کے بعد مدبرا صاحبہ کے لیے بقیہ پیرا گراف مکمل کرنا ناممکن تھا بس وہ اپنے تمام قارئین سے سورہ فاتحہ اور دعائے مغفرت کی درخواست ہی کر پائیں۔ ہمیں پورا اندازہ ہے کہ یہ صدمہ آپ قارئین کے لیے بھی ناقابل برداشت ہے۔ ہم نے نہایت فسر و دلی و شکستہ دلی سے اس محفل کو مرتب کیا ہے۔ ہمارے قارئین اور رائٹرز کی سرگرمیاں اور ان کی خوشی غمی ہمیں برابر کی عزیز ہے۔

عزیز قارئین، معراج رسول کے انتقال پر ملال کی خبر پھیلنے ہی فون کالز، امی میلز اور بیانات آن شروع ہو گئے تھے اگر آپ لوگ بھی اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیں تو مختصراً لکھ کر جلد از جلد بھیج دیں۔ اپریل 2019ء کا شمارہ اگرچہ ساگرہ نمبر ہی تھا مگر اس مرتبہ معراج رسول نمبر ہوگا..... جناب معراج رسول کی ادبی و سماجی خدمات کے لیے جتنا لکھا جائے بلا شک کم ہی ہوگا۔ اور حسب روایت سنت خیرہ دل اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیم کی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانان عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الحی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ شاعرہ و مصنفہ سہاس کل کا تازہ ترین شعری مجموعہ محبت پھر شروع کر لو شائع ہو گیا ہے۔ کتاب کا انتساب سہاس نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ 160 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی قیمت چار سو روپے ہے اور ہر دن ملک کے لیے 15 ڈالر بھی گئی ہے۔ کتابت اور پرنٹنگ کا معیار نہایت اعلیٰ ہے اور سرورق بھی گلاب کے پھولوں سے سجا ہوا ہے، رابطے کے لیے ایڈریس subasgull@gmail.com اور فون 03332267520 ہے (بہت مبارک ہو سہاس کل)

میں مصنف کی ادبی خدمات پر شعر و ادب کی چندہ شخصیات نے اظہار رائے کیا۔

☆ مستقل تبصرہ نگار آسیر عامر، کراچی کے نتیجہ احمد علی اور بھائی نذیب ندیم کی اس ماہ ساگرہ ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ اس ماہ اور اس تبصرہ نگار اور شاعرہ ہما علی، اسلام آباد کو تہری سالگرہ ہیں مبارک ہوں مطلب ہما کی اپنی سالگرہ، ان کے شوہر صاحب کی اور سب سے بڑھ کر ہما کی شادی کی سالگرہ..... (بے حد مبارک باد اور دلی دعا میں)

☆ نوجوان شاعر خرم خورشید کی خوب صورت اور پُر اثر شاعری پر مبنی مجموعہ کلام غم بھی گم نہیں ہوتے شائع ہو گیا ہے۔ دلکش سرورق اور خوب صورت کاغذ نے کتاب کی تزئین و آرائش میں اضافہ کیا ہے، کتاب کا انتساب خرم نے اپنی والدہ، بہن اور بیٹی کے نام کیا ہے گویا مصنفہ نازک کی اہمیت واضح کی ہے۔ 160 صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت 600 روپے ہے اور اسے گفتگو پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ رابطے کے لیے 4455990... 0092340 اور ای میل info@guftugu.com ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار و مرسلہ نگار حمیرا انجم وحید، واہ کیٹ کے بہنوئی رمیز اختر اپنے والدین کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہوئے۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ عذرا آفتاب لندن میں مقیم اپنے بچوں سے مل کر وہاں پاکستان پہنچ گئی ہیں۔ (الحمد للہ)

☆ مستقل قاری حدیث اختر، حاصل پرواد کی جان نئی گئی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ شاعرہ فریدہ خانم نے راسخ نگار لاہور کے بزم وارث شاہ میں مہمان خاص کی حیثیت سے شرکت کی۔ فریدہ خانم کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کو ہریان فاؤنڈیشن کی طرف سے حکیم محمد سعید شہید کی سالگرہ کے موقع پر ان کی شاعری پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اور ان کی شاعری کا دوسرا شعری مجموعہ سن شائع ہو گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ مستقل پاکیزہ قاری کیلوفر احمد، لاہور کے پیارے بیٹے کی شادی اس ماہ ہونا قرار پائی ہے۔ (مبارک ہو)

☆ راسخ شہیدہ کل اپنے شوہر اور ساس صاحبہ کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہوئیں۔ (مبارک ہو)

☆ حمیرا آف کامرس کی طرف سے عطیہ ہدایت اللہ اور حکیم فضل خالق کو خیر بہنوں خواہ کی بہترین خواتین راسخ تین راسخ کا ایوارڈ ملا ہے۔ (مبارکوں)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کے بڑے بھائی حاجی غلام عباس اور چھوٹے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔ عصمت کی بھانجی ناہیدہ اصغر کو بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ جبکہ مختار ایل بی بی جی بریٹ کے عارضے میں مبتلا ہیں انہیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ مستقل تبصرہ نگار صاحبہ آصف کی طبیعت ان دنوں خراب ہے۔

☆ مصنفہ عذرا آفتاب آج کل کمر کی تکلیف کے عارضے میں مبتلا ہیں۔

☆ شاعرہ پاکیزہ قاری فریدہ خانم کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔

انتقال برصالح

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار تنسیم کوثر کے شوہر کی اس ماہ دسویں برسی ہے۔

☆ شاعرہ فریدہ خانم کی کزن ارخسانہ سعید رضائے الہی سے انتقال کر گئیں۔

☆ مصنفہ حیات بخاری مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

☆ تمام مرحومین کے درجات کی بلندی کے لیے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆☆☆

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کتنے پیٹھے خلط کی جانب.....

☆ طیبہ فوغیر مغل، راول پنڈی سے۔ ”نزدت یہ کیا جاوے کہ ہر بار ادارے میں آپ کچھ کہنے کا کہہ کر سب کچھ کہہ

ڈاکٹر ہیں ماشاء اللہ..... (بہت شکر ہے) افسانہ آفریدی جی کے ناول کی ابتداء ایسا ہی جاری ہیں دوپٹ ناول کے لیے سیٹ بیلٹ باندھ لیں کیونکہ اڑان کافی بلند ہوگی۔ (جی بے شک) حیا بخاری، شیریں حیدر اور رفعت سراج کی تحاریر کا اہتمام بالکل مناسب انداز میں ہوا۔ فرحتی عظیم جی نے ایک سبق آموز افسانہ خوب لکھا جو لوگ اپنی جڑوں سے ناتا توڑ دیتے ہیں وہ یونہی منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ قرۃ العین سکندر کی مینا نے بھی کافی متاثر کیا کاش بھائی اسی طرح سے اپنی بہنوں کا ہمیشہ دفاع کرتے رہا کریں۔ مصنفہ نے ایک مثبت پیغام دیا اپنی تحریر کے لیے توبہ دل سے ممنون ہوں، عذرا ایسا، نزہت بہت اصغر، آمنہ حاد اور تمام پاکیزہ کی ٹیم کی۔ فریدہ بیگم کے ایڈیٹر نے تو دورِ حاضر کی سب سے صحیح حقیقت کو واضح کیا اور لکھنے کے انداز نے واقعی مزہ دیا، مبارک باد۔ سیار ضار دا آپ کی سوداگری نے تو بین مول خرید لیا کہ اسی موضوع پر میری تحریر اصحوری پڑی ہے لیکن اب ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ایک مکمل مصنفہ اس موضوع کو مکمل طور پر احاطہ تحریر میں لا کر بہت ہی خوب صورت الفاظ کی ہمراہی میں ایک بہترین سبق قارئین تک پہنچا دیا۔ صفحہ ایسی تحریر ہے کہ اس کے لیے جتنا کھسوکھس ہے البتہ اس پر مکمل تبصرہ کہانی کے اہتمام پر ہی کرنے کا ارادہ ہے۔ فی الحال پیاری وردان نوشین جی کے لیے بہت ساری دعا کریں کہ صفحہ ایک یادگار تحریر رہے گی ان شاء اللہ..... عائشہ تنویر کی تیرے آس پاس میں مجھے اپنی بیٹی کی شادی کا دن یاد آگیا کہ لوگ واقعی شکل صورت کے سوازیں میں لازمی پڑتے ہیں۔ میری بیٹی بھی بے تحاشا حسین ہے ماشاء اللہ..... تو بہت سارے لوگوں کو میرے داماد کے لیے یہی کہی گئی کہ وہ میری بیٹی کے مقابلے کم وجاہت رکھتا ہے لیکن اصل چیز چہرہ نہیں عادات ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو نیک سیرت لوگ ملیں، ماشاء اللہ عائشہ آپ نے بہت اچھا لکھا۔ سر پرانہ سنے سال کے موضوع پر ایک مختصر افسانہ تھا موقع کی مناسبت سے مریم نے لکھا یا اس میں ہیرو نے سر پرانہ کا تو ایسے کھڑا پھلکارا کہ بھاری ہیروئن کو خوب دلایا ایسے لڑکے کی تو اختتام میں جھستروں دل ہونی چاہیے تھی..... اب ایک حرمے جو طاری ہونے لگا ہے ایک نار کے ہاتھوں، جی ہاں بالکل بے سارہ کوئی اور نہیں ہیں من جاں باز موالی حرمہ ساجدی ہیں کمال کرنے والی خاتون بہت مبارکاں وہ بھی پیشگی۔ فائزہ خان نے بھی سلونی لکھ کر اسی فلسفے کو اجاگر کیا کہ خوب صورتی سب کچھ نہیں ہوتی ہے۔ شہید گل نے بہت خوب صورت ناول لکھا ماشاء اللہ..... بہت اچھی لکھاری بن کر ابھری ہیں، آئندہ بھی ان کی تحاریر کا انتظار رہے گا۔ تحسین گل کی سب مایا ہے تو سامنے کے ایک واقعے کی یاد دلا دی، یہ بات سچ ہے اب یہ بات بھی قابلِ شرم کچھ بھی جانے لگی ہے کہ بچے دو سے زیادہ ہوں اور جن کی تو ایک لڑکی ایک لڑکا ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں اب ہم نے دنیا فتح کر لی لیکن قدرت نے کیا لکھ کر رکھا ہوتا ہے اس سے ایک دم بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے، آمین۔ سیما بنت عاصم نے اپنوں کی بے حسی، روتیوں کی بد صورتی اور کرداروں کو جس طرح لکھا گویا سب مجھے آس پاس محسوس ہوتا رہا جیسے میں اس تحریر کو پڑھتے اس تحریر کا ایک کناں حصہ بن گئی جو موجود تھا لیکن ظاہر نہ تھا۔ جی اتنی ہی دلکش ہیرائے میں لکھی گئی تحریر بھی را کہ جو کئی لاکھ کی گئی بہت اچھی لکھی مصنفہ کو مبارک باد..... اختر شجاعت کی تحریر کے بغیر تو ہمیں پاکیزہ ویران لگے گا، یہ الگ بات ہے کہ اختر شجاعت جی نے میرا نام بھی نہیں لکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ اب وہ سارے جہان کے نام تو لکھنے سے رہیں، اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے بہت اچھی باتیں انہوں نے ہم تک پہنچائیں، خوش رہیں آمین۔ فاطمہ حسن سے گفتگو واقعی بہت مفید اور دلچسپ رہی۔ واہ جی ماشاء اللہ..... آسیرہ عامر جیتی رہیں بہت خوب صورت انداز میں آپ نے نیلوفر جی سے ملاقات کا احوال تحریر کیا اور سب ہی نہیں بہت پیاری لکھ رہی تھیں لیکن اب نزہت، آمنہ بی زیادہ تر نظر آتی ہیں، عذرا آپا کا دایاں بازو بنی اور یہ سچ بھی ہے کہ پاکیزہ واقعی روز بروز نکھر رہے تو اس میں ان دونوں سکھیوں کی بہت زیادہ محنت کا کمال ہے اور ہم ان کے ممنون ہیں کہ جب بھی ہم نے عذرا ایسا سے آمنہ تک تینوں کو پکارا تو بہت ہی محبت سے ہماری بے گئی باتوں کو بھی انہوں نے برداشت بھی کیا اور مطمئن بھی۔ بہت شکر ہے..... (ارے ڈیڑھ تو ہمارا فرض ہے ناں) بہنوں کی محفل میں بہت اچھا لگتا ہے جب ہماری قاری نکشیں اور لکھاری ہمیں تحریر کی تعریف کرتی ہیں تو حوصلہ دو چند ہو جاتا ہے ان تمام بہنوں کا شکر یہ جنہوں نے سراہا اور سب بہنوں کا شکر یہ جنہوں نے میری بیٹی کی شادی کی مبارک باد دی اور پاکیزہ کا شکر یہ کہ وہ ہماری ہر خبر پر آپ دوستوں تک پہنچاتا ہے سلامت رہے ہمارا پاکیزہ..... اب اپنے ناول کے شائع ہونے کی خوش سنبھالنے نہیں سنبھال رہی امید ہے قارئین ہماری تحریر کی کمی بیشی پہ معاف کر دیں گی اور تنقید میں ہتھ ہولا رکھنے کی پالیسی رکھیں گی معصوم سادل ڈر رہا ہے۔ (تعریف کے

سب ہی بہترین تھا۔ سارا ڈائجسٹ متاثر نہ تھا اس بار تیسرہ کرنے کا موقع مل گیا اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے اور بہنوں کی محفلیں جیتی رہیں، آمین....." (بے حد تفصیلی خط کا شکریہ سب کے خطوط شامل کرنا ہوتا ہے میں اس لیے فنی چلائی پڑی)

کچھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "خوب صورت مردوق سے صحافری کا پاکیزہ جلدی مل گیا۔ دین کی باتیں اور شجہ ہدایت پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ فاطمہ حسن جو کہ معروف ادیبہ اور شاعرہ ہیں سے گفتگو پسند آئی۔ ان کے بارے میں بہت کچھ جان کر بہت ہی اچھا لگا۔ ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام پڑھ کر یوں لگا جیسے ہم بھی وہاں موجود تھے اگر تصاویر گھڑی ہوئی تو اور مزہ آجاتا۔ بہت دلچسپی ہو گئی کہ ہم اقرب میں کیوں موجود نہیں تھے۔ پھر سوچا کہ کراچی سے بہاول نگر کا فاصلہ ایک ہزار کلومیٹر ہے تو کیا ہوا دل تو ہمارا وہاں پہنچا ہوا ہے، ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمیں کراچی میں گھر بنانا چاہیے تاکہ ہر ایک دو ماہ بعد پاکیزہ کی تقریب میں تو شریک ہو جایا کریں گے۔ (آپ آئیے تو کسی) نیلوفر عباسی آپلی جب ریڈیو پر کرکٹل پروگرام سنا کرتی تھیں ان کے پروگرامز میں میرے مہیاں جانی پرس افضل شاہین نے بہت سے انعامات جیتے تھے اور یہ بات ہماری شادی سے پہلے کی بات ہے۔ عذرا آپ کی بہت پرانی رائٹر خالدہ شمیم ملیں، ہم انہیں مبارک باد دیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نند فریدہ جاوید فری کے بھائی عبداللہ خان اور فریدہ اور امینہ عنایب کو مکمل صحت دے اور عالیہ بخاری کے شوہر اور فیضہ آصف خان کے جوان سال، بہنوں کو جنت میں جگہ دے اور لواحقین کو ہر میل عطا فرمائے، آمین..... مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے جو خبریں دس جنوری کو بھیجی تھیں وہ فروری کے شمارے میں جو کہ مجھے تین تاریخ کو ملا ہے شائع ہو چکی ہیں۔" (حیرت نہ کیجئے، ایسے ہی ہوتا ہے، تبصرے کا شکریہ)

کچھ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ "فروری کا شمارہ پاکیزہ اپنے دلکش نائٹل کے ساتھ ملا۔ مجھے کچھ کہنا ہے بے حد اچھا لکھا۔ اس مرتبہ سب کے افسانے بہت اچھے لگے۔ طیبہ عنصر منٹل کا ناول طواف آرزو بے حد پسند آیا مبارک ہو، طیبہ بی۔ بے حد سلام دعا اسی طرح اچھا، اچھا تھی رہو شکریہ..... ماہ نور کی شادی کی بے حد مبارک باد..... کافذی رشتے، ایک کی مینا ہونا کڑی، سر پرانزہ سلونی، سب مایا ہے بہترین خبریں سب کو مبارک باد..... دردناکوشین اور سجادہ ظفر کے یاد کرنے کا شکریہ..... دردناکوشین جی صفحہ ناول کی بات ہی اور ہے کیا شاندار ناول لکھا ہے مزہ آگیا۔ پاکیزہ تو ہمارا ہیورٹ میگزین ہے، میگزین سے اسے پڑھ رہے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں شگفتہ شقیق کی نعت نے دل کو درد دیا۔ یاسمین کنول کی غزل بہترین لگی۔ نظم فریدہ افتخاری اچھی لگی۔ اپنی بھابی پروین افضل کا لیلیف پڑھ کر بھی آئی۔ رونی بھی لکھانی ہے، پڑھ کر بے حد پسند آئی۔ اکثر گفتگوائی ہوں میں سب نے اچھا لکھا۔ طاہرہ بی آپ خوشاب میں کس جگہ رہتی ہیں؟ کیونکہ ہمارا خوشاب آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہماری نانو خوشاب گلی نمبر 5 میں رہتی ہیں۔ (چلیں ڈاک خانے مل گئے) پروین بھابی دعاؤں کا بے حد شکریہ....." (تبصرے کا شکریہ..... دعاؤں کے لیے بڑا اللہ..... ہم بھی آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو رہتے ہیں)

کچھ فرحت احمد، گلشن حدید، کراچی سے۔ "امید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گی۔ بہنوں کی محفل میں عذرا باجی کی حاضری دل کو خوش کر دیتی ہے۔ ان کے غلوں اور محبت کے ہم تو مداح ہیں ہر ایک سے ایسے ملتی ہیں کہ سامنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے برسوں کی جان بچان اور ملنا ملتا ہے، انہیں تو یاد بھی نہ ہو مگر مجھے تو یہ بات بھوتی ہی نہیں ہے کہ ایک کتاب کی روفا کی تقریب بھی۔ ہائی ٹی کے وقت وہ میری پلیٹ میں اپنے ہاتھوں سے چیزیں رکھ رہی تھیں حالانکہ پہلی ملاقات تھی اور بولنے کا انداز ایسا کہ دل موہ لے۔ میرے خیال میں جو بھی ان سے ایک مرتبہ ملا ان کے غلوں اور محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ڈیروں خوشیاں اور زندگی میں اطمینان اور کھنکھنایاں دے، آمین۔ (جی بالکل وہ ایسی ہی ہیں آپ بھی تشریف لائیں اور ملیں) سب سے پہلے تو ذکر کروں گی نیلوفر عباسی کے اعزاز میں وہی دہائی پارٹی کا پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ اپنی کی خود کو یہی ہے حد محسوس ہوئی۔ کافی سال پہلے اسی طرح کی ایک تقریب میں جس میں نیلوفر صاحبہ بھی تشریف لائی تھیں۔ میں بھی شریک ہوئی تھی اور ان کے ساتھ تصویریں بھی بنوائی تھیں۔ اور سب کو دکھائیں بھی تھیں۔ ہمارے لیے تو یہی اعزاز کی بات ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ ملاقات ہو یا بات ہو۔ (جی آپ آنے کی ہاں میری تو اتنی دفعہ ضرور یاد رکھیں گے) اب آتی ہوں تبصرے کی جانب..... سب سے پہلے جنوری کے شمارے میں شائع ہونے والی عقیدہ حق کی تحریر حاصل لا حاصل کی تشریف کروں گی۔ بہت اچھی تحریر۔ ناول طواف آرزو کا پہلا حصہ پسند آیا۔ دوسرے ناول، تبصرے آس پاس میں صدف کا انجم اچھا تھا مگر تشنہ تھا۔ صدف کی والدہ کو تو کبھی بھی کم حیثیت خواہ وہ مالی ہو یا تعلیمی پسند ہی نہیں آتی تھا۔ وہ کس طرح راضی ہوئیں۔ صدف بہترین جارہا ہے۔ افسانوں میں سب ہی اچھے لگے۔ مگر خاص طور پر ایڈیٹر کیوں

اور عبادات کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو نیکی کی توفیق عطا کرے، آمین۔ اور درودانہ توشیح کو صحت کے ساتھ زندگی دے آمین۔ (بہت خوب سعدیہ، اللہ تعالیٰ سب ہی کو نیک بنائے) ماہ جنوری میں اساطیر کی ریگ زار بہت خوب صورت تحریر بھی واقعی عورت ہو یا مرد بان کی محاسن یا زبان کی نئی انسان کو اس کی اہمیت سے آگاہی دلاتی ہے۔ یہ زبان ہی تو ہے جو مثنوی میں سی کے دل میں جگہ بنا ڈالے اور جب چاہے بندہ نظروں سے گر جائے۔ مبارک باد کی توفیق میں اس کہانی سے سبق حاصل کرے گی اور آپ کو دعا دے گی۔ واپس اور شافاروق سے ملاقات بھی دلچسپ رہی۔ اس باوجود ہدایت میں آخر شجاعت کی خوب صورت تحریر پر وہ پوچی کے حوالے سے لکھی گئی تھی اور ہم خواہش کی اکثریت ایسی ہے کہ ہم واقعی کسی کاراز، راز نہیں رکھتیں۔ بات بھی ایک امانت کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی کے راز کو امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کریں گے تو اللہ بھی ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ باقی تو سارے افسانے کہانیاں حسب معمول اچھے ہیں۔ ایک بار پھر زہت کا بہت، بہت شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور عذر را رسول کے چمن کو گل و گلزار بنائے رکھے، آمین۔ (جزاک اللہ خیر) اتنا پیار کرنے والی قاری ہمیں ہوں تو یہ چمن ان شاء اللہ سدا بہار ہے گا)

بھہ ساجدہ ظفر، مکالمہ سے۔ ”ٹھنڈی، ٹھنڈی ہواؤں کے رنگ پاکیزہ فردی کا شمارہ نظر نواز ہوا تو سرورق کی حسرت کی جانب نظریں جم گئیں کیونکہ حسرت کچھ اداس، اداسی نظر آ رہی تھی کہ جیسے اس کے کان میں درد ہو۔ اور وہ درد کا اثر کم کرنے کے لیے کانپیں کا بوجھ اتارنا چاہ رہی ہو۔ (واہ کیا اسٹوری بنائی ہے) ادارہ یہ خوب صورت اور سبق آموز تھا۔ جس میں جدیدیت اور ماضی کے درمیان ربط قائم کر کے خوب صورت باتیں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانوں میں سیمارضا ردا کا افسانہ سودا گرو اور میرم شہزاد کا افسانہ سر پران پڑھ سکی ہوں جو قابل تعریف ہیں۔ شجاعت میں آخر شجاعت صاحبہ کا بدگمانی، ممانعت الہی ایک سیر حاصل مضمون تھا۔ جسے موصوفہ نے نہایت عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے۔ مضمون میں ایک جگہ انہوں نے تحریر کیا ہے کہ برائی کے وسوسے ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ اس کی تکذیب کرنی ہے۔ مگر تکذیب کیسے کرنی ہے یہ نہیں بتایا۔ اگر کسی کے علم میں ہو تو ضرور بتا دے۔ وہ آئے بزم۔ میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب و شاعرہ فاطمہ حسن سے دلکش گفتگو دل میں گھر کر گئی۔ اور ان کا پسندیدہ شعر۔

ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھینگی..... میں درختوں پہ چھوڑ آئی ہوں اپنے ہاتھ کے رنگ

میں نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا (بالکل ٹھیک کیا) ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام کی تقریب کی رنگ کثرتی آسیہ عامر نے بہت خوب صورت انداز میں پیش کی۔ نیلوفر عباسی کے نام بہت پرانے فین ہیں جب وہ ریڈیو کے کمرشل پروگرامز میں اپنی آواز کا جادو جگایا کرتی تھیں۔ کتاب دہشت کا ترجمان موجودہ حالات کے لحاظ سے وقت کی ضرورت اور اہم سروے تھا۔ شاید اہل علم کے خیالات و نظریات پڑھ کر موجودہ نسل پھر کتابوں کی جانب راغب ہو جائے۔ گوشہ طرائف میں چوہدری سردار محمد خان عزیز کی کتاب دعوت لطائف کے اقتباسات زیادہ متاثر نہ کر سکے کیونکہ اکثر اقتباسات لطائف کی شکل میں ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں قارئین بہنوں سے اچھی ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور ان کی مزید اسرگرمیاں پڑھ کر دل فرط مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ عالیہ بخاری کے شوہر کے انتقال پر ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ پاکیزہ ڈائری میں نازنین آفریدی کے فضائل ذکر پسند آئے۔ میں اکثر سنگٹاتی ہوں میں معیاری اشعار پڑھنے کو۔ جبکہ بزم پاکیزہ میں انعامی سوالات کے علاوہ نسیم کوثر کراچی اور پروین افضل شاہین کے سوالات بھی دلچسپ تھے۔ پروین افضل شاہین کی تجویز کی ہم مژدورتا تیار کرتے ہیں کہ پاکیزہ ڈائری اور اشعار کے صفحات پر بھی منتخب تحریر اور اشعار پر انعامات دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے جیسا کہ چند برس قبل ہوا کرتا تھا۔ (ہاں ضرور خود کیا جائے گا)

بھہ خولہ سعید جاوید، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کی بہت ممنون ہوں جنوری کے شمارے میں اپنا خط دیکھ کر انتہائی خوش ہوئی۔ تمام افسانے اور مستقل سلسلے قابل تعریف ہوتے ہیں۔ مجھے اپنا افسانہ نہ چھینے کا بہت افسوس تھا لیکن یقین جانیں آخر شجاعت نے میری اتنی عزت افزائی کی کہ افسانہ بہت پیچھے رہ گیا۔ دل بدلنے پر اللہ قادر ہے اور آخر شجاعت آپ اللہ کی پسندیدہ اور خوش نصیب ہیں، میرے لیے بھی دعا کریں کہ دل کی دنیا بدل جائے آپ آج جس مقام پر ہیں وہاں آپ نے میرے نام سے مجھے یاد کر کے معتبر کر دیا۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کی اولاد کو اس جہان اور اگلی دنیا میں بہترین اجر سے نوازے۔ (انہی آمین) شادی سے پہلے بہت سارے کام بھی کیے اور ہر سال بھی پڑھا لیکن شادی ایسا امتحان ثابت ہوئی جہاں عرصہ دراز کے بعد

بہی پتا چلا کہ مستقل مکمل ہونا بھی بڑا اعزاز ہے جو بہت سارے لوگوں کو ملتا ہے لہذا دودھ بایاں گزار کر پھر ماضی میں جھانک لینے کو دل چاہا جہاں اختر شجاعت نے بھر پور دائے دے کر دل اندر سے خوش کر دیا۔ آپ کو اس زمانے میں صرف آپ کی تحریروں سے جانا اچھے لوگوں کو اللہ دلوں میں آکر دکھاتا ہے جب چاہو یا دکر لو آپ کو تو پھر ہم جیسے دنیا دار لوگوں کے لیے مثال بنادیا کم از کم میرے لیے کیونکہ بھی بنک میں چاہ کرنا میرا بھی خواب تھا۔ پاکیزہ کی تمام رائز اور قارئین ایک بڑی فیملی کی طرح ہیں جس کی کمر میں بھی ہوں بس لکھنے میں سستی تھی۔ اللہ پاک سب کو خوش رکھے۔“ (بہت پیاری باتوں کے لیے جزاک اللہ۔ اللہ آپ کے لیے آسانیاں پیدا کرے، آمین)

کچھ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ”فروری کا پاکیزہ اپنی خوب صورتی اور دل آویز تحریروں سے دل میں اترا محسوس ہوا۔ خاص طور پر بہنوں کی محفل کا تو کوئی مول ہی نہیں پیاری، پیاری بہنوں کے خطوط بہت اچھے لگتے ہیں۔ ایک اپنا تین سی محسوس ہوتی ہے اور جناب آپ کے ننھے سنے سے جوابات بھی کیا خوب ہوتے ہیں اور خاص کر بہن عذرا رسول آپ کے لیے دعا ہے اللہ تعالیٰ سے کم از کم چار پوتا، پوتی کی تو ضرور داد ہی بیش ان شاء اللہ (امی آمین) نئے شروع ہونے والے ناز میں سر ساجد کا نا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ امید ہے آگے چل کر بہتر سے بہتر ہو جائے گا۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ نار پڑھے، اچھے اور پھر سمجھائے سے کیا مراد ہے (یہ تو کہانی پڑھتے، پڑھتے واضح ہوتا جائے گا) اور میرا سارا رنگ اتار دو۔ افشاں آفریدی کا ناول بھی ٹھیک ہی لگ رہا ہے لیکن پھر بھی اسٹوری کے آگے بڑھنے کے بعد اعزاز ہوگا (جی ہاں) اور صفحہ کی تو کیا بات ہے یہ اپنی مثال آپ ہے۔ درودانوشین خوش رہیے، لگتا ہے درودانہ میں صفحہ جیسی نیک پاکیزہ اظہار ہیں۔ (بالکل ٹھیک کہا) مکمل ناول میں سیما بہت عاصم کا کار کا پڑھنا معذرت کے ساتھ یہ ناول بالکل نہیں بھایا۔ (امی، اپنی پسند ہے مجھی) البتہ طواف آرزو، طیبہ عنصر مغل نے نہایت عمدہ لکھا دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ افشاںوں میں فریدہ سٹی کا افسانہ ایڈو کٹر نمبر دن رہا۔ لڑکیوں، ہوش کے ناخن لو، یو تو قاتل ایڈو کٹر سے اپنی زندگی اور نصیب کو داؤ پر لگانے سے بچو۔ اس کے علاوہ عائشہ تنویر نے بھی اپنا ناول تیرے آس پاس شائد اگلے بہت پسند آیا۔ اسی طرح دوسرے افشاںوں میں کاغذی رشتے، ہفتی فیم کا افسانہ بھی بہت رہا مگر قرۃ العین سکندر کی ایک مٹی بھی ایک بچکانہ طوطا مینا کی عام سی اسٹوری لگی بالکل ایسے ہی مریم شہزاد کا سر براہ بھی بچوں کی کہانی کی طرح تھی۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت کا مضمون ہمیشہ کی طرح دل میں گھر کر گیا بدگمانی کے موضوع پر اپنی تحریر انگیز تحریر نے دل کو چھو لیا اختر شجاعت صاحبہ کو مودبانہ سلام عرض ہے۔ (ان کی طرف سے وٹیکم السلام) ایک شام نیلو فرحیاسی کے نام اس تقریب میں بہت مزہ آیا، آسیہ عامر نے تقریب کا آنکھوں دیکھا حال نہایت دلکشی سے لکھا اچھا لگا۔ دلی دعا ہے کہ پاکیزہ خوب تر ترقی کرے۔“ (تبرے کا شکر یہ)

کچھ عائشہ خان، لاہور سے۔ ”سال نو کی مبارک باد دیتا اجلا، اجلا، کھرا، کھرا پاکیزہ ہاتھوں میں آیا تو دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اسے سجاے اور سنوارنے والوں کا ہر لمحہ صحت و سلامتی کے ساتھ خوشیوں اور کامیابیوں کو سیکھنے کرے۔ (جزاک اللہ) یہ کہاں بچپن کی دل ہے کا اختتام زبردست رہا۔ ویلڈن رفعت جی۔ افشاں آفریدی اور سر ساجد اپنی تحریر کے شروع میں ہی چھاتی نظر آئیں۔ شینہ گل کی تحریر کو آپ نے حسین کہا تو بلاشبہ درست کہا۔ بہت اچھا لکھا شینہ نے۔ عقیدہ حق کے حامل لا حاصل نے بہت، بہت اداس کر دیا۔ درودانوشین خان کا صفحہ ہر حصہ پہلے سے زبردست، محبت لفظ ہے لیکن کا اختتام اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان جو بوتا ہے اسے کاٹنا ہی پڑتا ہے کاش یہ بات ہم جان لیں۔“ (مختصر تبرے کا شکر یہ) آپ کے ناول کی بھی جلد باری آئے گی)

کچھ حمزہ علوی، بالائین، سندھ سے۔ ”جنوری کا پاکیزہ بہت دی آئی بی تھا ایک، ایک کہانی لا جواب تھی۔ رفعت سراج نے ناول کا اینڈ بہت اچھا کیا اصل مزہ آیا۔ نئے ناول سر ساجد اور افشاں آفریدی دونوں کے ہی کمال کے لگے۔ باقی کہانیاں اور سلسلے بھی اچھے تھے۔ آپ کو سال نو کی مبارک باد ہو۔“ (بہت شکر یہ تبرے کا)

کچھ صفیہ مہر، فتح پور کمال سے۔ ”پاکیزہ اس بار بھی زبردست تھا۔ سب رائز بہت پیارے قلم سے موتوں جیسے الفاظ بکھیرتی ہوئی ہمارے ذہن منور کرتی ہیں۔ اس کا دوری کا افسانہ بہت اچھا تھا۔“ (تفصیلی تبرے بھیجیں)

کچھ نیہال علی، مٹان سے۔ ”نہزت آپنی میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور تمام کہانیاں ہی پسند آتی ہیں اسٹیلی رفعت سراج کا ناول بہت پسند ہے۔ آپنی افسانے چار پانچ ہی دیا کریں اور ناول اور مکمل ناول زیادہ دیا کریں (ہر ماہ آپ کے لیے ہم ورائٹی دیتے ہیں سبھی افسانے بھی ناول زیادہ)

کرتی ہوں خاص کر ان لوگوں کے لیے جو تنگی کر رہے ہیں۔ تنگی کی دعوت دے رہے ہیں۔ تنگی کی طرف بلا رہے ہیں لیکن کبھی، کبھی خاص نام بھی زبان پر آ جاتے ہیں۔ جیسے نہت آپ کا نام۔ انجم انصار، عذرا بہن، ذکیہ، بہن، اختر شجاعت، غیرہ احمد، نمرہ احمد، گلہت سیما، افشاں آفریدی..... خدا سب کو ان کی تنگیوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ (آمین) بہت سے لوگ ایسے ہی تنگی کے کام کر رہے ہیں۔ دعا کرتی ہوں کہ ان کے راستوں کی رکاوٹیں دور ہوں اور ان کو کامیابی ملے۔ اچھا اجر عطا ہو۔ یہ دنیا تو بہت ہی مختصر وقفہ ہے۔ کسی عمر تو آخرت ہی میں ملے گی۔ جس نے اس طرف جانے کے لیے کچھ تیاری کر لی وہی کامیاب ہوا اور ابدی آرام پا گیا۔ خدا ہم سب کو توفیق عطا فرمائے تنگی کرنے اور روشنی حاصل کرنے کی، آمین۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے اس دفعہ رسالہ مطالعے میں نہیں آیا۔ اچھا یہ ہوگا جیسا کہ ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ سب بہنوں کے لیے سلام اور نیک خواہشات۔ (کوئی بات نہیں آپ تو ہمیشہ ہی تہنہ کرتی ہیں آپ کی کبھی تنگی شاعری بھی لکھتی رہتی ہے۔ اپنا خیال رکھیں)

بھہ ہما علی..... اسلام آباد سے۔ ”ان سب بہنوں کا بے حد شکر ہے کہ جنہوں نے میری صحت یا بالی کی دعا کی۔ نہت بہن، پاکیزہ کی محفل میں ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ الحمد للہ اب طبیعت بہتر ہے۔ لینے، لینے بھی پورا رسالہ پڑھا۔ اس مرتبہ خولہ عرفان کی لکھنؤ عرفان رب بہت عمدہ تھی۔“ (بہت شکریہ، اب تفصیلی تبصرہ کرنا)

بھہ عصمت، ادا کاڑہ سے۔ ”پاکیزہ سے تو میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ میں سرگودھا میں ہوں ادا کاڑہ یا پھر لاہور..... پاکیزہ سے رابطہ رہتا ہے اور بہنوں کی محفل سے سب کی خیر خیریت بھی پتا چل جاتی ہے۔ (جی بالکل یہ آپ لوگوں کی ہی محفل ہے) میں آیا مٹی رال کے پاس سرگودھا آئی ہوئی ہوں ان کی طبیعت خراب ہے۔ (اللہ صحت دے) اور میری بھانجیاں امیر گل اور کنز علی گل بھی آئی ہوئی ہیں۔ مجھے پاکیزہ کے سارے سلسلے پسند ہیں۔ روحانی تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ عمل بھی کرتی ہوں اور دوسروں کو بھی بتاتی ہوں۔ اگر کسی سے قرض واپس لینا ہو تو اس کے لیے کوئی عمل ضرور بتائیں۔ (اس دفعہ بھی شامل ہے اور اگلی دفعہ بھی ضرور بتاؤں گی) مصنفات سے انٹرویو بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ مہرین کنول، لودھراں۔ آپ کی یہ کہانی ناقابل اشاعت ہے دوبارہ کوشش کریں، رسالے پر اے بھی ضرور دیں۔
✍ غزالہ نیل راء، ادا کاڑہ۔ بھہ سیدہ، مردان۔ بھہ ماہوش طالب، لاہور۔ بھہ انیلا طالب، گوجرانوالہ۔ آپ کی کہانیاں جلد لگیں گی۔

✍ مہناز، جہلم۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔
بھہ سائرہ خان لاشاری، کہونڈہ سے۔ ”میں پاکیزہ بہت عرصے سے پڑھتی آ رہی ہوں مگر بہنوں کی محفل میں کبھی شامل نہیں ہوئی۔ چاہ کی وجہ سے نا تم نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میری دعا ہے پاکیزہ اور کامیابیاں سیٹھ، آمین۔“ (دعاؤں کا شکریہ رسالے پر تبصرہ بھی کریں)

✍ صبا فیصل آباد۔ آپ پہلے تبصرہ تو لکھیں پھر کہانی بھی لکھ ڈالے گا۔
بھہ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”میرے ناولنگو کی چندا کو سب نے پسند کیا..... مجھے بہت خوشی ہوئی۔ سب بہنوں کی پسندیدگی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ رفعت سراج کا ناول ختم ہوا تو بہت دکھ ہوا۔ بڑا زبردست ناول تھا۔ ہر ماہ انتظار رہتا تھا اس کی نئی قسط کا۔ امرت بھی بہت زبردست تھا۔ امرت تو میری بہن تھی۔ میں بھی اسی طرح رشتے نبھانے میں خود کو بھلا دیتی ہوں۔ چلو اب نئے نئے ناولوں میں دل لگائیں گے۔ (جی بالکل)۔ صفحہ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اسے اگر معلوماتی ناول کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ نہت ڈیز..... ابھی شمارہ پورا پڑھا نہیں ہے سو تبصرہ نہیں کر سکتی لیکن جو کچھ پڑھا ہے ابھی تک اسی پر بات کروں گی۔ نیلوفر عاصی تو تب سے میری فیورٹ ہیں جب وہ شہزادی میں کام کرتی تھیں۔ اب یہ نہ کہنا کہ ہائے شمیم..... تم اتنی پرانی ہو۔ (ارے آپ سدا بہار ہیں ڈیز) تب میں شہزادی کی بہادری کو رشک سے دیکھتی تھی کہ ہائے نیلوفر تھی بولڈ ہے اور میں متقی ڈرپوک ہوں۔ رشک تو مجھے اب بھی نیلوفر پر آتا ہے وہ اس لیے کہ خدا انہیں نظر بد سے بچائے۔ (آمین) لیکن وہ وہی شہزادی والی نیلوفر ہے نہ ان کا وزن کم ہوا نہ زیادہ..... نہ ہی کوئی اور تبدیلی آئی، لگتا ہے جیسے وقت نیلوفر کو چھوئے بغیر آگے نکل گیا ہو۔ خیر اللہ ان کی عمر دراز کرے اور بہت خوشیاں دکھائے، آمین۔ (نیلوفر بھی پاکیزہ سے وابستہ سب راسخز اور ریڈرز کے لیے بہت پُر خلوص جذبات رکھتی ہیں اور آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں) وہ سب ہمیں جو بیمار ہیں ان کے لیے دعائے صحت۔ عالیہ بخاری کے

شوہر کو خدا مغفرت نصیب کرے (آمین) عالیہ میری فوری ضرورت راکٹر ہے۔ فیصلہ آصف خان کے بہنوئی کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔ فریدہ فخری کے لیے اور ان کے بھائی کے لیے خصوصی دعائیں۔ غدار رسول کی پوتی کے لیے بہت ساری مبارک بادیں۔“ (بہت شکر یہ مبارکبادوں اور تبرکے کا)

بھئی آسیہ عامر، کراچی سے۔ ”بزم پاکیزہ میں پہلا انعام میں اپنا نام پڑھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ Pakeeza is my best friend مجھ سے کسی نے پوچھا کہ میرا بیسٹ فرینڈ کون ہے کراچی میں تو میرے منہ سے یہی نکلا۔ کیونکہ جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس مینیے تو انتظار کی انتہا ہو گئی میرے شوہر اور بچوں نے تو میرا مذاق بنایا کہ میں دیوانی ہو گئی ہوں پاکیزہ کے لیے۔ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ (رسوائی کی کیوں بھیجی یہ تو تمہارا غلوں سے پیاری) سب سے پہلے مریم شہزاد کا سر براہ پڑھا۔ سری میں گزارے ہوئے دن بڑی شدت سے یاد آئے۔ رفعت سراج کو کوئی کی شادی بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نیک نصیب کرے، (آمین) یا مبین رشید آگئی تو اللہ تعالیٰ تندرستی دے۔ سحر ساجد کا نار اور افشاں آفریدی کا میرا سارا رنگ اتار دو اچھے ناول شروع ہوئے ہیں ابھی تو شروعات ہے۔ آگے، آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ (اچھا ہی ہوگا) عقیدت حق کا حاصل لا حاصل بھی اچھا تھا لیکن عقیدہ کی ہر کہانی میں رضائی کیوں ہیرہ ہوتا ہے؟ (اتفاق ہے بھی) انٹرویو تو آپے پڑھا جسے سر پر گن رکھ کر کہہ دیا گیا ہو پڑھا اور پڑھ کر ہی دم لیا۔ طواف آرزو، لیبر روم میں ہی پتا چل گیا تھا کون سا کس کا بچہ ہے لیکن پھر بھی تجس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسرے حصے کا انتظار کر رہے ہیں۔ نزہت جبین ضیا کا یہ دل کے رشتے ہیں ہمیشہ کی طرح ایک اچھی کہانی تھی۔ شمیم فضل خالق کا گلو کی چندا جیسی بھاگوان، ہوا ایک ہمارے مگر بھی آجائے تو کیا کہنے۔ (ہا ہا ہا) اچھی تحریر ہے۔ شبنم گل کا سایہ اور شہر ابھی پہلا حصہ پڑھا ہے بڑے اچھے مذہبی طریقے سے ساسوں کو سیدھے راستے پر لایا جا رہا ہے لیکن بہن سائیں ڈائجسٹ پڑھتی کب ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تو یا tabata ہوتا ہے یا وی کار میوٹ۔ ہاں عارف احمد کا کردار تو میرے شوہر سے ملتا جلتا ہے ماشاء اللہ وہ بھی ایسے ہیں۔ (اچھا بھی) تحسین گل کا سب مایا ہے بالکل آج کل کی بچیوں کی یہی سوچ ہے وہ تو شادی سے پہلے پلاننگ کر رہی ہوتی ہیں یہاں تک کہ اگر انڈر سٹینڈنگ نہ ہو تو حلاق کے لیے لیں گی۔ لہذا ایک سال تک بچہ نہ پیدا کیا جائے اللہ معاف کرے۔ جمالی کی نظم پڑھ کر دل دہل گیا۔ بہن تھوڑی سی بیماری کیا آئی آپ نے تو لاکھ رکھ دیا، یہ نظم آپ کے دل کی آواز نکلتی رہی ہے مجھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی دے اور اپنے بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔ (الٹی آمین) سلوٹی، فائزہ شیخ نے بہت اچھی بات کی کہ اپنے قیمتی آنسو اس لیے نہ بہائے جائیں کہ آپ سانولی ہیں جج میں اگر کبھی سانولی عورت سے پیار ہو جائے تو وہ بہت شدید ہوتا ہے۔ عائشہ تنویر کا تیرے آس پاس اچھی تحریر ہے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح شاندار۔“ (تبرکے کا شکر یہ انعام تو مل گیا ناں!)

اچھا بہنو۔..... خطوط تو تقریباً سب ہی مرتب ہو چکے تھے بس ابتدائی اور اختتامی ہی لکھنے جارہے تھے کہ جناب معراج رسول کی وفات کی خبر آن پہنچی..... ایسا لگا کہ اب مزید کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ فی الحال محفل کے صفحات پورے ہوئے۔ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے مگر نہایت دل گرنگی کے ساتھ کہ تعزیتی اور بدسعدی کے نامے شامل ہوں گے۔ بہر حال یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے، نظام قدرت ہے، ہر بشر کو جو دنیا میں آیا ہے واپس اپنے رب کے حضور جانا ہے۔ بس ہمیں ایک چہ، کچے راست باز مسلمان کی حیثیت سے اپنے نیک اعمال کا پلڑا اپنے پروردگار کی مدد اور توفیق سے ہماری رکھنا ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ہر آن، ہر گھڑی ہمارا مددگار اور ناصر و یاور ہو۔ آمین آمین!

آپ کی خیر خواہ
نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63c فیئر III یکمشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200, 021-35386783, 021-35802552 EXT 107, 118



حمد باری تعالیٰ

ہے حشر کا دن حاضر دربار ہیں بندے
یارب تیری رحمت کے طلب گار ہیں بندے
تو خالق عالم ہے سزا دے کہ جزا دے
مجبور ہیں، مجرم ہیں، گنہگار ہیں بندے
تو مالک و مختار ہے بخشے کہ نہ بخشے
شرمندہ ہیں، نادم ہیں، خطاوار ہیں بندے
ستار ہے، غفار ہے، تو خالق کل ہے
مایوس ہیں، معذور ہیں، لاچار ہیں بندے
اک جنس گراں مایہ ہے، مولا تری رحمت
بے زر ہیں، بڑے مفلس و نادار ہیں بندے
حقا، ترا ہمد ہے، نہ ثانی ہے، نہ ہسر
کرتے تری توحید کا اقرار ہیں بندے
مایوس منور ہے ترے رحم کا طالب
ہے حشر کا دن، حاضر دربار ہیں بندے

کلام: منور بدایونی

انتخاب: صبا نور، لید

نعت رسول مقبول

خدا کا ہے کرم کتنا کہ اس نے آپ کو بھیجا
نہ ہوتا آپ کا سایہ تو ہم جانے کدھر جاتے
سکھائے آپ نے آداب زندگی ورنہ
بھٹکتے رہتے عالم میں ادھر جاتے ادھر جاتے
لگا دی پار کشی آپ نے احساں کیا ہم پر
وگرنہ بیچ دریا میں گھرے ہو کر ٹھہر جاتے
وہ اک پیغام بھیجتی جو دیکھا آپ سے ہم نے
وگرنہ ہم تو لڑتے اور جھگڑتے پھر بکھر جاتے
جلائے آپ نے امید کے روشن دیے ہر سو

نہ ہوتی روشنی کیسے پھر ہم جنت میں گھر پاتے
یہی روئے کی جالی ہے ایسی جس نے بخشی ہے
نہ ہوتی یہ تو سب مدہوش دوانے کدھر جاتے
محمد آئے بخش بن کے اس تاریک دنیا میں
نہ ہوتی شمع یوں روشن تو پروانے کدھر جاتے

انتخاب: ممتاز خانم، کراچی

مناجات

پر دے غفلت کے نگاہوں سے ہٹا دے یارب
ہر برائی سے میرا پیچھا چھڑا دے یارب
میں گناہوں کے کھنور میں ہوں پھنسا اے مولیٰ
بار عیساں کا میرے سر سے ہٹا دے یارب
ایسی عادات عطا کر تجھے راضی کر لوں
نیک بندہ تو مجھے ایسا بنا دے یارب
مجھ کو توفیق دے کرتا رہوں میں نیک عمل
نیک رستے پہ سدا مجھ کو چلا دے یارب
ہو عطا عاصی کو اب حج کی سعادت مولیٰ
میری قسمت کے ستاروں کو جگا دے یارب

عقیدت مند: شکیل ملک، لاہور

ذرا سوچیے تو

ہذا زندگی میں ننانوے درست کام کرو اور ایک
بار غلط تو لوگ تمہارے ننانوے درست کام بھول کر
تمہارا ایک غلط کام پکڑ لیں گے..... یہ انسان ہیں۔
نہیں!

ہذا ننانوے بار غلط کام کرو اور ایک بار تو بہ کر لو تو اللہ
تمہارے ننانوے غلط کام نظر انداز کر کے ایک کچی تو بہ
قبول کر لے گا۔ اسے رحمان کہتے ہیں۔

دن ان ہی کے پیچھے قافلے چلتے ہیں۔
از: نگینہ ضیاء بنگش، سیماڑی

بے عیب خدا کی ذات

☆ ہم میں سے ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے لیکن ہماری یہی خامیاں ایک دوسرے کے لیے عجیب اور پُر تاثیر قسم کے تعلقات بناتی ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ان کی خامیوں کے ساتھ ہی قبول کریں تاکہ ہم ایک دوسرے کی وہ خوبیاں اجاگر کر سکیں جو اپنی خامیوں کی غفلت کے بوجھ میں دب کر ہم نہیں دیکھ پاتے۔

از: ماہینہ ضیاء، کراچی

عنوان بہار

پیدا نئی بہار کے عنوان ہوئے تو ہیں
غنچے سرگستاں غزل خواں ہوئے تو ہیں
گلشن میں اڑتی خاک تھی تشویش جان و دل
چرچے پڑ بہار دبستاں ہوئے تو ہیں
پھولوں کا کھٹنا، خوشبو کا چاروں طرف اثر
گلشن میں گستاں میں چراغاں ہوئے تو ہیں
راہوں میں کھل اٹھے ہیں صبح چاندنی کے پھول
کتنے چراغ آج فروزاں ہوئے تو ہیں
اس کی نگاہ ناز ہے مخفی غمار جاں
چہرے اسی بہار سے شاداں ہوئے تو ہیں
کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

توکل ایک بندھن

اللہ توکل کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔
انسان سوچے کہ اگر اللہ ہی اس کا ساتھ چھوڑ دے تو پھر دنیا کی وہ کون سی طاقت ہوگی جو اسے ذلت و پستی کی دلدل سے بچائے رکھے گی۔ اس لیے جو سچے مسلمان ہیں وہ صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں۔
حضرت ذوالنون مصری کہتے ہیں کہ ”میں نے یقین

کر لیا کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے کو کسی تکلیف نہیں ہوتی۔ اب آپ دو مشہور بزرگوں کی گفتگو پڑھیے توکل پر۔ یہ دو بزرگ ہیں حضرت...
عبدالرحمن ہمدانی اور حضرت ابراہیم الخواصؒ۔

توکل قرآنی اصطلاح ہے اس کے معنی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنا۔ اللہ پر بھروسہ کرنے سے انسان ابھی گھٹائے میں نہیں رہتا۔ دنیا و آخرت میں صاحب توکل کی عزت محفوظ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو یہ پسند کرے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے تو وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اور جس کو سب سے زیادہ دولت مند ہونا پسند ہو اس کو اپنی ملکیت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ توکل (بھروسہ) دل کو امراض حرص سے نجات دلاتا ہے، مہذب بناتا ہے، متوکل کو اللہ تعالیٰ دن رات اپنی عنایتوں سے سرفراز کرتا ہے اور ایسی جگہ سے فتوحات فراہم کرتا ہے جہاں اس کے گمان تک کی رسائی نہیں ہوتی۔ حضرت عبدالرحمن ہمدانیؒ نے حضرت ابراہیم الخواصؒ سے فرمایا کہ میں نے ابھی تک توکل کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بیان کیے ہیں جو اپنی جگہ اتنے جامع ہیں کہ ان پر کسی قسم کا اضافہ ممکن نہیں۔ آپ کے بیان کی روشنی میں توکل افلاس، غربت، فاقہ کشی اور... دریدی کا نام نہیں ہے۔ لوگ سلسل فاقوں میں توکل تلاش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ توکل کے ابتدائی مراحل میں کھو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”من توکل علی کفای یعنی جس نے اللہ تعالیٰ پر توکل یعنی بھروسہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا کام پورا کیا۔ پس توکل پر کمر باندھ اور یقین کر لے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے کو کبھی تکلیف اور ناامیدی نہیں ہوتی۔ حضرت امام رازی نے سورہ یوسف کی تفسیر میں لکھا ہے۔

مصیبت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ (اشفاق احمد)
☆ اس معاشرے کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ
اب چار مسلمان ایک سمت میں اس وقت چلتے ہیں
جب پانچواں مسلمان ان کے کندھوں پر سوار
ہو۔ (اشفاق احمد)

☆ چھوٹے بن کے رہو گے تو بڑی، بڑی رحمتیں
اور نعمتیں ملیں گی۔ بڑا ہونے پر تو ماں بھی بچے کو گود سے
اتار دیتی ہے۔ (بانو قدسیہ)

☆ پریشان ہونے والوں کو تو کبھی نہ کبھی سکون
مل جاتا ہے لیکن دوسروں کو پریشان کرنے والے خود
ساری زندگی پریشان رہتے ہیں۔
از: فرحت احمد، گلشن حدید

غزل

محبت کی ایسی سزا سوچتے ہیں
مگر ہر کسی کا بھلا سوچتے ہیں
کوئی کر کے جائے اگر بے وفا کی
کہ ہم اس کی خاطر وفا سوچتے ہیں
ہمیں تم بھلا دو مگر یاد رکھنا
تمہیں زندگی میں سدا سوچتے ہیں
جسے ہم نے چاہا، اسے زندگی میں
مری جاں مجازی خدا سوچتے ہیں
ہمیں جو ملا ہے یہ شعرو سخن میں
اے اپنے رب کی عطا سوچتے ہیں
فری یوں اندھیروں میں جو لوٹ آئے
اسے زندگی کی ضیا سوچتے ہیں
کلام: فریدہ فری، لاہور

سنہری باتیں

☆ ربّ الہی کے راستوں پر چراغاں کرنے
والے موتی انسان کے آنسو ہیں۔ ان چراغوں اور
موتیوں کی قیمت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے جن کا
خریدار خود رحیم و کریم پروردگار ہے۔
☆ دو چیزیں بڑی اہم ہیں..... اللہ کا ذکر اور اللہ

میری عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ انسان جب کسی کام
میں اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرتا ہے تو یہ شدت امتلا
اور مصیبت کا سبب ہو جاتا ہے اور جب مخلوق کو چھوڑ کر
اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ مقصد عمدہ طریقہ سے حاصل
کر لیتا ہے۔

مرسلہ: فریدہ فضل، ڈالاس

غزل

ہوگی سیاہ رات نظارا نہیں رہے گا
جب آسماں پہ کوئی ستارا نہیں رہے گا
اپنا پرایا کوئی بھی پیارا نہیں رہے گا
دنیا میں کوئی شخص ہمارا نہیں رہے گا
وہ تھام لے گا اس کو رب ہے عظیم تر
جب آدمی کا کوئی سہارا نہیں رہے گا
سانسوں میں گرمی ہوگی نہ آنکھوں میں روشنی
کہتے ہیں لوگ وقت ہمارا نہیں رہے گا
دلہیز دل کی پار نہ کر پائے گا بھی
جب تک وہ آنکھ بن کے ہمارا نہیں رہے گا
بانٹیں گے درد و غم کو اپنے جو درمیان
غم کا کسی پہ بوجھ سارا نہیں رہے گا
آتی بہار ہے خزاؤں کے بعد ہی
یہ وقت بھی کنول جی خدا را نہیں رہے گا
کلام: یاسمین کنول، پیرور

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تم سردیوں کی راتوں میں اپنے نرم گرم بستروں
سے اٹھ کر مجھے یاد کرو۔
میں تنگ، تاریک قبروں کی سختی میں تمہیں یاد
رکھوں گا۔

از: آسیہ عامر، کراچی

بٹے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ انسان بڑی دلچسپ مخلوق ہے۔ یہ جانور کو
تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے لیکن انسان کو

کا در اورس کی ویہ دو میں نصیب ہو گئیں۔ بھگت لوانا دنیا کی تمام سعادتیں حاصل ہو گئیں۔ ڈر ہوگا تو انسان گناہوں سے بچے گا اور در نصیب ہوگا تو عبادت کی تمام لذتیں نصیب ہوں گی۔

☆ نرم مزاجی، اچھا اخلاق اور بیٹھی مسکراہٹ ایمان کی علامت ہے۔ فطری ہو تو اللہ کا کرم اور کوشش سے حاصل ہو تو اللہ پاک کا انعام ہے۔

☆ انسان کی یادداشت کسی چہرے کو محفوظ نہیں رکھتی البتہ اچھے برے سلوک کو ضرور محفوظ رکھتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک کرو کہ جب، جب آپ یاد آئیں آپ کے لیے دوسروں کے دل سے دعائی نکلتے۔

☆ اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا..... اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا۔

از: نصیر آصف خان، ملتان

تفصیلات حادثہ

”لیکن بیگم صاحبہ جس کار نے کمر مار کر آپ کو نیچے گرادیا اس کا نمبر تو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔“

سپانی نے سوال کیا۔

”نہیں، میں نے نمبر نہیں دیکھا۔“ بیگم صاحبہ نے سوچ کر جواب دیا۔

”ہاں البتہ اس کار میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں جو گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھیں۔ کپڑا غلابا لیڈی ہملٹن تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس میں نفلی ہیرا تھا۔ بالوں میں سونے کا کلمپ تھا اور مصنوعی پوشین کا کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔“

خوش معاملگی

دو بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ایک دفعہ اکٹھے بیٹھے تھے اور اپنی، اپنی کمپنی کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ ایک اپنی کمپنی کے طریق کار اور حسن کارکردگی اور خاص کر خوش معاملگی اور قوم کی بلاتا خیر ادا کیگی کے بارے میں بڑی خود اعتمادی سے گفتگو کرتے

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

ہوئے کہنے لگا۔ ہم لوگ کبھی اپنے موٹکوں سے نہیں الجھتے، کبھی جھگڑا نہیں کرتے اور رقم کی ادائیگی وغیرہ سے جان چھڑانے کی بھی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اگر آج کوئی شخص سر جائے تو کل پہلی ڈاک میں ہی اس کی بیوہ کو رقم کی ادائیگی ہو جائے گی۔“

دوسرے ایجنٹ نے کہا۔ ”یہ تو کوئی کارکردگی نہ ہوئی۔ آپ نے گویا اپنی کمپنی کے حسن کارکردگی کی عظیم مثال پیش کی ہے۔ میں اپنی کمپنی کی ایک معمولی سی کارکردگی پیش کرتا ہوں۔ آپ نے مثال پیش کی ہے۔ میں آپ کو ایک امر واقعہ پیش کرتا ہوں۔ جس بلڈنگ میں ہماری کمپنی کا صدر دفتر ہے اس میں پندرہ منزلیں ہیں۔ تیسری منزل پر ہمارا دفتر ہے۔ دسویں منزل پر ہمارا ایک موٹر رہائش پذیر تھا۔ ابھی گزشتہ ہفتہ کا ذکر ہے کہ وہ اتفاقاً اپنی کھڑکی میں سے گر پڑا اور جب وہ گر رہا ہوا ہمارے دفتر کی کھڑکی کے سامنے سے گزرا ہم نے بیمہ کی رقم کا چیک اس کے حوالے کر دیا۔“

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

عشق و محبت نے اے یارو! کب ہم کو آباد کیا دیکھے جتنے خواب سہانے اتنا ہی ناشاد کیا سوکھے پھول اور تلی کوکل پھیکا اپنی کتابوں سے جن لمحوں میں قید تھے پہننے ان کو بھی آزاد کیا پہلے تو ہمیں کیا تھا جذبہ عشق کو دنیا نے چل اور پٹ کے ہاتھوں پھر ہم کو بھی برباد کیا راہ وفا میں ہم کو اک احساس تھا خاطر داری کا تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا دیکھ کے دل گھبراتا ہے اے بھئی سونی گیوں کو کون ہے جس نے اس بستی کو آ کر یوں برباد کیا

رشتہ: کلام: یعنی احمد، کراچی

رشتہ بناؤ تو آنکھوں اور پلکوں جیسا..... جب

میری زندگی ہے

کاوش: اقرا جٹ، ٹھن آباد

آنکھ میں کچھ چلا جائے تو پلکیں تڑپ اٹھتی ہیں اور جب پلکیں کچھ دیر نہ چمکیں تو آنکھیں رو پڑتی ہیں۔

تابع داری

ہوا میں سرد ہو جائیں یہ لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر کو خود پر تان لیتے ہیں
سنو درویش لوگوں کی کوئی دنیا نہیں ہوتی
ملے جو خاک رستے میں اسی کو چھان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جاں نکلتی ہے
یہ سانس جاری رکھنے کو ہم اس کی مان لیتے ہیں
از: فضلہ بتول، بہارہ کبو

زہر

مولانا رومی سے کسی نے پوچھا۔ ”زہر کیا ہے؟“
جواب ملا۔ ”ہر وہ چیز جو ضرورت سے زیادہ ہو
زہر ہے۔۔۔۔۔ جیسے طاقت، دولت، لالچ، نفرت، اور
محبت۔۔۔۔۔“

از: نادیا، راول پنڈی

غزل

میرے دکھ پہ شہر ستم رو پڑا
لکھے لفظ جب بھی قلم رو پڑا
یہ دل اس کے در کی طرف چل پڑا
تھی وہ شدت غم، صنم رو پڑا
میرے قلب و جان نے جو صدمے سہے
کچھ ایسا کیا صبر، غم رو پڑا
کوئی چیخ اٹھا میری روح میں
جو باقی تھا میرا بھرم رو پڑا
یہ جنگ و جدل ساری بے سود تھی
وجودِ زیاں پر عدم رو پڑا
تڑپ خانم ایسی میرے دل کی تھی
ہوا سجدہ حیراں، کرم رو پڑا

کلام: فریدہ خانم، لاہور

☆☆☆

بستر

لوگ بدلے نہیں بس اکثر ان کی زندگی میں آپ
سے بہتر کوئی اور آ جاتا ہے۔

ہے کوئی ایسا

مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں جو
میرے مرنے پر رونے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک
ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میرے رونے پر مرنے کو
تیار ہو۔

بہترین جگہ

دنیا میں رہنے کی دو جگہیں سب سے زیادہ
بہترین ہیں۔۔۔۔۔ کسی کے دل میں یا کسی کی دعاؤں
میں۔۔۔۔۔

از: بدر بودلہ، پنجاب

چاہ

تیرے سنگ چلوں
ہر راستے پر
ہر مشکل میں
ہر خوشی میں
تیرے ہر پل میں رہوں
بس
اک اتنی سی چاہ ہے

زندگی

جب بھی خدا سے کچھ مانگا ہے
تجھے ہی مانگا ہے
تیرے لیے ہی مانگا ہے
تیرے سوا کوئی چاہت نہیں ہے
تیرے سوا کوئی آرزو نہیں ہے
بس اک تجھ سے جڑنا ہی

میں اکثر گنگنائی ہوں

معصومی زبیدی

☆ یا کمین کنول..... پرورد

مجھ کو سوغاتِ محبت کی عطا ہو یارب
میرے کردار کو، گفتار کو رعنائی دے
ہاتھ پھیلائے تیرے در پہ کنول بیٹھی ہے
اس کو کچھ اور نہ بے جوش توانائی دے
☆ نامہٴ افضال..... سحرات

یہ میرا ضبط کہیں ٹوٹ تو نہیں ہے گیا
قدم، قدم پہ میں چھالوں کی بات کرتی ہوں
وہ چاند بن کے میرے دل میں جگمگاتا ہے
میں اس کے نام کے ہالوں کی بات کرتی ہوں
☆ حمیرا انجم..... واہ کینٹ

زرد پتے جہاں سے ٹوٹے ہیں
بزر پتے وہیں سے ٹپکس گئے
☆ مسرت نسیم..... ایف بی ایریا

مانا کہ اگر وہ آجاتے دو چار گھڑی ہم جی لیتے
پراتی ذرا سی خواہش پر ہم اُن کو پریشاں کیوں کرتے
☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

کس قدر دکھ ہے زندگانی میں
جیسے گھل جائے زہرِ پانی میں
کتنی صدیوں کا درد شامل ہے
ایک انسان کی کہانی میں
☆ ایمین رانی..... پنجاب

جانے کس راہ سے آجائے وہ جانے والا
ہم نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

☆ حمنی قدیل..... کمالیہ

میں دیکھ سکوں چہرے کے پیچھے بھی ہے کیا کچھ
اتنی سی عطا وہ مجھے بینائی تو کر جائے
ہے فرضِ قیاس اس پہ میرا جان چھڑکنا
پر وہ میری کچھ حوصلہ افزائی تو کر جائے
☆ سائرہ ارم..... ڈوگر

میں آئینوں سے سمجھتا ہوں پتھروں کا مزاج
میں شیشہ گر ہوں مجھے یہ ہنر بھی آتا ہے
☆ حمیرا احمد..... کراچی

اہلِ عشق کا ہم نے یعنی یہ بھی تماشا دیکھا ہے
اپنے لبو سے صحراؤں کی پیاس بجھانے آتے ہیں
☆ سائرہ..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

دیکھو کیسے، کیسے پھیلا، پھیلا کے ہاتھ
ماگ رہا ہے شہر سے چاہت کی خیرات
ایک ہی شہر میں اتنی بارش ٹھیک نہیں
آؤ ہم تم بانٹ لیں آنکھوں کی برسات
☆ اقرابٹ..... منجمن آباد

جانے کس موڑ پہ خورشید ہم سے کھو گئے
وہ جذبے جو کبھی پہچان تھے انسان کی
☆ سائرہ مثال..... کراچی

ہم نے سوچا تھا کہ ایک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا
☆ عبدالحمید قصوریہ..... ڈیر اسماعیل خان

بیٹے دنوں کے اچھے موسم یاد اکیلا میں کیا کرتا
اجڑا منظر ٹوٹے پنپنے سب کچھ راگلاں تیرے بعد

☆ کائنات عبدالکلیم..... میر پور خاص

خود ہی ویران کیا تم نے دیار دل کو
اب یہاں کوئی نہیں کس کا پتا مانگتے ہو
☆ فرحت احمد..... کراچی

جانے والے نے کہا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اک اسی آس پہ دروازہ کھلا رکھا ہے
☆ شمیم کوکب..... ضلع جہلم

صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
☆ رعنا امان اللہ..... سرگودھا

رنگوں کی کوئی رست تری خوشبو نہیں لائی
یہ داغ بھی دامن بہاراں میں رہے گا
اب کے بھی گزر جائیں گے سب وصل کے لمحے
مصرف کوئی وعدہ دیاں میں رہے گا
☆ فرحت..... گلشن حدید

کھلی ہوئی ہیں میری زپہ خاک بھی آنکھیں
کسی کا آہ، کہاں تک ہے انتظار مجھے
☆ نیو فرخان..... بہارہ کہو

سرد اندھیری راتوں میں دل اس سے باتیں کرتا ہے
آنکھیں جاگ رہی ہیں لیکن خواب میں چلنا اور ہنسنا
اپنی ذات کے میلے میں اب اتنا بھی کیا کم رہنا
خود سے خود کی باتیں کرنا خود سے جتنا اور ہنسنا
☆ زریں خان..... بہارہ کہو

رشتوں کو اپنا دوتوں کے غم کھائے
پھر بھی اجنبی ٹھہرے پھر بھی غیر کہلائے
☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمہیں غم کی قسم اس دل کی ویرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو سہی دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو
☆ رعنا مشتاق..... سرگودھا

زندگی سے مٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے میری بلا جانے

☆ سعیدہ بانو..... لوہڑال مری

چرچے تمام شہر میں الفت کے میری ہو گئے
گو کسی سے ذکر تو میں نے ابھی کیا نہیں
کیا خبر ہو آپ کو شام کے دکھ کی اے حضور
جام تہائی کبھی تو آپ نے پیا نہیں
☆ پروین..... جنوبی پنجاب

ٹھوکر یں مار کے محفل سے اٹھاتے ہیں مجھے
اور اک پاؤں سے دامن بھی دبا رکھا ہے
☆ رانی زرناب..... کمالیہ

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجازت میں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رُست کو زنجیر کرتے ہیں
☆ لاسبہ کائنات..... لاہور

نیا سال آیا ہے نئے غم ملیں گے
سنگمر بہت مہرباں کم ملیں گے
☆ تنیم کوثر..... کراچی

رک جائیں اگر آنسو تو بن جاتے ہیں ناسور
اچھا ہے دو چار نکل جاتے ہیں ہر روز
☆ عرشہ حنیفہ..... کراچی

کانوں سے انگلیاں نہ نکالو تو کچھ نہیں
سننے رہو تو روز نئی داستان ہے
☆ فرح طاہر قریشی..... ملتان

یہ ہم ہی ہیں کہ تیرا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں
☆ فریدہ فری..... لاہور

رنگ رعنائی اور خوشبو
پھول اس سے ادھار لیتے ہیں
اس کے جوڑے میں جج کے سرخ گلاب
اپنی قسمت سنوار لیتے ہیں

☆☆☆

منتخب غزلیں



مارچ نامور مقبول عام شاعر ناصر کاظمی کا ماہ وفات ہے اسی
مناسبت اس غزلیہ شاعر کا خوب صورت کلام آپ کے ذوق کی نذر...



وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں
اس دنیا میں اپنا کیا ہے
کہنے کو سب کچھ اپنا ہے

ترپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں
یوں تو شبنم بھی ہے دریا
یوں تو دریا بھی پیاسا ہے

ترے جلو میں بھی دل کانپ، کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
یوں تو ہیرا بھی ہے سنگر
یوں تو مٹی بھی سونا ہے

کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں
منہ دیکھے کی باتیں ہیں سب
کس نے کس کو یاد کیا ہے

مگر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں
تیرے ساتھ گئی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں
بات نہ کر صورت تو دکھا دے
تیرا اس میں کیا جاتا ہے



پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسین کے تیار کردہ کھانوں کی ترکیب بعنوان ”امی کی رستہ پشی“ بھی لکھ کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

چٹ پٹی مچھلی

اجزاء: مچھلی، آٹھ ٹکڑے، لہسن اور کک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ پس ہوئی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ لیمن، ایک عدد (نچوڑ کر عرق نکال لیں) یہ سارے اجزاء مچھلی میں ملا لیں اور بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

تیل، تین سے چار کھانے کے چمچ (تیل گرم کر کے مچھلی فرانی کر لیں اور نکال کر رکھ لیں)۔

اجزا برائے گریوی:

میتھی دانہ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ تیز پتا..... دو عدد..... ثابت زیرہ، آدھا چائے کا چمچ پیاز، دو سے تین عدد (پس لیں)۔ نمائز، دو عدد (پس لیں)۔ اور کک لہسن کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ پسا ہوا زیرہ، آدھی چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، تین سے چار عدد (چمچ میں سے کاٹ کر رکھ لیں)۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔

ترکیب: مچھلی کو فرانی کرنے کے بعد بچے ہوئے تیل میں سب سے پہلے میتھی دانہ ڈال دیں۔ جیسے ہی اس میں سے خوشبو آئے اس میں تیز پتا شامل کر لیں، ساتھ ہی ثابت زیرہ ڈال کر فرانی کر لیں اور چند سیکنڈز کے بعد پس ہوئی پیاز بھی شامل کر دیں۔ پس ہوئی پیاز ڈالنے کے بعد چولھے کی آگ بڑھا دیں پھر اس میں اور کک، لہسن کا

چپٹ شامل کر دیں۔ اب اس میں ہلدی، زیرہ پاؤڈر، پس لال مرچ، دھنیا پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر آگ کو درمیانہ کر دیں۔ اب اس میں آدھا کک پانی بھی شامل کر دیں۔ دو منٹ پکا لیں۔ جیسے ہی پانی میں ابال آئے، نمائز کا پیسٹ ڈال دیں اور اس وقت تک مسالا بھونیں جب تک مسالا تیل نہ چھوڑ دے۔ اب اس میں دو کک پانی شامل کریں، کٹی ہوئی ہری مرچ اور نمک شامل کر دیں۔ آگ کو تیز کر دیں۔ جیسے ہی مسالے میں ابال آجائے اس میں مچھلی ڈال دیں۔ اب اسے ڈھانک دیں، پانچ منٹ کے بعد دہی یا کڑا ہی (جو بھی برتن آپ استعمال کر رہی ہیں) اسے ہلا لیں۔ (یاد رکھیں مچھلی میں نیچ نہ چلائیں ورنہ مچھلی ٹکڑے بکڑے ہو جائے گی)۔ اب دس منٹ تک مزید پکا لیں۔ آخر میں کٹنا ہوا دھنیا ڈالیں اور گرم چاولوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔ بونس مپ، مچھلی کی بو ختم کرنے کے لیے مچھلی دھونے کے بعد سفید سر کے کے چند قطروں سے مچھلی کو تھکھار لیں۔

پوشیٹو لیپٹا

اجزاء: آلو، چھ عدد (فریج فراز کی طرح کاٹ لیں)۔ میدہ، ڈیڑھ کپ کارن فلاور، ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔ پس ہوئی کالی مرچ، آدھی چائے کا چمچ۔ اور کیکیو، ایک چائے کا چمچ (پنڈ ہو تو شامل کر لیں)۔ پس ہوئی اور کک، ایک چائے کا چمچ۔ پس ہوئی لال مرچ، آدھی چائے کا چمچ۔ آچور پاؤڈر، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ بریڈ کریمز، حسب ضرورت۔ نمک، حسب ذائقہ۔

بند کر دیں۔ گاجر کے حلوے کو دوش میں نکالیں، اوپر سے پھیکا کھویا ڈالیں اور مزے لے، لے کر کھائیں۔
 بولس ٹپ ۱: پھیکا کھویا، پکاتے ہوئے شامل نہ کریں کیونکہ وہ گاجروں میں شامل ہو کر کس ہو جاتا ہے۔
 بولس ٹپ ۲: اگر کنڈینسڈ ملک شامل کر رہے ہیں تو شکر کی مقدار کم کر رکھیں ورنہ بیٹھا بہت زیادہ ہو جائے گا۔
 ہمیشہ یاد رکھیں ای کی ریسیپی، کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

سسزیوں کی بریانی

اشیا: آلو، تین عدد۔ درمیانے۔ گاجر، تین عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ پھول گوشت، ایک پاؤ، (پھول ہوں صرف) سفید بیٹکن، دو عدد۔ شہم، تین عدد۔ تازہ مٹر کے دانے، ایک پیالی۔ ہری مرچ، دو عدد کیوبز کاٹ لیں۔ ٹماٹر، پودینہ، حسب پسند۔ ہرا دھنیا، نمک، کٹی لال مرچ اور تیل، حسب پسند اور حسب ضرورت۔ کالا زیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ ثابت گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول بریانی، تین کپ۔ (تین منٹ بڑی الائچی، دار چینی، لونگ، کالی مرچ، چھوٹی الائچی، پھول) چکن کیوبز، ایک عدد۔ دہی آدھی پیالی۔

ترکیب: دہی میں حسب ضرورت تیل ڈال کر پیاز باریک کاٹ کر گولڈن کریں۔ تھوڑی سی تلی پیاز نکال لیں گارینٹنگ کے لیے باقی پیاز میں لہسن، ادرک، پیسٹ، نمک، مرچ، زیرہ، گرم مسالا، دہی، چکن کیوب اور ٹماٹر ڈال کر تھوڑا بھونیں پھر مٹر، گاجر آلو ڈالیں اور دس منٹ بعد باقی کی سبزیاں ہر مرچ سمیت بھی ڈال دیں۔ پانی کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا ڈال لیں اب سبزیاں گل جائیں تو اسی میں بھیکے چاول ڈال دیں اور اندازے سے پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔ اندازہ کر لیں کہ اسی پانی میں چاول گل جائیں گے نہیں تو ہلکا سا چھینٹا ڈال دیں۔ تیار ہونے پر ہرا دھنیا، پودینے کی چٹاں اور پیاز چھڑک دیں۔ مزیدار سبزی بریانی چھٹی، اچار یا ریتھے کے ساتھ نوش فرمائیں۔
 از: مجتبیٰ زیدی، بہارہ ہو

تیار کر لیں۔ علاوہ ساری چیزیں ایک پیالے میں ڈالیں اور تھوڑے پانی کی مدد سے درمیانہ کچر بنالیں۔ ایک پین میں دو کپ پانی گرم کریں، جیسے ہی پانی اٹھنے لگے اس میں نمک شامل کر دیں، ساتھ ہی گئے ہوئے آلو ڈال دیں۔ ایک سے دو منٹ تک پکے دیں، اس کے بعد پانی چھان لیں، آلوؤں کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب آلو ٹھنڈے ہو جائیں تو بنائے گئے کچر میں اس کو ڈالیں۔ پھر بریڈ کر موز لگا لیں اور ایک بار پھر کچر میں ڈالیں۔ پھر دوبارہ بریڈ کر موز لگا لیں۔ اسی طرح سے سارے آلوؤں کو تیار کر لیں، ایک کڑائی میں تیل کو گرم کریں، جب تیل گرم ہو جائے تو ایک، ایک کر کے آلوؤں کو شامل کر دیں، گولڈن براؤن ہونے تک پکائیں۔ اب اسے کچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔
 بولس ٹپ: اس بات کا خیال رکھیں کہ آلو پانی میں گل نہ جائیں ورنہ وہ خستہ نہیں بنیں گے۔

گاجر کا حلو

اجزاء: گاجر، دو کلو (کدو کش کر لیں)۔ دودھ، ڈھائی گلاس۔ شکر، دو کپ۔ گھی، چار کھانے کے چمچ۔ کنڈینسڈ ملک، حسب ضرورت۔ شہم، پستہ، بادام، اخروٹ گری، حسب ضرورت۔ پھیکا کھویا، آدھا پاؤ یا حسب ضرورت۔

ترکیب: پہلے کڑائی میں دودھ ڈال کر گرم کریں جیسے ہی ابال آجائے، کدو کش کی ہوئی گاجر اس میں شامل کر دیں۔ آٹھ درمیانی کر دیں اور گاجروں کو دودھ میں نرم کر لیں (بہت زیادہ نہ گلائیں)۔ جیسے ہی دودھ خشک ہونے لگے اس میں شکر شامل کر دیں، ساتھ ہی دو کھانے کے چمچ گھی بھی ڈال دیں۔ تھوڑی دیر میں شکر اپنا پانی چھوڑ دے گی، اب آٹھ تیز کر دیں اور اسے بھون لیں، یہاں تک کہ شکر کا پانی خشک ہو جائے۔ (اگر کنڈینسڈ ملک استعمال کرنا ہے تو اسی مرحلے پر شامل کر لیں اور دو کھانے کے چمچ گھی اور ڈال دیں)۔ اب میوہ شامل کر کے کس کر لیں اور پانچ منٹ کے بعد چولہا



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ مشال..... کراچی
سوال: آپنی تسلی اور اطمینان میں کیا فرق ہے؟
جواب: تسلی لوگ دیتے ہیں، اطمینان خود حاصل کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر
سوال: شادی کے وقت دلہن کے چہرے پر تو نور آتا ہے دلہا کے چہرے پر کیا آتا ہے؟
جواب: ترس.....

☆ مریم بنت کاشف..... حیدر آباد
سوال: آسمان کا تھوکا ہمیشہ منہ پر ہی کیوں آتا ہے؟
جواب: تم نے آڑ ماکے تو دیکھ لیا پھر بھی پتا نہیں چلا۔
سوال: آگ اور پانی میں میر کیوں؟
جواب: اللہ کی قدرت ہے۔
☆ لائیکہ کائنات..... لاہور

سوال: سانپ کو قابو میں کرنے کے لیے بین بجائی جاتی ہے لیکن جب انسان بے قابو ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟
جواب: ہدایت کی دعا۔

سوال: دل بچھ جائے تو شہر ترنا کا چراغ کیسے روشن کیا جائے؟
جواب: دل بچھ جائے تو اس کی قبر پر اسی چراغ کو جلا یا جاتا ہے۔

☆ محسنی قدیل..... کمالیہ
سوال: منگنی اور نکاح کے درمیانی عرصے میں زیادہ فائدہ کس کا ہوتا ہے بڑی کو یا لڑکے کو؟

جواب: موبائل فون کارڈ کمپنی کو.....

سوال: کہتے ہیں میاں، بیوی گاڑی کے دو پیسے ہیں، اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو؟

جواب: اسپرملز بھی تو ضروری ہیں۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

سوال: عورت پہلے چن، چن کر شوہر کی ساری عادتیں بدلتی ہے اور بعد میں رو، رو کر کہتی ہے اب آپ پہلے جیسے نہیں رہے..... کیوں؟

جواب: معصوم شوہر اتنی آسانی سے بدل جاتا ہے..... حیرت ہے۔

سوال: کاش غم، ریت کے مانند ہوتے جو مٹی سے خود بخود نیچے گر جاتی ہے؟

جواب: اللہ پر توکل ہر غم کو ایسے ہی مالتا ہے۔

☆ محسنی قدیل..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: لوگوں نے اپنے چہرے پر محبت کا ایک ماسک پہنا ہوا ہے..... وہ اپنے اصل چہرے کے ساتھ سامنے کیوں نہیں آتے؟

جواب: تم بھی تو بدگمانی کی عینک پہنے رہتی ہو۔

سوال: دل کے دریا میں اگر سیلاب آجائے تو؟

جواب: نہاں آتا ہے بھجوں کا، غلوں کا، ہمدردی کا۔

☆ افراتجٹ..... مین آباد

سوال: انہوں اور غیروں میں سے کسی کو چننا ہو تو ہم

ہمیشہ انہوں کو ہی کیوں جتنے ہیں؟

جواب: تم غیروں کو چن لو۔

سوال: وہ بتا ہے کہ میں نے تم سے محبت کی۔

میں کہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوئی؟

جواب: چل جھوٹی!

☆ فرخندہ جعفری..... سحرات

سوال: انسان کا چہرہ دھواں، دھواں کب ہوتا ہے؟

جواب: جھوٹ پکڑے جانے پر۔

سوال: منافق آدمی صرف اپنے لیے ہی کیوں جیتا ہے؟

جواب: وہ تو اپنے لیے بھی نہیں جیتا۔

☆ تنسیم کوثر..... کراچی

سوال: آپ کے نزدیک سب سے بہترین دعا کون

کی ہے؟

جواب: حفظ ایمان کی۔

سوال: ذرا یہ تو بتائیں کہ مکھن کھانے اور لگانے

کے علاوہ بھی کئی اور کام آتا ہے؟

جواب: اتنے بڑے، بڑے کام تو بیچارہ مکھن کر لیتا

ہے اور کیا کراؤ گی۔

☆ فرحت احمد..... بخش حدید

سوال: اینٹ سے اینٹ بجانا آسان اور اینٹ پر

اینٹ رکھنا مشکل کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

جواب: محنت کے کام تو مشکل لگتے ہی ہیں۔

سوال: سر پر پیر رکھ کر کس طرح بھاگا جاتا ہے؟

جواب: باغ سے پھل تو ڈکرائی کی نظروں سے بچ

کر جب بھاگا جاتا ہے تو ایسے ہی دور لگتی ہے۔

☆ سائرہ مثال..... کراچی

سوال: محبت اور نفرت دو الگ، الگ جذبے

ہیں مگر ہمیشہ ایک کی موت کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے

ایسا کیوں؟

جواب: یہ بھی ایک دوسرے کے پیچھے رہنے کا عمل،

کب کون سا جذبہ غالب آجائے اس لیے ساتھ، ساتھ ہی

رہتے ہیں۔

سوال: اپنے روٹھ جائے تو منالیتا چاہیے مگر اپنوں

سے دل روٹھ جائے تو؟

جواب: پہلے دل کو مٹاؤ پھر اپنوں کو ورنہ منافقت

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: خوب صورت دلہن بھی بیوی پارر سے کیوں

تیار کروائی جاتی ہے؟

جواب: تیار ہونے دو، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔

سوال: آخر میرے میاں جانی مجھے سمجھتے کیا ہیں؟

جواب: تمہارے میاں جانی ہیں کچھ بھی سمجھیں

ہمیں کیا۔

☆ سائرہ ارم..... کمالیہ

سوال: دولت عظیم رشتوں کے درمیان دراڑ کیوں

بن جاتی ہے؟

جواب: یہی تو امتحان ہے انسان کا۔

سوال: ہر دماغ دو منزلہ ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل

آخرت کے کام سرانجام دیتی ہے اور نیچے کی دنیاوی.....

آپ کی کون سی منزل بہتر کام کرتی ہے؟

جواب: یہ تو دوسرے ہی بتائیں گے، ہم تو اللہ

تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی سرخروگی طلب کرتے ہیں۔

☆ نسیم منظر..... کراچی

سوال: بیگانی شادی میں عبد اللہ ہی دیوانہ کیوں

ہوتا ہے؟

جواب: عبد اللہ یعنی..... اللہ کا بندہ..... وہ کوئی بھی

ہو سکتا ہے۔

سوال: مجھ کو مارنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟

جواب: مجھ مارا سپرے کرو..... اور کیا بندوق سے

مارو گی۔

☆ ناصر تحریم..... کراچی

سوال: اگر کسی کا اخلاق دیکھنا ہو تو؟

جواب: غصے کے وقت دیکھ لو۔

سوال: جج صاحبان مرنے سے پہلے مجرم سے اس

کی آخری خواہش کے بارے میں کیوں پوچھتے ہیں؟

جواب: تم کل عدالت جا کر جج سے ضرور پوچھ

لیتا۔ اور ہمیں بھی بتا دینا۔

☆☆☆



معاف فرمائے گا۔ (صحیفہ نماز) بشرطیکہ آئندہ کے لیے تقویٰ اختیار کرے۔

عذاب قبر سے امان کی نماز

تعداد: ۲۰ رکعت ۲۲ رکعت پڑھیں، ماہِ رجب کی چاندنرات درمیان نماز مغربین۔
طریقہ: ہر رکعت میں سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید ایک بار۔

فضیلت: اس نماز کے پڑھنے والا، اس کی اولاد اور خاندان والے عذابِ قبر اور بربادی مال سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور روز قیامت پل صراط سے بچنے کی طرح گزر جائیں گے۔ (صحیفہ نماز)

ہفت ہیکل کا حصار

یہ عمل بہت مشہور ہے اور آسان ہے۔ اس عمل کے بارے میں ہر خاص اور عام خوب جانتے ہیں۔ ہمارے دینی رسالوں اور کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اس عمل کی اہمیت اور قدر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مولا علیؑ سے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز تعلیم کروں کہ ساتوں آسمان اور زمین کی خلقت مل کر تمہیں بدی پہنچانا چاہے تو کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ یا علی جو کوئی اس ہفت ہیکل کو پڑھے اس کے نامہ اعمال میں ستر ہزار اعمال حسن لکھے جائیں گے۔ ستر ہزار قصر بہشت میں ہوں گے۔ جو شخص ان سات آیات کو پڑھے اور اپنے پاس رکھے تو روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔

مجبرب نماز ادائیگی قرض

طریقہ: پہلی رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید گیارہ بار۔

دوسری رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید اکیس بار۔

تیسری رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید اکتیس بار۔

چوتھی رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید اکتالیس بار۔

نماز کے بعد سورہ توحید (سورہ اخلاص) 51 بار، صلوٰۃ 51 بار سجدے میں جائے اور سو بار کہے یا اللہ، یا اللہ پھر حاجت طلب کرے۔

فضائل: مرحوم علی بن طاووس فرماتے ہیں کہ حضرت مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس نماز کو پڑھا تو خدا اس کی دعا کو حتماً مستجاب فرماتا ہے۔ اگر نمازی نے پہاڑوں کے ٹلنے، بارش کے ہونے جیسی دعا کی خدا اس کو بھی قبول فرمائے گا۔

نماز بخشش گناہ

تعداد: دس رکعت دو، دو رکعت پڑھے۔ ماہِ رجب کی کسی ایک شب۔

طریقہ: ہر رکعت میں سورہ حمد ایک بار، سورہ کافرون ایک بار، سورہ توحید تین بار۔

فضیلت: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے تمام گناہ

سات آیات قرآنی

یہاں پر ہم صرف سورہ اور آیت نمبر بتا رہے ہیں۔

- 1- سورہ توبہ آیت نمبر 51
- 2- سورہ یونس آیت نمبر 107
- 3- سورہ ہود آیت نمبر 6
- 4- سورہ ہود آیت نمبر 56
- 5- سورہ عنکبوت آیت نمبر 60
- 6- سورہ فاطر آیت نمبر 2
- 7- سورہ زمر آیت نمبر 38

قرض کے لیے

☆ اگر کوئی شخص قرض کے لیے جوہر تلے دیا ہو تو ہر روز صبح شام یہ دعا پڑھے۔ بہ طور وظیفہ ستر مرتبہ اس دعا کو پڑھا جائے۔ ہر نماز کے بعد۔

اللہم اکفنی بحلالک عن حرامک واغننی بفضلك عن سواک

☆ ادا نیکی قرض اگر استطاعت سے باہر ہو تو سورہ تحریم کی بہ کثرت تلاوت کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے غیب سے اس قرض کی ادائیگی کی صورت پیدا فرما دے گا۔

☆ اگر کسی پر قرض ہو اور اس کے اترنے کا سامان نہ ہو تو ہر نماز کے بعد سورہ مزمل ایک مرتبہ پڑھی جائے۔ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کا سامان فرما دے گا۔

قرآن پاک کی ان سورتوں کی دی گئی آیات سارے جسم پر پڑھ کر پھونکیں، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کا حصار ہو جائے گا۔ چھ دن سورہ تغابن بارہ نمبر 28 کی تلاوت بعد نماز عشا اور (6) چھ دن مسلسل یہ حصار کریں۔

عمل برائے قضائے حاجات

تین شب متواتر خلوت میں بیٹھ کر ہر رات ایک ہزار مرتبہ پڑھیے۔
اَللّٰہُمَّ قَدْ اَقْبَضَ رَجَائِیْ عَنِ الْخَلْقِ وَاَنْتَ رَجَائِیْ
اللہ پاک کے حضور اس کے حبیب پاک اور اس کی آل کے ویلے سے دعا طلب کریں۔

کاروبار کی بحالی کے لیے

☆ اگر کسی کا کاروبار بند ہو گیا تو وہ کاروبار کی بحالی کی نیت سے سورہ جمعہ نماز تہجد کے بعد تین مرتبہ اکتالیس روز تک پڑھے۔ ان شاء اللہ کاروبار بحال ہو جائے گا۔

کاروبار کی حفاظت

☆ اگر کوئی شخص اسم مبارک "یار قیوم" کا بکثرت ورد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے مال، احوال، کاروبار، اہل و عیال اور روزگار وغیرہ کی حفاظت فرمائے گا اور اسے دشمنوں یا حاسدوں کے ہاتھوں لاحق ہونے والے نقصانات سے محفوظ رکھے گا۔

قرض سے نجات

قضائے حوائج اور ادائیگی قرض کے لیے جمعہ المبارک کے دن غسل کر کے قبل از طلوع شمس دو رکعت نماز بطریق نماز فجر ادا کرے اور بعد از نماز ایک ہزار پینتالیس مرتبہ پڑھے مَسْأَلِیْہِ اللّٰہُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ اور اللہ تعالیٰ سے گرو گزرا کر دعا مانگے۔

☆☆☆



☆ نازنین آفریدی، پشاور

☆ السلام علیکم ماہ جبیں آنلی (علیکم السلام) حسن نگار یہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور اکثر آپ کے دیے ہوئے ٹوٹے ٹوٹے نوٹ بھی کرتی ہوں اور اپلائی بھی..... آنٹی چہرے کے بھورے تلوں کے بارے میں بھی رہنمائی فرمادیں۔ پلیز یہ کیسے بننے ہیں اور ان سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ بادام کے تیل میں لیمن ڈال کر یوز کیا، کچھ دھیسے پڑتے محسوس ہوئے لیکن یہ ایک بہت ہی سلو پروس ہے جبکہ ہم... بے صبروں کو فوری رزلٹ چاہیے۔ کیا، کیا جائے کہ چہرہ بھورے تلوں سے پاک ہو جائے۔

جواب: بکری کے کچے دودھ میں بادام بھگو کر چھلکا اتار کر باریک پیس کر چہرے پر لگائیں۔ تین ماہ روز دات کو یہ عمل کریں، صبح چہرہ میسن سے دھو لیں۔ نیم گرم پانی استعمال کریں آخر میں ٹھنڈے پانی کے چھینے ماریں۔

☆☆☆

شہنشاہ گل

خوب صورت و خوش رنگ پھول ہمیں تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ انہی پھولوں میں گلاب کے پھول کو جو اہمیت حاصل ہے اور اس کی جو افادیت ہے وہ دوسرے پھولوں میں کہاں۔ اسی وجہ سے اسے شہنشاہ گل کہا جاتا ہے، گلاب کی خوشبو جہاں رمانغ کو مہل کرتی ہیں وہیں دل میں تازگی اور خوشی کا احساس جگاتی ہے۔

عزیز پاکیزہ بہنو..... آج گلاب کے پھول کی افادیت و اہمیت ہم آپ کو بتائیں گے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی اس حسین نعمت سے اچھی طرح فیض یاب ہوں۔ گلاب کے بے شمار خواص اور طبی فوائد ہیں۔

☆ گرمی اور جس کی وجہ سے کپٹیوں سے اشد درد کی ٹیسیں گلاب کا پھول بار، بار سونگھنے سے کسی حد تک کم ہو جاتی ہیں، اس کے علاوہ عرق گلاب اور خالص عطر گلاب کو سونگھنے سے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے، منگی اور چکر کی کیفیت بھی رفع ہو جاتی ہے۔

☆ غسل کے پانی میں تازہ چٹاں گلاب کے پھول کی شامل کر لیں اور اس سے نہا میں علاوہ ازیں پتیوں کو ہاتھوں میں مسل کر ز پر بازو بھی لگائیں۔

☆ گلاب کی پتیوں کو پیس کر اس کا مرہم سا بنالیں اور سوزش یا درم والی جگہ لگانے سے آرام آ جاتا ہے۔

☆ گرم موسم میں آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ اس کے لیے تازہ گلاب کی پتیوں کو پیس کر ایک ملل کے کپڑے میں رکھ کر پوٹی بنالیں اور اس کو ٹھنڈا کر کے آنکھوں پر رکھنے سے آرام آتا ہے۔ خالص عرق گلاب آنکھوں میں پکانے سے بھی آرام ملتا ہے۔

☆ مسوڑھوں اور دانتوں کی تکلیف میں خشک گلاب کے پھولوں کو پانی میں جوش دے کر نیم گرم پانی سے بار، بار کلیاں کرنے سے افادہ ہوتا ہے۔ اس کا پیسٹ دانتوں پر ملنے سے منہ سے ناگوار بو آنا بھی بند ہو جاتی ہے۔

☆ چہرے کی جلد اور ہاتھ پاؤں کی جلد کی تازگی کے لیے اس کی پتیوں اکسیر کا کام کرتی ہیں۔ گرمی کی شدت یا گرد و غبار سے رنگ سائلو ہوجائے تو خشک گلاب کی پتیوں کو پیس لیں۔ اس سفوف کو ہم وزن میسن اور دودھ میں ملا کر پیسٹ بنالیں اور اینٹن کی طرح چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ملیں اور پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ دو دن میں ایک دفعہ یہ عمل کرنے سے جلد کی رنگت ٹھہر آتی ہے۔



شواہے ہومیوپیتھک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیوپریاتیوٹ لیڈنڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہانہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ہے۔ بیٹہ جاؤں تو اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں میں جیسے طاقت ہی نہیں رہی۔ لیکور یا کا مسئلہ ہے۔ علاج کروانے سے ایک یا دو ماہ ٹھیک رہتا ہے اس کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے میسر بعض دفعہ ٹھیک ہوتے ہیں بعض دفعہ بہت درد کے ساتھ اور کبھی لیٹ ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی جلد بلیک ہو گئی ہے۔ دانے نکل آتے ہیں اور پھر داغ بکے ہوتے جاتے ہیں۔ چہرے پر جھانیاں ہیں۔ بہت کریٹیں استعمال کیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ گرمیوں میں سینے کی سخت بدبو سے تنگ ہوں۔

جواب: تازہ پھل، ہنسیاں اور دودھ، دہی کا استعمال بڑھا دیں۔ کم از کم 8 گلاس پانی پیا کریں، لیکن کھانے سے پہلے، کھانے کے ساتھ اور بعد میں بالکل بھی نہیں پیئیں گی۔

صبح نہار منہ پہلے Sulphur-200 کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ایک دن بعد Calc Carb-30، Pulsatilla-30 اور Chelidonium-6 کے 5-5

جسمانی مسائل

رقیہ.....ٹیکسلا

کچھ عرصے سے میرے ٹخنوں میں درد بہت زیادہ

ٹوکن

برائے شواہے ہومیوپیتھک

اپریل 2019ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مینے بھیجیں اسی مینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____
پتہ: _____



تیز مرج معائنہ اور گوشت کے
پرہیز کریں۔ سبزیاں اور فروٹ
زیادہ استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار
شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل
ادویات 2 ماہ تک استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔
Staphisagria-200 کے 5 قطرے ہر ہفتہ ایک دفعہ
لیں۔ اس کے ایک دن بعد Agnus Cast-30 اور
Lycopodium-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس
پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

زیادتی حیض

ارمغال..... سیالگوٹ

میرے مینسٹر ٹھیک نہیں ہوتے۔ ذرا سی گرم تاثیر
والی چیز کھاؤں مثلاً انڈا، شہد، ڈرائی فروٹ یا کوئی اور چیز تو
مینسٹر وقت سے پہلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے میں کوئی
اس طرح کی طاقت والی چیز نہیں کھا سکتی۔ میں نے اس مسئلے
کے لیے بہت سی ایلو پیتھک دوائیں بھی کھائی ہیں جس سے
وقت فرق پڑتا ہے۔ میرا یہ مسئلہ ابتدا..... سے ہے۔ مجھے
بہت کمزوری ہے۔ سر بھی چکر اٹا رہتا ہے۔

جواب: آپ کو شروع ہی میں معالج خصوصاً ہومیو
پیتھ سے رجوع کر لینا چاہیے تھا تاکہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اس
کا فوری علاج ہو جائے۔ آپ اپنا U/S Pelvis کر کر
رپورٹ بھیجیں، اس دوران اپنی غذا کا خیال رکھیں۔ غذا
ہمیشہ متوازن ہونی چاہیے۔ ورزش بھی مفید ہوتی ہے۔
ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک
استعمال کریں۔ Sabina-6, Iodum-30 اور
Pulsatilla-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی
میں دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

ٹائسلو

ہری چندا..... ہری پور

مجھے نزلے کی شکایت تھی۔ آپ نے بتایا تھا کہ
ناک میں گوشت بڑھ گیا ہے۔ میں نے پاکیزہ میں آپ

قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ 2
ماہ تک پیئیں اور اس کے بعد دوبارہ تفصیل سے اپنی
کیفیت سے آگاہ کریں۔ چھل قندی کی بھی عادت
ڈالیں۔ پہلے 5 منٹ کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھاتے
ہوئے ایک گھنٹا چھل قندی کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔
یاد رکھیے گا تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی
استعمال کرنی ہیں۔

پیشاب میں جلن

سحرش..... پشاور

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ برائے مہربانی حل
کر دیں۔ مجھے 3 سال سے یہ مسئلہ ہے وہ کسی بھی دوائی
سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ مجھے پیشاب میں جلن کی شکایت ہے
جو کہ گرمی میں اور خاص کر رمضان میں برداشت سے باہر
ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔
آخری دفعہ جو علاج کرایا تھا اس کے ٹیسٹ وغیرہ بھیج رہی
ہوں۔ میں بہت مایوس ہوں۔ پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں۔
جواب: مایوس ہونا کفر ہے۔ اللہ سے اچھی امید
رکھیں۔ ہماری کوشش ناقص ہو سکتی ہے۔ لہذا کوشش کو
جاری رہنا چاہیے۔ کم از کم 10 گلاس پانی روزانہ ضرور
پئیں۔ لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں۔
ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Merc.cor-30 اور
Terebinth-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی
میں ڈال کر پیئیں۔ 2 ماہ بعد حال لکھیں Urine D/R کی
رپورٹ کے ساتھ۔

ازدواجی زندگی

ارسلان..... اسلام آباد

میری شادی کو 6 ماہ ہونے والے ہیں اور میں
اندرونی طور پر کافی کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ آپ کو بڑی
امید کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا کوئی بہترین
علاج بتادیں جس سے میری صحت ٹھیک ہو جائے۔
جواب: غلط قسم کی صحبت اور خشن فلموں سے بچیں۔

Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ یاد رکھیں کہ یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی ہی استعمال کریں۔

لیکچر یا

عروسہ حیات..... گجرات

مجھے کافی عرصے سے لیکچر یا کا مسئلہ ہے جو پچھلے 3 سال سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کی ادویات استعمال کیں لیکن بالکل بھی افادہ نہیں ہوا۔ چہرہ بے رونق اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی ہیں۔ جب سے یہ مسئلہ زیادہ ہوا ہے چہرے پر چھائیاں بھی پڑ گئی ہیں جس کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ میرا وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ تقریباً 10 کلو کی ہوئی ہے، درد اور تھکاوٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوائی تجویز کریں جس سے میرے وزن میں بھی اضافہ ہو اور مجھے اس تکلیف سے بھی نجات مل سکے۔

جواب: متوازن غذا کھائیں اور ورزش کیا کریں۔ فلی دنیا، ڈراموں، ناولوں اور ڈائجسٹوں کی مصنوعی خوابوں کی دنیا سے دور رہیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ ذکر واذکار اور قرآن پاک کی تلاوت کیا کریں۔ قرآن کے ترجمے اور احادیث کی طرف بھی توجہ کیا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax-30, Iodine-30 اور Calc Carb-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد اپنے احوال سے آگاہی فراہم کریں۔

صحت و نسوانی مسائل

رضیہ مصطفیٰ..... کراچی

لیکچر یا کبھی زیادہ ہو جاتا ہے کبھی خود ہی سیٹ ہو جاتا ہے۔ بہت کمزور ہوں جیسے ہڈیوں کا ڈھانچا۔ خوراک اثر ہی نہیں کرتی مجھ پر۔ نظر کمزور، دماغ کمزور،

تجویز کردہ نسخہ پڑھا تو ادویات منگوائیں۔ ایک مہینے سے میں ادویات لے رہی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کافی فرق ہو گیا لیکن بطن ابھی بھی ہے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ نائسلو کا ہے جو کہ بچپن ہی سے ہے۔ منہ سے بدبو بھی آتی ہے۔

جواب: کھنڈی، کھنڈی چیزوں سے پرہیز کریں۔ صبح شام نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر غرا لے کریں اور رات کو برش کر کے سویا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کرنے کے بعد پھر تفصیل سے حال بتائیں۔ Baryta, Merc.sol-30 Carb-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ اور Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چبا کر لیں۔

چہرے پر بال

رابعدہ شیخ..... چیچہ وطنی

ڈاکٹر صاحب میرے ماہانہ ایام میں بے قاعدگی ہے۔ اکثر بہت زیادہ درد کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی لیٹ ہو جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر بہت زیادہ بال ہو گئے ہیں، گالوں پر اور شوڑی پر بھی۔ میرے لیے اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ میرے چہرے کے بال ختم ہو جائیں بالوں کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ ایک اور بات کہ مجھے خون کی کمی کی شکایت بھی ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی، اچھی سی دوا میرے لیے تجویز کر دیں۔

جواب: آپ نے علاج کروانے میں اتنا عرصہ کیوں لگایا؟ ابتدا سے ہی اس کا علاج کر لیتا چاہیے تھا۔ غذا کا خاص خیال رکھیں۔ پھل، سبزیوں اور لال گوشت کا استعمال زیادہ کریں۔ ورزش بھی کیا کریں۔ Calc Pulsatilla-30, Iodine-30



دوران بہت زیادہ ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہوں۔ ہر وقت اسی بارے میں سوچتی رہتی ہوں اور مختلف وسوسوں کا شکار رہتی ہوں۔ رات میں نیند نہیں آتی۔ دماغ بے اولاد کی وجہ سے سوچوں میں گھرا رہتا ہے۔ پھر پورا دن بہت نیند آتی ہے اور سستی اور جسم میں درد رہتا ہے۔

جواب: کوئی مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔ مایوس ہونا کفر ہے۔ فضول باتیں اور وسوسے شیطان کا حملہ ہیں۔ اعمو باللہ پڑھا کریں۔ درود شریف پڑھیں۔ استغفار پڑھا کریں۔ اللہ کی ان نعمتوں کے متعلق سوچا کریں جو آپ کے پاس ہیں اور پھر اللہ کا زبان سے زیادہ شکر ادا کریں۔ پھر دیکھیں اللہ شکر کرنے والوں کے ساتھ کیا کرتا ہے؟ مدت علاج کچھ نہیں ہوتا۔ صحیح علاج کے بعد اللہ کا حکم ہونا چاہیے۔ اچھا یہی ہے کہ آپ آ کر ملیں۔ جسمانی مسائل کے علاوہ کچھ اور بھی وجوہات ہوتی ہیں جو بے اولاد کی سبب بنتی ہیں۔ ان کا تعین کرنے کے بعد ہی صحیح علاج کیا جاسکتا ہے۔ فون نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے کی Bovista-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پیئیں۔

شوابے کی ادویات ہی کیوں؟

اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ صرف ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ہی کیوں استعمال کرتے ہیں؟ جبکہ یہ مہنگی بھی ہیں۔
ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ہی استعمال کیوں کی جائیں؟ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:
(1) دوا بنانے کے لیے جس چیز (پودے معدنیات وغیرہ) کا استعمال ہوتا ہے وہ پوری فٹے داری کے ساتھ جانچ پڑتال کے بعد ہوتا ہے۔
(2) دوا بنانے کے دوران اس کی کوالٹی کو بار بار

چیزیں رکھ کر بھول جاتی ہوں۔ لوگ دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ تم کھاتی کچھ نہیں ہو۔ اور اگر رات کو دودھ پی لوں تو صبح پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ میں تنگ ہو گئی ہوں بس۔ برائے کرم کوئی اچھی دوائی تجویز کریں کہ میری ان مسائل سے جان چھوٹے اور میری زندگی میں کچھ سکون میں ہو جائے۔

جواب: متوازن غذا (دودھ، انڈے، مکھن، گوشت سبزیاں اور پھل) کا استعمال کریں۔ چھل قدی کی ورزش بھی کیا کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ یاد رکھیں کہ رات کو سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت بالکل غلط ہے۔ یقیناً اس طرح ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ عیس کی زیادتی، تیزابیت اور موٹن ہو جاتے ہیں۔ دودھ ہمیشہ صبح ناشتے میں اور شام کو پینا چاہیے۔ رات کو برش کر کے سویا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور اس کے بعد پھر تفصیل سے حال بتائیں۔ Nat Mur-30, Iodium-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

اولاد کی نعمت

بسمہ عیان..... کراچی

شادی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ کئی جگہ علاج کروا چکی ہوں۔ ڈاکٹر کے مطابق ٹیسٹ کی تمام رپورٹس نارمل ہیں۔ لیکور یا بہت زیادہ رہتا ہے۔ ایام کے فوراً بعد سے لیکور یا کی شکایت ہونے لگتی ہے جو کہ پندرہ دن تک مسلسل رہتی ہے اور پھر ایام کے کچھ دن پہلے پھر شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مرض شادی سے پہلے سے ہے مگر کبھی علاج نہیں کروایا تھا۔ میری خوراک بہت کم ہے۔ صبح ناشتائیں کرتی اور دن میں بھی بھوک بہت کم لگتی ہے۔ اکثر اوقات ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں اور جسم کا غنہ لگتا ہے۔ پیروں اور گھر میں بھی بہت درد رہتا ہے۔ ایام وقت پر ہوتے ہیں مگر کچھ دن پہلے چکر آنے لگتے ہیں اور مٹی محسوس ہوتی ہے اور اس

استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔
7-6 Staphisagria-30, Calc. phos-30
قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ
پئیں۔

یادداشت کی کمزوری

تانیہ عباس..... لاڑکانہ

میں انٹری طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں
رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی
ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کرٹیکس (Cratex) کے
بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی
فرمائی۔

۱: اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں؟

۲: ایام کے دنوں میں استعمال کر سکتی ہوں؟

۳: کرٹیکس کب سے شروع کروں اور کب تک

کھاؤں؟

۵: اس دوا کی قیمت؟

جواب: بی بی ویاغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو
بڑھانے کے لیے کرٹیکس ڈاکٹر ولما شواہے جرمنی کی
ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات
مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہانہ ایام کے دنوں میں بھی اس
کو لیا جاسکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ
قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ
تک استعمال کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 420 روپے
ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہے۔ صبح اور شام ایک
ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ اس کے علاوہ 30
Ancardium شواہے جرمنی کے 5 قطرے دن میں
تین مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆ ☆ ☆

(3) اس کی پیکنگ خود کار کمپیوٹر انڈیشنوں سے
کی جاتی ہے جو پیکنگ کے معیار کو مسلسل چیک کرتی
رہتی ہے۔

(4) ماحول آلودگی سے پاک ہوتا ہے (کارکنان
سر کے بالوں کو ڈھانپنے رکھتے ہیں، چہرے پر ماسک
ہوتا ہے، ہاتھوں میں گھونڈ اور جسم پر گاؤن ہوتا ہے)
(5) فارمیسی کا ٹیسر اور ہوا کی نمی کو کنٹرول میں رکھا
جاتا ہے۔ ہر فارمیسی اور بالخصوص مقامی فارمیسی اتنے
معیارات کا خیال نہیں رکھ پاتیں جس سے دوا کی اثر
پذیری پر بہت۔۔۔ اثر پڑتا ہے۔ لہذا ان وجوہات کی
بنیاد پر اعلیٰ معیار کی قابل بھروسہ ادویات کو استعمال کرتے
اور کراتے ہیں۔

جوڑوں کا مسئلہ

ریحانہ نصیر..... فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے
جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگ ہلاتی تھی تو تک
تک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے
درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت گھٹنوں کے
جوڑوں سے تک تک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑی
دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت
ایسا زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا
علاج بتائیگی۔

جواب: بی بی، قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔
نماز کی پابندی کیجئے۔ اور پھر اپنی صحت کے لیے دوا
کیجئے۔ غذا متوازن لیں۔ اپنے سونے جاگنے کا وقت مقرر
کریں۔ بے مصرف کاموں میں وقت نہ گزاریں۔ ڈاکٹر
شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شواہے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء



Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.

صحت کی جستجو۔ لازوال تحقیق بناتے بے شواہے کو معیار بے مثال

شواہے اپنی ادویات کے 80% سے 85% فیصد یورپ کی افزائش اپنے وسیع و پیمانہ بنات سمیت کرتا ہے۔

جدید ترین تحقیق پر مبنی ایک صحت طلب اور مضبوط طریقہ کار کے ذریعے فطرت کے انتہائی قیمتی اجزاء کو ایک کھلے جاتے ہیں۔

دوا سازی کا عمل درست اجزاء سے حصول سے مکمل کے فوری مرحلے تک GMP کے معیار اور معیارات پر مبنی کے اصولوں کے تحت جاری ہیں۔

اس طرح تیار کی گئی ادویات کو پختی سے دیا جانے پر پاکستان میں برآمد کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مایکین مکمل بخروے کے ساتھ شواہے سنگھریلی برقی برقی کر کے ہیں۔

Homoeopathy Demands only Premium Quality

شواہے سنگھریلی ریپیڈیز

ہومیوپیتھی میں بہترین

مددکنگر، ڈیٹیشن



German imported
in Original Pack



Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt) Ltd.
www.drhamidschwabe.com

مزید معلومات کے لئے رابطہ کریں

Karachi, Phone: 021-32211895
Lahore, Phone: 042-36201603

شواہے سنگھریلی ریپیڈیز کے ساتھ ساتھ